تعارف

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے ۱۹۲۴ء میں مبلغ دس ہزار روپیہ کی رقم اس غرض کے لئے منظور کی کہ وہ مفید کتابیں جو ہمارے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوسکتی ہیں۔ اردو نیز یہاں کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں۔ تاکہ زبان کی ترویج اور خدمت سے خصوصاً ہمارے مدارس کے کتب خانوں کے لئے کارآمد، دلچسپ اور عمدہ کتابیں مہیا ہوسکیں۔

پنجاب گورنمنٹ کے احکامات کے ماتحت ۱۹۳۵ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی جگہ پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس نے لی۔ اور اس مذکورہ بالا علمی اور ادبی خدمت کو بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ یعنی تراجم و اشاعت کتب کا وہ سلسلہ جو ۱۹۲۴ء میں شروع ہوا تھا اور جس کے ضمن میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی تھیں جاری رکھا۔

۱۹۲۴ء سے اب تک ہر سال اس مقصد کے لئے پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی اور موجودہ پنجاب ایڈوائزری بورڈ اپنے سالانہ بجٹ میں روپیہ کی منظوری دیتی رہی ہے۔ اور متعدد کتابیں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتابیں جن کی فہرست سیکرٹری پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس۔ لاہور یا میسرز رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز۔ لاہور سے دستیاب ہو سکتی ہے صوبہ کے مدارس کی لائبریریوں کے لئے تحفتہً پیش کی جاتی ہیں۔

کتاب ہذا یعنی "نوع انسان کی کہانی" بھی اسی سلسلے میں ایک ہے پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس میسرز جارج جی ہیرپ اینڈ کمپنی لمیٹڈ (لنڈن) کی احسان مند ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو اردو زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت دی۔

سیکرٹری
پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس لاہور

دُنیا کی ابتدا

ہماری ہستی ایک بہت بڑا گورکھ دھندا ہے +

ہم کون ہیں ؟

ہم کہاں سے آئے ہیں ؟

ہم کہاں جا رہے ہیں ؟

ان سوالات کا جواب اُفق سے بھی پرے کہیں دُور ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ اور ہم بہت ہی آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال اور ہمت کے ساتھ اس کے قریب پہنچ رہے ہیں +

لیکن ابھی ہم نے کچھ بھی مسافت طے نہیں کی +

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں +

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ تاہم اتنا کچھ جان گئے ہیں۔ کہ اپنے علم کی بدولت کئی اور باتیں بہت حد تک بوجھنے کے قابل ہو گئے ہیں +

اس باب میں میں تمہیں یہ بتاؤنگا۔ کہ ظہور انسان سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ دنیا کا کیا حال تھا +

اگر ہم یہ اندازہ لگائیں۔ کہ کُرۂ زمین پر جاندار اشیا کا وجود کتنے عرصے سے ممکن ہے۔ اور اُس مدت کو اس لکیر سے ظاہر کریں تو جو ننھی سی لکیر اس کے نیچے کھینچی



گئی ہے۔ وہ یہ ظاہر کرتی ہے۔ کہ انسان (یا انسان کی طرح کی مخلوق) یہاں کتنے عرصے سے رہتی ہے +

انسان سب سے آخر میں آیا۔ لیکن عقل کے ذریعے قدرت کی طاقتوں کو تسخیر سب سے پہلے کیا + اسی لئے ہم بلیوں یا کتوں یا گھوڑوں یا دوسرے جانوروں کی بجائے

انسان ہی کی تاریخ کا مطالعہ کرینگے۔ گو اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی تاریخ بہت دلچسپ ہے +



موسلا دھار مینہ برسا

جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ یہ کرۂ زمین جس پر ہم آباد ہیں۔ شروع میں شعلہ بار مادے کا ایک بہت بڑا گولا تھا۔ جو فضا کے ناپیدا کنار سمندر میں دھوئیں کے ایک ننھے سے بادل کی مانند اُڑ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی سال بعد جب زمین کی سطح جل چکی۔ تو اس پر چٹانوں کی ایک ہلکی سی تہ نمودار ہوئی + ان بنجر چٹانوں پر موسلا دھار مینہ برسا۔ سخت پتھر بارش کے پانی میں تحلیل ہو گئے اور گدلا پانی ان وادیوں میں بہ نکلا۔ جو گرم گرم زمین کی اونچی اونچی پہاڑیوں کے درمیان چھپی ہوئی تھیں +

آخر ایک ایسا زمانہ آیا۔ جب سورج نے بادلوں میں سے اپنا چہرہ نکالا۔ اور دیکھا کہ اس ننھے سے کُرے کی سطح پر پانی کے چند تالاب سے بن گئے ہیں + یہی تالاب بعد میں مشرقی اور مغربی نصف کروں کے عظیم الشان سمندر بن گئے +

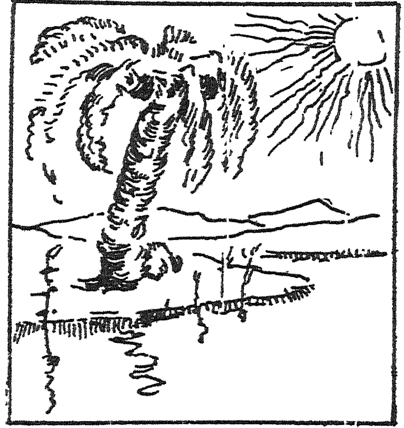
پھر ایک دن ایک حیرت انگیز معجزہ ظہور میں آیا۔ بیجان دنیا نے جاندار چیزوں کو جنم دیا +

پہلا جاندار ذرہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوُا +

کئی سال تک یہ ذرہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتا رہا۔ اس عرصے میں رفتہ رفتہ زمین کے ناموافق حالات سے مانوس ہوتا گیا۔ اور بالآخر زندگی کی مشکلات پر قابو پا لیا بعض ذرے ایسے بھی تھے۔ جو جھیلوں اور جوہڑوں کی تاریک گہرائیوں ہی میں خوش رہتے تھے۔ بہت سی مٹی اور کیچڑ پہاڑوں کی چوٹیوں سے بہ کر نیچے آئی تھی۔ اس میں جڑیں پکڑ لیں اور پودے بن گئے + بعض نے کسی جگہ ٹھیرنا پسند نہ کیا۔ یونہی ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ ان کے جسم میں سے بچھوؤں کی سی عجیب و غریب جوڑ دار ٹانگیں نمودار ہوئیں۔ اور وہ سمندر کی تہ میں پودوں اور اُن سبزی مائل لوتھڑوں کے درمیان جو جیلی مچھلیوں سے مشابہ تھے۔ رینگنے لگے۔ بعض چھلکوں والے ذرے ایسے بھی

تھے۔جنہیں خوراک کی تلاش میں ادھر اُدھر تیرنا پڑتا۔ ان کی بدولت سمندر رفتہ رفتہ کروڑوں مچھلیوں سے آباد ہوگیا۔

اس عرصے میں پودوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انہیں رہنے کے لئے نئی نئی جگہیں تلاش کرنی پڑیں۔ طوعاً و کرہاً پانی کو الوداع کہا۔ اور پہاڑوں کے دامن میں کیچڑ اور دلدلوں کے اندر سکونت اختیار کرلی۔ دن میں دو دفعہ جوار بھاٹے کی وجہ سے نمکین سمندر کی لہروں سے ہم آغوش ہوتے۔ لیکن باقی تمام وقت بڑی بیچینی سے کاٹتے۔ اور اس رقیق ہوا میں جو زمین کی سطح کو لپیٹی ہوئی تھی۔ زندہ رہنے کی کوشش کرتے۔ کئی صدیوں کی تربیت کے بعد اس قابل ہوئے۔ کہ جس طرح پہلے پانی میں رہتے تھے۔ ویسی آسانی کے ساتھ اب ہوا میں رہنے لگے۔ بڑے ہوئے۔ تو جھاڑیاں اور درخت بنے۔ اور آخر کار خوبصورت پھول پیدا کرنا سیکھا۔ جب پھول اُگے۔ تو بھنورے آکر رس چوسنے لگے۔ پرندے دور دور تک بیج اُڑا کرلے گئے۔ یہاں تک کہ سب زمین پر سبزے نے اپنی چادر بچھا دی اور بڑے بڑے درختوں نے اپنے سائبان پھیلا دئے۔


پودوں نے پانی کو الوداع کہا

بعض مچھلیوں نے بھی سمندر سے باہر قدم رکھا۔ اور گلپھڑوں کی بجائے پھیپھڑوں سے سانس لینا سیکھا۔ ایسے جانوروں کو خاکابی کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ خشکی اور تری دونو جگہ آسانی سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ کسی مینڈک سے پوچھو۔ وہ تمہیں بتائیگا۔ کہ خاکابی جانور کس مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

جب ایک دفعہ پانی سے باہر نکل آئے۔ تو یہ جانور رفتہ رفتہ خشکی ہی کے ہو رہے۔ بعض نے رینگنا سیکھا۔ اور سنسان جنگلوں میں کیڑے مکوڑوں کے ساتھ رہنے لگے۔ نرم نرم زمین پر تیزی سے چلنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ تو رفتہ رفتہ ٹانگیں بڑی ہوگئیں۔ ساتھ ہی جسامت بھی بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ دنیا بڑے

بڑے بڑے جانوروں سے آباد ہوگئی۔علم حیوانات کی کتابوں میں اختیاسورس[1]، میگلاسورس[2]۔ اور برانتوسورس[3] نامی جانوروں کا ذکر آتا ہے۔ جو تیس تیس چالیس چالیس فٹ لمبے تھے اور ہاتھیوں سے اس طرح کھیل سکتے تھے جس طرح بلّی اپنے بچوں سے کھیلتی ہے +

ان رینگنے والے جانوروں میں سے بعض جانور درختوں پر جا چڑھے اور وہیں رہنے سہنے لگے۔(درخت ان دنوں سو فٹ سے زیادہ اونچے ہوتے تھے) چلنا پھرنا موقوف ہوگیا۔ تو ٹانگوں کی بھی ضرورت نہ رہی لیکن ایک شاخ سے دوسری شاخ تک پھدکنے سے حرکت کرنے کے لئے اپنی جلد کی جھلّی سی بنائی۔ اور اسے اگلے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان اس ٹانگ سے اس ٹانگ تک پتنگ کی طرح پھیلا لیا۔ پھر اس جھلّی میں پَر اُگائے۔ دُم سے مڑنے تڑنے کا کام لیا۔ ڈال ڈال اُڑنے لگے اور سچ مچ کے پرندے بن گئے +

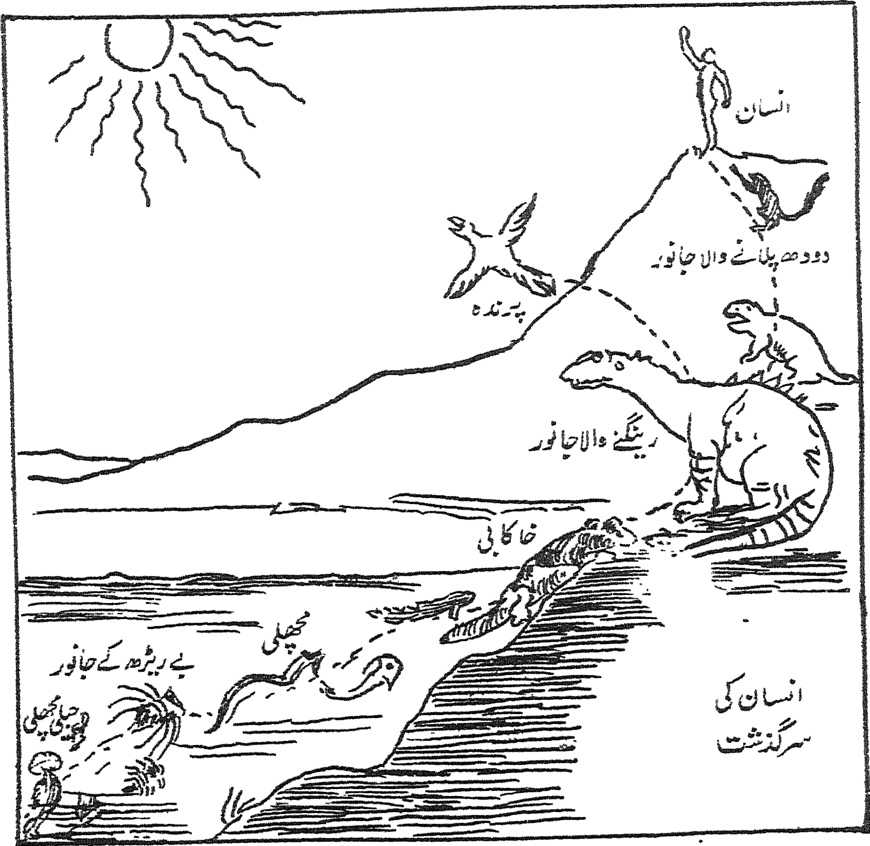
اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بڑے بڑے عظیم الجثّہ رینگنے والے جانور سب کے سب مر گئے۔ اس کا سبب آج تک معلوم نہیں ہوسکا۔ شاید آب و ہوا یک لخت تبدیل ہوگئی۔ یا شاید بھوک کے مارے مر گئے۔ کیونکہ بہت ممکن ہے وہ اتنے بڑے ہو گئے ہوں کہ نہ تیرنے کے قابل رہے ہوں نہ چلنے کے نہ رینگنے کے۔ اور بڑے بڑے پودے اور درخت سامنے دکھائی دے رہے ہوں۔ لیکن وہ اُن تک پہنچ نہ سکتے ہوں + بہرحال بڑے بڑے رینگنے والے جانور دس لاکھ سال تک اس دنیا پر مسلّط رہے اور پھر یہاں سے چل بسے +

ان کی جگہ بالکل ہی مختلف قسم کے جانوروں نے لے لی + یہ اولاد تو انہیں رینگنے والے جانوروں کی تھے۔ لیکن ان میں بڑا فرق یہ تھا۔ کہ اپنے بچوں کو چھاتیوں کا دودھ پلاتے تھے۔ اس لئے انہیں دودھ پلانے والے جانور کہتے ہیں + مچھلیوں کے سے پَر ان کے جھڑ چکے تھے۔ پرندوں کے سے پَر اختیار نہ کئے۔ اُن کی بجائے بال اُگ آئے + ان دودھ پلانے والے جانوروں نے بعض ایسی عادات سیکھ

---

[1] Iehthyosaurus [2] Megalosaurus [3] Brontosaurus

ہیں - جن کی بدولت ان کی نسل کو باقی تمام جانوروں پر فوقیت حاصل ہوگئی جب



جانوروں کا شجرہ نسب

تک بچے پیدا نہ ہو جاتے - مادہ اپنے انڈے جسم کے اندر ہی اٹھائے پھرتی + باقی سب جانور تو اپنے بچوں کو گرمی اور سردی کے رحم پر چھوڑ دیتے - لیکن دودھ پلانے والے جانور بہت مدت تک اپنے بچوں کو ساتھ رکھتے - اور جب تک وہ طاقتور ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہو جاتے - خود اُن کی حفاظت کرتے اس طرح دودھ پلانے والے جانوروں کے بچے کئی باتیں اپنی ماں سے سیکھ لیتے - اور زیادہ آسانی سے زندہ رہ سکتے + کسی بلّی کو دیکھو - کس طرح بچّوں کو اپنی حفاظت کرنا اور منہ دھونا اور چوہے پکڑنا سکھاتی ہے +

لیکن ان دودھ پلانے والے جانوروں کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ

بتانے کی ضرورت نہیں۔ تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ تمہارے اردگرد ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ بازاریں اور گھر پر وہ تمہارے ساتھ رہتے ہیں۔ اور جو اتنے عام نہیں۔ انہیں تم چڑیا خانے میں جا کر دیکھ سکتے ہو +

ان بیشمار بے زبان جانوروں میں سے ایک جانور نے باقی سب سے الگ اپنے لئے ایک رستہ نکالا۔ عقل و شعور کو کام میں لایا۔ اور اس کی بدولت زندگی کی کشمکش میں اپنی نسل کی رہنمائی کی۔ یہ جانور "انسان" کہلایا +

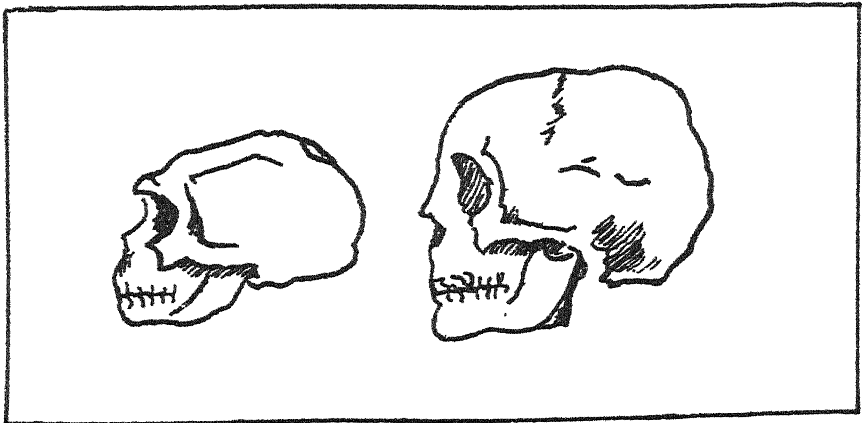
تھا تو یہ بھی دودھ پلانے والا جانور لیکن خوراک مہیا کرنے اور جان بچانے میں سب سے ہوشیار تھا۔ پہلے اگلی ٹانگوں سے شکار پکڑنے کی عادت ڈالی۔ ہوتے ہوتے پنجے کی شکل ہاتھ کی سی بن گئی۔ پھر بے انتہا کوششوں کے بعد پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھا (یہ کرتب اب بھی کچھ ایسا آسان نہیں۔ انسان دس لاکھ سال سے اس کا عادی ہے۔ پھر بھی ہر بچے کو یہ ازسرنو سیکھنا پڑتا ہے) +

یہ جانور دیکھنے میں کچھ بندر کچھ بن مانس سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن ذہانت میں دونوں سے بڑھ کر تھا۔ شکار میں کوئی اس کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ ہر قسم کی آب و ہوا میں رہ لیتا تھا۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتا۔ تو حفاظت کی خاطر ہمجنسوں کی ایک ٹولی بنا کر سفر کرتا۔ بچوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے عجیب و غریب آوازیں نکالتا۔ کئی لاکھ سال بعد انہی آوازوں سے گفتگو کرنا سیکھا +

تمہیں یقین تو مشکل سے آئیگا۔ کہ ہم تم سب اسی جانور کی اولاد ہیں + لیکن حقیقت یہی ہے +

ہمارے قدیم ترین آباو اجداد

قدیم ترین "سچ مچ کے" انسانوں کے متعلق ہمارے معلومات بہت کم ہیں۔ ان کی تصویریں ہماری نظر سے کبھی نہیں گزریں۔ بعض اوقات کسی پرانی زمین کی سب سے گہری تہ کے اندر بعض ایسے جانوروں کے ٹوٹے پھوٹے پنجر دستیاب ہوتے ہیں۔ جو عرصہ ہؤا صفحۂ زمین سے معدوم ہو چکے ہیں۔ انہیں پنجروں کے ساتھ قدیم انسان کی ہڈیاں بھی مدفون ملتی ہیں + بڑے بڑے سائنس دانوں نے (جو تمام عمر اس بات کے مطالعے میں گزار دیتے ہیں۔ کہ نسلِ انسانی کا دیگر جانوروں کی نسل سے کیا تعلق ہے) ان ہڈیوں کو جوڑ جوڑ کر اس بات کا اچھا خاصا اندازہ لگا لیا ہے۔ کہ قدیم ترین انسان کا ڈھانچہ کس وضع کا تھا +



انسانی کھوپری کی ہیئت کس طرح بدلی

قدیم ترین انسان دودھ پلانے والا جانور تھا۔ لیکن ٹھنگنا۔ بدصورت۔ بدوضع اور ہم تم سے کہیں پست قد + آفتاب کی گرمی اور جاڑوں کی سرد ہوا سے اس کی رنگت سنولا گئی تھی + دھڑ کا بیشتر حصہ۔ اور سر بازو اور ٹانگیں لمبے لمبے موٹے سخت بالوں سے ڈھکی ہوئی تھیں + انگلیاں پتلی لیکن مضبوط تھیں۔

چنانچہ ہاتھ بندروں کے سے معلوم ہوتے تھے ۔ ماتھا تنگ تھا ۔ جبڑا اُن وحشی جانوروں کا سا جو دانتوں سے کانٹے اور چھری دونو کا کام لیتے ہیں ۔ ننگ دھڑنگ رہتا تھا ۔ آگ اس نے گڑگڑاتے ہوئے آتش فشاں پہاڑوں کے سوا اور کہیں نہ دیکھی تھی ۔ جن کے شعلے بلند ہوتے ۔ تو دنیا لاوا اور دھوئیں سے بھر جاتی ۔

آج کل کے افریقی بونوں کی طرح قدیم انسان بھی بڑے بڑے تاریک اور مرطوب جنگلوں میں رہتا تھا ۔ بھوک لگتی تو درختوں کے پتے یا پودوں کی جڑیں ویسے ہی چبا جاتا ۔ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کسی جانور کے انڈے زبردستی چھین لیتا ۔ کبھی کبھار بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کسی چڑیا یا جنگلی کتے یا خرگوش کو پکڑ لیتا اور اسے کچا ہی کھا جاتا ۔ پکانا ابھی نہ سیکھا تھا ۔ اس لذت سے ابھی بیخبر تھا ۔

قدیم انسان دن بھر خوراک کی تلاش میں وحشی جانوروں کی طرح ادھر اُدھر پھرتا رہتا ۔

جب رات پڑتی اور دنیا پر تاریکی چھا جاتی ۔ تو بیوی بچوں کو کسی درخت کی کھوکھ یا بڑی بڑی چٹانوں کی اوٹ میں چھپا دیتا ۔ کیونکہ اردگرد چاروں طرف خونخوار درندے رہتے تھے ۔ جو رات کے وقت اپنے اپنے بیوی بچوں کے لئے خوراک تلاش کرتے پھرتے تھے ۔ اور جنہیں انسان کا گوشت بہت لذیذ معلوم ہوتا تھا ۔ اس زمانے میں دنیا کا دستور یہی تھا ۔ کہ یا تم کسی کو کھا جاؤ ۔ یا تمہیں کوئی کھا جائیگا ہر وقت جان کے لالے پڑے رہتے تھے ۔ اور زندگی ڈر اور فکر میں گزرتی تھی ۔

گرمیوں میں چلچلاتی ہوئی دھوپ ستاتی اور جاڑوں میں بچے گود ہی میں ٹھٹھر کر مر جاتے ۔ چونکہ شکار پر گزران تھا ۔ اس لئے اکثر بھاگ دوڑ میں کوئی ہڈی ٹوٹ جاتی یا ٹخنے میں موچ آجاتی ۔ آس پاس کوئی تیمار دار نہ ہوتا ۔ اور انسان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا ۔

چڑیا خانے میں جانور طرح طرح کی آوازیں نکال کر خوش ہو لیتے ہیں ۔ اسی طرح قدیم انسان بھی کچھ غاں غوں کرتا رہتا اور چند بے معنی سی آوازیں بار بار دہراتا رہتا ۔ کیونکہ اپنی آواز سن کر اسے بھی خوشی حاصل ہوتی تھی ۔ رفتہ رفتہ خطرے کے وقت ساتھیوں کو آگاہ کرنے کا کام انہی آوازوں سے لینے لگا ۔ مثلاً

تاریخ

زمانہ تاریخ اس موٹی سیاہ لکیر سے ظاہر کیا گیا ہے

بالآخر سچ مچ کا انسان بن گیا

بھوک اور سردی اور بیماری بھی اسے فنا نہ کر سکی

یہ وحشی انسان کئی لاکھ سال تک ترقی کرنے کے لئے جدوجہد کرتا رہا

انسان نے آہستہ آہستہ ترقی کی

دنیا کی پیدائش کو
کئی لاکھ سال گزر چکے جب کہیں وہ جاندار ظہور میں آیا جس کی ہم سب اولاد ہیں

انسان کا عروج

قبل تاریخ کا زمانہ اس بل کھائی ہوئی لکیر سے ظاہر کیا گیا ہے

تاریخ اور تاریخ سے قبل

خاص خاص موقعوں پر چھوٹی چھوٹی چیخیں مار کر ساتھیوں کو بتاتا کہ "یہاں ایک شیر ہے" یا "پانچ ہاتھی آ رہے ہیں" ساتھی بھی الم غلم آوازیں نکال کر جواب دیتے کہ "ہاں ہمیں دکھائی دے رہا ہے" یا "چلو بھاگ نکلیں اور کہیں چھپ جائیں"۔ انسانی بولی کی داغ بیل غالباً یونہی پڑی۔

لیکن جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ان شروعات کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ قدیم انسان کے پاس نہ تو کوئی ہتھیار تھے۔ نہ اس نے کوئی مکان تعمیر کئے۔ نہ اس کی بود و باش کے کوئی آثار باقی رہ گئے ہیں۔ بجز اس کے کہ کہیں کہیں ہنسلی یا کھوپری کی ہڈیاں مل جاتی ہیں۔ جن سے اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہزارہا سال پیشتر دنیا میں بعض ایسے دودھ پلانے والے جانور آباد تھے۔ جو باقی جانوروں سے مختلف تھے۔ جو غالباً بندر کی قسم کے ایک ایسے جانور کی اولاد تھے جس نے پچھلی ٹانگوں کے بل چلنا۔ اور اگلے پنجوں کو ہاتھوں کے طور پر استعمال کرنا سیکھ لیا تھا۔ اور جن کا سلسلہ غالباً اس مخلوق سے ملتا ہے۔ جو ہمارے آبا و اجداد ہیں۔

ہمارے علم کی نظر بس یہیں تک کام کرتی ہے۔ اور باقی سب اندھیرا ہے۔

زمانہ تاریخ سے پہلے کا انسان

زمانۂ تاریخ سے پہلے کا انسان اپنے لئے چیزیں بنانا شروع کرتا ہے

شروع شروع میں انسان یہ بالکل نہ جانتا تھا۔ کہ وقت کیا چیز ہے۔ پیدائش۔ شادی۔ موت کسی واقعے کی تاریخ یا وقت کی کوئی یادداشت محفوظ نہ رکھتا تھا۔ دن یا ہفتے یا سال کے تصور سے اس کا ذہن واقف نہ تھا۔ البتہ سرسری طور پر موسموں کے تسلسل کا احساس اسے ضرور تھا۔ کیونکہ وہ دیکھتا تھا۔ کہ جاڑوں کے بعد ہمیشہ بہار کا خوشگوار موسم آتا ہے۔ بہار کے بعد سخت گرمی پڑتی ہے۔ پھل پک جاتے ہیں اناج کے بھٹے کھانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد جب ہوا کے تیز جھونکوں سے پت جھڑ شروع ہو جاتی ہے۔ اور کئی جانور لمبی نیند کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ تو گرمیوں کا موسم ختم ہو جاتا ہے +

لیکن پھر ایک عجیب و غریب اور ہولناک واقعہ پیش آیا + موسم میں خلل سا آ گیا۔ گرمیوں کے دن بہت دیر میں آئے۔ پھل کچے رہ گئے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں جن پر گھاس اُگا کرتی تھی برف کے تودوں کے نیچے ڈھکی کی ڈھکی رہ گئیں +

پھر ایک دن صبح کے وقت بہت سے وحشی لوگ جو گرد و نواح کے لوگوں سے بہت مختلف تھے۔ پہاڑ کی بلند چوٹیوں سے اُتر کر نیچے آ گئے + اُن کے جسم لاغر ہو رہے تھے۔ اور چہرے فاقوں کے مارے اُترے ہوئے تھے + ان کی بولی کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ کہہ رہے ہیں ہم بھوکے ہیں + خوراک کی ایسی کثرت نہ تھی۔ کہ پرانے باشندے اور نو وارد دونو اپنا پیٹ بھر سکتے چنانچہ جب اُن کو آئے کئی دن گزر گئے۔ اور اُنہوں نے جانے کا نام نہ لیا۔ تو خوفناک

جنگ چھڑ گئی۔ فریقین نے اپنے پانوؤں اور ہاتھوں سے جو بالکل جانوروں کے پنجوں کی مانند تھے۔ ایک دوسرے کو نوچنا شروع کیا۔ خاندان کے خاندان اس لڑائی میں کام آئے۔ جو زندہ بچ رہے۔ وہ واپس پہاڑوں کو بھاگ گئے۔ جب وہاں برفانی آندھی آئی۔ تو وہ بھی فنا ہو گئے۔

لیکن جنگل کے رہنے والے لوگ بہت سہمے ہوئے تھے۔ کیونکہ دن رفتہ رفتہ چھوٹے ہوتے جاتے تھے۔ اور راتوں کو سردی پہلے سے زیادہ پڑنے لگی تھی۔

آخرکار دو اونچی اونچی پہاڑیوں کے درمیان سبزی مائل برف کا ایک چھوٹا سا ذرّہ دکھائی دیا۔ جس کا حجم تیزی کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ حتےٰ کہ ایک بہت بڑا گلیشیر ڈھلوان پر سے پھسلتا ہوا نظر آیا۔ جس نے بڑے بڑے پتھروں کو وادی میں دھکیل دیا۔ برف اور کیچڑ اور چٹانوں کا ایک دندناتا ہوا آبشار جنگل کے باشندوں کے اوپر آن گرا۔ اور وہ نیند سے اُٹھنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئے۔ صدیوں کے پرانے درخت پاش پاش ہو گئے۔ اور پھر اس کے بعد برف پڑنے لگی۔

برف کئی مہینوں تک پڑتی رہی۔ پودے سب مر گئے۔ جانور آفتاب کی تلاش میں جنوب کی سمت بھاگ نکلے۔ انسان بھی اپنے بچوں کو پیٹھ پر اُٹھائے ان کے پیچھے ہو لیا۔ لیکن وحشی جانوروں کی سی تیزی کہاں سے لاتا؟ چنانچہ مجبور ہو گیا۔ کہ یا تو سوچ سے کام لے اور جلد جلد کوئی ترکیب نکالے یا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ معلوم ہوتا ہے سوچ ہی سے کام لیا۔ کیونکہ اس قسم کے گلیشیر چار دفعہ قہر بن کر نازل ہوئے۔ یہاں تک کہ انسان کے مٹ جانے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ لیکن انسان کو دیکھئے زندہ وسلامت موجود ہے۔

سب سے مقدم یہ تھا۔ کہ انسان اپنے جسم کو ڈھانپے تاکہ ٹھٹھر کر مر نہ جائے۔ چنانچہ اس نے گڑھے کھودنا سیکھا۔ ان پر شاخوں اور پتوں کی چھت ڈالی۔ اس ترکیب سے ریچھوں اور لگڑبگڑوں کو پکڑا۔ بھاری بھاری پتھروں سے ان کو ہلاک کیا۔ اور ان کی کھالیں اُتار کر اپنے اور اپنے خاندان کے لئے کوٹ بنائے۔ پھر گھر بنانے کا سوال پیش آیا۔ یہ کام کچھ مشکل نہ تھا۔ کئی جانور اندھیرے

گلیشیر ہٹ رہے ہیں
بحر منجمد
بالٹک
بحر اوقیانوس
ٹیمز
رائن
انسان یورپ کے بیابانوں کو واپس آ رہا ہے
ڈینیوب
بحر اسود
پیرنیز
الپس اب بھی برف سے ڈھکا ہے
جنگل پھر شمال کو جا رہے ہیں
بحیرہ روم کی ابتدا
یہ افریقہ ہے

زمانہ تاریخ سے قبل یورپ کی حالت

غاروں میں سوتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی انسان کو بھی یہی ترکیب پسند آئی۔ جانوروں کو نکال کر آپ بھٹوں میں جا گھسا۔ اور مالک بن بیٹھا +

پھر بھی سردی اتنی پڑتی تھی۔ کہ اکثر لوگ اس کی تاب نہ لا سکے۔ اور بوڑھے اور جوان سبھی ہزاروں کی تعداد میں مرنے لگے + اس پر کسی عقلمند کو آگ تاپنے کا خیال سُوجھا + ایک دفعہ جب وہ شکار کو نکلا تھا۔ تو جنگل میں آگ لگ گئی تھی۔ جس میں وہ جل کر کباب ہو چلا تھا + بچ گیا مگر یہ واقعہ اسے نہ بھولا + اب تک تو آگ دشمن تھی۔ اب اسے اپنا دوست بنا لیا + ایک سوکھے ہوئے درخت کو غار کے اندر گھسیٹ لائے۔ جلتے جنگل سے ایک سلگتی ہوئی شاخ اٹھا لائے۔ اس سے درخت کو جلایا۔ اور ٹھنڈے غار کو گرم کمرے کی مانند آرام دہ بنا لیا +

پھر ایک دن شام کو ایک مرا ہؤا مُرغا آگ میں جا پڑا۔ جتنے اسے آگ سے نکالا۔ وہ اچھی طرح بھُن چُکا تھا + کھایا تو معلوم ہؤا کہ پکا ہؤا گوشت زیادہ لذیذ ہوتا ہے + یہ دریافت کرنے کے بعد انسان نے فوراً ایک پرانی حیوانوں کی سی عادت چھوڑ دی۔ اور خوراک پکا کر کھانے لگا +

اس طرح ہزار ہا سال گزر گئے + صرف وہی لوگ باقی رہ گئے جن کے دماغ تیز تھے۔ دن رات سردی اور بھوک کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ اس لئے انسان ہتھیار ایجاد کرنے پر مجبور ہو گیا + پتھروں کو تراش کر کلہاڑے بنائے۔ اور گھس گھس کر ہتھوڑے وضع کئے + جاڑوں کے طویل زمانے کے لئے خوراک کا ذخیرہ جمع کرنا پڑا + مٹی کے پیالے اور ظروف بنانے سیکھے۔ اور اُن کو دھوپ میں سُکھا کر سخت بنایا + گویا گلیشیروں کا زمانہ جو نسل انسانی کے لئے مہلک معلوم ہوتا تھا۔ فی الحقیقت ایک رحمت ثابت ہؤا۔ کیونکہ اس کی بدولت انسان نے اپنی عقل کو کام میں لانا سیکھا +

مصریوں کا مقدس رسم الخط

مصریوں نے تحریر کا فن ایجاد کیا۔ جس کی بدولت تاریخ لکھی جانے لگی

زمانہ قدیم کے یہ لوگ جو یورپ کے بیابانوں میں آباد تھے۔ بہت جلد جلد نئی باتیں سیکھ رہے تھے + کچھ عرصے کے بعد وہ اپنا وحشی پن چھوڑ کر یقیناً مہذّب بن جاتے۔ اور ایسی تہذیب کی بنیاد ڈال لیتے۔ جس میں بیرونی اثرات کا کچھ دخل نہ ہوتا۔ لیکن تہذیب کے درجے کو پہنچنے نہ پائے تھے۔ کہ غیر ملکی اثرات نے غلبہ پا لیا۔ یعنی اور قوموں نے ان کا کھوج لگا لیا +

جنوب کی گمنام سرزمین کے رہنے والے ایک سیاح نے ہمت کر کے سمندر اور اونچے اونچے پہاڑی دروں کو عبور کیا۔ اور براعظم یورپ کے وحشیوں تک آن پہنچا + یہ سیاح افریقہ سے آیا تھا۔ اس کا وطن مصر تھا +

جب اہل مغرب تمدن کے ابتدائی مراحل مثلاً پہیے کا استعمال کرنا۔ غاروں کی بجائے مکانات میں رہنا۔ وغیرہ سے روشناس ہوئے۔ اُس سے بھی ہزارہا سال پہلے وادیٔ نیل میں آفتابِ تہذیب نصف النہار پر تھا۔ اس لئے اہلِ مغرب کے آباؤ اجداد کو غاروں ہی میں رہنے دیجئے۔ اور بحیرۂ روم کے جنوبی اور مشرقی ساحل کی سیر کیجئے۔ جہاں نسل انسانی پہلی مرتبہ تہذیب کا سبق سیکھ رہی تھی +

مصریوں نے ہمیں کئی باتیں سکھائی ہیں + وہ فن کاشتکاری کے ماہر تھے۔ اور آبپاشی کے طریقوں سے پوری طرح واقف تھے + عبادت گاہوں کی تعمیر میں یونانیوں نے مصریوں ہی کی تقلید کی۔ اور پھر یونانیوں کی بدولت یہ فن ہم تک پہنچا۔ گویا موجودہ زمانے کے گرجے بالواسطہ مصریوں ہی کی صنعت کا نتیجہ ہیں + جو جنتری انہوں نے ایجاد کی۔ وہ وقت

کی پیمائش کے لئے اس قدر مفید ثابت ہوئی۔ کہ خفیف سی ردوبدل کے بعد آج بھی ہم اسی کو استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن مصریوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے۔ کہ انہوں نے انسانی کلمات کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ رکھنے کا فن یعنی فنِ تحریر ایجاد کیا +

ہم اخباروں اور کتابوں اور رسالوں سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں۔ کہ ہم سمجھتے ہیں۔ نوشت وخواند کا فن روزِ ازل سے چلا آتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے + دنیا کی اہم ترین اختراع یعنی فنِ تحریر کی ایجاد حال ہی کا واقعہ ہے + اگر یہ فن ہمارے پاس موجود نہ ہو۔ تو ہماری حالت کتے بلیوں کی سی ہو۔ جو اپنے بچوں کو چند موٹی موٹی باتیں سکھا دیتے ہیں۔ لیکن گزشتہ نسلوں کے تجربے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے کہ ان کے آباؤ اجداد کا علم ان کے پاس محفوظ نہیں +

پہلی صدی قبل مسیح میں جب اہلِ روما مصر میں آئے۔ تو انہیں وادیٔ نیل میں ہزارہا چھوٹی چھوٹی عجیب وغریب تصویریں ملیں۔ قیاس سے معلوم ہوا۔ کہ ان تصویروں کا تعلق تاریخ مصر سے ہے + لیکن رومن لوگ غیر ملکی چیزوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے یہ دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ کہ یہ تصویریں جن سے محلات اور عبادت گاہوں کی دیواریں بھری ہوئی ہیں۔ اور جو سرکنڈے کے بنے ہوئے کاغذوں کے ہزارہا صفحوں پر منقوش ہیں۔ یہ کہاں سے آئیں۔ مصر کے مذہبی پیشوا اس مصوری کے مقدس فن سے واقف تھے۔ لیکن ان کی نسل کو ختم ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ مصر کی آزادی چھن گئی تھی۔ اور یہ تاریخی مسودات ہزاروں کی تعداد میں باقی رہ گئے تھے جنہیں اب کوئی نہ پڑھ سکتا تھا۔ اور جو اس لئے کسی مصرف کے نہ تھے۔

سترہ صدیاں گزر گئیں۔ لیکن مصر قدیم کے چہرے پر سے کوئی شخص نقاب نہ الٹ سکا۔ بالآخر ۱۷۹۸ء میں ایک فرانسیسی سپہ سالار بوناپارٹ نامی برطانیہ کے ہندوستانی مقبوضات پر حملہ آور ہونے کی غرض سے مشرقی افریقہ میں وارد ہوا۔ اسے اپنے مقصد میں کامیابی تو حاصل نہ ہوئی۔ اور وہ دریائے نیل تک ہی پہنچ کر رک گیا۔ لیکن اس مہم کی بدولت مصر کے خطِ تصویری کا راز معلوم ہو گیا +

افواج فرانس دریائے نیل کے دہانے پر دریائے روزیٹا[1] کے کنارے ایک چھوٹے سے قلعے میں مقیم تھیں۔ ان کی زندگی تفریح اور تنوع سے یکسر خالی تھی۔ ایک نوجوان افسر اکثر ارد گرد کے کھنڈروں کی سیر کو نکلا۔ وہاں ایک پتھر نظر پڑا۔ جس کے نقوش کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا۔ پتھروں پر چھوٹی چھوٹی تصویروں کا منقوش نظر آنا تو مصر میں عام بات تھی۔ لیکن سیاہ چٹان کا یہ ٹکڑا اور پتھروں سے مختلف تھا۔ اس پر تین قسم کی تحریریں کندہ تھیں۔ جن میں سے ایک یونانی زبان میں تھی افسر نے سوچا۔ یونانی زبان تو ہم جانتے ہیں۔ یونانی تحریر کے ساتھ مصری تحریر کا لفظاً لفظاً مقابلہ کیا جائے۔ تو یقینی امر ہے۔ کہ مصری زبان کے پڑھنے کا طریقہ معلوم ہو جائیگا +

بات تو بہت سہل معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس معمے کے حل کرنے میں بیس سال سے بھی زیادہ لگ گئے۔ ۱۸۰۲ء میں ایک فرانسیسی پروفیسر شمپولیوں[2] نامی نے دوبارہ اس پتھر کی یونانی اور مصری تحریروں کا مقابلہ کیا + ۱۸۲۳ء میں اس نے اعلان کیا۔ کہ میں نے چودہ تصویروں کے معنے دریافت کرلئے ہیں۔ تھوڑے عرصے بعد پروفیسر شمپولیوں کام کرتا کرتا مرگیا۔ لیکن مصری تحریر کے موٹے موٹے اصولوں سے دنیا کو آگاہ کرگیا۔ اس کی بدولت ہم آج وادئ نیل سے جس قدر واقف ہیں۔ دریائے مسیسپی سے نہیں۔ کیونکہ ہمارے پاس ایسی تحریریں موجود ہیں۔ جن سے چار ہزار سال کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے +

چونکہ اہل مصر کا یہ قدیم مقدس رسم الخط تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ انہی کی ابجد کے بعض حروف ردوبدل کے بعد ہماری ابجد میں بھی شامل ہیں۔ اس لئے اس کا حال ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہئے۔ تاکہ معلوم ہو۔ کہ آج سے پانچ ہزار سال پہلے بنی نوع انسان نے انسانی کلمات کو آئندہ نسلوں کے لئے کیونکر محفوظ کردیا +

تم نے اس طرز تحریر کا حال تو سنا ہوگا جس میں اشاروں اور نشانوں سے مطلب ادا کیا جاتا ہے۔ امریکہ کے اصلی باشندوں کے متعلق کوئی کہانی پڑھو۔ اس میں اس کا ذکر ضرور آئیگا۔ ان لوگوں نے چند نشان اور بعض بعض تصویریں مقرر کر رکھی ہیں۔

---

[1] (Rosetta)　[2] (Champollion)

جن کا منصب کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔ کہ اتنے بھینسے مارے گئے۔ یا فلاں گروہ میں اتنے شکاری ہیں وغیرہ وغیرہ + ایسی تحریر کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں +

لیکن قدیم مصریوں کا رسم الخط اس قسم کا نہ تھا۔ یہ قسم تو فن تحریر کی ابتدائی شکل ہے۔ اور وادئ نیل کے ترقی یافتہ باشندے اس سے آگے نکل چکے تھے۔ ان کی تصاویر بہت پرمعنی ہوتی تھیں +

فرض کرو تم شمپولیوں ہو۔ اور تم مصری تحریروں کا مطالعہ کر رہے ہو۔ ایک جگہ تمہیں ایک آدمی کی تصویر نظر آتی ہے اس کے ہاتھ میں ایک بیلچہ ہے۔ اور سامنے ایک کھائی کھدی ہے۔ تم اس کا مطلب یہ سمجھوگے۔ کہ ایک آدمی نے خندق کھودی۔ لیکن ایک اور تحریر میں کسی ملکہ کی ضیافت کا تذکرہ ہے۔ اور بیچ میں کھائی کی تصویر بنی ہے۔ اس کا مطلب تو خندق ہو نہیں سکتا۔ ایک خندق کا ضیافت سے کیا تعلق! اس کا مطلب ضرور کچھ اور ہوگا۔ لیکن کیا؟

یہی وہ سوال تھا جس کا جواب شمپولیوں نے دریافت کیا + وہ اس نتیجے پر پہنچا۔ کہ مصریوں کا رسم الخط اس قسم کا ہے۔ جسے ہم آج کل صوتی رسم الخط کہتے ہیں۔ (صوت کے معنی آواز ہیں) اس میں تصویروں کے ذریعے الفاظ کی آوازیں ادا کی جاتی ہیں۔ اور چند نقطوں اور خطوں کی بدولت سب الفاظ کی آوازیں ضبط تحریر میں لائی جاسکتی ہیں +

کھائی کے دو معنے ہیں۔ ایک خندق اور دوسرے "کھانا" کا ماضی مطلق۔ خندق کی تصویر بنانے سے کھانے کا مفہوم بھی ادا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس "کھائی" اور اُس "کھائی" کا تلفظ ایک جیسا ہے۔ جب کئی سو سال گزر گئے۔ تو مصری یہ دو معنی بھول گئے۔ اور خندق کی تصویر نے ایک حرف کی صورت اختیار کر لی۔ جو "کھ" کا کام دینے لگا +

اہل مصر فن تحریر ایجاد کر کے ہزارہا سال تک اسے استعمال کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ اس میں کئی جدتیں پیدا ہوتی گئیں۔ اور اس نے بہت ترقی کی۔ اس کی بدولت دوستوں کو خط بھیجنے لگے۔ اپنا حساب کتاب رکھنے لگے۔ اور اسی کی بدولت اپنے ملک کی تاریخ لکھی۔ تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں اپنے آباؤ اجداد کی غلطیوں سے عبرت پکڑیں۔ اور ان کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں +

وادئ نیل

دریائے نیل کی وادی میں تہذیب کا آغاز

انسان کی تاریخ کیا ہے۔ فسانہ ہے ایک بھوکے جانور کا جو ہمیشہ خوراک کی تلاش میں مارا مارا پھرا۔ جہاں خوراک کا پتہ ملا۔ وہیں پہنچ کر گھر بنا لیا۔

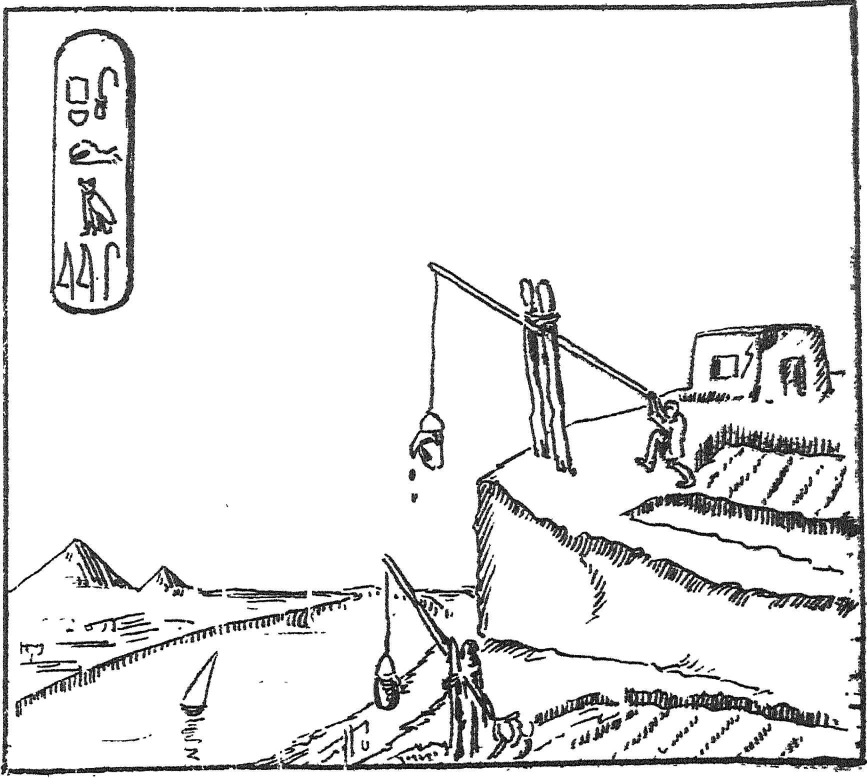
معلوم ہوتا ہے۔ وادئ نیل کی شہرت آج سے بہت پہلے دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ کیونکہ اندرون افریقہ اور صحرائے عرب اور مغربی ایشیا کے لوگ جوق در جوق اپنے اپنے ملکوں کو چھوڑ کر مصر میں آن بسے۔ اور وہاں کے زرخیز علاقوں پر قابض ہوگئے۔ یہ سب حملہ آور مل کر ایک قوم بن گئے۔ اپنا نام انہوں نے "ریمی"[1] رکھا جس کے معنی ہیں "اعلیٰ قسم کے انسان"۔ بڑے ہی خوش نصیب تھے۔ جو قسمت نے انہیں اس تنگ خطے کا رستہ دکھایا۔ کیونکہ ہر سال گرمیوں کے موسم میں جب دریائے نیل میں سیلاب آتا۔ تو یہ وادی ایک پایاب سی جھیل بن جاتی۔ جب پانی اُتر جاتا۔ تو کھیتوں اور چراگاہوں پر نہایت ہی زرخیز مٹی کی کئی انچ موٹی لپائی کر جاتا۔

دریا یاوری نہ کرتا۔ تو اس خدمت کے لئے کئی لاکھ آدمی درکار ہوتے۔ جہاں تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے شہر سب سے پہلے مصر ہی میں آباد ہوئے۔ ان شہروں کی ہزارہا مخلوق اسی دریا کی بدولت پیٹ بھر کر کھانا کھاتی تھی۔ سب کے سب کھیت تو اس وادی میں واقع نہ تھے۔ تاہم کنوؤں اور نہروں کے ذریعے بڑی دانائی سے کام لے کر پانی کو دریا کی سطح سے اونچے اونچے کناروں تک لے آتے اور پھر آبپاشی کے لئے نالیاں کھود کر ان نالیوں کے رستے ملک بھر میں پہنچا دیتے۔

زمانہ تاریخ سے پہلے کا انسان دن رات میں سے سولہ گھنٹے اپنے اور اپنے کنبے کے لئے خوراک جمع کرتا پھرتا تھا۔ لیکن مصر کا دہقان یا شہری اس قدر مصروف نہ رہتا تھا۔

---

[1] (Remi)



وادیٔ مصر

فرصت کے وقت میں اس نے کئی ایسی چیزیں بنائیں جو محض آرائش کے کام آتی تھیں۔ ان کا فائدہ کچھ بھی نہ تھا۔

اس کے علاوہ فرصت کا ایک اور مشغلہ بھی ڈھونڈ نکالا۔ ایک دن اس پر انکشاف ہوا۔ کہ میرا دماغ کھانے پینے۔ سونے جاگنے اور بچوں کے لئے گھر بنانے کے علاوہ اور کئی باتیں بھی سوچ سکتا ہے۔ اپنے گرد و نواح پر غور کیا۔ کئی عجیب و غریب سوالات نے طبیعت کو گدگدایا۔ خیال کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ یہ ستارے کہاں سے آتے ہیں؟ جب بادل مہیب کڑک سنائی دیتی ہے۔ تو یہ کون شور مچاتا ہے؟ کون ہے، جو دریائے نیل میں سیلاب اس باقاعدگی سے بھیجتا ہے کہ ہر سال دریا کو چڑھتے اترتے دیکھ کر جنتری کا حساب لگایا جا سکتا ہے؟ میں خود کون ہوں؟ ایک عجیب و غریب ننھا سا حیوان۔ مگر یہ کیا ہے کہ میرے اردگرد موت اور بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ اور میں پھر بھی خوش ہوں۔ قہقہے لگاتا ہوں۔

مصری نے کئی ایسے سوالات اپنے آپ سے پوچھے + بعض لوگوں نے ان سوالات کو اپنے ذمے لے لیا۔ اپنی سمجھ کے مطابق اُن کا جواب دیا + مصریوں نے ان کو اپنا پادری بنا لیا۔ اپنے خیالات کی نگہبانی ان پر چھوڑ دی اور ان کا بیحد احترام کرنے لگے + یہ پادری بڑے عالم لوگ تھے + تحریری یادداشتوں کے محفوظ رکھنے کا مقدس کام انہی کے سپرد تھا + ان کا عقیدہ تھا۔ کہ محض دنیاوی بہبود کا خیال رکھنا اچھی بات نہیں + لوگوں سے کہا۔ اُس وقت کا خیال رکھو جو ابھی آنے والا ہے۔ جب کہ تمہاری رُوح پچھم کے پہاڑوں کے اُس پار جائیگی۔ اور جب اُسے اوسیرس[1] یعنی خدائے جبار کے سامنے جو مُردوں اور زندوں کا حاکم اور جزا و سزا کا مالک ہے اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا + پادریوں نے آئسس[2] اور اوسیرس کی مملکت اور روزِ آخرت کو اتنی اہمیت دی۔ کہ مصری لوگ اس زندگی کو حقیر سمجھنے لگے۔ ایک چند روزہ مہلت جس کا مصرف یہی ہے۔ کہ آئندہ زندگی کے لئے سامان فراہم کیا جائے + چنانچہ نیل کی سیراب وادی کو انہوں نے مُردوں کے نام پر وقف کر دیا +

اہلِ مصر کا ایک عجیب عقیدہ یہ تھا۔ کہ کوئی روح اوسیرس کی مملکت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ وہ جسم بھی اس کے ساتھ نہ ہو۔ جو اس دنیا میں اس کا مسکن تھا + اس لئے جب کوئی آدمی مرجاتا۔ تو اقربا لاش کو طرح طرح کے مصالحے لگاتے۔ تاکہ گلنے سڑنے نہ پائے + پہلے لاش کو شورے کے پانی میں بھگو رکھتے۔ پھر اس میں مومیائی بھر دیتے + (مومیائی فارسی کا لفظ ہے۔ اسی سے "ممی" کا لفظ نکلا ہے۔ جب لاش کو مصالحہ لگا کر رکھ دیا جائے۔ تو اسے "ممی" کہتے ہیں +) پھر ایک خاص قسم کے کپڑے کی گزوں لمبی پٹی اس کے گرد لپیٹ دیتے۔ ایک خاص تابوت بنا کر لاش کو بند کر کے قبر میں پہنچا دیتے + مصری قبر بالکل گھر معلوم ہوتی تھی + سامان آرائش سجایا جاتا تھا۔ ساز تک وہاں رکھے جاتے تھے۔ (تاکہ انتظار کی گھڑیوں میں مردہ اپنا دل بہلاتا رہے) + باورچیوں اور نانبائیوں اور حجاموں کے چھوٹے چھوٹے بت بنا کر قبر میں کھڑے کر دئے جاتے (تاکہ اس اندھیرے گھر کا رہنے والا بھوکا نہ رہے اور حجامت باقاعدہ بنواتا رہے)+

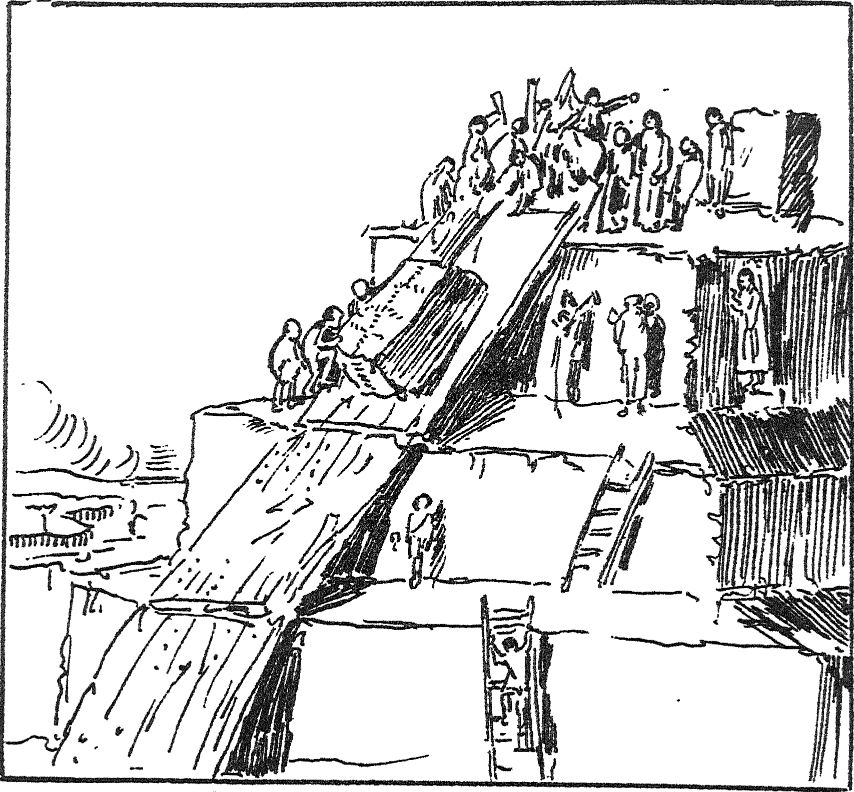
شروع شروع میں یہ قبریں مغربی کوہستان کی چٹانیں کھود کر بنائی جاتی تھیں لیکن۔

---

[1] (Osiris)

[2] (Isis)

جب اہل مصر شمال کی جانب بڑھے۔ تو قبرستان لاچار صحرا میں بنانے پڑے + صحرا میں درندے اور ڈاکو بستے تھے۔ جو قبریں کھود کر ممیوں کو خراب کر دیتے۔ اور لاش کے ساتھ



مینار بن رہے ہیں

جو جواہرات دفن کئے جاتے تھے۔ انہیں چرا کر لے جاتے۔ اس بیحرمتی کے انسداد کے لئے مصری لوگ قبروں پر پتھروں کی ایک ڈھیری سی بنا دیا کرتے تھے۔ ڈھیریوں سے قبے تعمیر ہونے لگے۔ کیونکہ دولتمندوں کی قبریں غریبوں سے اونچی بننے لگیں۔ ہر شخص کی یہی خواہش تھی کہ میری قبر سب سے بلند ہو + شاہ خوفو[1] نے (جسے یونانی کیوپس[2] کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور جو مسیح سے تین ہزار سال پہلے مصر پر حکمران تھا) سب کو نیچا دکھایا۔ اس کی قبر کا مینار پانچسو فٹ سے بھی اونچا ہے + (یونانی اس مینار کو "پرمیڈ"[3] کہتے ہیں۔ مصری زبان

ف۳ (Pyramid)   ف۲ (Cheops)   ف۱ (Khufu)

ہیں "پر-آیم-اُس" کے معنے اونچے کے ہیں) +

اس قبر کا رقبہ تیرہ ایکڑ ہے - عیسائیوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ یعنی سینٹ پیٹر کے گرجا کا رقبہ بھی اس سے ایک تہائی ہے +

ایک لاکھ سے زیادہ مزدور بیس سال تک دریا پار سے پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے رہے + اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آتا - کہ وہ بڑے بڑے پتھر اٹھا کر دریا کس طرح عبور کرتے تھے + اس کنارے پر پہنچ کر صحرا میں بڑی بڑی دور تک ان پتھروں کو گھسیٹنا پڑتا - اور آخر کار انہیں ٹھکانے سے چن دیا جاتا + یہ تمام کام شاہی معماروں اور انجینروں نے اس خوبی سے سرانجام دیا - کہ جو تنگ سا رستہ مینار کے اندر عین قبر تک پہنچتا ہے - وہ اب بھی ویسے کا ویسا موجود ہے - اس کا ایک پتھر بھی انچ بھر نہیں سرکا - حالانکہ چھت اور دیواروں پر دائیں بائیں اور اوپر لاکھوں من پتھروں کا بوجھ پڑا ہے - جو ہر طرف سے اُسے بھینچ رہا ہے +

۱ے (Pir-em-us) ۲ے (St. Peter)

مصر کی داستان

مصر کا عروج و زوال

دریائے نیل نے یوں تو ہمدرد دوست بن کر انسان کی دستگیری کی۔ لیکن بعض اوقات جابر سردار کی طرح کام بھی بڑی سختی سے لیا۔ دونوں کناروں پر جو لوگ آباد تھے۔ اُن کو سکھایا۔ کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے میں بڑی برکت ہے + جب آبپاشی کے لئے نالیاں کھودتے۔ یا جب کسی بند کی مرمت کرتے۔ تو ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہوتے + اس طرح سے مل جل کر رہنا سیکھا + دیکھتے ہی دیکھتے اس باہمی امداد کی انجمن نے ایک منظم قوم کی صورت اختیار کر لی +

پھر ان میں سے ایک آدمی نے اتنا زور پکڑا۔ کہ اکثر ساتھیوں سے زیادہ طاقتور ہو گیا + وہ قوم کا سردار مقرر ہوا + مصر کے خوشحال لوگوں کو دیکھ کر جب مغربی ایشیا والوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور انہوں نے اس زرخیز وادی پر حملہ کر دیا۔ تو وہی ان کا سپہ سالار بنا + ہوتے ہوتے بادشاہ بن گیا۔ اور بحیرۂ روم سے لے کر مغربی کوہستان تک سب ملک پر حکومت کرنے لگا +

مصر کے بادشاہ کا لقب فرعون تھا جس کی جمع فراعنہ ہے + فرعون کے معنی ہیں "وہ شخص جو بڑے گھر (یعنی محل) میں رہتا ہے" +

فراعنہ مصر کی سیاسی طاقت کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس سے غریب کسانوں کو کچھ واسطہ نہ تھا + وہ بیچارے چپ چاپ اپنے کھیتی باڑی کے کام میں لگے رہتے تھے + ناواجب محصول ادا نہ کرنا پڑے۔ تو فرعون کی حکومت ان کے نزدیک اوسرس کی حکومت سے کم قابل تسلیم نہ تھی +

اپنے بادشاہ کو تو مان لیتے تھے۔ لیکن کوئی بیرونی طاقت حملہ آور ہو۔ اور ان کا مال و اسباب لوٹ لے۔ تو اس کی اطاعت آسانی سے قبول نہ کرتے تھے + مصریوں کی اپنی

حکومت دو ہزار سال تک قائم رہی۔ اس کے بعد عرب کے وحشی چرواہوں کے ایک قبیلے نے جن کا نام ہکسوس[1] تھا۔ مصر پر حملہ کر دیا۔ اور پانچ سو سال تک یہاں حکومت کرتے رہے۔ رعایا ہمیشہ ان سے بددل رہی +

اس زمانے میں عبرانی قوم کے لوگ بڑی صحرانوردیوں کے بعد گوشن[2] کی سرزمین میں آکر پناہ گزین ہوئے۔ اور یہاں پہنچ کر غیر ملکی حکومت کے ماتحت محکمۂ محصولات اور دیگر سرکاری محکموں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ اہل مصر کو ان سے بھی سخت نفرت تھی +

۱۶۰۰ء قبل مسیح کے تھوڑے عرصے بعد تھیبز[3] کے باشندوں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اور بڑی کشمکش کے بعد ہکسوس کو ملک سے نکال دیا + مصر کو پھر آزادی نصیب ہوئی +

ایک ہزار سال بعد جب اسیریوں[4] نے مغربی ایشیا کا تمام علاقہ فتح کر لیا۔ تو مصر سارڈاناپالوس[5] کی مملکت کا ایک حصہ بن گیا + لیکن ساتویں صدی قبل مسیح میں پھر خود مختار ہو گیا۔ خود مختار بادشاہ کا صدر مقام دریائے نیل کے ڈیلٹا میں سائیس[6] نام کا ایک شہر تھا۔ لیکن ۵۲۵ھ قبل مسیح میں فارس کا بادشاہ کیمبائیسیز[7] مصر پر قابض ہو گیا۔ اور جب چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم نے فارس کو فتح کیا۔ تو مصر بھی مقدونیہ کے مقبوضات میں شامل ہو گیا + اس کے بعد سکندر کا ایک جرنیل اپنے آقا سے منحرف ہو کر صوبۂ مصر کا خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ گویا مصر کو پھر ایک طرح کی آزادی حاصل ہو گئی + اس جرنیل نے بطلیموسوں[8] کے خاندان کی بنیاد ڈالی۔ بطلیموسوں کا دارالخلافہ سکندریہ کا شہر تھا۔ جسے تعمیر ہوئے ابھی بہت عرصہ نہ گزرا تھا +

آخر کار ۳۰ء قبل مسیح میں رومن لوگ آئے + مصر کی آخری ملکہ کلوپیٹرا[9] نے

---

[1] (Hyksos) [2] (Goshen) [3] (Thebes)

[4] (Assyrians) [5] (Sardanapalus)

[6] (Sais) [7] (Cambyses)

[8] (Ptolemies) [9] (Cleopatra)

ملک کو حملہ آوروں سے بچانے کے لئے بڑا زور مارا + کلوپیٹرا کا حسن اور اس کی ادائیں رومن جرنیلوں کے لئے مصری فوجوں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوئیں + دو دفعہ اس نے اپنے رومن فاتحوں کو دام زلف کا اسیر بنایا + ۳۰ء قبل مسیح میں سیرز کے بھتیجے اور جانشین آگسٹس[1] نے سکندریہ کے ساحل پر قدم رکھا۔ چچا تو ملکہ کے حسن کی تاب نہ لا سکا۔ لیکن بھتیجے پر اس کا کچھ اثر نہ ہؤا + فوجوں کو تہس نہس کر ڈالا۔ مگر ملکہ کی جان بخش دی + دل میں یہ ٹھان رکھی تھی۔ کہ واپس روما پہنچ کر رومن دستور کے مطابق فتح کی خوشی میں اپنا ایک جلوس نکالونگا۔ جس میں تمام مال غنیمت اور تمام قیدیوں کو اپنے رتھ کے ساتھ ساتھ بازاروں میں پھراؤنگا + جب یہ خبر ملکہ کے کانوں تک پہنچی۔ تو وہ زہر کھا کر مر گئی + اور مصر مملکت روما میں شامل ہو گیا +

---

[1] (Augustus)

عراق

عراق ۔ مشرقی تہذیب کا دوسرا مرکز

فرض کرو میں تمہیں مصر کے سب اونچے مینار کی چوٹی پر لے جاؤں اور فرض کرو تمہاری آنکھیں عقاب کی سی تیز ہوں ۔ تو تمہیں دور ۔ بہت دور ۔ زرد زرد ریگستان سے بھی بہت پرے ۔ ایک سبز سی چیز جھلملاتی نظر آئیگی + یہ ایک وادی ہے ۔ جو دو دریاؤں کے درمیان واقع ہے ۔ عہد نامۂ عتیق میں جس علاقے کو بہشت کہا گیا ہے ۔ وہ یہی علاقہ ہے ۔ اس طلسماتی سرزمین کو یونانی میسوپوٹیمیا کہتے تھے جس کے معنی "دوآبہ" کے ہیں (اردو میں اسے عراق کہتے ہیں) +

ایک دریا کا نام دجلہ ہے ۔ دوسرے کا نام فرات + دجلہ کو اہل بابل دکلۃ اور فرات کو پُرانو کہتے تھے ۔ یہ دریا ملک آرمینیا کے برفانی پہاڑوں میں سے نکلتے ہیں (حضرت نوحؑ کا سفینہ انہی پہاڑوں پر آکر رُک گیا تھا) اور آہستہ آہستہ جنوبی میدان میں سے بہتے ہوئے خلیج فارس کے دلدلی کناروں تک جا پہنچتے ہیں + ان سے ملک کو بہت فائدہ پہنچتا ہے + مغربی ایشیا کا خشک علاقہ انہی سے سیراب ہو کر ایک سرسبز باغ بن گیا ہے +

بنی نوع انسان نے وادئ نیل کو اس لئے پسند کیا تھا ۔ کہ وہاں خوراک بڑی آسانی سے مل جاتی تھی + عراق نے بھی لوگوں کو اسی لئے اپنی طرف کھینچا + خوشحالی دجلہ اور فرات کے کنارے بیٹھی اہل ہمت کو اشاروں سے بلا رہی تھی ۔ چنانچہ ادھر شمالی کوہستان کے رہنے والوں نے کمر ہمت باندھی ۔ ادھر جنوبی صحرا کے خانہ بدوشوں نے قدم بڑھایا + ایک کو دوسرے کا دخل نہ بھایا ۔ آپس میں رقابت پیدا ہوئی دونو ایک دوسرے کی تباہی کے درپے ہوئے ۔ اور جنگ چھڑ گئی ۔ جو بہت عرصے تک جاری رہی + اس جنگ میں وہی لوگ سلامت بچے ۔ جو توانا اور بہادر تھے ۔ اسی لئے آخر میں جو قوم پروان چڑھی وہ طاقتور لوگوں کی قوم تھی ۔ جنہوں نے عراق میں ایک ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی ۔ جو کسی طرح بھی مصر کی تہذیب سے کم حیثیت نہ رکھتی تھی +

وہ پہاڑ جہاں کوئی رہنا نہیں چاہتا

سیمیری

آشوری

دنیائے قدیم کا دنگل

سیمیری

اہل میدیہ

اہل فارس

نینوہ

دریائے فرات

زرخیز عراق جو سب کو مرغوب ہے

مصری

فنیقی

ارامینی

عموری

امیری

عبرانی

بابلی

کلدانی

یہ گرم صحرا ہے جہاں کوئی رہنا نہیں چاہتا

عراق - دنیائے قدیم کا دنگل

سمیری قوم

سمیری[1] قوم کے کاتب قلم کی بجائے ناخن سے لکھتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی مٹی کی تختیوں سے اسیریا اور بابل یعنی اس سرزمین کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں کئی سامی اقوام یکے بعد دیگرے آئیں۔ پروان چڑھیں اور فنا ہو گئیں۔

پندرھویں صدی میں کئی نئے نئے ملک دریافت ہوئے۔ کولمبس گھر سے جزیرۂ خطا کا رستہ تلاش کرنے نکلا۔ لیکن حسنِ اتفاق سے اس نے ایک ایسا براعظم دریافت کر لیا۔ جس کا کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا۔ آسٹریا کا ایک اُسقف بڑی تیاریاں کر کے ماسکو کے گرنیڈ ڈیوک کے وطن کی تلاش میں مشرق کو روانہ ہو گیا۔ لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اہل مغرب کو اس کے بعد بھی تقریباً تیس سال تک ماسکو پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ اس دوران میں شہر وِنیس کے ایک باشندے باربیرو[2] نامی نے مغربی ایشیا کے کھنڈروں کو چھان مارا۔ واپس آ کر یورپ والوں کو یہ مژدہ سنایا۔ کہ شیراز میں عبادتگاہوں کی چٹانوں اور مٹی کی بیشمار تختیوں پر ایک عجیب وغریب زبان کے الفاظ کندہ ہیں۔ لیکن یورپ والے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ تین چار سو سال تک کسی نے ان تحریرات کی طرف توجہ نہ کی۔ آخرکار اٹھارھویں صدی کے اخیر میں ڈنمارک کا ایک مساحت دان جس کا نام نی بوہر[3] تھا۔ ایران جا کر وہاں سے اس خطِ مثلثی کی نقل اپنے ساتھ یورپ لے آیا۔ (اس رسم الخط میں حروف پھانے کی شکل کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کو خطِ مثلثی کہتے ہیں) تیس سال کے بعد ایک جرمن مدرس

---

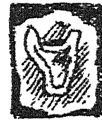
[1] (Sumerians)

[2] (Barbero)

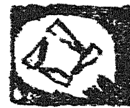
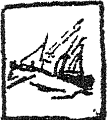
[3] (Niebuhr)

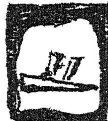
کو صرف اتنی کامیابی حاصل ہوئی۔ کہ اُس نے پہلے چار حروف پڑھ لئے۔ وہ حروف د ۔ ا ۔ ر اور ش تھے۔ اور اُن کو ملا کر فارس کے بادشاہ دارا کا نام بنتا تھا+ بیس سال کے بعد ایک انگریز افسر ہنری رالنسن[1] نے بیستون[2] کا وہ مشہور و معروف کتبہ دریافت کیا۔ جس کے ذریعے سے مغربی ایشیا کی ناخن سے لکھی ہوئی تحریرات کو پڑھنے کا طریقہ سمجھ میں آگیا+

شمپولیوں[3] کا کام نسبتاً بہت آسان تھا۔ کیونکہ مصر کے لوگ اپنا مطلب تصویروں کے ذریعے ادا کرتے تھے۔ لیکن عراق کے اولین باشندوں یعنی سمیری قوم نے (جو مٹی کی تختیوں پر ناخنوں سے کھود کھود کر لکھتے تھے) تصویروں میں تغیر و تبدل کر کے ایک مثلثی ابجد وضع کر لی تھی۔ اور تصویروں کا استعمال ترک کر دیا تھا+ تغیر و تبدل کے بعد لفظ کی شکل تصویر سے اتنی مختلف ہو جاتی۔ کہ اسے دیکھ کر متروک تصویر کا اندازہ لگانا بہت ہی مشکل تھا+ میں اس بات کو چند مثالوں سے واضح کرتا ہوں+ شروع شروع میں جب مٹی کی تختی پر ناخن سے ستارے کی تصویر کھینچتے۔ تو اس کی شکل یہ ہوتی اس تصویر کا کھینچنا دقت سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ تھوڑے عرصے کے بعد جب ستارے کے لفظ میں آسمان کے معنی بھی شامل ہو گئے۔ تو اس تصویر کو یوں بنانے لگے: اب اس کا سمجھنا پہلے سے مشکل ہو گیا+

بیل کی تصویر  سے تبدیل ہو کر  ہو گئی+ مچھلی پہلے 

تھی۔ پھر اسے یوں لکھنے لگے + سورج کی تصویر نے یہ

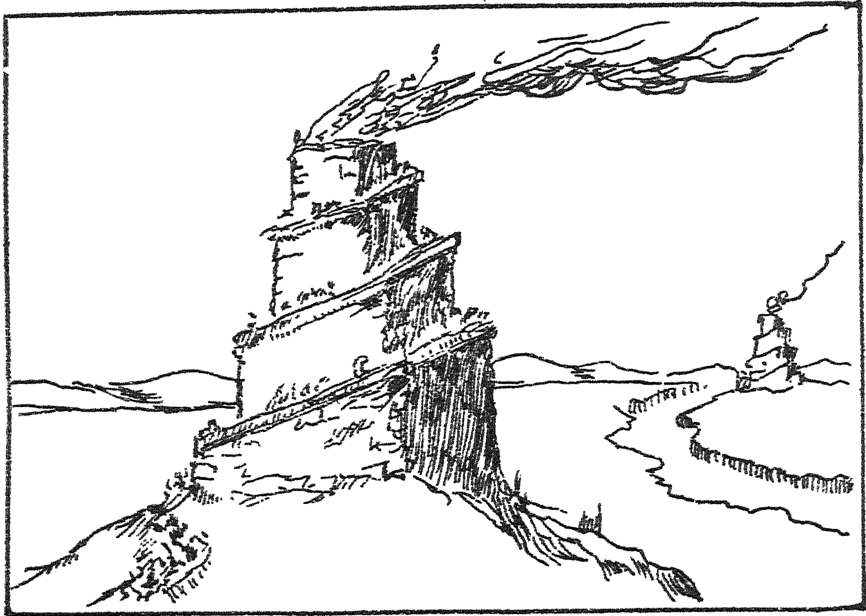
شکل  اختیار کر لی+ آج کل اگر ہم سمیری رسم الخط سے کام لیں تو 

کو یوں لکھیں گے  +خیالات کا اس طریقے سے ادا کرنا طول

۱؎ (Rawlinson) ۲؎ (Behistun) ۳؎ Champollion)

عمل تو معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سمیری اور بابلی اور اسیری اور اہل فارس اور وہ تمام اقوام جو یکے بعد دیگرے اس زرخیز وادی میں بزور شمشیر داخل ہوئیں تین ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے تک یہی رسم الخط استعمال کرتی رہیں +

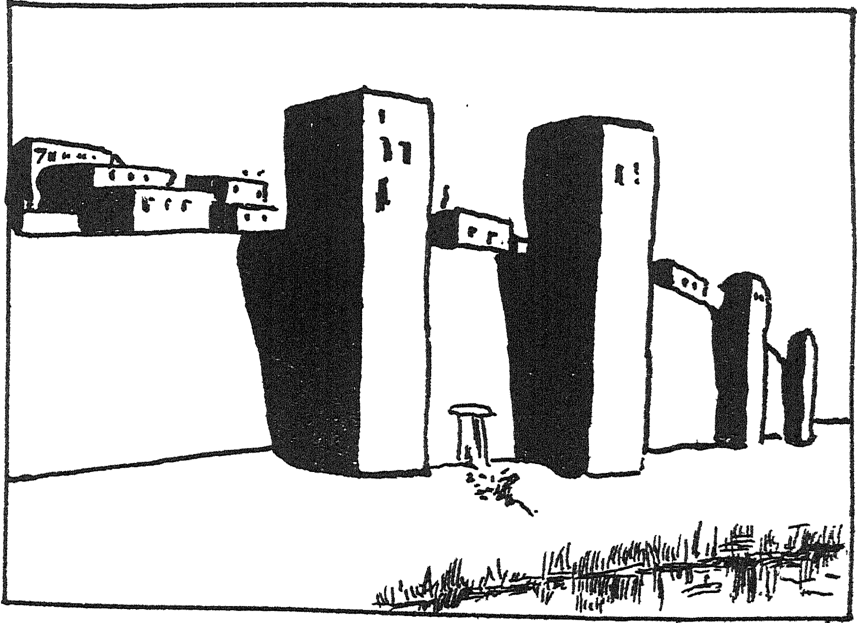
عراق کی سرگذشت جنگ و جدل اور فتح و شکست کی ایک طویل داستان ہے + پہلے شمال کی سمت سے سمیری آئے + یہ گوری رنگت کے پہاڑی لوگ دیوتاؤں کی پرستش پہاڑ کی چوٹیوں پر کرنے کے عادی تھے۔ جب میدانوں میں پہنچے۔ تو وہاں بھی ٹیلے بنا کر ان پر عبادت گاہیں تعمیر کیں + سیڑھیاں بنانے کے فن سے واقف نہ تھے۔ اس لئے مناروں پر چڑھنے کے لئے ایک منزل سے دوسری منزل تک ڈھلوان پیچدار پگڈنڈیاں بنائیں + ہمارے انجنیئروں نے اوپر چڑھنے کے لئے اس طرح کے



بابل کا ایک مینار

رستے بنانا (اور اس کے علاوہ نہ معلوم اور کیا کیا باتیں) سمیریوں ہی سے سیکھی ہیں + اس کے بعد اس زرخیز وادی میں اور اور قومیں آکر آباد ہوئیں۔ سمیری لوگ ان نئی اقوام میں کچھ اس طرح جذب ہوئے۔ کہ ان کا پتہ ہی نہ ملا۔ تاہم عراق کے کھنڈروں میں ان کے مینار اب تک کھڑے ہیں + جب یہودی جلاوطن ہو کر بابل کی سرزمین

بیں داخل ہوئے - تو یہ مینار سامنے دکھائی دئے - یہودیوں نے ان کا نام بابل کے مینار رکھا + سمیریوں کی قوم مسیح سے چار ہزار سال پہلے عراق میں داخل ہوئی + بہت عرصہ نہ گزرا - کہ یہ لوگ اکادیوںؒ کے ہاتھوں مغلوب ہوئے + اکاؔد سامیوں کے ایک قبیلے کا نام تھا + (سامی قوم کے تمام قبائل صحرائے عرب میں رہتے تھے - زبان سب کی ایک تھی - چونکہ قدیم زمانے کے لوگ انہیں نوح کے بیٹے سامؔ کی اولاد سمجھتے تھے - اس لئے ان کا نام سامی پڑ گیا) + ایک ہزار سال بعد اکادیوں نے قبیلہ عمورؔیہ کے ہاتھوں شکست کھائی عموریہ

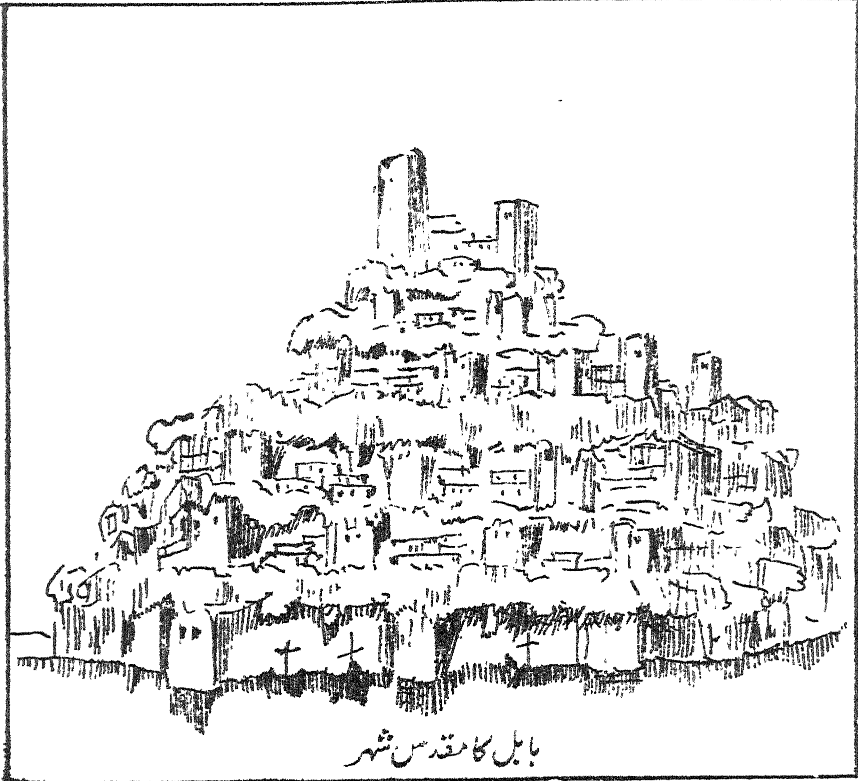


نینوہ

بھی سامی قوم کے ایک صحرائی قبیلے کا نام تھا - ان کے شاہنشاہ حمورؔابی نے بابل کے مقدس شہر میں ایک عالیشان محل تعمیر کیا - اور ملک میں ایسے قوانین نافذ کئے - کہ ارضِ بابل نظم و نسق کے اعتبار سے قدیم دنیا کی مہذب ترین سلطنت شمار ہونے لگی + اس کے بعد حطّیؔ آئے (ان کا ذکر تمہیں عہدنامہ عتیق میں بھی ملیگا) اُنہوں نے وادیٔ زرخیز کو پامال کر ڈالا - جو لوٹ سکتے تھے وہ لوٹ لیا - جو باقی رہ گیا - اسے تاراج کر ڈالا + حطّیوں کو اسیریوںؔ نے

ف۱ (Akkadians) ف۲ (Shem) ف۳ (Amorites)

ف۴ (Hammurabi) ف۵ (Hittites) ف۶ (Assyrians)



بابل کا مقدس شہر

نیچا دکھایا + یہ لوگ صحرا کے دیوتا اشور[1] کی پوجا کرتے تھے + انہوں نے نینوہ کو دارالخلافہ بنا کر ایک وسیع سلطنت کی نبیاد ڈالی۔ بڑے دبدبے اور رعب سے حکومت کی اور تمام مغربی ایشیا اور مصر کو فتح کر کے بیشمار قوموں کو باجگزار بنایا + ساتویں صدی قبل مسیح کے آخر میں کلدانیوں[2] کے سامی النسل قبیلے نے بابل کو از سر نو صدر مقام مقرر کیا + ان کے عہد میں بابل کو وہ عروج نصیب ہوا۔ کہ اس عہد قدیم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کے سب سے مشہور بادشاہ بخت نصر[3] نے سائنس کو ترقی دی + (ہمارے علم نجوم اور علم ریاضی کے بنیادی اصول کلدانیوں ہی کے وضع کئے ہوئے ہیں) + ۵۳۸ء قبل مسیح میں فارس کے اکھڑ چرواہوں کے ایک قبیلے نے اس قدیم سرزمین پر حملہ کیا۔ اور کلدانیوں کی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا + مگر دو سو سال بعد یہ قبیلہ خود سکندر اعظم کا مطیع بن گیا + سکندر اعظم نے وادئی زرخیز کو جو اتنی بیشمار اقوام کی جولانگاہ رہ چکی تھی۔ یونانی مقبوضات میں شامل کر لیا + اس کے بعد رومن اور رومنوں کے بعد ترک حکمران ہوئے اور عراق کی سرزمین جہاں بنی نوع انسان نے تہذیب کا دوسرا مرکز قائم کیا تھا۔ اُجڑ گئی + اب وہاں مٹی کے بڑے بڑے ٹیلے عظمت رفتہ کی مرثیہ خوانی کر رہے ہیں +

---

[1] Ashur [2] Chaldeans [3] Nebuchadnezzar

حضرت موسےٰ ؑ

اہل یہود کے پیشوا حضرت موسےٰ ؑ کا قصّہ

بیسویں صدی قبل مسیح میں سامی چرواہوں کا ایک معمولی اور چھوٹا سا قبیلہ جو دریائے فرات کے دہانے پر سرزمین اُور میں آباد تھا۔ اپنے وطن کو چھوڑ کر شاہان بابل کی مملکت میں نئی چراگاہوں کی تلاش میں نکلا + جب شاہی سپاہیوں نے مزاحمت کی۔ تو یہ لوگ یہاں سے مایوس ہو کر مغرب کو چل دئے۔ کہ کہیں تھوڑی سی زمین بھی ایسی مل جائے جس کا کوئی والی وارث نہ ہو۔ تو وہیں ڈیرے ڈال دیں +

یہ لوگ عبرانی کہلاتے تھے + (آج کل انہیں یہودی کہتے ہیں) دور دراز ملکوں کی خاک چھانی اور سالہا سال کی سرگردانیوں کے بعد آخر کار مصر میں پناہ ملی۔ کچھ اوپر پانسو سال مصریوں میں گزارے + جب قبیلہ ہکسوس کے لوگ مصر پر حملہ آور ہوئے۔ (جیسا کہ میں مصر کے حال میں، بیان کر چکا ہوں) تو یہی یہودی ملک کے نظم و نسق میں حملہ آوروں کے دست راست بنے جس کا صلہ انہیں یہ ملا۔ کہ چراگاہوں پر ان کا قبضہ بحال رہا + لیکن ایک طویل جنگ آزادی کے بعد جب مصریوں نے ہکسوس کو وادئ نیل سے نکال دیا۔ تو یہودیوں کے بُرے دن آئے + یا تو بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ یا پھر اب معمولی غلام بن کر رہنا پڑا + مصریوں نے ان سے شاہی سڑکوں اور میناروں پر پتھر ڈھونے کا کام لیا + سرحدوں پر مصری سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ کہیں بھاگ بھی نہ سکتے تھے +

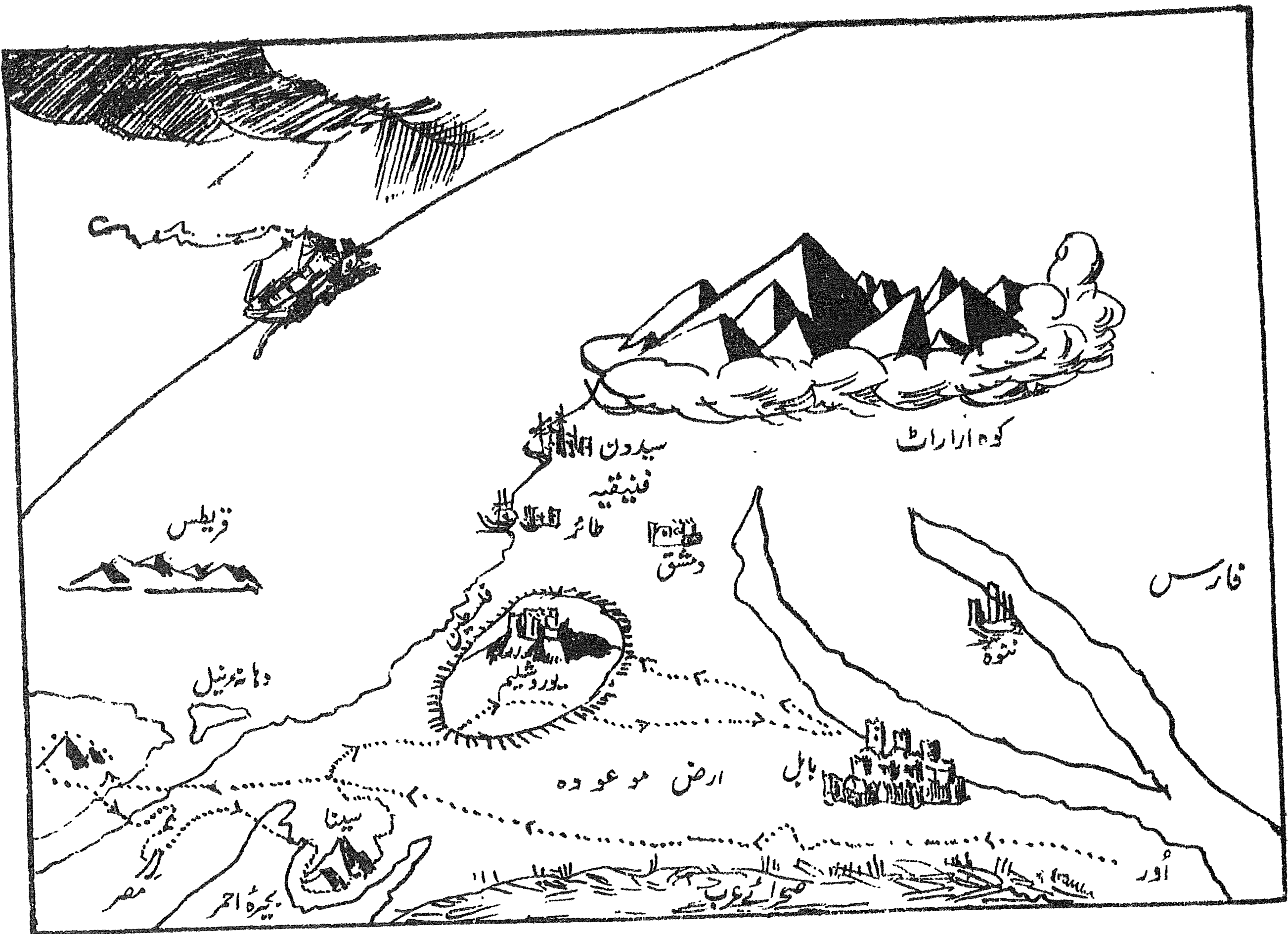
کئی سالوں تک یونہی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ آخر کار ایک نوجوان یہودی نے جس کا نام مُوسےٰ تھا۔ انہیں ذلت کے گڑھے سے باہر نکالا + حضرت موسےٰ ؑ صحرا کے رہنے والے تھے۔ آباو اجداد نے تمام زندگی شہروں سے دور بسر کی تھی۔ اور غیر ملکی تہذیب کی عیش پرستی اور تن آسانی سے دامن آلودہ نہ ہونے دیا تھا + حضرت موسےٰ اپنے آباو اجداد کی سادہ طرز زندگی کے بہت قائل تھے +

چنانچہ انہوں نے تہیہ کر لیا۔ کہ اپنی قوم کو بزرگوں کے نقش قدم پر چلاؤنگا۔ مصری فوج ان کے تعاقب میں بھیجی گئی۔ لیکن وہ ان سے بچ نکلے۔ وہ اپنی قوم کو ساتھ لئے کوہ سینا کے دامن میں میدان کے عین بیچوں بیچ جا پہنچے۔ صحرا میں برسوں تنہائی کی زندگی بسر کرنے کرنے بجلی اور آندھی کے دیوتا کا (یعنی اس دیوتا کا جو اونچے اونچے آسمانوں پر حکومت کرتا ہے۔ اور جس کے بغیر چرواہوں کو زندگی۔ روشنی۔ سانس کچھ بھی نصیب نہیں ہو سکتا) بیحد احترام کرنے لگے تھے۔ اس دیوتا کا نام یہووہ تھا+ مغربی ایشیا میں ایسے کئی دیوتا پوجے جاتے تھے۔ لیکن حضرت موسےٰ کی تعلیم کا یہ اثر ہؤا۔ کہ عبرانیوں نے صرف ایک یہووہ ہی کو اپنا خدا تسلیم کیا +

ایک دن حضرت موسےٰ یہودیوں کی بستی سے غائب ہو گئے+ لوگ سہمے ہوئے ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرتے پھرتے تھے۔ کہ سنا ہے ناتراشیدہ پتھر کی دو تختیاں اپنے ساتھ لے گئے ہیں+ سہ پہر کے وقت پہاڑ کی چوٹی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ایک مہیب طوفان کی تاریکی نے اس پر پردہ ڈال دیا+ لیکن جب حضرت موسےٰ واپس لوٹے۔ تو یہودیوں نے کیا دیکھا۔ کہ کڑکتے بادلوں اور چمکتی بجلیوں کے اندر خداوند یہووہ نے جن الفاظ میں بنی اسرائیل کو مخاطب فرمایا تھا۔ وہ الفاظ تختیوں پر کندہ ہیں+ اس دن سے سب یہودی خداوند یہووہ کو جس نے اپنے دس احکام کے ذریعے سے انہیں نیک زندگی کا راستہ دکھایا۔ اپنی قسمتوں کا مالک اور حقیقی اور واحد خدا ماننے لگے +

بنی اسرائیل نے حضرت موسےٰ کے کہنے پر صحرا میں اپنا سفر جاری رکھا۔ جن چیزوں کو انہوں نے گرم آب و ہوا میں صحت کے لئے مفید بتایا۔ ان کو حلال سمجھا۔ جن کو مُضر کہا ان کو اپنے اوپر حرام کر لیا+ کئی سال صحرا کی خاک چھاننے کے بعد ایک پُر فضا زرخیز سرزمین میں پہنچے۔ جس کا نام فلسطین تھا (جزیرہ قریطس[ل] میں فلسطو[ت] نامی ایک چھوٹا سا قبیلہ آباد تھا۔ چونکہ اس قبیلے کے لوگ غریب الوطن ہونے کے بعد اسی ساحلی علاقے میں آن بسے تھے۔ اس لئے اس کا نام فلسطین پڑ گیا تھا) شومئی قسمت

ل Crete   ت Pilistu



یہودیوں کی دشت پیمائیاں

سے جب یہودی یہاں پہنچے۔ تو یہاں ایک اور سامی قوم یعنی کنعانی لوگ آباد تھے۔ لیکن یہودی کنعانیوں پر غلبہ پاکر وادیوں میں آگھسے۔ وہاں شہر آباد کئے۔ ایک بہت بڑی عبادت گاہ بنائی۔ جہاں عبادت گاہ تعمیر کی اس شہر کا نام یوروشلیم یعنی دارالسلام (سلامتی کا گھر) رکھا۔

لیکن حضرت موسےٰ دنیا کو خیرباد کہہ چکے تھے فلسطین کی پہاڑیاں ابھی دور دکھائی دے رہی تھیں۔ کہ موت نے اُن کی تھکی ہوئی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر دیں۔ حضرت موسےٰ نے خداوند یہوواہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے عمر بھر ثابت قدمی اور وفاداری سے خدمت کی۔ انہی کی بدولت بنی اسرائیل نے غیروں کی غلامی کا جوا اُتار پھینکا۔ اور فلسطین کے نئے دیس میں آزادی کا سانس لیا۔ انہی کی طفیل دنیا کی سب قوموں سے پہلے یہودیوں کی قوم نے خدائے واحد کی پرستش کی۔

فنیقی قوم

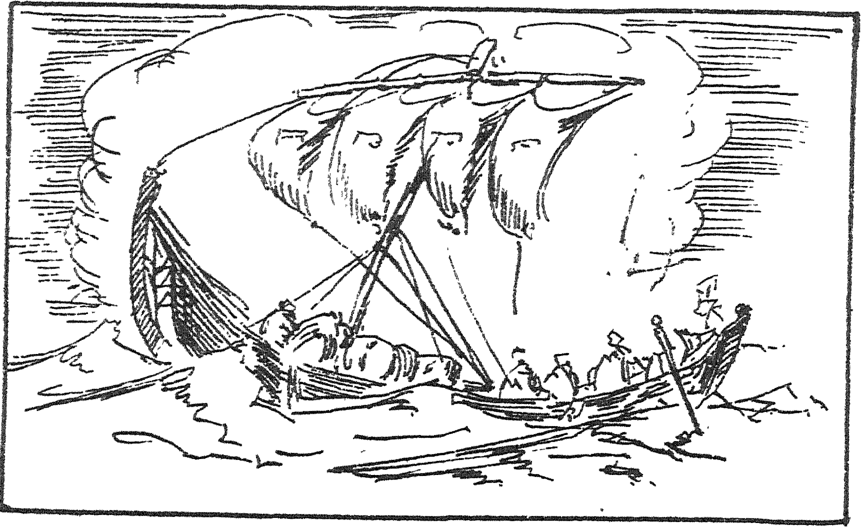
انگریزی ابجد دراصل فنیقیوں ہی کی ایجاد ہے

فنیقی سامی النسل لوگ تھے اور یہودیوں کے پڑوس میں رہتے تھے + ان کا قبیلہ بہت شروع ہی میں بحیرہ روم کے کنارے آباد ہوگیا تھا + وہاں انہوں نے دو قلعہ بند شہر طائر[2] اور سیدون[3] تعمیر کئے اور تھوڑے ہی عرصے میں مغربی سمندروں کی تجارت تمامتر اپنے قبضے میں کرلی + ان کے جہاز باقاعدہ یونان اور اطالیہ اور ہسپانیہ تک آتے جاتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات آبنائے جبل الطارق سے گزر کر جزائر سِلّی[4] تک پہنچ جایا کرتے تھے۔ اور وہاں سے ٹین خرید خرید کر لایا کرتے تھے + جہاں جاتے وہیں چھوٹے چھوٹے سے تجارتی مرکز قائم کر لیتے (جنہیں نوآبادیات کے نام سے پکارتے) ایسے ہی کئی مقامات ترقی کرکے بعد میں قادِز[5] اور مارسیلز جیسے شہر بن گئے +

فنیقیوں کو جس چیز میں نفع دکھائی دیتا۔ اُسی کی تجارت شروع کر دیتے۔ ایمانداری سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا + ان کے پڑوسیوں نے جو حالات لکھے ہیں۔ ان سے تو کم از کم یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ حق شناسی اور دیانتداری انہیں چھو تک نہ گئی تھی + روپیہ جمع کرنے کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے + کوئی ان سے ملنا جلنا پسند نہ کرتا۔ چنانچہ کسی کو بھی اپنا دوست نہ بنا سکے + لیکن باوجود ان سب برائیوں کے آئندہ آنے والی نسلوں کی ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دے گئے۔ وہ یہ کہ ایک ابجد ایجاد کر گئے۔ جو آج کل یورپ کے اکثر ممالک میں استعمال ہوتی ہے +

لے Phœnicians　　۲ھ Tyre　　۳ھ Sidon

۴ھ Scilly　　۵ھ Cadiz



فنیقی تاجر

فنیقی لوگ سمیریوں کی طرز تحریر سے واقف تھے۔ لیکن سمیری حروف کا لکھنا ایک تو مشکل تھا۔ دوسرے اس میں بہت سا وقت لگ جاتا تھا۔ فنیقی تاجر لوگ تھے۔ فضولیات میں وقت گنوانا پسند نہ کرتے تھے۔ ان سے یہ توقع بھلا کہاں ہو سکتی تھی۔ کہ دو تین حروف لکھنے کی خاطر کئی گھنٹے صرف کر دیں + چنانچہ انہوں نے ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا۔ جو پرانے رسم الخط سے بہت بہتر تھا + کچھ تصویریں مصریوں سے لیں۔ کچھ مثلثی شکلیں سمیریوں سے اڑائیں۔ انہیں مختصر بنایا۔ پرانے حروف کی خوبصورتی کو نظر انداز کر کے ان میں ایسی تبدیلیاں کیں۔ کہ انسان انہیں جلدی جلدی لکھ سکے + اس طرح کئی ہزار تصویروں اور شکلوں کو کانٹ چھانٹ کر کل بائیس حروف کی ایک ابجد بنائی +

ہوتے ہوتے یہ ابجد بحیرہ ایجیین کو عبور کر کے یونان پہنچی۔ یونانیوں نے چند حروف اپنے پاس سے بڑھائے اور نئی ابجد کو ساتھ لے کر اطالیہ پہنچے۔ وہاں رومنوں نے اس میں کچھ اور ردو بدل کیا۔ اور یہ ابجد مغربی یورپ کے وحشیوں کو سکھا دی۔ یہ وحشی لوگ انگریزوں کے آبا و اجداد تھے۔ اسی لئے انگریزی کتابیں مصریوں کے تصویر خط یا سمیریوں کے ناخن سے لکھی ہوئی تحریر کی بجائے فنیقیوں کی ایجاد کردہ ابجد میں لکھی جاتی ہیں +

انڈویورپین نسل کے لوگ

فارس کے انڈویورپین لوگوں نے سامی دنیا اور مصری دنیا کو فتح کر لیا

مصر۔ بابل۔ اسیریا اور فنیقیہ[1] میں بنی نوع انسان نے تین ہزار سال تک تہذیب وتمدن کی محفل کو آراستہ رکھا۔ لیکن تین ہزار سال تک زینت بزم بننے کے بعد بڑھاپے اور ماندگی کی وجہ سے وادیٔ زرخیز کی محترم اقوام مرجھاسی گئیں + اس کے بعد جب ایک تازہ دم اور جواں ہمت نسل نے دنیا میں قدم رکھا۔ تو اُن کی یادوں سے محو ہو گئی + اس نئی نسل نے یورپ اور ہندوستان دونوں پر حکمرانی کی۔ اس لئے اسے انڈویورپین کہتے ہیں +

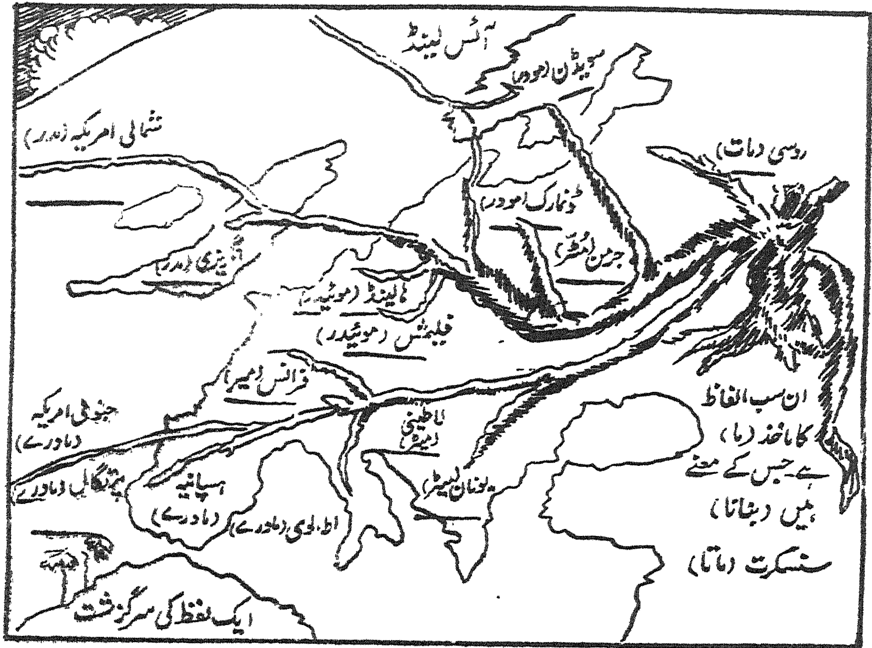
انڈویورپین لوگوں کی رنگت سامی اقوام کی طرح گوری۔ لیکن زبان ان کی زبان سے بہت مختلف تھی + اسی زبان کو بجز ہنگیرین۔ فنش اور شمالی ہسپانیہ کی باسک زبانوں کے یورپ کی باقی تمام زبانوں کی ماں سمجھا جاتا ہے + انڈویورپین نسل کا دوسرا نام آرین ہے۔ سنسکرت میں آریہ کے معنی شریف ونجیب کے ہیں +

جس زمانے سے ان کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں انہیں بحیرۂ خضر کے کنارے رہتے ہوئے کئی صدیاں گزر چکیں تھیں + ایک دن وہاں سے بوریا بستر باندھ اور نئے وطن کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے + کچھ تو وسط ایشیا کے کوہستان میں جا بسے اور کئی صدیوں تک ان پہاڑیوں میں مقیم رہے۔ جو ایران کی سطح مرتفع کے چاروں طرف کھڑی ہیں۔ کچھ مغرب کو چل دئے اور یورپ کے میدانوں پر قابض ہو گئے + یورپ جانے والوں کا مفصل حال یونان اور روما کے تحت میں بیان کرونگا +

فی الحال آرین قوم کا حال بیان کرتا ہوں + ان میں اکثر تو اپنے پیشوا اور ہادی زرتشت کے ماتحت اپنے پہاڑی وطن کو چھوڑ کر دریائے سندھ کے ساتھ سمندر کی جانب چل دئے +

---

[1] Phœnicia



ایک لفظ کی سرگزشت

لیکن بعض ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے مغربی ایشیا کے پہاڑوں کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ انھوں نے اہل میڈیا[1] اور اہل فارس[2] دو نیم خود مختار قبیلوں کی بنیاد رکھی۔ (ان دو قبائل کا پتہ قدیم تاریخوں سے ملتا ہے) ساتویں صدی قبل مسیح میں قبیلہ میڈ نے اپنی ایک سلطنت میڈیہ[3] نامی قائم کر لی۔ لیکن جب انشان[4] نامی قبیلے کا سردار سائرس[5] فارس کے تمام قبیلوں کا سردار بن بیٹھا۔ تو یہ سلطنت تباہ ہو گئی۔ سائرس نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا چنانچہ وہ اور اس کی اولاد تمام مغربی ایشیا اور مصر پر بے دھڑک حکومت کرتے رہے +

فارس کے انڈو یورپین لوگوں نے مغرب کی جانب فاتحانہ قدم اٹھایا۔ تو وہ آنہ بڑھتے چلے گئے۔ لیکن جزیرہ نمائے یونان اور بحیرہ ایجیین کے جزائر تک پہنچ کر رکنا پڑا۔ یہاں

---

[1] Medes [2] Persians [3] Media [4] Anshan

[5] Cyrus

انڈو یورپین اور ان کے پڑوسی

انہی کے ہم نسل وہ لوگ آباد تھے۔ جو صدیوں پہلے یورپ پہنچ کر ان علاقوں پر قابض ہو گئے تھے۔ وہ مزاحم ہوئے۔

یونان اور فارس کے درمیان تین مشہور لڑائیاں ہوئیں۔ شاہ دارا اور شاہ زرکسیز[1] نے یونان کے شمالی حصے پر حملہ کیا۔ یونان کی سرزمین کو روند ڈالا۔ اور براعظم یورپ پر قدم جمانے کے لئے بڑا زور مارا۔

لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہوئے۔ ایتھنز کی بحری فوج کو شکست نہ دے سکے۔ اس بحری فوج نے ہر دفعہ افواجِ فارس کے سامان خورد و نوش کا سلسلہ اس طرح منقطع کیا۔ کہ ایشیائیوں کو لاچار پسپا ہونا پڑا۔

ایشیا اور یورپ یعنی کہنہ مشق استاد اور نوجوان سرگرم شاگرد کے درمیان یہ پہلی مٹ بھیڑ تھی۔ جوں جوں اس کتاب کے صفحے الٹتے جاؤ گے۔ تمہیں معلوم ہوتا جائیگا۔ کہ یہ کشمکش کبھی بند نہ ہوئی۔ بلکہ آج تک جاری ہے۔

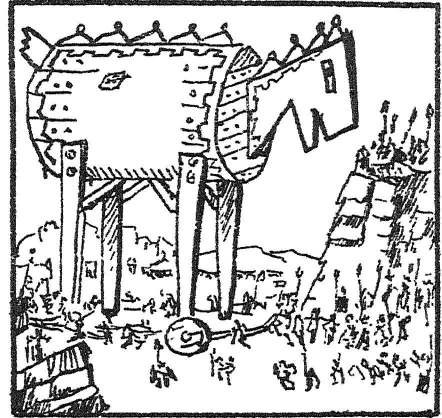
---

[1] Xerxes

بحیرۂ ایجئین

بحیرۂ ایجئین[1] کے باشندوں نے قدیم ایشیا کی تہذیب کو یورپ کے بیابانوں تک پہنچا دیا

ہائنرخ شلیمان[2] ابھی بچہ ہی تھا۔ کہ باپ سے قدیم شہر ٹرائے[3] کے حالات سُنے۔ ایسی دلچسپ کہانی پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ دل میں شوق پیدا ہُوا۔ ارادہ کرلیا۔ کہ بڑا ہو کر یونان جاؤنگا۔ اور اس شہر کا پتہ لگاؤنگا۔ باپ میکلن برگ[4] کے گاؤں میں ایک غریب سا پادری تھا۔ لیکن والدین کے افلاس کے باوجود ہمت پست نہ ہوئی۔ سوچا روپے کے بغیر یہ کام مشکل ہے۔ چنانچہ پہلے روپے کا بندوبست کیا۔ تھوڑے عرصے میں بہت سی دولت جمع کرلی۔ جب اس مہم کے لئے کافی روپیہ جمع ہوگیا۔ تو گھر سے نکل کھڑا ہُوا۔ ایشیائے کوچک کے شمال مغربی کونے میں اس مقام پر پہنچا۔ جہاں خیال تھا۔ کہ ٹرائے کا شہر مدفون ہے۔ اور کھدائی کا کام شروع کردیا۔ وہاں ایک پہاڑی تھی جس پر کھیت ہی کھیت تھے۔ لوگوں میں مشہور تھا۔ کہ ٹرائے کا بادشاہ پرائیمس[5] یہیں رہتا تھا۔ شلیمان میں مستعدی زیادہ تھی۔ علم کم تھا۔ آثارِ قدیمہ کے ماہر اطمینان کرنے کو شروع میں تھوڑا سا کھود کر دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن شلیمان نے بغیر



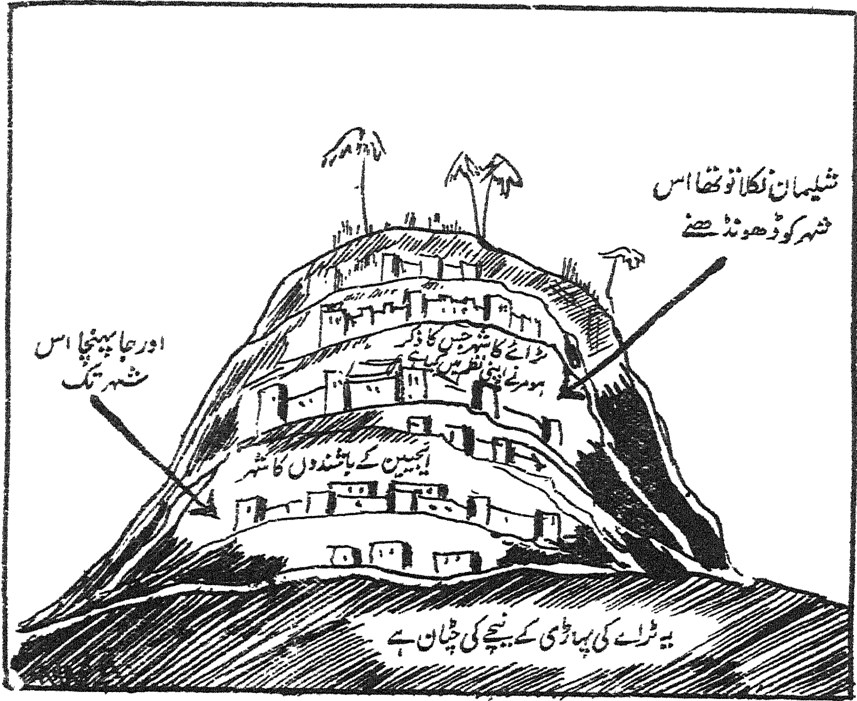
ٹرائے کا گھوڑا

---

[3] Troy [2] Heinrich Schliemann [1] Aegean

[5] Priamus [4] Mecklenburg

سوچے سمجھے کھودنا شروع کر دیا۔ اور اس شدومد اور تیزی سے کھودتا چلا گیا۔ کہ جس شہر کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔ اس کے بیچ میں سے صاف گزر کر اس سے نیچے ایک اور شہر تک جا پہنچا۔ جو ٹرائے سے بھی ایک ہزار سال پرانا تھا۔ پھر ایک عجیب وغریب



شلیمان نے ٹرائے تک پہنچنے کے لئے زمین کو کھودا

واقعہ پیش آیا۔ اگر شلیمان کو پتھر کے ترشے ہوئے ہتھوڑے یا بے ڈول برتنوں کے ٹھیکرے مل جاتے۔ تو کسی کو تعجب نہ ہوتا۔ کیونکہ یونانی تہذیب سے پہلے زمانہ تاریخ سے قبل کے جو لوگ ان علاقوں میں رہتے تھے۔ ان کے ہاں تو ایسی ہی چیزیں پائی جاتی تھیں۔ لیکن وہاں سے تو بڑی بڑی خوبصورت مورتیاں۔ بیش بہا زیورات اور ایسے ایسے منقوش ظروف نکلے جن کے نقش و نگار یونانی صنعت سے مختلف تھے شلیمان نے اندازہ لگایا۔ کہ جنگ ٹرائے سے ایک ہزار سال پہلے بحیرۂ ایجیین کے ساحل پر ایک عجیب وغریب قوم آباد تھی۔ اور اس قوم کے لوگ ان وحشی یونانیوں سے کہیں زیادہ تہذیب یافتہ تھے۔ جنہوں نے ان پر حملہ آور ہو کر یا تو ان کی تہذیب

کو بالکل ہی تباہ و برباد کر دیا۔ یا اُسے اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا۔ کہ اُس کی اپنی ہیئت بالکل ہی مسخ ہو گئی + شلیمان کا یہ خیال بعد میں ٹھیک ثابت ہؤا کیونکہ جب ۱۸۷۶ء کے قریب مائسینی[1] کے کھنڈروں کی سیر کو گیا۔ جن کی قدامت پر اُن



آرگولس[2] کے علاقے میں مائسینی کا شہر

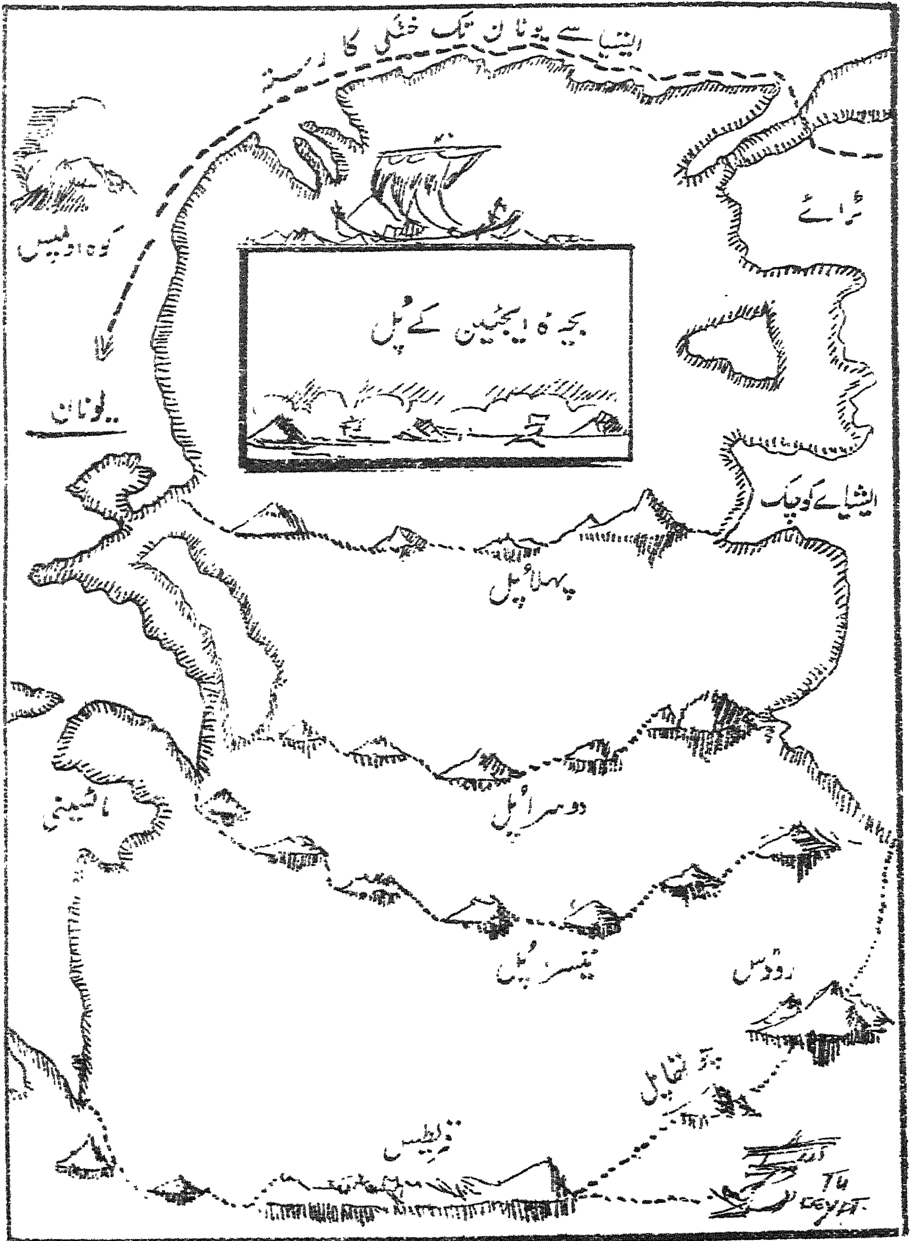
رومن کتابوں کے مصنفین حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے تھے۔ جو سیاحوں کی رہنمائی کے لئے لکھی جاتی ہیں تو وہاں ایک گول صحنچے کے فرش کے نیچے سے ایک بیش قیمت دفینہ ہاتھ آیا۔ جو اُسی قوم کی یادگار تھا + اس قوم نے یونان کے ساحل پر بیشمار شہر آباد کئے۔ اور ان کے گرد اتنی بڑی بڑی اور مضبوط فصیلیں کھڑی کیں۔ کہ یونانی لوگ ان کی تعمیر کو ان دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے۔ جن کا ذکر ان کی داستانوں میں پایا جاتا تھا +

لیکن جب ان آثار کو غور سے دیکھا گیا۔ تو معلوم ہؤا۔ کہ طلسم کا اس میں کچھ دخل نہیں + ان اشیا کے بنانے والے اور ان فصیلوں اور قلعوں کے تعمیر کرنے والے کوئی جادوگر نہ تھے۔ بلکہ سیدھے سادھے ملاح اور تاجر لوگ تھے + یہ لوگ کریٹس اور ارد گرد کے جزیروں میں رہتے تھے۔ اور جہازرانی میں انہیں کمال حاصل تھا + ایک طرف ایشیا کی تہذیب یافتہ سرزمین۔ اور دوسری طرف یورپ کے بیابان تھے۔ جو رفتہ رفتہ

---

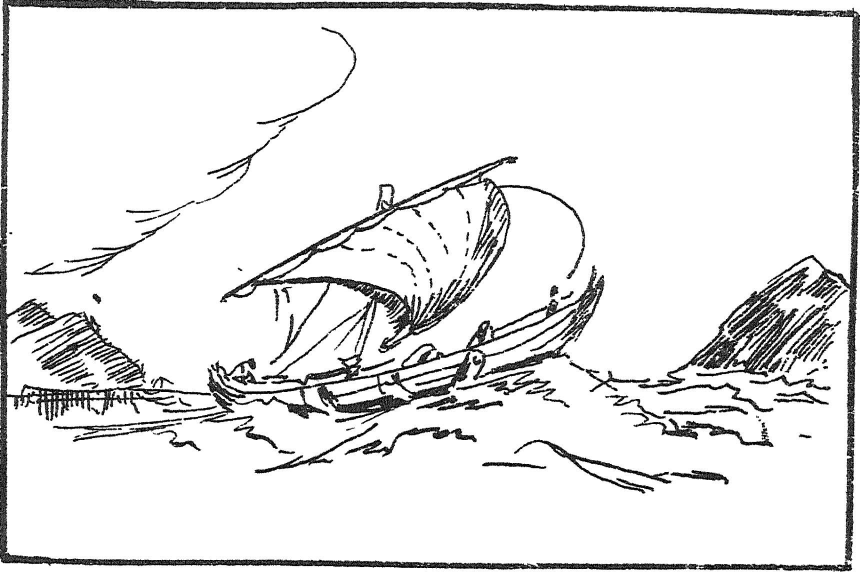
[1] Mycenæ

[2] Argolis



ایشیا اور یورپ کے درمیان جزیروں کے پُل

تہذیب ہو رہے تھے۔ ان دونو کے بیچ میں بحیرہ ایجیئین انہی لوگوں کی بدولت تجارت کی منڈی اور لین دین کا مرکز بن گیا +



بحیرۂ ایجیئین

جزیروں کی یہ مملکت ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے تک برسر اقتدار رہی۔ اور اس عرصے میں اس مملکت کی حدود کے اندر صنعت و فن نے بہت ترقی کی + سب سے مشہور شہر کنوسس ؎ تھا۔ جو قریطس کے شمالی ساحل پر واقع تھا۔ حفظان صحت اور آسائش جسمانی کا انتظام آج کل سے کم نہ تھا۔ محل میں باقاعدہ نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ گھروں میں انگیٹھیاں تھیں۔ لوگ ہر روز ٹب میں نہاتے تھے (غسل کا یہ طریقہ اس سے پہلے دنیا میں رائج نہ تھا)۔ شاہی محل اپنے پیچ در پیچ زینوں اور وسیع ایوان ضیافت کے لئے مشہور تھا۔ محل کے تہ خانے جہاں شراب اور غلّے اور زیتون کے تیل کا ذخیرہ جمع رہتا تھا۔ اتنے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کہ یونانیوں نے جب انہیں پہلے پہل دیکھا۔ تو دنگ رہ گئے۔ بھول بھلیاں کے قصے کا خیال یونانیوں کے ذہن میں ان تہ خانوں کو دیکھ کر ہی پیدا ہوا +

؎ Cnossus

لیکن اس عظیم الشان مملکت کا آخر میں کیا حشر ہُوا۔ اور اتنی بڑی سلطنت صفحہ ہستی سے یک لخت ہی کیونکر مٹ گئی۔ یہ کسی کو معلوم نہیں +

اہل قریطس لکھنا تو جانتے تھے۔ لیکن ان کا لکھا آج کل کوئی پڑھ نہیں سکتا۔ اس لئے ان کے تاریخی حالات سے ہم بیخبر ہیں۔ ان کی کارگزاریوں کا اندازہ کھنڈروں ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔ اور یہ کھنڈر صاف بتا رہے ہیں کہ مملکت ایجیین پر اچانک ہی ایک ایسی قوم نے غلبہ پا لیا۔ جو تہذیب میں ادنےٰ تھی۔ اور جو تھوڑا عرصہ ہُوا۔ شمالی یورپ کے میدانوں سے آئی تھی + اغلب یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جن لوگوں نے قریطس اور اس کی تہذیب کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ وہ وہی خانہ بدوش چرواہوں کے قبیلے ہیں۔ جنہوں نے اس سے ذرا پہلے ایڈریاٹکؔ[1] اور ایجیین کے درمیانی جزیرہ نما کی سنگلاخ سرزمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور جنہیں ہم یونانیوں کے نام سے پکارتے ہیں +

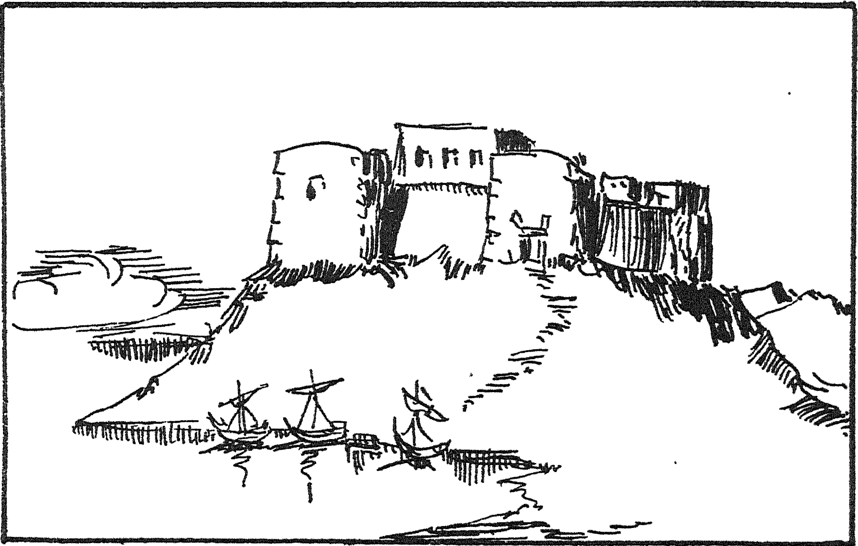
---

[1] Adriatic

اہل یونان

اس دوران میں انڈو یورپین نسل کا ہیلینی[۱] قبیلہ یونان پر قبضہ کر رہا تھا

جب مصر کے میناروں کو بنے ہوئے ایک ہزار سال کا عرصہ گزر گیا۔ اور ان پر خستگی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اور بابل کے دانشمند بادشاہ حمورابی کو تہ خاک کئی صدیاں گزر چکیں۔ تو چرواہوں کا ایک چھوٹا سا قبیلہ جو دریائے ڈینیوب[۲] کے کنارے رہتا تھا۔ اپنے وطن کو چھوڑ کر جنوب کی سمت نئی چراگاہوں کی تلاش میں نکلا۔ اس



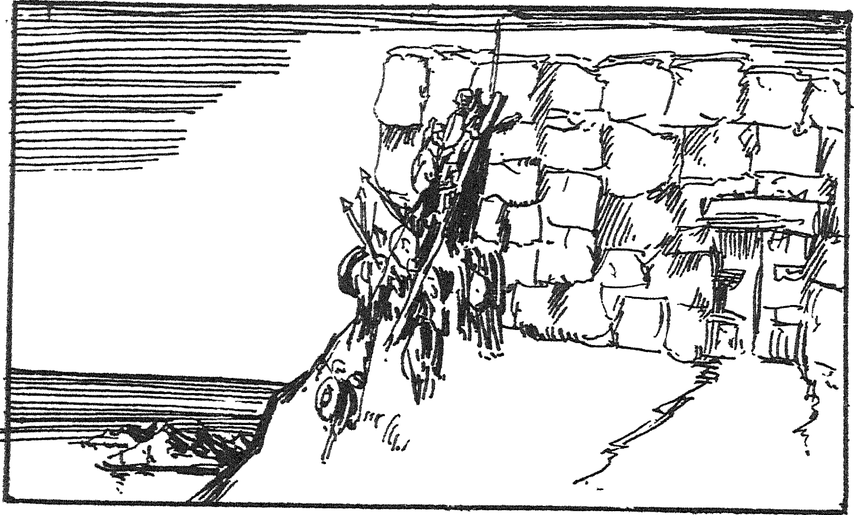
یونان کی سرزمین پر ایک ایجیین شہر

قبیلے کے لوگ اپنے آپ کو ہیلینی کہتے تھے۔ کیونکہ وہ ڈیوکیلین[۳] اور پرہا[۴] کے بیٹے ہیلین[۵]

۱۔ Hellenes ۲۔ Danube ۳۔ Deucalion

۴۔ Pyrrha ۵۔ Hellen

کو اپنا جدامجد سمجھتے تھے + پرانی داستانوں میں آیا ہے۔ کہ ایک دفعہ جب دیوتاؤں کا دیوتا زیوسؔ[1] جو کوہ اولمپسؔ[2] پر رہتا ہے۔ اہل دنیا کی سیاہ کاریوں پر بہت ناراض ہؤا۔ تو اس نے دنیا میں طوفان بھیجا۔ جس میں سب لوگ غرق ہو گئے۔ صرف دو



قبیلہ ایکیین کے لوگ ایک ایجیین شہر کو فتح کر رہے ہیں

شخص۔ ایک مرد اور ایک عورت زندہ بچے + یہ ہیلین کے والدین تھے +

شروع زمانے کے ہیلینوں کے حالات سے ہم محض بے خبر ہیں + سقوطِ ایتھنز[3] کا مورخ تھوسی ڈائیڈیز[4] اپنے قدیم آبا و اجداد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ "ان لوگوں کی کوئی حیثیت نہ تھی" + غالباً حقیقت بھی یہی ہے۔ شروع زمانے کے ہیلینی بڑے غیر شائستہ لوگ تھے۔ ان کی بود و باش سؤروں کی سی تھی۔ دشمنوں کی لاشیں اپنی بھیڑوں کے رکھوالے وحشی کتوں کے سامنے ڈال دیتے + حق شناسی کا مادہ ان میں بالکل نہ تھا۔ جزیرہ نمائے یونان کے باشندوں کو (جن کو پیلاسجیئن[5] کہتے تھے) تہ تیغ کر دیا + ان کے مال مویشی چھین لئے۔ ان کے کھیتوں پر قبضہ کر لیا۔ اور اُن

---

[1] Zeus   [2] Olympus   [3] Athens   [4] Thucydides

[5] Pelasgians

کی بیویوں اور بیٹیوں کو غلام بنالیا + جب کوہستان تھسیلی[1] اور پیلوپنیسس[2] میں داخل ہوئے۔ تو قبیلہ ایکیین[3] جلو میں تھا۔ چنانچہ ان کی شجاعت اور بہادری کی تعریف میں بے شمار گیت لکھے +

کہیں کہیں اونچی اونچی چٹانوں پر قوم ایجیین کے قلعے بھی دکھائی دیتے۔ ان پر حملہ آور نہ ہوئے + ایجیین سپاہیوں کی آہنی تلواروں اور بھالوں سے ڈرتے تھے۔ جانتے تھے۔ کہ ان کے مقابلے میں ہمارے یہ پتھروں کے بے ڈول کلہاڑے کچھ بھی کام نہ آئیں گے +

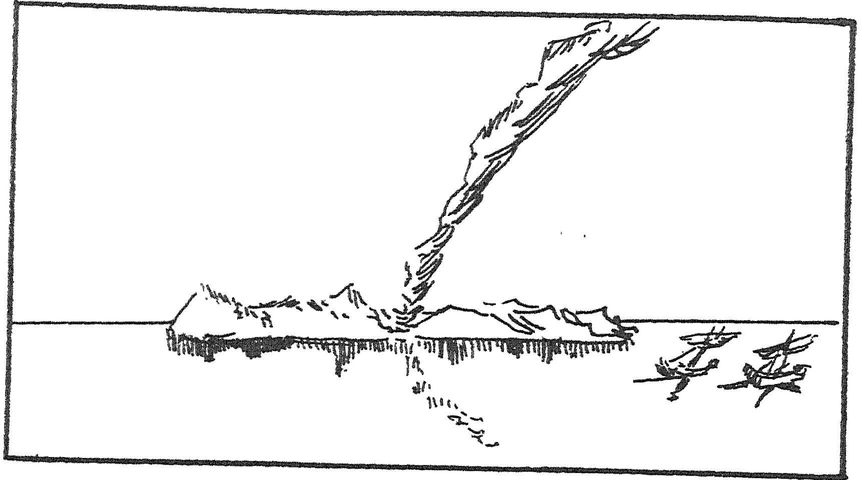
کئی صدیوں تک وادی وادی اور پہاڑ پہاڑ گھومتے پھرے۔ جب سب کا سب ملک آباد ہو چکا۔ تو ہجرت کا سلسلہ لازماً بند ہوگیا +

یونانی تہذیب بس اسی زمانے سے شروع ہوتی ہے + یونانی دہقان کو سامنے اہل ایجیین کی نوآبادیاں دکھائی دیتی تھیں۔ دل میں سوچتا تھا۔ یہ میرے مغرور پڑوسی کس طرح کے لوگ ہیں + آخر کار نہ رہا گیا تو جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا + معلوم ہوا کہ مائسینی[4] اور ٹائرینز[5] کی بلند اور سنگین چار دیواریوں کے اندر بڑے صاحب کمال بستے ہیں۔ جن سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے +

شاگرد ذہین تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اُن آہنی ہتھیاروں کا استعمال سیکھ لیا جو ایجیین قوم کے لوگ بابل اور تھیبز سے لائے تھے + اس کے علاوہ جہاز رانی کے طور طریقوں سے بھی واقف ہوگیا۔ اور اپنے استعمال کے لئے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنانے لگا +

جب سب کچھ سیکھ چکا۔ تو پہلے استاد پر ہی طبع آزمائی کی۔ اور ایجیین قوم کو یونان کی سرزمین سے نکال کر پھر انہی جزیروں میں بھیج دیا۔ جہاں وہ پہلے پہل آباد تھے + تھوڑے عرصے بعد جہازوں پر سوار ہو کر گھر سے نکلا۔ اور قوم ایجیین کے تمام شہروں کو فتح کر ڈالا + آخر کار پندرھویں صدی قبل مسیح میں کنوسس کو

ف[1] Thessaly　ف[2] Peloponnesus　ف[3] Achæans
ف[4] Mycenal　ف[5] Tiryns



کنوسس کی تباہی

کو لوٹ کر برباد کر دیا + گویا ہیلینی قوم ایک ہزار سال کے اندر اندر یونان - بحیرہ
ایجیین اور ایشیاے کوچک کے ساحلی علاقے پر بے دھڑک حکومت کرنے لگی +
پرانی تہذیب کی آخری یادگار - تجارت کا آخری بڑا مرکز بس ایک ٹراے کا شہر
رہ گیا تھا + گیارھویں صدی قبل مسیح میں اس کی بھی اینٹ سے اینٹ بج گئی + تاریخ
یورپ اصلی معنوں میں یہیں سے شروع ہوتی ہے +

یونان کے شہر

یونان کے شہر جن میں سے ہر ایک بذات خود ایک سلطنت تھا

آج کل ہم سب لوگ "بڑائی" پر جان دیتے ہیں۔ اس بات پر فخر کرتے ہیں۔ کہ ہماری سلطنت "سب سے بڑی" ہے۔ ہماری بحری فوج "سب سے بڑی ہے ہمارے ہاں" سب سے بڑے" آلو اور "سب سے بڑی" نارنگیاں اُگتی ہیں + چاہتے ہیں ایسے شہروں میں رہیں۔ جہاں "لاکھوں" آدمی آباد ہوں۔ جب مر جائیں تو "سب سے بڑے" قبرستان میں دفن ہوں +

قدیم یونان کا رہنے والا اگر ہماری باتیں سن پائے۔ تو ہمارا منہ دیکھتا رہ جائے + اس کا اصول زندگی یہ تھا۔ کہ ہر بات میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہیئے + کسی چیز کا محض بڑا ہونا اسے مرعوب نہ کر سکتا تھا۔ اور یہ محض زبانی جمع خرچ نہ تھا۔ بلکہ پیدائش سے لے کر مرگ تک اس کا ہر فعل اعتدال پسندی کی ایک مثال تھا + لٹریچر میں اسی اصول کو مد نظر رکھا۔ عبادتگاہیں بنائیں۔ تو چھوٹی چھوٹی مگر فن تعمیر کے اعتبار سے بے مثال + مردوں کے لباس اور عورتوں کے زیورات تک میں اعتدال کو نظر انداز نہ کیا۔ حتےٰ کہ تھیئٹر کے تماشائی بھی اسی اصول پر کاربند ہوتے۔ کوئی ڈرامہ نویس بد مذاقی یا بیہودگی کا مرتکب ہوتا۔ تو شور و غل مچا کر اسے فوراً چپ کرا دیتے +

اعلےٰ سیاست دان ہو خواہ لوگوں کا منظور نظر کھلاڑی۔ یہ صفت سب میں ضروری سمجھی جاتی + ایک شخص جو دوڑنے میں مہارت رکھتا تھا۔ سپارٹا[1] میں آیا اور بڑے فخر سے کہنے لگا۔ کہ جتنی دیر میں ایک ٹانگ پر کھڑا ہو سکتا ہوں۔ ہیلس[2] بھر میں کوئی دوسرا شخص کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لوگوں نے اسے شہر سے باہر نکال دیا۔ کہنے لگے۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ جس پر فخر کیا جائے۔ یہ تو معمولی پرندے بھی کر سکتے ہیں +

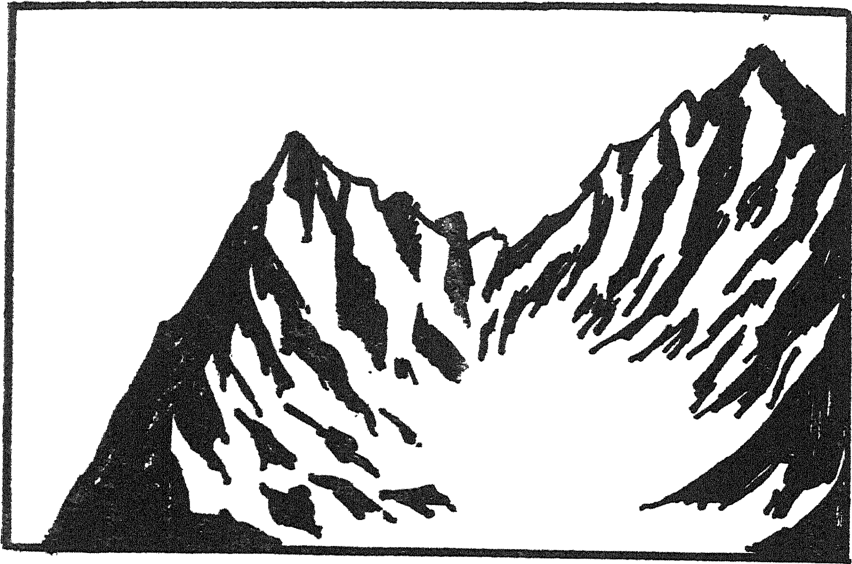
---

[1] Sparta

[2] Hellas

تم کہو گے۔ مان لیا کہ اعتدال اور کمال فن کی قدر کرنا بہت بڑی خوبی ہے۔ لیکن یہ خوبی آخر یونانیوں ہی میں کیوں پائی جاتی تھی؟ باقی قومیں اس سے کیوں محروم تھیں؟ اس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے یونانیوں کی طرز زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

مصر اور عراق کے رہنے والے ایک ان جانے شاہنشاہ کی رعایا تھے۔ جو عوام کی نظروں سے اوجھل میلوں دور ایک بند محل میں رہتا تھا۔ برخلاف اس کے یونانی



کوہ اولمپس جہاں دیوتا رہتے تھے

سینکڑوں چھوٹے چھوٹے خود مختار شہروں کے آزاد باشندے تھے۔ بڑے سے بڑے شہر کی آبادی بھی آج کل کے گاؤں سے زیادہ نہ تھی۔ جب سرزمین اُور کا رہنے والا شخص یہ کہتا۔ کہ میں بابلی ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا۔ کہ آج کل مغربی ایشیا کی تمام مملکت پر ایک بادشاہ حکمران ہے۔ لاکھوں انسان اس کے مطیع و باجگزار ہیں۔ میں بھی ان میں کا ایک شخص ہوں۔ لیکن جب کوئی یونانی بڑے فخر سے یہ کہتا۔ کہ میں ایتھنز[1] کا رہنے والا یا تھیبز[2] کا شہری ہوں۔ تو اس کا مطلب کچھ اور ہوتا۔ ایتھنز یا تھیبز ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ وہی اس کا وطن وہی اس کا دیس تھا۔ اوپر کوئی بادشاہ نہ

---

[1] Athens
[2] Thebes

تھا جس کی اطاعت واجب ہوتی۔ چوک میں لوگ جمع ہو کر جس بات کا فیصلہ کرتے۔ اسی کو قانون مانتا۔

ایک یونانی کا آبائی ملک حقیقی معنوں میں اس کا وطن تھا۔ وہیں وہ پیدا ہوا۔ وہیں ایکروپولیس[۵ے] کی وہ چٹانیں تھیں۔ جہاں والدین جانے سے منع کرتے تھے۔ اور جہاں وہ کھیل کود کر بڑا ہوا تھا۔ جیسے تم اپنے مدرسے کے ساتھیوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ ویسے ہی وہ وہاں کے بچے بچے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ بچپن میں سب اس کے ساتھ کے کھیلنے والے تھے۔ سب سے بے تکلفی تھی۔ اسی مقدس سرزمین میں اس کے ماں باپ دفن تھے۔ یہیں شہر کی چاردیواری کے اندر اس کا گھر بار تھا۔ جہاں اس کے بیوی بچے محفوظ رہتے تھے۔ گویا سنگلاخ زمین کا چار پانچ ایکڑ رقبہ بس یہی اس کی دنیا تھی۔ خود ہی سوچو۔ کہ اس گرد و پیش کا اس کے خیالات اور اس کے افعال پر کتنا گہرا اثر پڑتا ہوگا؟ بابل اور اسیریا اور مصر کا رہنے والا تو جم غفیر کا ایک حصہ تھا۔ نقار خانے میں ایک طوطی یا سمندر میں ایک قطرہ۔ برخلاف اس کے یونانی اپنے شہر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ شہر بھی چھوٹا سا تھا۔ سب کے سب باشندے جان پہچان کے لوگ تھے۔ اس لئے اسے ہمیشہ یہ خیال رہتا۔ کہ سمجھدار پڑوسی میری ہر بات کو دیکھ رہے ہیں۔ کوئی ڈرامہ لکھتا یا سنگ مرمر کے بت تراشتا۔ یا شعر کہتا۔ تو یہ سمجھ کر۔ کہ اہل ذوق اسے اچھی طرح پرکھینگے۔ اس لئے اپنے فن میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اور بچپن ہی سے اسے یہ تعلیم دی گئی تھی۔ کہ کمال بغیر اعتدال کے پیدا نہیں ہو سکتا۔

جہاں ہر بات اس سختی سے جانچی تولی جائے۔ وہاں کی مردم خیزی کا بھلا کیا پوچھنا؟ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یونانی کئی باتوں میں سب دنیا سے آگے نکل گئے۔ نئے نئے آئین وضع کئے شعر و سخن میں کئی باتیں پیدا کیں۔ اور فنون لطیفہ میں تو جدت طرازی کے وہ جوہر دکھائے۔ کہ آج تک اہل فن ان کا لوہا مانتے ہیں۔ اور یہ سب کمالات انہوں نے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں رہ کر دکھائے۔ جن میں کا ہر ایک قصبہ بمشکل ہمارے

۵ے Acropolis

بڑے بڑے شہروں کے چار پانچ چوراہوں کے رقبے کے برابر تھا +

ان کا انجام کیا ہوا ؟ وہ بھی سن لو +

چوتھی صدی قبل مسیح میں مقدونیہ کے سکندر اعظم نے دنیا کو فتح کر لیا + لڑائی بھڑائی سے چھٹکارا ہوا - تو دل میں یہ خیال سمایا - کہ یونانیوں کے کمالات سے سب دنیا کو مستفید کرنا چاہیئے + چنانچہ یونانی علم و ہنر کو چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں سے نکال کر اپنے نئے مقبوضات کے عالیشان محلات میں روشناس کرایا - اور کوشش کی کہ یہ وہاں بھی ویسے ہی پروان چڑھے - لیکن اہل یونان جب وطن سے کوسوں دور پردیس میں پہنچے - تو وہاں ان کی آنکھیں اپنی عبادتگاہوں کو ڈھونڈھتی تھیں - اُن ٹیڑھی ٹیڑھی گلیوں کو ڈھونڈھتی تھیں - جن کی خوشبوؤں اور آوازوں سے وہ اس قدر مانوس ہو چکے تھے + دل کی کلی مرجھا گئی - طبیعت میں وہ شگفتگی نہ رہی - وہ ولولے مٹ گئے - اعتدال کا وہ حیرت انگیز احساس جاتا رہا - جس کی بدولت انھوں نے اپنی چابکدستی اور طباعی سے اپنی شہری سلطنتوں کی شان و شوکت میں چار چاند لگا دئے تھے - وطن سے جدا ہوئے - تو سپہر کمال کے یہ ستارے عرش سے فرش پر آ گرے - اور ان کی صنعت میں وہ پہلی سی بات نہ رہی - جس دن یونان کی چھوٹی چھوٹی شہری سلطنتیں اپنی خود مختاری کو خیرباد کہہ کر ایک عظیم الشان قوم کا حصہ بن گئیں - اُسی دن قدیم یونان کی روحِ تہذیب بھی فنا ہو گئی - اور ایسی فنا ہوئی - کہ پھر آج تک زندہ ہونے کا نام نہیں لیا +

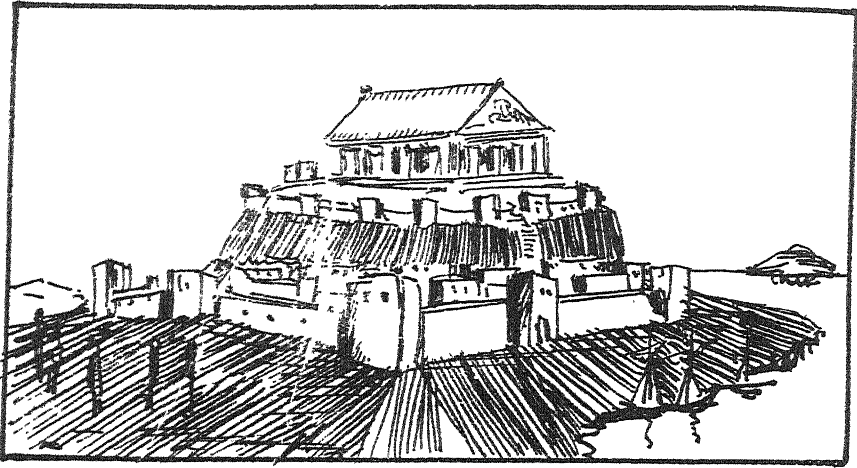
اہل یونان کی حکومت خود اختیاری

دنیا میں سب سے پہلے یونانیوں ہی نے حکومت خود اختیاری جیسی مشکل چیز کو آزما کر دیکھا

شروع شروع میں سب یونانی ایک ہی حیثیت کے لوگ تھے۔ نہ ان میں کوئی امیر تھا نہ غریب۔ گائیں اور بھیڑیں ہر ایک کے پاس تھیں۔ کچے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ پر اپنے گھر میں ہر ایک بادشاہ تھا۔ کسی پر کوئی پابندی عائد نہ تھی۔ جب کوئی اہم قومی معاملہ درپیش ہوتا۔ تو سب لوگ چوک میں جمع ہو جاتے۔ کسی بزرگ آدمی کو صدر چن لیتے اور وہ باری باری ہر ایک کو اظہار رائے کا موقع دیتا۔ کسی سے جنگ چھڑ جاتی۔ تو جو ساتھی ذرا مستعد اور حوصلے والا نظر آتا۔ اسے اپنا سپہ سالار مقرر کر لیتے۔ خود ہی اس کو سردار بناتے۔ اور جب آئی بلا ٹل جاتی۔ تو خود ہی چاہتے۔ تو اسے برطرف بھی کر دیتے۔

گاؤں رفتہ رفتہ شہر بن گیا جس میں بعض لوگ محنتی تھے۔ بعض کاہل۔ جن کے بُرے دن آئے۔ وہ کنگال بن گئے۔ جنہوں نے ادھر اُدھر ہاتھ مارا اور حلال حرام کی پروا نہ کی۔ وہ دولتمند ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ سب کی حیثیت ایک سی نہ رہی۔ ملک کی بیشتر دولت معدودے چند لوگوں کے قبضے میں آ گئی۔ اور عام لوگ روٹیوں کو ترسنے لگے۔

اس کے علاوہ ایک اور تبدیلی رونما ہوئی۔ پہلے زمانے میں تو لوگ اپنی مرضی سے کسی ایسے شخص کو اپنا سپہ سالار یا سردار یا بادشاہ مقرر کرتے۔ جو فنِ سپاہگری سے واقف ہوتا۔ لیکن اب اختیارات سب امرا نے اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ گویا اب برسرِ اقتدار وہ لوگ تھے۔ جو رفتہ رفتہ دوسروں کی زمین اور جائداد غصب کر کے متمول ہو گئے تھے۔



..یونانیوں کی شہری سلطنت

امرا عام آزاد باشندوں سے بہت زیادہ مزے میں رہتے تھے + روپے کی ان کے پاس کمی نہ تھی۔ اس لئے جب چاہتے۔ مشرقی بحیرۂ رُوم کے بازاروں میں جاکر بہترین سے بہتر بن اسلحہ خرید سکتے تھے + فرصت بہت تھی۔ اس لئے فنون سپہ گری میں مشق بہم پہنچا سکتے تھے۔ پختہ مکانات میں رہتے تھے + جب لڑنے کی ضرورت ہوتی۔ تو کرائے کے سپاہی نوکر رکھ لیتے + شہر پر حکومت کرنے کے لئے ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے + جسے فتح نصیب ہوتی۔ وہ بادشاہ بن کر پڑوسیوں پر حکومت کرتا۔ تا آنکہ کسی دوسرے امیر کی ہوس کا شکار ہو کر یا تو مارا جاتا۔ یا بھاگ جاتا +

اس قسم کا بادشاہ چونکہ اپنی فوجی طاقت کے بل پر حکومت کرتا۔ اس لئے لوگ اسے ٹائرنٹ[1] کے نام سے پکارتے (ٹائرنٹ کے معنے مطلق العنان غاصب کے ہیں) ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں ہر یونانی شہر پر ایسے کئی ٹائرنٹ حکمران ہوئے۔ کئی ایک نے بڑے تدبّر اور دانشمندی سے بھی حکومت کی۔ لیکن با ایں ہمہ لوگ اس طریق حکومت سے بیزار ہو گئے اور اصلاح کی تدبیریں سوچنے لگے + دنیا کی اولین جمہوری سلطنت انہی اصلاحات کی بدولت ظہور میں آئی +

---

[1] Tyrant

ساتویں صدی کے شروع میں اہل اتھینز نے اپنے وطن کی اصلاح کا تہیہ کر لیا + سنتے آئے تھے۔ کہ جب ان کے ایکیین آبا و اجداد یونان پر حکومت کرتے تھے۔ تو انتظامی معاملات میں اکثر آزاد باشندوں کو مشورہ دینے کا حق حاصل تھا + یونانیوں نے اس پرانے دستور کو از سر نو زندہ کرنا چاہا۔ اس مطلب کے لئے ایک قانون ساز کی تلاش شروع ہوئی + آخر کار ایک شخص ڈراکو[1] نامی کے ذمے یہ خدمت سپرد کی۔ کہ ایسے قانون وضع کرے جن کے ماتحت غریب لوگ امیروں کی چیرہ دستی سے محفوظ ہو جائیں + ڈراکو کا پیشہ ہی وکالت تھا۔ تمام عمر قانونی موشگافیوں میں گزر گئی تھی۔ اس لئے عام زندگی کے نشیب و فراز سے واقف نہ تھا۔ قوانین تو وضع کئے لیکن اتنے سخت۔ کہ جاری ہو جاتے تو آفت ہی آجاتی + وہ ایک ہی بات جانتا تھا۔ کہ جو شخص مجرم وہ بس مجرم ہے۔ اُسے جرم کا مزا چکھانا چاہیئے + سیب تک چرانے کی سزا موت مقرر کی۔ بھلا اُس کے قانون نافذ ہو جاتے۔ تو سب مجرموں کو پھانسی دینے کے لئے رسّی کہاں سے لاتے ؟

چنانچہ ڈراکو کو چھوڑ کر ایک اور شخص کو جس کا نام سولن[2] تھا۔ اس کام پر مقرر کیا + سولن امیر گھر کا بیٹا تھا۔ دنیا بھر کا سفر کر کے مختلف ممالک کے قوانین و آئین کا مطالعہ کر چکا تھا۔ بڑے غور و خوض کے بعد ایسے قوانین وضع کئے۔ جن میں اعتدال کے اصول کو مدنظر رکھا۔ جو یونانی سیرت کا خاصہ ہے + اُمرا کو نظر انداز کرنا تو قرین مصلحت نہ تھا۔ کیونکہ جنگ میں یہی لوگ بہت مفید ثابت ہوتے (یا کم از کم ہو سکتے تھے)۔ چنانچہ سولن نے ایسے قانون بنائے۔ کہ کسان بھی اُسے دعا دیں۔ اور امرا کی مرفہ الحالی پر بھی آنچ نہ آنے پائے + اُن دنوں جج بغیر تنخواہ کے کام کرتے تھے۔ اس لئے ہمیشہ امیر لوگ ہی جج مقرر ہوتے۔ جو غربا سے بے انصافی کرتے + سولن کے قوانین کی رو سے غریبوں کو اب یہ اجازت تھی۔ کہ اگر انہیں کسی جج سے شکایت ہو۔ تو وہ اپنی فریاد اپنے جیسے تیس اشخاص کی ایک جیوری کے سامنے پیش کر کے داد چاہیں +

سب سے بڑی خوبی ان قوانین میں یہ تھی۔ کہ ان کے نفاذ سے عام آزاد باشندے

---

[1] Draco　[2] Solon

شہری معاملات میں ذاتی طور پر دلچسپی لینے اور براہ راست شریک ہونے پر مجبور ہو گئے اب یہ ممکن نہ تھا۔ کہ ایک اہم قومی مسئلہ درپیش ہو۔ اور کوئی گھر پر بیٹھ رہے۔ کہ "آج تو مجھے فرصت نہیں"۔ یا "آج تو بارش ہو رہی ہے"۔ اب اس کا یہ فرض تھا۔ کہ شہری کونسل کے جلسوں میں حصہ لے۔ اور سلطنت کو ترقی دینے اور اس کی حفاظت کرنے میں اپنے ساتھیوں کا ہاتھ بٹائے۔

"جمہور" (یعنی عام لوگوں) کی سلطنت بعض اوقات ناکام بھی رہی۔ فضول اور بیہودہ بحث زیادہ ہوتی تھی۔ اور لوگ عہدے اور نام کی خاطر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ لیکن یہی وہ طرز حکومت تھی جس کی بدولت یونانیوں نے اپنے پاؤں کھڑا ہونا سیکھا۔ اور یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں۔

یونانیوں کی بُود و باش

اہل یونان کس طرح رہتے سہتے تھے

تم پوچھو گے کہ آئے دن تو چوک میں جلسے ہوتے رہتے تھے۔ جہاں ہر شخص کی حاضری ضروری تھی۔ تو پھر یہ قدیم یونانی گھر بار اور کام کاج کی دیکھ بھال کے لئے وقت کہاں سے لاتے تھے۔ اس کا جواب بھی ہم تم کو دیئے دیتے ہیں +

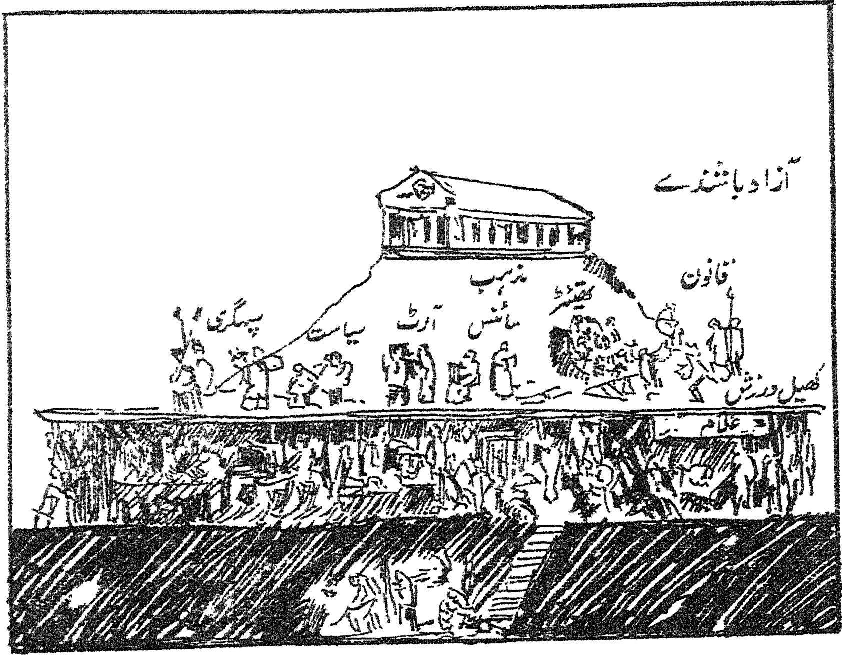
بات یہ ہے۔ کہ یونانیوں کی حکومت جمہوری تو تھی۔ لیکن انتظامی معاملات میں صرف ایک ہی طبقے کو دخل حاصل تھا۔ یہ "آزاد باشندوں" کا طبقہ تھا۔ ہر یونانی شہر میں تین طرح کے لوگ بستے تھے۔ تھوڑے سے "آزاد باشندے"۔ بہت سے غلام اور خال خال پردیسی +

بعض اوقات (مثلاً جنگ کے دوران میں جب فوج کے لئے سپاہیوں کی ضرورت ہوتی) یونانی مصلحتاً پردیسیوں کو (جنہیں وہ "بربری" کے نام سے پکارتے تھے) اپنی قوم میں شامل کر کے انہیں شہریوں کے سے حقوق عطا کر دیتے + لیکن ایسا کبھی کبھار ہوتا تھا ورنہ قاعدہ یہی تھا۔ کہ شہریت کا حق پیدائشی حق ہے۔ ایتھنز کا شہری وہی ہے جس کے آباؤ اجداد ایتھنز کے شہری تھے + کوئی شخص کتنا ہی بڑا تاجر یا کتنا ہی جوانمرد سپاہی کیوں نہ ہو۔ اگر اس کے ماں باپ ایتھنز کے شہری نہیں۔ تو وہ ابد الآباد تک پردیسی ہی شمار ہوگا +

بادشاہ یا ٹائرنٹ تو خیر اپنی مرضی کا مالک ہوتا تھا۔ لیکن جمہوری حکومت کے ماتحت شہر کا انتظام "آزاد باشندوں" ہی کے ہاتھ میں تھا۔ جو ہمیشہ اپنے ہی بھلے کی بات کرتے + غلاموں کی تعداد آزاد باشندوں سے پانچ چھ گنا نہ ہوتی۔ تو آزاد باشندوں کے سب کام ادھورے رہ جاتے۔ ہم لوگ اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے اور گھر کا کرایہ ادا کرنے کے لئے جتنی محنت مشقت کرتے ہیں۔ وہ یونان میں سب کی سب

غلاموں کے سپرد تھی +

جو مالک تھے وہ تو جلسوں میں سیاسی معاملات پر بحث کرتے یا تھیٹر میں ایسکلس[۱] کا نیا کھیل دیکھتے۔ یا کہیں اور یوریپی ڈیز[۲] کے مجدانہ خیالات پر بحث مباحثہ سننے چلے جاتے (یہ یاک یوریپی ڈیز مقدس دیوتا زیوس[۳] کی عظمت و جبروت سے منکر ہوا جاتا



تھا!) جو غلام تھے وہ پکاتے۔ رینڈھتے۔ روشنی کا انتظام کرتے۔ کپڑے سیتے۔ بڑھئی کا کام کرتے۔ زیور بناتے۔ بچوں کو پڑھاتے۔ بہی کھاتوں کا حساب کرتے۔ مالکوں کی غیر حاضری میں خرید اربھگتاتے اور کارخانوں کی دیکھ بھال کرتے +

غرضیکہ قدیم یونان آج کل کے ایک کلب کی مانند تھا۔ آزاد باشندے اس کے ارکان تھے۔ غلام خدمتگذار۔ وہ پیدائشی آقا۔ یہ پیدائشی نوکر + ہر ایک اپنی اپنی جگہ خوش تھا +

آقا غلاموں پر ظلم نہ کرتے تھے + اس میں شک نہیں کہ جو غلام کھیتی باڑی کا کام

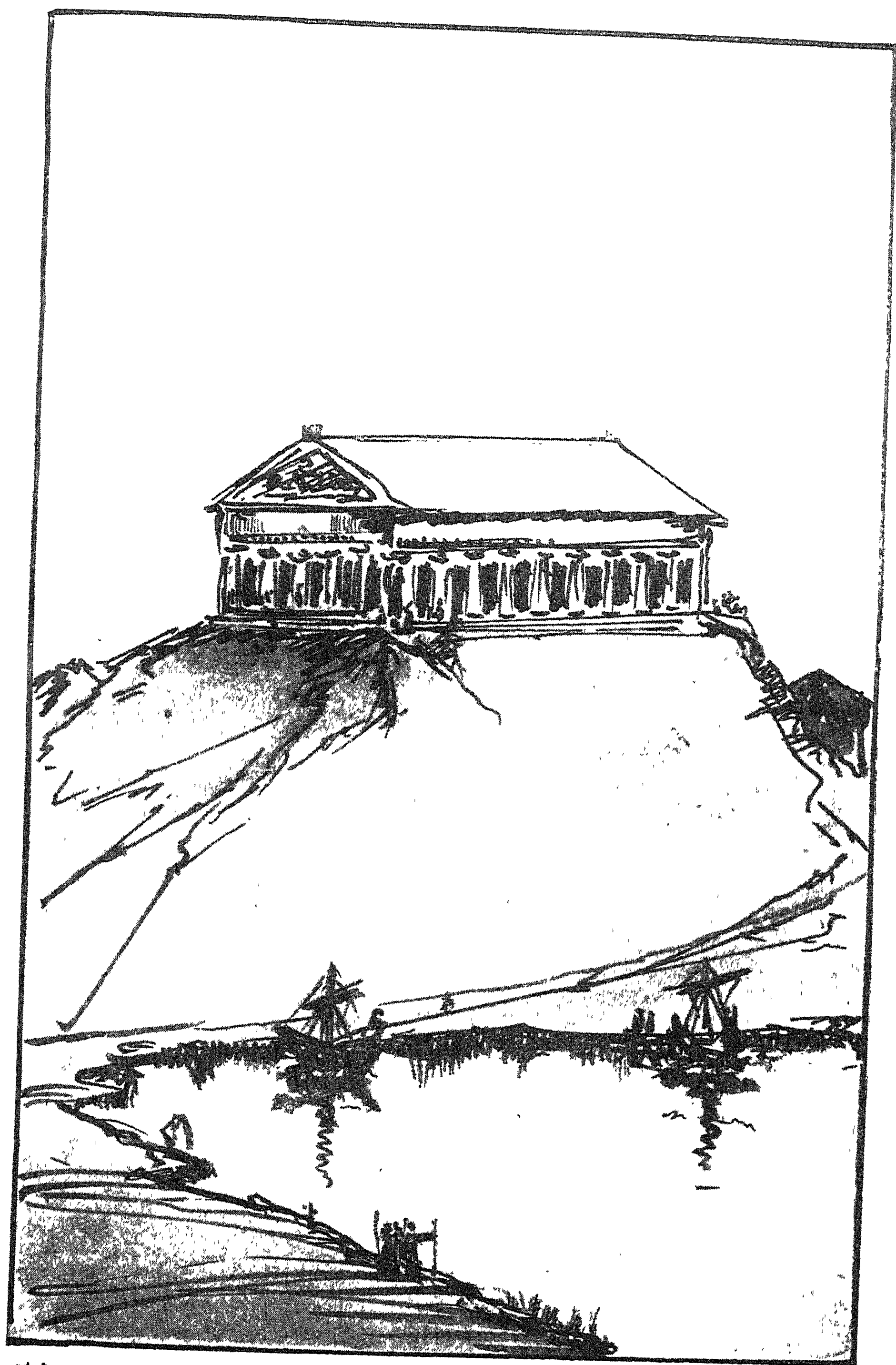
Zeus ۳؎ Euripides ۲؎ Aeschylus ۱؎

کرتے تھے۔ اُن کا دن بُری طرح کٹتا تھا لیکن کئی متوسط درجے کے آزاد باشندے جو افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کھیتوں میں مزدوری کرتے تھے۔ اُن کا بھی یہی حال ہوتا تھا + شہروں میں کام کرنے والے غلام نچلے طبقے کے آزاد باشندوں سے زیادہ خوشحال تھے۔ یونانیوں کی اعتدال پسند طبیعتوں کو یہ بات ہرگز گوارا نہ تھی کہ غلاموں پر ویسے ستم ڈھائیں۔ جیسے بعد میں روما کے لوگ روا رکھتے تھے + روما میں تو یہ حالت تھی۔ کہ جو غلام ہے۔ وہ ہر طرح کے حقوق سے محروم ہے۔ اُسے تو بس ایک بہت بڑی کل کا ایک بیجان اور بیحس پرزہ فرض کیا جاتا تھا + ذرا سے قصور پر اسے درندوں کے سامنے ڈال دیتے تھے +

یونان کے لوگ غلاموں کا رکھنا ضروری خیال کرتے تھے۔ اس دستور کو وہ اعلےٰ تمدن کا جزو لاینفک سمجھتے تھے جس کے بغیر کسی شہر کے لوگ حقیقی معنوں میں مہذب کہلانے کے حقدار نہیں +

تاجروں اور پیشہ ور لوگوں کے کام بھی غلام ہی سرانجام دیتے تھے۔ باقی رہے گھر بار کے دھندے وہ نہ ہونے کے برابر تھے + اہل یونان فرصت کی قدر و قیمت پہچانتے تھے۔ بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے بہت حد تک خانہ داری کے ان جھمیلوں سے آزاد تھے جن میں دن بھر ہمارے گھر کی عورتیں لگی رہتی ہیں۔ یا جو ہمیں خود دفتر سے آ کر کرنے پڑتے ہیں +

اوّل تو مکان بہت سیدھے سادے بنے ہوتے تھے۔ بڑے سے بڑے امیر کا گھر بھی ایک کچا احاطہ سا معلوم ہوتا تھا۔ جہاں آج کل کے ترقی یافتہ ممالک کے مزدور بھی شاید ہی رہنا پسند کریں + بس چار دیواریں کھڑی ہیں۔ ان پر ایک چھت پڑی ہے۔ کھڑکیوں کا دستور نہ تھا۔ بازار کے رخ دیوار میں ایک دروازہ ہے۔ اندر صحن ہے صحن کے کنارے کنارے باورچی خانہ اور رہنے سہنے کے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ بیچ میں یا ایک فوارہ ہے یا ایک بت کھڑا ہے۔ اردگرد پودے لگا رکھے ہیں۔ وہیں اس صحن کی سجاوٹ ہیں + ایک کونے میں باورچی کھانا پکا رہا ہے۔ دوسرے کونے میں استاد بیٹھا بچوں کو ابجد اور پہاڑے سکھا رہا ہے + شرفا کی عورتیں گھر سے باہر کم نکلتی ہیں۔ چنانچہ بیوی بھی صحن میں ایک طرف کو بیٹھی ہے۔ درزن کو وہیں بلا لیا ہے۔ میاں کے کوٹ کی مرمت کروا رہی ہے۔ دروازے کے ساتھ ایک چھوٹا سا دفتر ہے۔ وہاں گھر کا مالک اپنے کارندے کے ساتھ زمین



معبد

کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کر رہا ہے + یہ تو تم خود ہی سمجھ گئے ہو گے۔ کہ باورچی اور استاد اور درزن اور کارندہ سب غلام لوگ ہیں +

کھانے پر گھر کے سب لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن کھانا بہت ہی مختصر اور سادہ ہوتا تھا یونانی لوگ کھانے کو چٹی سمجھ کر کھاتے تھے۔ اسے تفریح نہ سمجھتے تھے۔ کہ بیٹھے اس سے دل بہلاتے رہیں + روٹی۔ شراب۔ تھوڑا سا گوشت اور تھوڑی سی سبزی بس یہ ان کی خوراک تھی۔ مجبوری ہو تو پانی بھی پی لیتے تھے۔ ورنہ پانی کو صحت کے لئے مضر سمجھتے تھے + دعوتوں کا دستور عام تھا۔ لیکن پُر تکلف ضیافتوں سے متنفر تھے + میز پر اکٹھے ہوتے تھے۔ تو ایک دوسرے کی صحبت کا لطف اٹھانے کے لئے + گپیں ہانکتے تھے اور ایک آدھ پیالہ شراب کا پی لیتے تھے۔ لیکن چونکہ اعتدال پسند تھے۔ اس لئے زیادہ پینے پلانے کو بہت بُرا سمجھتے تھے +

کھانا مختصر تھا تو لباس بھی نہایت سادہ تھا۔ صفائی پسند ضرور تھے۔ گھر سے نہا دھو کر نکلتے۔ سر اور ڈاڑھی کے بال سلیقے سے کترواتے۔ تیراکی اور کسرت سے جسم کو سڈول بنائے رکھتے۔ لیکن ایشیائیوں کی طرح بھڑکیلا لباس زیب تن نہ کرتے + لمبے لمبے سفید لبادے پہنتے۔ اور ان میں بھی ایسے سجیلے معلوم ہوتے۔ جیسے آج کل کے اطالوی افسر اپنے لمبے نیلے کیپ میں معلوم ہوتے ہیں +

عورتوں کو زیور پہنتا دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ لیکن اپنی دولت (یا اپنی بیوی) کی لوگوں کے سامنے نمائش کرتے پھرنا بہت ذلیل حرکت سمجھتے تھے + عورتیں کبھی بن ٹھن کر باہر نہ نکلتیں۔ بازار میں آتیں بھی تو اس طرح کہ لوگ ان کی طرف بہت کم متوجہ ہوں +

مختصر یہ کہ یونانیوں کی زندگی نہ صرف اعتدال بلکہ اعتدال اور سادگی دونوں کا مرقع تھی + کرسیاں میزیں۔ کتابیں۔ مکانات۔ گھوڑا گاڑی یہ سب چیزیں ایسی ہیں۔ کہ شروع میں تو انسان انہیں اپنی سہولت کے لئے چاہتا ہے۔ لیکن بعد میں ان کا غلام بن جاتا ہے اور اپنا بیشتر وقت انہی کی دیکھ بھال اور جھاڑ پونچھ میں ضائع کر دیتا ہے + یونانی آزادی پسند لوگ تھے۔ جسم اور دماغ دونوں کی آزادی چاہتے تھے۔ اسی آزادی کی خاطر انہوں نے اپنی ضرورتوں کو اتنا مختصر کر لیا۔ کہ اس سے زیادہ اختصار ممکن نہ تھا +

یونانی تھیئٹر

عوام کی سب سے پہلی تفریح یعنی تھیئٹر کا آغاز کیونکر ہوُا

جب یونانیوں کے آباؤ اجداد نے پیلاس جین کو ہیلس سے نکال دیا تھا۔ اور ٹرائے کی سطوت وشوکت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ تو ان فاتحوں کی شان میں کئی نظمیں لکھی گئیں تھیں۔ یونانیوں نے شروع ہی میں ان نظموں کو یکجا کر لیا تھا۔ یہ نظمیں بازاروں میں پڑھی جاتیں اور چونکہ لوگوں کے پسند کی چیزیں تھیں۔ اس لئے سننے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ لیکن تھیئٹر کا آغاز اس شعرخوانی سے نہیں ہوُا۔ تھیئٹر کا جنم لینا تو ایک ایسا عجیب وغریب واقعہ ہے۔ کہ اس کا حال علیحدہ بیان کرنا چاہئے۔

یونانی ہمیشہ سے تماشا پسند لوگ تھے۔ ہر سال شراب کے دیوتا ڈائیوتائی سوس[ا] کے اعزاز میں کئی کئی مذہبی جلوس نکالتے۔ یونانیوں کے نزدیک پانی کا مصرف تو تیراکی اور جہازرانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ہر چھوٹا بڑا شراب پینے کا عادی تھا۔ اس لئے شراب کے دیوتا کو بہت مقبولیت حاصل تھی۔

مشہور تھا۔ کہ یہ دیوتا تاکستانوں میں رہتا ہے۔ جہاں اس کے اردگرد ایک عجیب وغریب مخلوق آباد ہے۔ جسے سیٹر[۲] کہتے ہیں۔ سیٹر ایک فرضی جانور کا نام تھا۔ جس کا آدھا دھڑ انسان کا اور آدھا بکرے کا تھا۔ اس لئے جلوسوں میں جو لوگ شامل ہوتے وہ بکروں کی کھالیں پہن لیتے اور بکروں کی طرح ممیاتے پھرتے۔ یونانی زبان میں بکرے کو ٹراگوس[۳] اور گویّے کو آئے ڈوس[۴] کہتے تھے۔ اس لئے جو گویا بکرے کی طرح ممیاتا تھا۔ اسے "ٹراگوس آئے ڈوس" کہتے تھے۔ ٹریجڈی[۵] کا لفظ اسی سے نکلا ہے۔ تھیئٹر کی اصطلاح

ا؎ Dionysos　　۲؎ Satyr　　۳؎ Tragos

۴؎ Oidos　　۵؎ Tragedy

ہیں ٹریجڈی ایسے کھیل کو کہتے ہیں جس کا انجام حسرت ناک ہو+ جس کھیل کا انجام مسرت انگیز ہو۔ اس کو کامیڈی[1] کہتے ہیں (کوموس[2] کے معنے خوشدل کے ہیں) +

تم کہو گے ہم تو سننا چاہتے تھے ان شاندار ٹریجیڈیوں کا حال جو دو ہزار سال سے ہمارے تھیٹروں کی رونق ہیں کہ وہ کیونکر شروع ہوئیں ۔ اور تم ہمیں قصہ سنا رہے ہو۔ ایسے شور وغل مچانے والے خوش فکروں کا جو بازاروں میں ممیاتے پھرتے تھے + بھلا ان کو اُن سے کیا تعلق ؟

یہ ہم تمہیں ابھی سمجھائے دیتے ہیں۔ شروع شروع میں گانے والوں کی ٹولی بازار میں جہاں کھڑی ہوتی۔ لوگوں کے ٹھٹھ بندھ جاتے ۔ اور گویوں کے لطیفوں اور چٹکلوں سے لوگ ہنسی کے مارے دُہرے ہو ہو جاتے + لیکن لوگ بہت جلد اس ٹھٹھول بازی اور غل غپاڑے سے اُکتا گئے + یونانی کسی بات سے اُکتا جانے کو بیماری یا بدصورتی سے کم نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہیں کسی نئی چیز کی تلاش ہوئی۔ ایٹیکا[3] کے علاقے میں اکاریا[4] نامی ایک گاؤں تھا۔ وہاں ایک نوجوان شاعر رہتا تھا۔ طبیعت رسا پائی تھی۔ جب دیکھا کہ لوگ اس مشغلے سے تنگ آ گئے ہیں۔ تو اس ناچ گانے میں ایک ایسی جدت پیدا کی۔ جو تھوڑے ہی عرصے میں مقبول عام ہو گئی + اب جلوس کے آگے آگے جو سازندے پین[5] کی نفیریاں بجاتے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک سازندہ آگے بڑھ آتا۔ ادھر سے ممیانے والی ٹولی کا ایک گویا اس کے برابر آ کھڑا ہوتا۔ دونو ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے۔ گویا صف سے آگے نکل کر بھانڈوں کی طرح بھاؤ بتا بتا کر باتیں کرتا جاتا (یعنی "ایکٹ[6]" کرتا) ۔ باقی کے گویے اردگرد کھڑے گاتے رہتے۔ بھانڈ بہت سے سوال پوچھتا جاتا۔ سازندہ شاعر کے موزوں کئے ہوئے جوابات پڑھ پڑھ کر سناتا جاتا + گفتگو یا مکالمہ یونہی شروع ہُوا +

اس گفتگو کے ذریعے ڈایونائی سوس یا کسی اور دیوتا کی کہانی بیان کی جاتی + یہ طرز بیان لوگوں کو بہت پسند آیا۔ چنانچہ اس کے بعد ڈایونائی سوس کے ہر جلوس میں اس طرح

ئے[1] Comedy　　ئے[2] Comos　　ئے[3] Attica

ئے[4] Icaria　　ئے[5] Pan　　ئے[6] act

کا ایک سین ضرور دکھایا جاتا + رفتہ رفتہ ایکٹنگ کو لوگ بھیڑ بھڑکے اور ممیانے سے زیادہ اہم سمجھنے لگے +

ایسکاس[1] جو ٹریجڈی نویسوں ہیں سب سے زیادہ کامیاب تھا۔ ۵۲۶ قبل مسیح سے ۴۵۵ تک زندہ رہا۔ اور اس عرصے میں کم از کم اسی کھیل لکھے + اس نے اپنے کھیلوں میں ایک کی بجائے دو ایکٹر رکھے + تقریباً تیس سال بعد سافوکلیز[2] نے ایکٹروں کی تعداد دو سے بڑھا کر تین کر دی + پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط میں یوریپیڈیز[3] نے اپنی زہرہ گداز ٹریجڈیوں میں جتنے ایکٹر چاہے رکھے + بعد میں ارسطافانیز[4] آیا۔ جو اپنی کامیڈیوں کے لئے مشہور ہے۔ اس نے ہر چیز اور ہر شخص کا مضحکہ اڑایا۔ حتےٰ کہ کوہ اولمپس پر رہنے والے دیوتا بھی اس کے بے پناہ طنز سے نہ بچے + اس کے کھیلوں میں گانے والوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہ تھی۔ کہ ایکٹروں کے پیچھے صف باندھ کر تماشائی بنے کھڑے رہتے۔ اور کبھی کبھار جب ہیرو دیوتاؤں کی مرضی کے خلاف کسی جرم کا مرتکب ہوتا۔ تو یہ ایک گیت گا دیتے۔ کہ " دنیا مصیبتوں کا گھر ہے" +

اس طرح کے تماشے کے لئے خاص ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر یونانی شہر کے لوگوں نے اپنے آس پاس کی پہاڑیوں میں اپنا اپنا ایک تھیئٹر بنا لیا + تماشائی ایک بہت بڑے گول میدان کے سامنے لکڑی کی بنچوں پر بیٹھ جاتے یہ میدان سٹیج تھا جس پر ایکٹر اور گویے اپنا اپنا ہنر دکھاتے + پیچھے ایک خیمہ لگا ہوتا۔ جس میں بیٹھ کر ایکٹر اپنے پارٹ کی ضروریات کے مطابق مٹی کے نقلی چہرے (ہنسی کا پارٹ ہو تو ہنسنے والے چہرے۔ رونے کا پارٹ ہو تو رونے والے) لگا لیتے تھے + یونانی زبان میں خیمے کو سکین کہتے ہیں سکین سے سکینری اور سکینری سے سینری[5] کا لفظ نکلا ہے +

جب ایک دفعہ ٹریجڈی یونانی زندگی کا حصہ بن گئی۔ تو لوگ بجائے دل بہلاوے کے اسے ایک قابل قدر فن سمجھنے لگے + نئے کھیل کو کونسل کے نئے انتخاب سے کم نہ سمجھتے تھے۔ اور ڈرامہ نویس کا احترام ایک فاتح جرنیل سے بھی زیادہ کرتے تھے +

---

[1] Aeschylus   [2] Sophocles   [3] Euripides
[4] Aristophanes   [5] Scenery

اہل فارس کے حملے

یونانیوں نے کس طرح یورپ کو ایشیائیوں کے غلبے سے بچایا۔ اور اہل فارس کو بحیرہ ایجیین کے پار ہٹا دیا

یونانیوں نے تجارت کا فن فنیقیوں کے شاگرد اہل ایجیین سے سیکھا + فنیقیوں کی طرح یونانیوں نے بھی نوآبادیات قائم کیں۔ بلکہ غیر ملکی گاہکوں کے ساتھ لین دین میں روپے کا استعمال وہ دل کھول کر کیا۔ کہ فنیقیوں کو بھی مات کر دیا + چھٹی صدی قبل مسیح تک انہوں نے ایشیائے کوچک کے ساحل پر اپنے قدم جما لئے۔ اور فنیقیوں کی بہت سی تجارت اپنے قبضے میں کر لی + فنیقیوں کو یہ بات ناگوار تو بہت گزری۔ مگر کیا کرتے۔ حریف بہت طاقتور تھا۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ موقع کے انتظار میں چپکے بیٹھے رہیں۔ آخر وہ موقع خدا نے نصیب کیا +

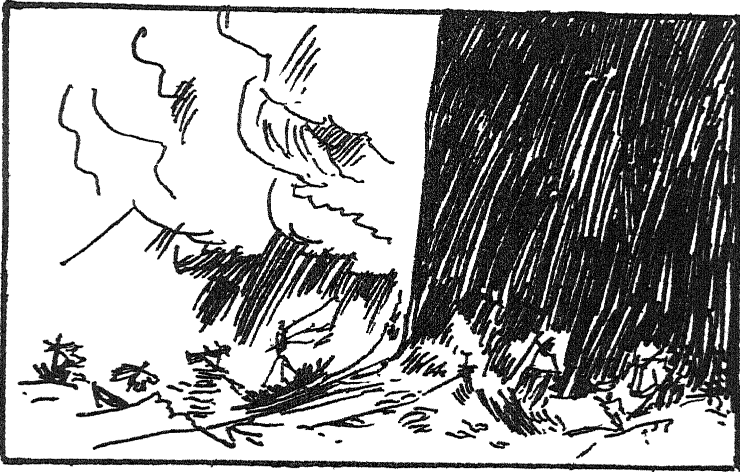
پہلے میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ کہ فارس کے چرواہوں کا ایک نہایت ہی معمولی قبیلہ ایکا ایکی سب کے منہ آنے لگا تھا۔ حتےٰ کہ انہوں نے رفتہ رفتہ مغربی ایشیا کا بہت سا علاقہ فتح کر لیا۔ یہ اہل فارس مہذب لوگ تھے۔ لوٹ مار ان کا شیوہ نہ تھا۔ محکوم قوموں سے صرف سالانہ خراج وصول کرتے تھے۔ ہوتے ہوتے ایشیائے کوچک کے ساحل پر پہنچے۔ لیڈیاؔ کی یونانی نوآبادیات کو کہلا بھیجا۔ کہ شاہ فارس کو اپنا شاہنشاہ مانو۔ اور خراج ادا کرو + اُدھر سے انکار ادھر سے اصرار ہونے لگا۔ آخر کار نوآبادیات کے باشندوں نے یونان والوں سے امداد طلب کی + بگاڑ شروع ہو گیا +

اصل بات تو یہ ہے۔ کہ فارس کے بادشاہ یونان کی شہری سلطنتوں کو سیاسی اعتبار سے بہت خطرناک سمجھتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں ان کی دیکھا دیکھی ہماری محکوم اقوام

ؔ Lydia

جنہیں ہمیشہ ہمارا مطیع و فرمانبردار رہنا چاہئے۔ آزادی کے خواب نہ دیکھنے لگ جائیں +
یونانیوں کا ملک یوں تو محفوظ تھا۔ حملہ آوروں کے رستے میں ایجیین کا گہرا سمندر
حائل تھا۔ لیکن ستم یہ ہؤا کہ ان کے حریف یعنی فینیقی غنیم سے جا ملے۔ ہر طرح کا مشورہ
اور امداد پیش کی۔ اہل فارس سے یہ سمجھوتا کیا۔ کہ فوجیں تم لاؤ جہاز ہم مہیا کر دینگے +
اس طرح ۴۹۲ قبل مسیح میں ایشیا والوں نے یورپ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچل ڈالنے
کا تہیہ کر لیا +

شاہ فارس نے ایک مرتبہ پھر اپنے ایلچی یونانیوں کے پاس بھیجے۔ اور ان سے "مٹی
اور پانی" مانگا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا۔ کہ ہماری اطاعت قبول کر لو + یونانیوں نے
کہا۔ تمہیں مٹی اور پانی چاہئے۔ تو یہ لو حاضر ہے۔ یہ کہہ کر ایلچیوں کو کوئیں میں پھینک
دیا + اس کے بعد صلح کا کوئی امکان باقی نہ رہا +



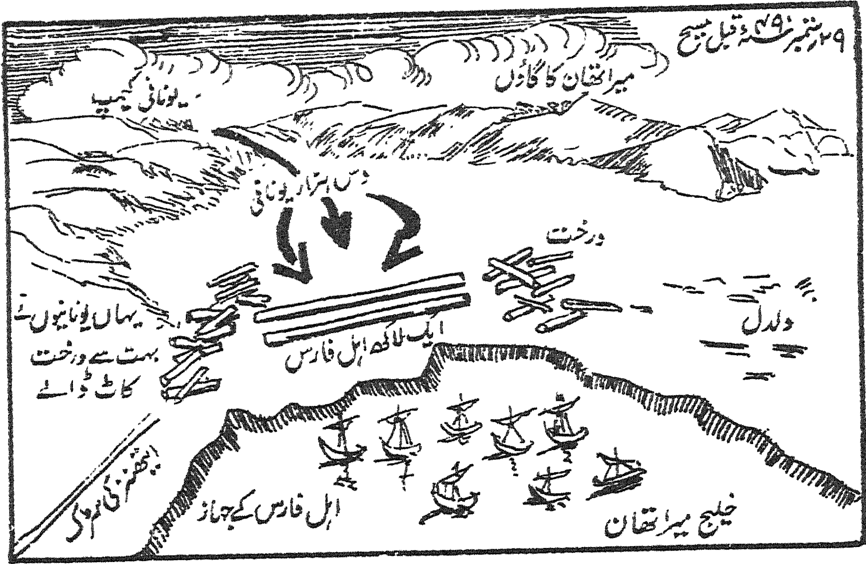
کوہ ایتھوس کے قریب اہل فارس کے جہازوں کی غرقابی

لیکن کوہ اولمپس کی بلندیوں پر سے دیوتا اپنے بچوں کی نگہبانی کر رہے تھے + جب
فینیقیوں کا بیڑہ جس پر فارس کی فوجیں سوار تھیں۔ کوہ ایتھوس[1] کے پاس پہنچا۔ تو آندھی
کے دیوتا نے اس زور زور سے پھونکیں ماریں۔ کہ اس کی ماتھے کی رگیں پھول کر تن
گئیں۔ سب کے سب جہاز طوفان کی لپیٹ میں آ گئے۔ اور فوجیں سب غرق ہو گئیں +

---

[1] Athos

دو سال بعد اہل فارس نے پھر حملہ کیا۔ اس دفعہ بحیرہ ایجیین کو عبور کرکے میراتھان[1] کے گاؤں کے پاس ساحل پر اُتر پڑے۔ میراتھان کے میدان کے اردگرد پہاڑی علاقہ



میراتھان کی لڑائی

تھا۔ جب اہل ایتھنیز نے اہل فارس کی آمد کی خبر سنی۔ تو اس پہاڑی علاقہ کی حفاظت کے لئے فوجیں روانہ کیں۔ ایک بہت ہی تیز دوڑنے والا ایلچی کمک کے لئے سپارٹا[2] بھیجا۔ لیکن سپارٹا والے ایتھنز سے جلتے تھے۔ انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ باری باری سب یونانی شہروں سے مدد مانگی۔ لیکن کسی نے انہیں منہ نہ لگایا۔ صرف پلیٹیا[3] کے چھوٹے سے شہر نے ایک ہزار آدمی بھیج دئے ۔ ۱۲ ستمبر ۴۹۰ء قبل مسیح کو ایتھنز کے سپہ سالار ملٹیاڈیز[4] نے اس تھوڑی سی فوج کے ساتھ ایرانیوں کے لشکر پر دھاوا بول دیا۔ اور دشمن کے تیروں اور بھالوں کی بوچھاڑ کے بیچ میں سے گزر کر ایشیائی افواج کو تہس نہس کر ڈالا۔ ایرانیوں کو ایسے غنیم سے کبھی پالا نہ پڑا تھا ۔

رات کے وقت اہل ایتھنز کی آنکھوں نے یہ نظارہ دیکھا۔ کہ جلتے ہوئے جہازوں کے شعلوں سے آسمان سرخ ہو رہا ہے۔ منتظر تھے۔ کہ دیکھیں میدان جنگ سے کیا

---

[1] Marathon [2] Sparta [3] Plataea [4] Militiades

خبر آتی ہے + آخر کار جو سڑک شمال کو آتی تھی - اس پر گرد و غبار اڑتا دکھائی - فی ڈی پائی ڈیز[1]
بھاگا چلا آرہا تھا - قریب پہنچا - تو ہانپتا کانپتا زمین پر گر پڑا - جان لبوں پر تھی - تھوڑے
ہی دن ہوئے پیغام لے کر سپارٹا گیا تھا - وہاں سے اڑتا ہوا ملیٹا ایڈیٹر کے پاس جا پہنچا
تھا - صبح کے وقت فوج کے پہلو بہ پہلو جنگ میں شریک ہوا تھا - دن ڈھلے فتح کی
خبر اپنے عزیز ہموطنوں تک پہنچانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا - اور دوڑتا دوڑتا
ایتھنز آیا - لوگوں نے اسے گرتے دیکھا - تو سہارا دینے کو لپکے - لیکن اس کا کام پورا
ہو چکا تھا - بمشکل تمام صرف اتنا کہا - کہ "ہم جیت گئے" اور جان دیدی + اس
شاندار موت پر سب لوگوں کے دل رشک سے بھر گئے +

اس شکست کے بعد اہل فارس نے پھر کوشش کی - کہ ہو سکے تو ایتھنز کے قریب
ساحل پر جا اتریں - لیکن وہاں فوجوں کا پہرہ تھا - اس لئے دُم دبا کر بھاگے + ہیلس
کی سرزمین کو پھر امن نصیب ہوا +

اہل فارس آٹھ سال تک دبکے بیٹھے رہے + یونانی غافل نہ تھے - جانتے تھے ایک
نہ ایک دن پھر حملہ ہوگا - لیکن اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے - کہ مدافعت کا بہترین طریقہ کیا
ہے - ایرس ٹائیڈیز[2] اور اس کے ساتھیوں کی رائے تھی - کہ فوج کی تعداد بڑھا دی جائے -
تھیمسٹو کلیز[3] اور اس کے ساتھیوں کی رائے یہ تھی - کہ ایک طاقتور جنگی بیڑے کا ہونا ضروری
ہے + دونوں میں سخت لڑائی ہوئی - اور تیاری کا کام سب دھرا رہ گیا - آخر کار ایرس
ٹائیڈیز کو جلاوطن کیا گیا - اس کے بعد تھیمسٹو کلیز نے من مانی کارروائیاں کیں - جتنے
جہاز بنا سکتا تھا بنائے - اور پائیریئوس[4] کے مقام پر ایک زبردست بحری چھاؤنی
ڈالی +

سنہ ۴۸۰ قبل مسیح میں فارس کا ایک جری لشکر شمالی یونان کے صوبہ تھیسلی[5] میں
نمودار ہوا + مصیبت کی اس گھڑی میں سب یونان کی آنکھیں سپارٹا کی طرف لگی ہوئی
تھیں - وہی سب سے بہادر فوجی سلطنت تھی - اور سب کو اسی سے رہنمائی کی توقع تھی +
بعض سلطنتیں تو حسد کے مارے الگ تھلگ رہیں لیکن جو سلطنتیں متفق و متحد ہو کر

---

[1] Pheidippides　[2] Aristides　[3] Themistocl
[4] Piræus　[5] Thessaly

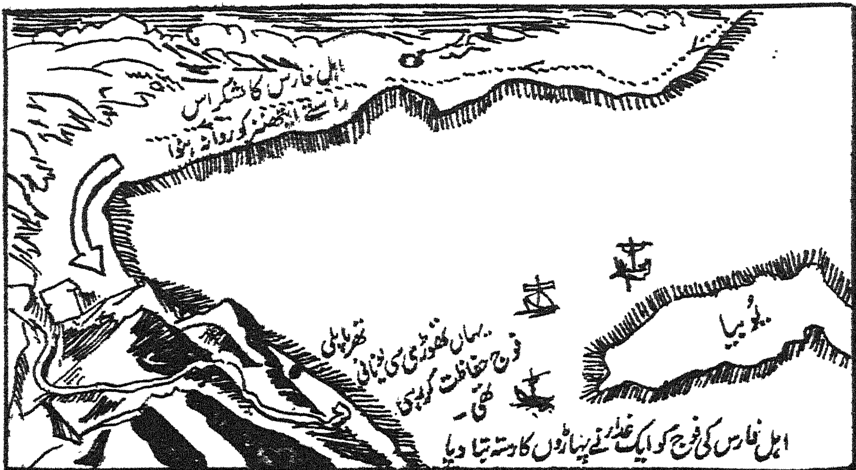
میدان جنگ میں اُتریں ۔ انہوں نے بڑے غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ۔ کہ تھرماپلی کے مقام پر غنیم سے دوچار ہؤا جائے ۔ تھرماپلی ایک پہاڑی علاقہ تھا ۔ جو تھیسلی اور جنوبی علاقوں کے درمیان واقع تھا ۔



تھرماپلی

یونانی فوج میں کل چھ ہزار سپاہی تھے ۔ سپارٹا کا بادشاہ لیونی ڈیس ان کا سپہ سالار مقرر ہؤا ۔ چھ ہزار آدمیوں کی بذات خود تو کچھ حقیقت نہ تھی ۔ مگر یونانیوں کا خیال تھا ۔ کہ زرکسیز کے پہنچنے سے پہلے ہی کمک پہنچ جائیگی ۔ زرکسیز توقع سے پہلے آن پہنچا ۔ اور یونانیوں کی فوج تباہ ہوگئی ۔ بعض یونانی پسپا ہونا چاہتے تھے ۔ لیکن لیونی ڈیس نے کہا ۔ "تمہیں واپس جانا ہو تو چلے جاؤ ۔ میں اور میرے ہموطن اس درے کی حفاظت کے لئے بھیجے گئے ہیں ۔ ہم اس جگہ کو نہیں چھوڑ سکتے ۔

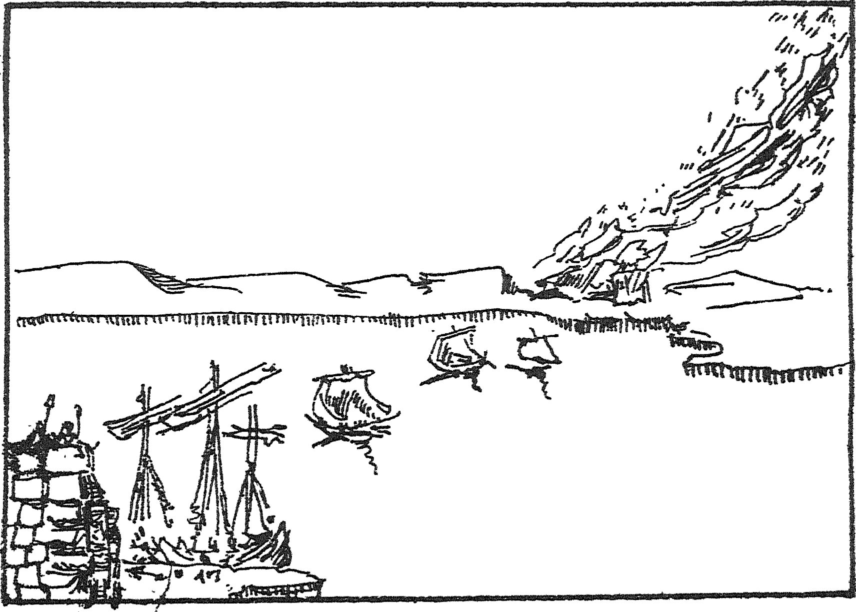
اس کے بعد وہ گھمسان کی لڑائی ہوئی ۔ کہ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگی



تھرماپلی کی لڑائی

Thermopylæ ؎   Leonidas ؎۲

دو دن تک تو کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ دوسرے دن شام کو ایفائلٹیز[1] نامی ایک غدار قوم نے جو مالیس[2] کی پگڈنڈیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اہل فارس کو پہاڑیوں کا رستہ بتا دیا۔ لیونی ڈیس نے چار سو اہل ایتھنز اور سات سو اہل تھیبز کو تو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ باقی سب کو گھر بھیج دیا۔ اور اپنے تین سو ہموطنوں کے ساتھ مرنے



اہل فارس نے ایتھنز کو جلا دیا

کے لئے تیار ہو گیا۔ جانتا تھا کہ موت یقینی ہے۔ اس لئے تنگ درے میں سے بیدریغ باہر نکلا اور غنیم کے لشکر پر جا پڑا۔ جب رات ہوئی۔ تو لیونی ڈیس اور اس کے جوانمرد سپاہی دشمنوں کی لاشوں کے نیچے دبے پڑے تھے۔

اہل فارس نے درہ فتح کر لیا۔ اور یونانی فوج کے بیشتر سپاہیوں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد کوچ کرتے کرتے ایتھنز کی جانب بڑھے۔ ایکروپولس کی چٹانوں پر جو فوج مقیم تھی۔ اسے کھائیوں میں پھینک دیا۔ اور شہر کو جلا دیا۔ لوگوں نے بھاگ کر جزیرہ سیلامس[3] میں پناہ لی۔ اور اپنے ملک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن ۲۰ ستمبر ۴۸۰ سنہ (قبل مسیح) کو تھیمسٹو کلیز نے اہل فارس کے بیڑے کو اس تنگ آبنائے میں جا روکا۔

---

[1] Ephialtes [2] Malis [3] Salamis

جو جزیرہ سلامس اور سرزمین یونان کے درمیان واقع ہے۔ اور چند گھنٹوں ہی میں دشمن کے تین چوتھائی بیڑے کو تباہ کر دیا +

گویا تھرماپلی فتح کرنے پر بھی اہل فارس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ زرکسیز کو چارو ناچار پسپا ہونا پڑا۔ چلتے چلتے اعلان کیا۔ کہ اگلے سال اس جنگ کا قطعی فیصلہ کر دونگا چنانچہ فوجیں لے کر تھیسلی جا بیٹھا۔ اور موسم بہار کا انتظار کرنے لگا +

لیکن اس دفعہ اہل سپارٹا نے بھی خطرے کو اچھی طرح محسوس کیا۔ خاکنائے کورنتھ[1] پر ایک فصیل تعمیر کر رکھی تھی۔ اس فصیل سے باہر نکل آئے۔ پوسینیس[2] اُس کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا۔ اور ایرانی جرنیل مردونی اس[3] کے مقابلے کو روانہ ہوئے۔ یونانیوں کی تعداد کوئی ایک لاکھ کے قریب تھی جن میں تقریباً بارہ مختلف شہروں کے لوگ شامل تھے + پلیٹیا کے قریب اس فوج نے تین لاکھ ایرانیوں پر دھاوا بول دیا + پہلے کی طرح پھر یونانیوں کی پیادہ فوج نے دشمن کے تیروں کی بوچھاڑ میں سے گزر کر ایرانیوں کو شکست دی۔ ایکی بار اہل فارس ایسے بھاگے۔ کہ پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ حُسن اتفاق دیکھو۔ جس دن یونانی فوج نے پلیٹیا کے قریب فتح حاصل کی۔ اسی دن یونانی جہازوں نے ایشیائے کوچک میں راس مائیکالے[4] کے قریب دشمن کے جہازوں کو بھی غرق کر دیا +

ایشیا اور یورپ کی پہلی آویزش کا یوں خاتمہ ہؤا + ایتھنز کی شان و شوکت میں چار چاند لگ گئے۔ سپارٹا والوں نے بھی خوب داد شجاعت دی۔ اگر یہ دو شہر متحد ہو جاتے اور اپنی شکر رنجیوں پر خاک ڈالتے۔ تو یونان سب کا سب متحد ہو کر ایک بہت بڑی طاقت بن جاتا۔ جس کی باگ ڈور ان دونو کے ہاتھ میں ہوتی +

لیکن افسوس کہ انہوں نے اپنی فتحمندی اور اپنے جوش قومی سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اور اس موقع کو یونہی ہاتھ سے گنوا دیا +

ے[1] Corinth　ے[2] Pausanius　ے[3] Mardonius

ے[4] Mycale

ایتھنز اور سپارٹا کی کشمکش

یونان کا رہنما بننے کیلئے ایتھنز اور سپارٹا مدت تک ایک ہلاکت خیز جنگ لڑتے رہے

ایتھنز اور سپارٹا دو تو یونان کے شہر تھے اور دونو کی زبان ایک تھی۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی بات ان میں مشترک نہ تھی + ایتھنز کھلے میدان کے بیچ میں بلندی پر واقع تھا + سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتیں تو مسرور بچے کی طرح مسکراتا ہوا اردگرد کی دنیا پر نظر ڈالتا + سپارٹا ایک گہری وادی کی تہ میں واقع تھا۔ اردگرد پہاڑوں کی فصیل تھی۔ بیرونی خیالات کا دخل مشکل تھا + ایتھنز میں تجارت کی گرم بازاری تھی۔ سپارٹا ایک چھاؤنی تھی۔ جہاں کے لوگوں کو سپاہیانہ زندگی کا بہت شوق تھا + ایتھنز کے باشندوں کا مرغوب مشغلہ یہ تھا۔ کہ دھوپ میں بیٹھے کسی فلسفی کے منہ سے دانائی کی باتیں سن رہے ہیں۔ یا شعر شاعری کا تذکرہ ہو رہا ہے + سپارٹا کے لوگ شعر و سخن سے بالکل کورے لیکن جنگ کے فن سے اچھی طرح واقف تھے۔ تلوار کے دھنی تھے۔ لیکن لطیف جذبات کو جنگی مشاغل کی بھینٹ چڑھا دیا تھا +

سپارٹا کے لوگ ایتھنز والوں کے عروج کو دیکھ دیکھ کر رشک اور حسد کے مارے جلتے تھے + تحفظ وطن کی خاطر جو مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں۔ انہوں نے اہل ایتھنز میں اولوالعزمی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ زمانہ امن میں بھی اسی عالی ہمتی سے فائدہ اٹھایا ایکرو پولس کو از سر نو تعمیر کیا۔ وہاں ایتھینی[1] دیوی کا سنگ مرمر کا مندر بنایا۔ ایتھنز کے جمہوری سردار پیریکلیز[2] نے دور دور سے نامور سنگتراش اور مصور اور سائنسدان بلائے اور شہر کی تزئین اور ایتھنز کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ سپارٹا کی طرف سے بھی غافل نہ رہا۔ اونچی اونچی فصیلیں بنوائیں۔ اور ایتھنز

---

[2] Pericles [1] Athene

کو سمندر سے جا ملایا۔ اور شہر کو اس مضبوطی سے قلعہ بند کیا۔ کہ ملک میں اس کی نظیر نہ ملتی تھی +

ان دو چھوٹے چھوٹے یونانی شہروں میں معمولی سی بات پر رنجش پیدا ہوئی۔ جس نے بڑھتے بڑھتے جنگ کی صورت اختیار کر لی + یہ جنگ تیس سال تک جاری رہی اور آخر میں ایتھنز کو بُری طرح زک اٹھانی پڑی +

لڑائی کے تیسرے سال شہر میں وبا پھیل گئی۔ شہر کا اولوالعزم سردار پیریکلیز اور نصف سے زیادہ آبادی وبا کا شکار ہو گئی۔ اس کے بعد نالائق اور بے شعور سرداروں اور رہنماؤں نے اور بھی گل کھلائے + ایک ذہین نوجوان ایلسی بائیڈیز[ا] نامی کو شہر میں بہت ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ سرائیکوز[۲] پر حملہ کیا جائے۔ جو صقلیہ میں سپارٹا والوں کی نو آبادی تھی + شومئے قسمت سے بازار میں کسی سے جھگڑا ہو گیا۔ اور ایلسی بائیڈیز کو شہر سے بھاگتے ہی بنی۔ اس کا جانشین اناڑی نکلا پہلے توسب جہازوں کا اور پھر ساری فوج کا خاتمہ کروالیا + جو تھوڑے بہت لوگ زندہ بچ گئے۔ انہیں دشمنوں نے سرائیکوز کی پتھر کی کانوں میں پھینک دیا۔ جہاں وہ بھوک اور پیاس کے مارے مر گئے +

اس مہم میں ایتھنز کے تمام نوجوان کام آئے۔ اب ایتھنز کا آخری وقت سر پر آن پہنچا۔ طویل محاصرے کے بعد اپریل ۴۰۴ء قبل مسیح میں شہر والوں نے ہتھیار ڈال دئے۔ بلند فصیلیں مسمار کر دی گئیں۔ بحری فوج کو اہل سپارٹا نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ ایتھنز نے اپنی خوشحالی کے زمانے میں جو وسیع مملکت فتح کی تھی اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ لیکن تحصیل علم اور تحقیق کا جذبہ جو عظمت و عروج کے زمانے میں ایتھنز کا طغرائے امتیاز تھا۔ وہ فنا نہ ہونے پایا۔ بلکہ اس نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی +

سرزمین یونان کی باگ ڈور ایتھنز کے ہاتھ سے نکل گئی۔ لیکن ایتھنز کے علم و فضل سے دور دور تک اُجالا ہو گیا۔ دنیا میں جہاں بھی کوئی علم کا پیاسا تھا۔ اُس نے اسے چشمے سے اپنی پیاس بجھائی۔ دنیا کی سب سے پہلی بڑی یونیورسٹی یہیں قائم ہوئی +

[ا] Alcibiades [۲] Syracuse

سکندرِ اعظم

مقدونیہ کے سکندر اعظم نے کس طرح تمام دنیا پر یونانی حکومت کا سکہ جمایا۔ اور اس کے بلند ارادوں کا کیا انجام ہُوا

جب اہلِ ایکین، دریائے ڈینیوب کے کناروں کو خیرباد کہہ کر نئی چراگاہوں کی تلاش میں وطن سے نکلے۔ تو پہلے کچھ عرصہ مقدونیہ کے پہاڑوں میں زندگی بسر کی + اس دن سے یونانیوں نے اس شمالی ملک کے باشندوں کے ساتھ کم و بیش رسمی تعلقات ہمیشہ قائم رکھے۔ اہلِ مقدونیہ بھی یونان کے حالات میں برابر دلچسپی لیتے رہے +

اتفاق کی بات دیکھو۔ جب سپارٹا اور ایتھنز کی جنگ ختم ہوئی۔ مقدونیہ پر ایک بہت ہی دانشمند بادشاہ فلپ[1] نامی حکمران تھا۔ فلپ یونانیوں کے علم و فن کا بڑا مداح تھا۔ لیکن سیاسی معاملات میں ان کی بے راہروی کی بہت مذمت کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر بہت کڑھتا تھا۔ کہ ایک اچھی خاصی مہذب قوم کے لوگ فضول جھگڑوں میں خواہ مخواہ روپیہ اور فوجیں ضائع کر رہے ہیں + اس کا علاج اس نے یہ سوچا۔ کہ خود تمام یونان کا بادشاہ بن بیٹھا۔ نئی رعایا کو اپنے ساتھ ملایا۔ اور ایران کے سفر کی تیاری کی۔ تاکہ ڈیڑھ سو سال پہلے زرکسیز نے یونان پر جو حملہ کیا تھا۔ اس کا بدلہ لے +

ابھی روانہ بھی ہونے نہ پایا تھا۔ کہ مارا گیا۔ تباہی ایتھنز کا انتقام لینے کے لئے اپنے بیٹے سکندر کو پیچھے چھوڑ گیا۔ جو یونان کے سب سے بڑے عالم ارسطو[2] کا شاگرد تھا + سکندر نے ۳۳۴ء قبل مسیح میں یورپ کو خیرباد کہا۔ اور سات سال کے بعد ہندوستان جا پہنچا + اس سات سال کے عرصے میں یونانیوں کے پرانے تجارتی

Aristotle [2]　　Philip [1]

حریف فینیقیہ کو تباہ کر ڈالا۔ مصر کو فتح کیا۔ جہاں کے لوگ اسے فراعنہ کا جانشین سمجھ کر اس کی پرستش کرنے لگے۔ فارس کے آخری بادشاہ کو شکست دی۔ مملکت ایران کا تختہ الٹ دیا۔ بابل کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ اور فوجوں کو ساتھ لئے کوہستان ہمالیہ کے وسط میں جا پہنچا۔ غرضیکہ اس تھوڑے سے عرصے میں تمام دنیا کو فتح کر کے مقدونیہ کے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ پھر ذرا دم لیا۔ اور پھر اس سے بھی بڑے بڑے منصوبے باندھنے لگا۔

اس کی آرزو یہ تھی۔ کہ یونانی علم و فن کے نور سے دنیا کا کونہ کونہ روشن ہو جائے سب رعایا یونانی زبان اختیار کرنے اور سب مغلوب اقوام یونانی طرز کے شہروں میں رہنا سیکھ جائیں۔ چنانچہ سکندر کے سپاہیوں نے شمشیر زنی چھوڑ کر دنیا کو تمدن کا سبق پڑھانا شروع کیا۔ جہاں چھاؤنیاں ڈالی تھیں۔ وہاں یونانی تہذیب کے مرکز قائم کئے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یونانی تہذیب یونانی تمدن اور یونانی رسوم کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا۔ سکندر کے ارادے خدا جانے اور کتنے بار آور ہوتے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ ایک دن بخار ہو گیا۔ اور ۳۲۳ قبل مسیح میں شاہنشاہ حمورابی کے پرانے محل میں فرشتہ اجل کو لبیک کہا۔

سکندر کی وفات کے بعد اقوامِ عالم یونانیوں کا پڑھایا ہوا سبق رفتہ رفتہ بھول گئیں تاہم یونانی تہذیب کا اثر زائل نہ ہوا۔ حق تو یہ ہے کہ سکندر نے باوجود اپنی طفلانہ خواہشات اور نخوت کے بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دی۔ اس کی موت کے بعد اس کی سلطنت تو تھوڑے ہی دنوں میں فنا ہو گئی۔ اس کے لالچی سپہ سالاروں نے حصے بخرے کر کے اُسے آپس میں بانٹ لیا لیکن ایشیائی اور یونانی تہذیبوں کی ایک متحدہ دنیا کا جو تصور سکندر نے قائم کیا تھا۔ وہ ان کے دل سے کبھی محو نہ ہوا۔

یہ سب سپہ سالار کچھ عرصے تک تو خود مختار رہے۔ لیکن آخر کار اہل روما نے مغربی ایشیا اور مصر کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ یونانی سلطنت کے ساتھ ہی ہیلینی تہذیب بھی (جو یونانی تہذیب۔ مصری تہذیب اور بابلی تہذیب سے مرکب تھی) اہل روما کے حصے میں آئی۔ جسے رومن دنیا پر اتنا غلبہ حاصل ہوا۔ کہ آج کل ہماری زندگی پر بھی اُسی کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔

خلاصہ

اب تک تم جو کچھ پڑھ چکے ہو۔ اُس کا خلاصہ

اب تک تو تم مشرقی ممالک کا تماشہ دیکھتے رہے۔ اب میں تمہیں مغرب کی سیر کراتا ہوں۔ کیونکہ مصر اور عراق کی تاریخ میں آگے اب کوئی دلچسپی کی بات نہیں +

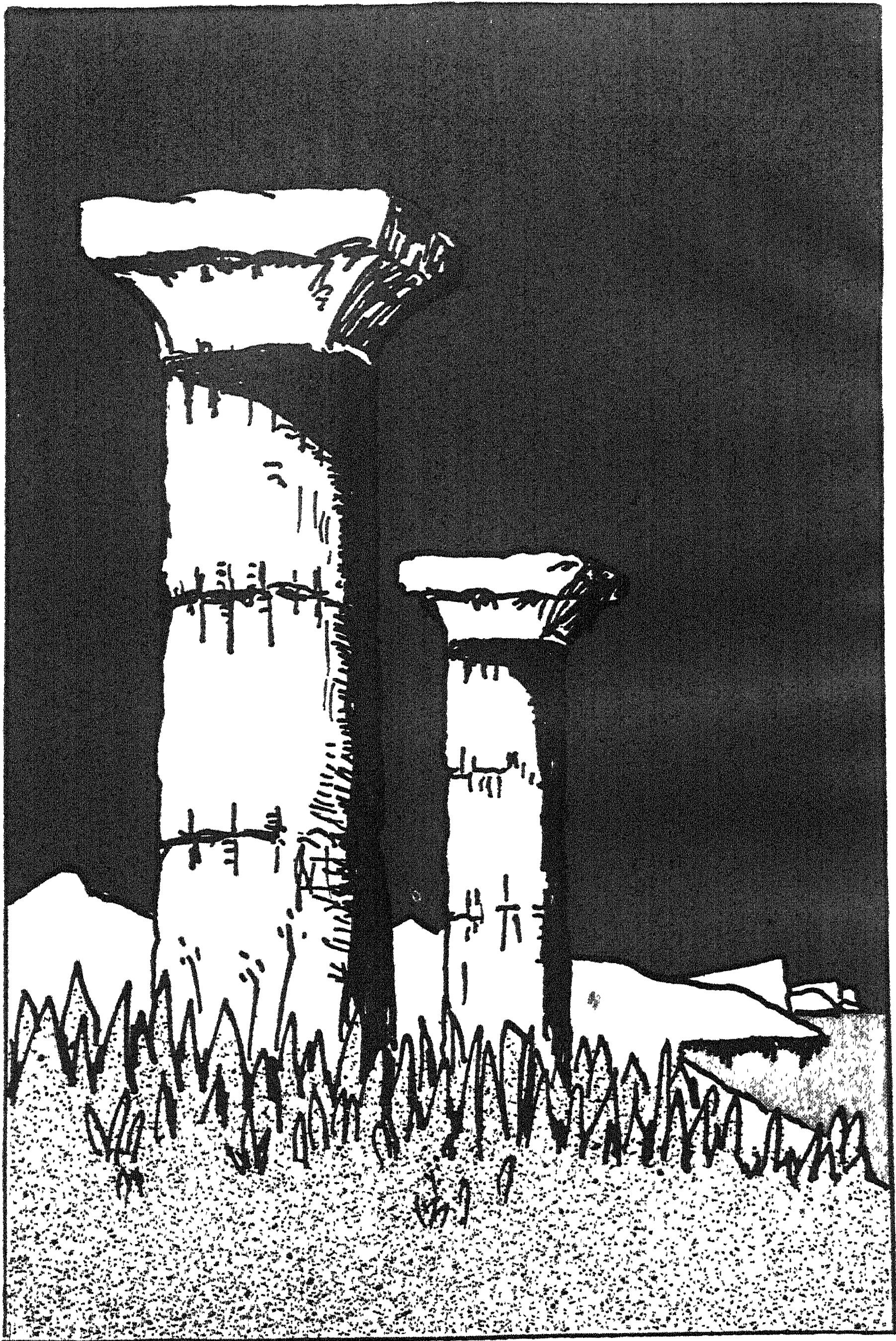
لیکن جو کچھ ہم نے اب تک دیکھا ہے۔ پہلے ذرا اُسے اچھی طرح سمجھ لیں +

سب سے پہلے میں نے تمہیں زمانہ تاریخ سے پہلے کا انسان دکھایا۔ اس کی عادات بہت سادہ اور اس کے اطوار بہت غیر شائستہ تھے۔ دنیا بھر کے جنگلوں میں جتنے جانور گھومتے پھرتے تھے۔ انسان ان سب سے کمزور تھا۔ لیکن چونکہ دماغ سب سے بڑا اور سب سے اعلےٰ پایا تھا۔ اس لئے کسی سے نہ دبا +

پھر گلیشروں کا زمانہ آیا۔ کئی سو سال تک سردی پڑتی رہی۔ اور کرہ زمین پر رہنا اتنا دشوار ہوگیا۔ کہ انسان کو دماغ کرید کرید کر جان بچانے کے لئے تدبیریں نکالنی پڑیں۔ لیکن چونکہ زندہ رہنے کی خواہش بہت زبردست ہوتی ہے۔ اور آخری دم تک کام کرتی رہتی ہے۔ اس لئے انسان نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ اس شدید سردی کے طویل زمانے میں کئی خونخوار جانوروں کا نام ونشان تک صفحہ زمین سے مٹ گیا۔ لیکن انسان نے اپنے اوپر آنچ نہ آنے دی۔ بلکہ سردی کا زمانہ ختم ہوتے تک کئی ایسی باتیں سیکھ لیں۔ جن کی بدولت باقی جانوروں پر فوقیت حاصل کرلی +

شروع میں پچاس لاکھ سال تک تو انسان کو ہر وقت فنا کا خدشہ لگا رہتا تھا۔ لیکن بعد میں اپنے عقل وفہم کی طفیل اس خطرے سے بہت بڑی حد تک محفوظ ہوگیا +

ہمارے قدیم ترین آباؤ اجداد ترقی کی شاہراہ پر ہلکے ہلکے چلے جارہے تھے کہ وادیٔ نیل کے باشندوں نے ایک زقند بھری اور دیکھتے ہی دیکھتے سب سے آگے نکل گئے۔ تہذیب کا سب سے پہلا مرکز مصر میں قائم ہوا +



یونان

پھر ہم نے تمہیں سرزمین عراق کی سیر کرائی۔ جو بنی نوع انسان کی دوسری تعلیم گاہ تھی۔ پھر بحیرۂ ایجیئن میں ٹاپوؤں کے جھرمٹ سے بنے ہوئے تھے۔ ہم نے ان کا نقشہ کھینچ کر بتایا۔ کہ قدیم مشرق کا علم وفن کس طرح مغرب کے نئے ممالک میں جا پہنچا۔ جہاں یونانیوں کی قوم آباد تھی + پھر ہم نے تمہیں انڈو یورپین نسل کے ہیلینی قبیلے کے لوگوں کا حال سنایا۔ جو کئی ہزار سال پیشتر وسط ایشیا سے نکل کر گیارھویں صدی قبل مسیح میں یونان کے سنگلاخ جزیرہ نما میں آ پہنچے تھے۔ اور جن کا نام اس دن سے یونانی پڑ گیا تھا + پھر ہم نے تمہیں ان چھوٹے چھوٹے یونانی شہروں کا حال بتایا۔ جن میں سے ہر ایک بذات خود ایک سلطنت تھا۔ اور جہاں قدیم مصر اور ایشیا کی تہذیبوں نے اپنی ہیئت کچھ اس طرح بدلی۔ اور ان کا رنگ روپ کچھ ایسا نکھرا۔ کہ دنیا کی آنکھ نے ایسا حسن وجمال پہلے کبھی نہ دیکھا تھا +

تم اگر نقشے کو دیکھو۔ اور جو کچھ تم نے پڑھا ہے۔ اسے پیش نظر رکھو۔ تو تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ اس تمام عرصے میں تہذیب ایک نصف دائرے کے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہی ہے۔ مصر سے روانہ ہوئی اور عراق اور بحیرۂ ایجیئن کا چکر کاٹتی ہوئی مغرب کی سمت میں براعظم یورپ تک جا پہنچی + پہلے چار ہزار سال کے عرصے میں تہذیب کی مشعل مصریوں۔ پھر بابلیوں پھر فینیقیوں اور پھر بے شمار سامی قبیلوں کے ہاتھ میں رہی۔ سامیوں نے انڈو یورپین یونانیوں کو اور یونانیوں نے ایک اور انڈو یورپین قبیلے یعنی رومنوں کو تہذیب کا سبق سکھایا + لیکن اس دوران میں سامی لوگ مغرب کی طرف افریقہ کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ بڑھتے چلے گئے۔ اور جب اہل یونان یا انڈو یورپین لوگ بحیرہ روم کے مشرقی نصف حصے پر مسلط ہو گئے۔ تو سامیوں کا پرچم مغربی نصف حصے پر لہرانے لگا +

تم آگے چل کر پڑھو گے۔ کہ اس کے بعد ان دو حریف قوموں کے درمیان ایک زبردست کشمکش شروع ہوئی جس میں کامیابی کا سہرا رومنوں کے سر رہا۔ اہل روما ایک وسیع سلطنت پر حکومت کرنے لگے۔ جس کی بدولت

یہ مصری عراقی یونانی تہذیب براعظم یورپ کے دور دراز کونوں تک پہنچ گئی +
موجودہ انگریزی معاشرت کی بنیاد بہی قدیم تہذیب ہے +
یہ بات تمہیں پیچیدہ تو ضرور معلوم ہوگی - لیکن اگر تم ان موٹے موٹے اصولوں
کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو - تو باقی تاریخ کا سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا +
جس بات کو لفظ بیان نہ کر سکیں - وہ نقشوں سے واضح ہو جائیگی + اس قطع
کلام کے بعد اب ہم پھر آگے چلتے ہیں - اور تمہیں کارتھیج[لہ] اور روما کی مشہور جنگ
کا حال سناتے ہیں +

لہ Carthage.

روما اور کارتھیج

افریقہ کے شمالی ساحل پر کارتھیج کی سامی نوآبادی اور اطالیہ کے مغربی ساحل پر روما کا انڈویورپین شہر واقع تھا۔مغربی بحیرۂ روم پر دونوں میں جنگ ہوئی۔ اور کارتھیج تباہ و برباد ہو گیا۔

"کارت ہدشت"[۱] (یا کارتھیج[۲]) فنیقیوں کی ایک چھوٹی سی تجارتی نوآبادی کا نام تھا۔جو افریقہ کے ساحل پر واقع تھی۔سامنے نوے میل چوڑا سمندر تھا۔سمندر پار یورپ کا براعظم۔تجارت کے لئے یہ مقام بہت ہی موزوں تھا۔اس قدر موزوں کہ فنیقیوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔کارتھیج والوں کے ہاں تھوڑے ہی عرصے میں ہن برسنے لگا۔یہاں تک کہ جب چھٹی صدی قبل مسیح میں بخت نصر شاہِ بابل نے ٹائر کو برباد کر ڈالا۔تو اہل کارتھیج نے فنیقیوں کو دھتا بتا دی اور خود مختار بن بیٹھے۔ سا ر اقوام کا سب سے مغربی شہر یہی تھا۔

جو طریقے ایک ہزار سال سے فنیقیوں میں رائج تھے۔ان کا رنگ کارتھیج پر بھی چڑھا ہوا تھا۔خود مختار تو ہو گیا۔لیکن رنگ ڈھنگ فنیقیوں کے سے رہے۔ شہر کیا تھا۔تجارت کی ایک بہت بڑی منڈی تھی۔حفاظت کے لئے ساحل کے ساتھ ساتھ ایک جنگی بیڑا لنگر ڈالے کھڑا تھا۔لوگ زندگی کی لطافتوں سے ناآشنا تھے۔شہر پر۔ اردگرد کے علاقے اور دور دراز کی نوآبادیات پر دولتمند لوگوں کا ایک چھوٹا سا مگر طاقتور گروہ حکمران تھا۔کل اختیارات دس بارہ لوگوں کے ہاتھ میں تھے۔جو بڑے بڑے جہازوں اور بڑی بڑی کانوں کے مالک تھے۔ان سوداگر

---

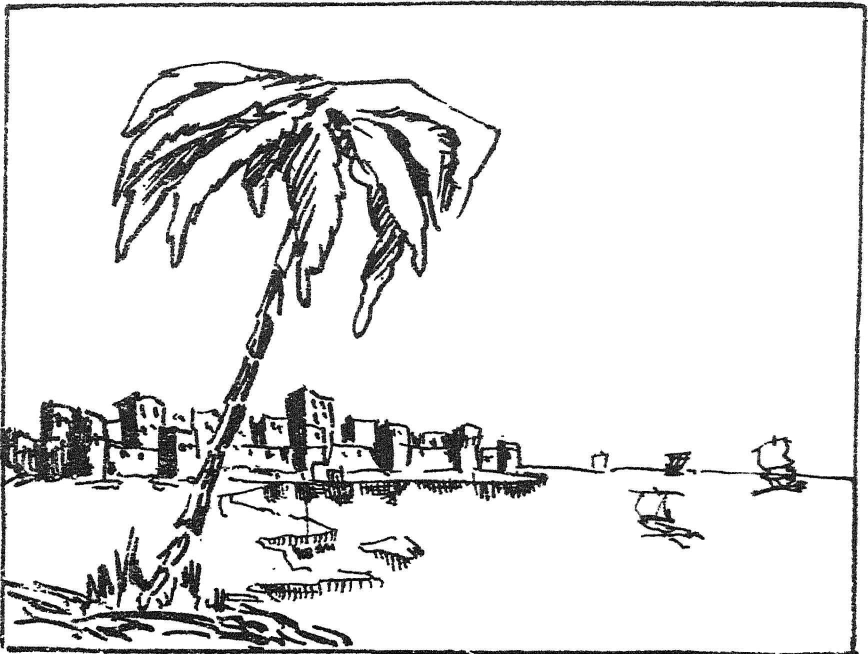
[۱] Kart hadsht

[۲]

پیشہ حاکموں کے نزدیک حکومت بھی ایک تجارت تھی۔ جلب منفعت ہی کو کامیابی کا معیار سمجھتے تھے۔ اس لئے وطن کو محض کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے + لیکن بڑے معاملہ فہم اور مستعد لوگ تھے۔ اور محنت سے جی نہ چُراتے تھے +

کارتھیج رفتہ رفتہ زور پکڑتا گیا۔ یہاں تک کہ ساحل افریقہ کے بیشتر حصے بلکہ فرانس کے بعض علاقوں پر بھی تسلط جمالیا۔ اور ان ممالک سے محصول اور خراج وصول کرنے لگا۔ جو روپیہ تجارت کے ذریعے ان علاقوں سے کھینچ لیتا تھا۔ وہ جُدا تھا +

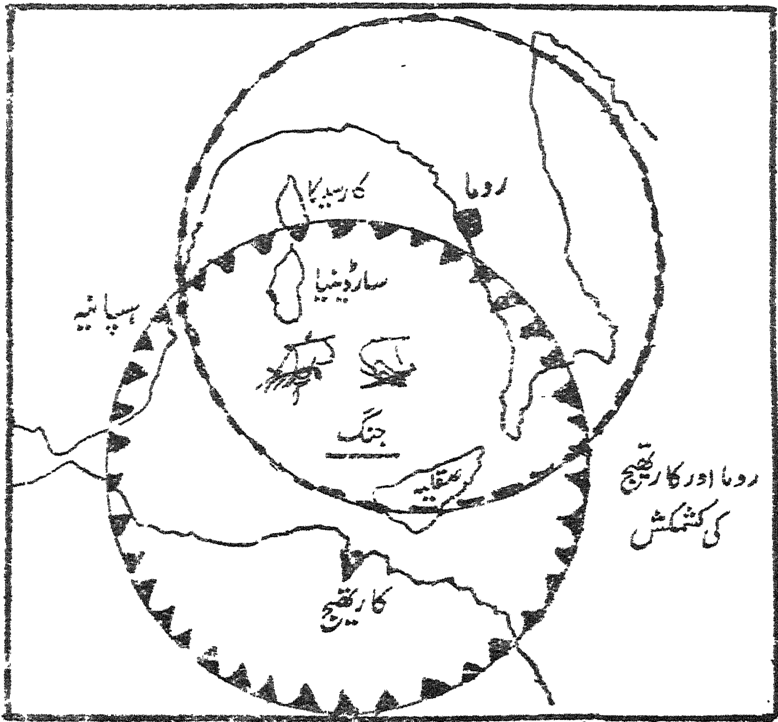
امرا کی حکومت کو عوام کی طرف سے ہمیشہ خدشہ رہتا۔ جب تک کام کی کثرت ہو۔ اور مزدوری زیادہ ملے۔ لوگ خوش رہتے ہیں۔ اور امرا کی حکومت سے کچھ تعرّض نہیں کرتے۔ لیکن اگر کبھی جہازوں کا جانا آنا بند ہو جائے۔ دھاتوں کی درآمد نہ رہے۔ بھٹیوں اور جہازوں پر کام کرنے والے بیکار ہو جائیں۔ تو ظاہر ہے۔ کہ لوگوں میں بے اطمینانی پیدا ہوگی۔ اور وہ اس بات کا مطالبہ کرینگے۔ کہ جس طرح خوداختیاری جمہوری حکومت کے زمانے میں شہر پر لوگوں کی منتخب کردہ ایک کونسل حکمران تھی۔



کارتھیج

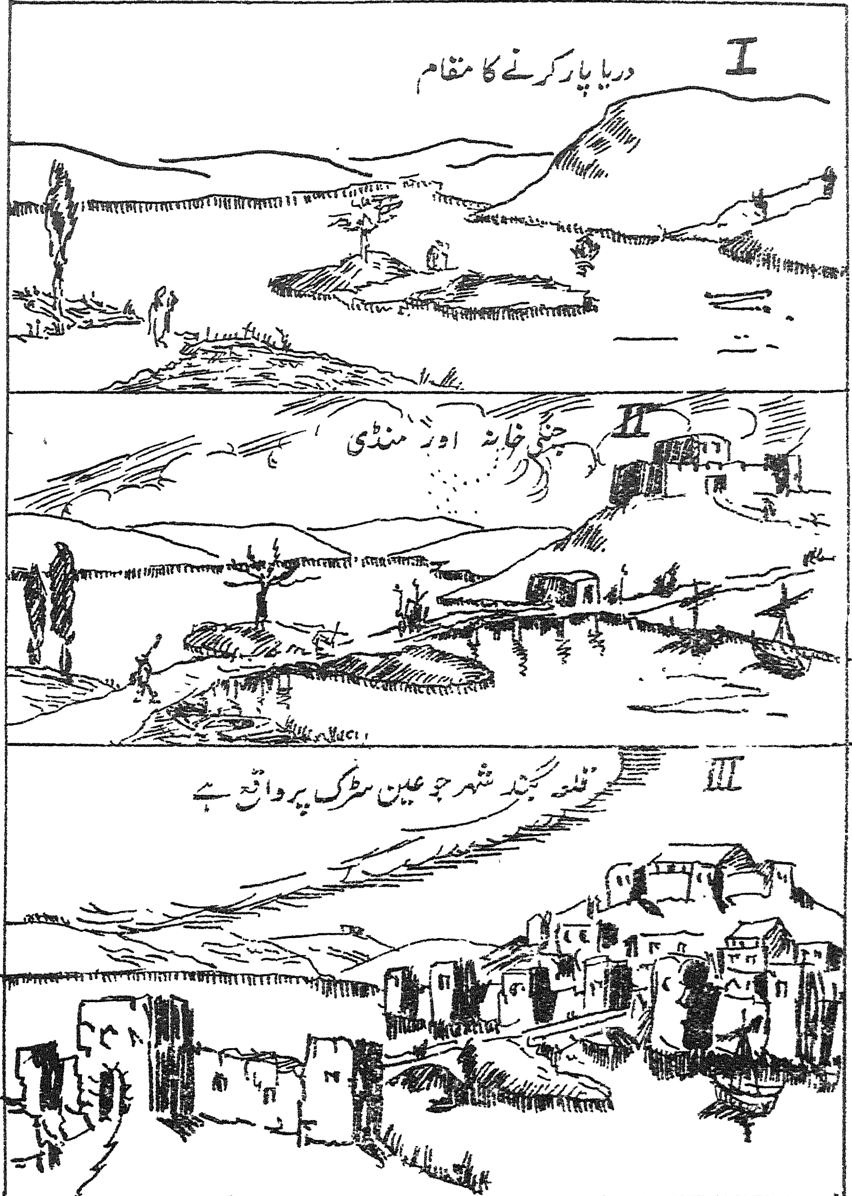
ویسے ہی اب بھی ہونی چاہئے +

اس ڈر کے مارے امراء ات دن اسی کوشش میں لگے رہتے کہ تجارت کا بازار ٹھنڈا نہ ہونے پائے۔ پانسو سال تک دھڑلے سے حکومت کرتے رہے۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسی باتیں سننے میں آئیں۔ کہ پریشان ہوگئے۔ کہا جاتا تھا۔ کہ اطالیہ میں دریائے ٹائبرلہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔ جس کا نام رومایہ ہے۔ وہاں کے لوگ اتنے طاقتور ہوگئے ہیں۔ کہ وسط اطالیہ کے تمام لاطینی قبیلے انہیں اپنا سردار ماننے لگے ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا۔ کہ یہ لوگ اب جہاز بنا رہے ہیں۔ اور جہاز بنا کر فرانس کے جنوبی ساحل اور جزیرہ صقلیہ کی تجارت بھی اپنے ہاتھ میں لیا چاہتے ہیں +



حلقہ ہائے اقتدار

Sicily ٭صقلیہ   Rome. ٭رومایہ   Tiber. ٭ٹائبر



روما کا شہر کیونکر بنا

اہلِ کارتھیج کو بھلا یہ کب گوارا تھا۔ کہ ایسا حریف ان کے مقابلے میں سر اٹھائے + اب تک مغربی بحیرہ روم میں کوئی انہیں آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا لیکن اب انہیں فکر پڑ گئی۔ حریف کی سرکوبی کی تدبیریں سوچنے لگے + لیکن سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہا۔ کہ اصل بات کیا ہے +

مہذب قوموں نے عرصہ دراز سے اطالیہ کے مغربی ساحل کا رخ نہ کیا تھا + یونان میں جتنی اچھی بندرگاہیں تھیں۔ سب مشرقی ساحل پر واقع تھیں۔ اور ان کے بالمقابل جزائر ایجئین کے جھرمٹ تھے۔ برخلاف اس کے اطالیہ کے مغربی ساحل کے سامنے بحیرہ روم کی ہولناک موجوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لوگ بھی یہاں کے غریب تھے۔ اس لئے غیر ممالک کے تاجروں نے کبھی یہاں آنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ یہاں کے باشندے اپنی پہاڑیوں اور دلدلی میدانوں پر قابض رہے۔ اور کسی نے ان کو نہ چھیڑا +

اس علاقے پر سب سے پہلا حملہ شمال کی سمت سے ہوا۔ گو یہ معلوم نہیں کہ کس سنہ میں ہوا + حملہ آور بعض انڈو یورپین قبیلوں کے لوگ تھے۔ کوہ الپس[۵۱] کے دروں میں سے رستہ ڈھونڈ نکالا۔ اور جنوب کی طرف بڑھتے چلے آئے۔ حتےٰ کہ وہ دو علاقے جنہیں اطالیہ کا پنجہ اور ایڑی کہنا چاہئے۔ (اطالیہ کی شکل بالکل بوٹ کی سی ہے) ان لوگوں سے بھر گئے + ان حملہ آوروں کے حالات ہمیں بالکل معلوم نہیں۔ کیونکہ ان کے ہاں کوئی شاعر ایسا پیدا نہ ہوا۔ جو ہومر[۵۲] کی طرح ان کے قصیدے لکھتا + ابتدائے روما کے حالات ان کی تحریروں میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ مگر وہ قابلِ اعتماد نہیں۔ کیونکہ اوّل تو تعمیر روما کے آٹھ سو سال بعد یعنی اس وقت لکھے گئے تھے۔ جب روما کا چھوٹا سا شہر ترقی کرتے کرتے ایک وسیع مملکت کا دار الخلافہ بن چکا تھا۔ دوسرے وہ تاریخی نقطہ نظر سے کسی مصرف کے نہیں۔ انہیں پڑھو۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے الف لیلہ کی کوئی داستان پڑھ رہے ہیں۔ ہیں تو بہت

Homer. ۵۲ Alps. ۵۱

دلچسپ لیکن اصل واقعات سے انہیں کچھ نسبت نہیں۔ اصل واقعات اتنے دلفریب نہیں + روما کا شہر یوں کر بنا۔ اس کا مختصر بیان یہ ہے۔ کہ چونکہ اس کا محل وقوع نہایت موزوں تھا۔ اس لئے کسی زمانے میں کئی اور مقامات کی طرح یہاں بھی گھوڑوں کی تجارت ہونے لگی۔ اور یہ چھوٹا سا گاؤں تباد لے کی منڈی بن گیا۔ اس کی ترقی کا راز یہ تھا۔ کہ وسط اطالیہ کے میدانوں کے عین بیچوں بیچ واقع تھا۔ دریا یہاں پایاب تھا۔ اسے عبور کرنا کسی موسم میں بھی مشکل نہ تھا۔ اس لئے جو سڑک شمال سے جنوب کو آتی تھی۔ وہ یہیں سے ہو کر گزرتی تھی۔ اور پھر دریا کے کنارے سات چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ جو دشمنوں کے مقابلے میں قلعوں کا کام دیتی تھیں۔ خواہ وہ دشمن پہاڑوں کے رہنے والے ہوں۔ خواہ سمندر پار کے باشندے + کوہستانی علاقے کے باشندے سیبائن[1] کہلاتے تھے۔ یہ بڑے اکھڑ لوگ تھے لوٹ مار ان کا شیوہ تھا۔ اور معاشرت ان کی بہت پست تھی۔ پتھر کے کلہاڑوں اور لکڑی کی ڈھالوں سے لڑتے تھے۔ اہل روما کی فولادی تلواروں کے سامنے ان کی بھلا کیا پیش چلتی؟ باقی رہے سمندر پار کے لوگ۔ وہ البتہ خطرناک تھے۔ ان کا نام ایٹرسکن[2] تھا۔ ان کے ٹھیک ٹھیک حالات نہ اس وقت کسی کو معلوم تھے۔ نہ اب کسی کو معلوم ہیں + کوئی نہ جانتا تھا (نہ اب جانتا ہے) کہ یہ لوگ کون تھے؟ کہاں سے آئے۔ اور کیوں آئے تھے؟ ان کے شہروں اور قبرستانوں اور تالابوں کے کھنڈر تمام اطالوی ساحل کے ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہم ان کے کتبوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن چونکہ آج تک کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہؤا۔ جو ان کی تحریرات کو پڑھنا جانتا ہو۔ اس لئے ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے +

معلوم یہ ہوتا ہے۔ کہ ایٹرسکن لوگوں کا اصلی وطن ایشیائے کوچک میں تھا۔ وہاں یا تو کوئی بڑی جنگ ہوئی۔ یا کوئی وبا آئی اور انہیں ہجرت کرتے ہی بنی + یہ قیاس ٹھیک ہو یا غلط۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اس قوم کو تاریخی اعتبار سے

---

[1] Sabines

[2] Etruscan.

بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کے ذریعے سے قدیم تہذیب مشرق سے مغرب میں پہنچی۔ رومن قوم نو شمال سے آئی تھی۔ انہوں نے مکانات اور بازاروں کا تعمیر کرنا۔ علم نجوم۔ طبابت اور کھانے پکانے کا ہنر اور فنون لطیفہ ان سے نہیں تو پھر آخر کس سے سیکھے؟

جس طرح یونانی اہل ایجئین سے تہذیب سیکھ کر انہی کی چھاتی پر چڑھ بیٹھے تھے۔ اسی طرح کچھ عرصے بعد رومن لوگ بھی ایٹرسکن قوم کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئے۔ اور جب ذرا موقع دکھائی دیا۔ انہیں جھٹ بیدخل کر دیا + اسی زمانے میں یونانی تاجروں کو اطالیہ میں تجارت کے امکانات نظر آئے۔ جہازوں کے لنگر اٹھائے۔ اور روما آن پہنچے آئے تو تجارت کی غرض سے تھے۔ لیکن یہاں پہنچ کر اپنی تہذیب کا پرچار شروع کر دیا ادھر روما کے مضافات میں جو قبیلے (یعنی لاطینی[۱] لوگ) آباد تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یونانیوں کو کئی ہنر ایسے بھی آتے ہیں۔ جو عملی زندگی میں بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں تو شاگردوں کی صف میں آن بیٹھے + دیکھا کہ فنِ تحریر بہت مفید چیز ہے۔ اسے جھٹ یونانیوں سے سیکھ لیا۔ انہی کی دیکھا دیکھی لین دین میں سہولت پیدا کرنے کے لئے اپنے سکوں کو اور ناپ تول کے لئے اوزان اور پیمانوں کو باقاعدہ منظم کیا۔ اور رفتہ رفتہ تمام یونانی تہذیب کو بالکل ہی اپنا بنا لیا +

یہاں تک کہ اہل یونان کے دیوتاؤں کو بھی خوش آمدید کہا۔ پہلے تو زیوس[۲] نے روما میں قدم رکھا۔ جہاں وہ جوپیٹر[۳] کے نام سے مشہور ہؤا۔ اس کے بعد اور دیوتاؤں کی باری آئی + یونان میں تو ان دیوتاؤں کا یہ تصور تھا۔ کہ بے تکلف بھائیوں کی طرح اپنے بندوں کے ساتھ شریکِ رزم و بزم ہیں۔ لیکن روما پہنچ کر ان کی حیثیت افسروں کی سی ہو گئی + ہر ایک کا اپنا جُدا ایک محکمہ تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی خدائی کا کام بڑی دانائی اور انصاف پسندی مگر بڑے رعب اور دبدبے سے کرتا تھا۔ کسی پجاری کی مجال نہ تھی۔ کہ پرستش میں کوتاہی کرے۔ پجاری بیچاروں نے بھی فرمانبرداری اور اطاعت میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ لیکن قدیم ہیلینوں کے زمانے میں کوہ اولمپس

---

[۳] Jupiter [۲] Zeus [۱] Latin

کے ساکنوں اور زمین کے رہنے والوں کے درمیان مشفق دوستوں اور عزیز بھائیوں کے سے جو خوشگوار تعلقات تھے۔ وہ روما میں آن کر بالکل ہی بدل گئے۔

رومنوں نے طریق حکومت میں یونانیوں کی نقل تو نہ کی۔ لیکن چونکہ یہ لوگ بھی اہل ہیلیس کی طرح انڈو یورپین نسل سے تھے۔ اس لئے روما کو بھی شروع شروع میں انہی مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ جو ایتھنز اور دوسرے یونانی شہروں کو پیش آچکے تھے۔ جو لوگ شروع شروع میں قبیلوں کے سردار تھے۔ ان کے جانشین بعد میں بادشاہ بن بیٹھے۔ اہل روما نے پہلے تو ان کو برطرف کیا۔ جب اُن کو نیچا دکھایا۔ تو اُمرا نے سر اٹھایا۔ ان پر قابو پاتے پاتے صدیاں گزر گئیں۔ تب کہیں جاکر روما کو ایسی حکومت نصیب ہوئی جس میں ہر آزاد باشندے کو انتظامی معاملات میں دلچسپی لینے کا موقع حاصل ہوا۔

لیکن ایک بات میں یونانیوں سے بڑھ کر تھے۔ نظم و نسق کا کام بغیر لمبی چوڑی تقریروں کے سرانجام دیتے تھے۔ یونانیوں کی طرح فلسفیانہ مزاج کے لوگ نہ تھے عملی کارروائی کو منطقی موشگافیوں سے بہرحال بہتر سمجھتے تھے۔ جمہور کی پست فطرت سے اچھی طرح واقف تھے۔ بحث مباحثوں میں وقت ضائع نہ کرتے تھے۔ شہر کا انتظام دو قونصلوں[1] کے سپرد کر رکھا تھا۔ جو ہر بات میں "بزرگوں" کی ایک مجلس سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ اس مجلس کا نام سینیٹ[2] تھا (سینیکس[3] کے معنے بوڑھے آدمی کے ہیں) دستور یہی تھا اور سہولت بھی اسی میں تھی۔ کہ اس مجلس مشاورت کے ارکان امرا میں سے منتخب ہوں۔ لیکن ان کے اختیارات محدود تھے۔ اور وہ ان سے تجاوز نہ کر سکتے تھے۔

تمہیں یاد ہوگا۔ کہ یونان میں ڈراکو اور سولون نے جو نئے قوانین وضع کئے تھے۔ ان کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ غریب لوگ اُمرا سے نالاں رہتے تھے۔ کچھ عرصے بعد روما میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ یہاں یہ کشمکش پانچویں صدی قبل مسیح میں رونما ہوئی۔ یہاں بھی نئے قانون جاری ہوئے جن کی رو سے اب شہر کے

---

[1] Consul [2] Senate [3] Senex

مجسٹریٹ مقرر ہونے لگے - ان مجسٹریٹوں کا لقب "ٹریبیون" تھا- اور عوام انہیں اپنی مرضی سے منتخب کرتے تھے- اس طرح سے غریب لوگ امیر حجوں کے ظلم سے محفوظ ہو گئے- ٹریبیون کو یہ اختیار حاصل تھا- کہ اگر کسی سرکاری افسر کو بے انصافی کرتے دیکھے- تو اس کا انسداد کرے- قونصل موت کی سزا تو دے سکتا تھا- لیکن اگر الزام پوری طرح ثابت نہ ہوا ہو- تو ٹریبیون سزائے موت منسوخ کروا سکتا تھا +

روما یوں تو ایک چھوٹا سا شہر تھا- جس کی آبادی چند ہزار سے زیادہ نہ تھی- لیکن روما کا اقتدار درحقیقت ان مضافات کے بل پر تھا- جو شہر کی چاردیواری سے باہر واقع تھے+ یہی وہ صوبے تھے- جہاں روما نے شروع ہی میں جہانبانی کی حیرت انگیز قابلیت کا ثبوت دیا +

شروع شروع کے زمانے میں تمام وسط اطالیہ کے اندر روما کے علاوہ اور کوئی شہر مستحکم طور پر قلعہ بند نہ تھا- لیکن جب کبھی کسی لاطینی قبیلے کو کسی طرف سے حملے کا ڈر پیدا ہوتا- اہل روما اپنے شہر کے دروازے کھول دیتے اور انہیں اپنی حفاظت میں لے لیتے+ اردگرد کے سب لاطینی جانتے تھے- کہ ایسے مستحکم اور ذی اقتدار شہر کے لوگوں سے دوستی رکھنی چاہئے+ انہوں نے سوچا کہ اہل روما کے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ کرنا چاہئے جس کی رو سے اگر ایک پر حملہ ہو- تو دوسرا اس کی مدد کرے + رومنوں کی جگہ مصری یا بابلی یا فنیقی یا یونانی بھی ہوتے- تو ان قبائل کے ساتھ ایسا معاہدہ کرتے- جیسا کوئی شاہنشاہ کسی باجگزار قوم سے کرتا ہے- اور ان سے غیر مشروط اطاعت قبول کرواتے- لیکن رومنوں نے اس بات کی پرواہ نہ کی- بلکہ ان "اجنبیوں" کو موقع دیا- کہ چاہیں تو رومنوں کی برادری میں شامل ہو جائیں +

انہوں نے کہا- تم ہمارے ساتھ اتحاد چاہتے ہو- تو ہمیں اس میں کوئی عذر نہیں- ہم تمہیں بالکل اپنے شہریوں کے سے حقوق عطا کر دینگے- لیکن اس کے صلے میں تم سے یہ توقع رکھینگے- کہ جب ضرورت پڑے- ہمارے شہر کی مدد کے لئے جان مال سے دریغ نہ کرو- کیونکہ اس پیارے دیوی دیوتاؤں کی زمین سب کی ماں ہے - اور ہم سب پر اس کا احترام واجب ہے +

"اجنبی" نے بھی اس عالی حوصلگی اور فیاضی کی دل سے قدر کی - اور ہمیشہ روما

کی وفاداری کا دم بھرتا رہا +

یونان میں جب کسی پر حملہ ہوتا۔ تو "اجنبی" یعنی باہر کے لوگ سب وہاں سے رفوچکر ہو جاتے۔ دل میں کہتے۔ ہمیں بھلا کیا پڑی ہے۔ کہ ہم خواہ مخواہ پرائی آگ میں کود پڑیں۔ شہر تباہ ہوتا ہے تو ہوتے دو۔ ہماری بلا سے۔ کوئی ہمارا وطن تھوڑا ہی ہے۔ جو ہمیں فکر ہو۔ ہماری حیثیت تو یہاں سرائے کے مسافروں کی سی ہے۔ کہ جب تک کرایہ ادا کرتے رہو۔ پڑے رہو۔ ورنہ نکل جاؤ + لیکن جب کوئی غنیم روما کی فصیل کے سامنے آ کر للکارتا۔ تو دُور دُور کے لاطینی مادرِ وطن کی مدد کو دوڑے چلے آتے + جنہوں نے آج تک کبھی روما کی مقدس پہاڑیوں کو دیکھا تک نہ ہوتا۔ وہ بھی اپنا حقیقی وطن روما ہی کو سمجھتے +

اس شہر پر کئی مصیبتیں آئیں۔ رومنوں نے کئی دفعہ زک اُٹھائی لیکن لاطینیوں کے اس جذبۂ وطنیت میں ذرہ بھر فرق نہ آیا + چوتھی صدی قبل مسیح میں گال[۱] قوم کے وحشی لوگ اطالیہ میں آ گھسے۔ دریائے ایلیا[۲] کے قریب رومن فوجوں کو شکست دی۔ اور پھر روما کی طرف بڑھے۔ جب روما کو بھی سر کر لیا۔ تو اب انتظار کرنے لگے کہ کب شہر کے لوگ آ کر ہمارے پاؤں پڑتے ہیں۔ اور ہم سے امان چاہتے ہیں۔ لیکن وہاں کوئی ٹس سے مس نہ ہوا + تھوڑے عرصے کے بعد مضافات کے لوگوں نے آ کر شہر کو گھیر لیا۔ اور فاتحین پر سامان خورد و نوش پہنچنے کے سب رستے بند کر دئے۔ سات مہینے تک تو وہ شہر کے اندر بیٹھے رہے۔ آخر جب بھوکوں مرنے لگے۔ تو دست بردار ہوتے ہی بنی + یہ اہل روما کا حسن سلوک ہی تھا جس کی وجہ سے مضافات کے لوگ مصیبت کے زمانے میں یوں آڑے آئے۔ اور روما کے اقتدار نے اور بھی تقویت پائی +

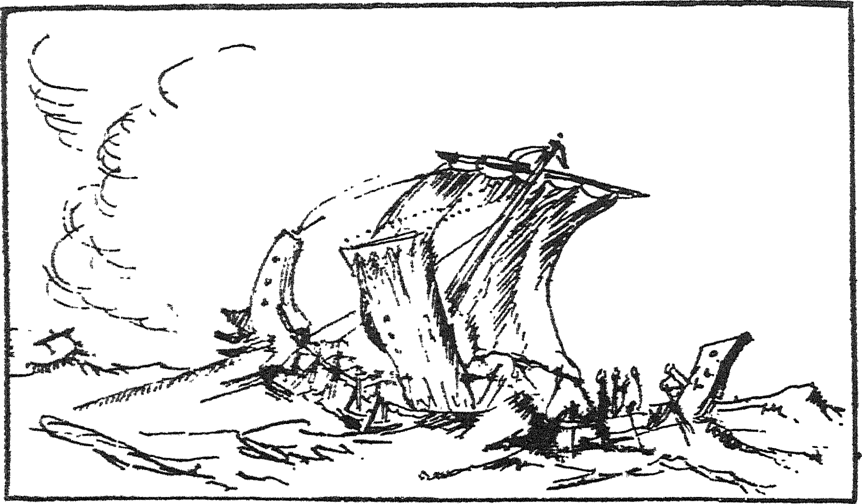
روما کے شروع زمانے کے یہ مختصر حالات ہم نے اس لئے بیان کئے۔ کہ تمہیں معلوم ہو جائے۔ اہل روما کے دل میں ایک کامیاب حکومت کا تصور قدیم دنیا (مثلاً کارتھیج) کے لوگوں سے کس قدر مختلف تھا + رومن لوگ سب شہریوں کو ایک

---

[۲] Allia   [۱] Gaul

آنکھ سے دیکھتے تھے۔ حکومت کی کامیابی کے لئے سب شہریوں کی باہمی امداد اور دستگیری کو ضروری سمجھتے تھے۔ برخلاف اس کے اہلِ کارتھیج مصر اور مغربی ایشیا کی سلطنتوں کی طرح لوگوں کو اپنا "محکوم" جانتے تھے۔ اور بلا وجہ اور ان کی مرضی کے خلاف ان سے اپنا حکم منواتے تھے۔ جب رعایا منحرف ہو جاتی۔ تو جنگ کے لئے کرایے کے سپاہی بھرتی کرنے پڑتے +

یہی وجہ تھی۔ کہ کارتھیج اپنے ہشیار۔ اور طاقتور حریف سے خوف کھاتا تھا۔ اُمراکی حکومت اس تاک میں بیٹھی تھی کہ موقع ملے۔ تو کسی بہانے سے اس طاقتور دشمن کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ڈرتے تھے۔ کہ اگر اس میں دیر کی۔ تو پھر یہ روگ ہمارے بس کا نہ رہیگا + لیکن معاملہ فہم لوگ تھے۔ یہ بھی جانتے تھے۔ کہ بہت جلدی بھی نہ کرنی چاہئے ورنہ کام بگڑ جائیگا۔ اس لئے پہلے تو رومنوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی۔ کہ ہم



رومنوں کا ایک تیز رو جنگی جہاز

تم دو نو نقشہ اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں۔ اس پر دو دائرے کھینچ کر اپنی اپنی حدود مقرر کر لیتے ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرے کے اندر رہے۔ اور دوسرے کی حد میں قدم نہ رکھے + رومنوں نے یہ بات مان لی۔ اور اس پر معاہدہ ہو گیا + لیکن سمجھوتا ہوا ہی تھا۔ کہ اس کی خلاف ورزی بھی شروع ہو گئی + جزیرہ صقلیہ کی

زمین کتنی زرخیز تھی - اور حکومت بھی کمزور - روما اور کارتھیج دونو نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی اپنی فوجیں وہاں بھیج دیں +

نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں بحری جنگ چھڑ گئی - جو چوبیس سال تک جاری رہی - (اسے پہلی پیونک[۱] جنگ کہتے ہیں) + شروع شروع میں قرائن سے یہی معلوم ہوتا تھا - کہ کارتھیج کی آزمودہ کار بحری فوج رومن بیڑے کو جو بمشکل آٹھ دن کی پیدائش تھا - بُری طرح زک دیگی - کارتھیج والوں کو اپنی پُرانی چالیں سب یاد تھیں - اپنے جہازوں کو دشمن کے جہازوں سے جا ٹکراتے - یا دشمن کے جہاز پر پہلو کی طرف سے بیدھڑک حملہ کر دیتے - اور سب چپو توڑ ڈالتے - [illegible] سب ملاحوں کو اپنے تیروں اور آگ کے [illegible] تجربوں سے ایک نئی قسم کے جہاز ایجاد کئے - ان کی خصوصیت یہ تھی [illegible] پر ایک لکڑی کا بنا بنایا پل تیار رہتا تھا جب ضرورت پڑتی - اس پل کو نیچے اتار کر دشمن کے جہاز کے ساتھ لگا دیتے - پیادہ فوج اس پر سے گزر جاتی - اور دشمن کے جہاز پر جا حملہ کرتی - اس پر کارتھیج کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا - مائلی[۲] کی لڑائی میں ان کے بیڑے نے شکست فاش کھائی - کارتھیج صلح کرنے پر مجبور ہو گیا - اور صقلیہ رومن مقبوضات میں شامل ہو گیا +

تئیس سال بعد ایک نیا قصہ کھڑا ہوا - جب رومنوں نے (تانبے کی خاطر) سارڈینیا[۳] کے جزیرے کو فتح کر لیا تھا - تو کارتھیج والے (چاندی کی خاطر) تمام جنوبی ہسپانیہ پر قابض ہو گئے تھے + دونو قوموں کا کھوے سے کھوا چھلنے لگا - رومنوں کو یہ بات ناگوار گزری اپنی فوجوں کو حکم دیا - کہ کوہ پرنیز[۴] کو عبور کر کے اُس پار کارتھیج کی جو فوجیں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں - ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو +

گویا پھر جنگ کے سامان ہونے لگے - اس دفعہ پھر ایک یونانی نوآبادی کا بہانہ ہاتھ آیا - اہل کارتھیج نے ہسپانیہ کے مشرقی ساحل پر سگنتم[۵] کا محاصرہ کر رکھا تھا - سگنتم کے باشندوں [illegible]

۱؎ Punic. ۲؎ Mylae ۳؎ Sardinia

۴؎ Pyrenees. ۵؎ Saguntum.



ہینی بال الپس کو عبور کر رہا ہے

نے مدد کی غرض سے لاطینی فوجوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا۔ لیکن مہم کی تیاری میں کچھ عرصہ گزر گیا۔ اتنے میں اہل کارتھیج نے شہر کو فتح کر کے اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس پر روما والوں کو غصہ آیا۔ سینیٹ نے جنگ کا فیصلہ کر لیا۔ ایک لشکر جنوب کی سمت روانہ کیا۔ کہ بحر افریقہ کو عبور کر کے کارتھیج پر حملہ آور ہو۔ ایک لشکر ہسپانیہ کی طرف بھیجا۔ کہ وہاں کارتھیج کی فوجوں کو مصروف پیکار رکھے۔ اور انہیں کارتھیج کی مدد کو نہ پہنچنے دے + چال تو خوب چلی۔ اور دل میں بھی سب خوش تھے۔ کہ اب میدان مار لیا۔ لیکن دیوتاؤں کی مرضی کچھ اور ہی تھی +

یہ واقعہ ۲۱۸ قبل مسیح کے موسم خزاں کا ہے۔ رومن فوج ہسپانیہ میں اہل کارتھیج پر حملہ کرنے کے لئے اطالیہ سے روانہ ہو چکی ہے۔ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ کب فتح کی خبر وہاں سے پہنچتی ہے۔ اتنے میں دریائے پو کی وادی میں تشویشناک اور پریشان کن افواہیں اڑنے لگیں۔ کوہستان کے رہنے والے غیر مہذب لوگ پہاڑوں سے بھاگے آئے۔ ان کے ہونٹ دہشت کے مارے کانپ رہے تھے۔ انہوں نے یہ خبر سنائی۔ کہ درہ گرائین[۱] کے ارد گرد برفانی پہاڑوں پر ایکا ایکی سانولے رنگ کے کئی لاکھ آدمی گھٹا بن کر چھا گئے ہیں۔ (یہ وہی درہ تھا جس میں سے ہزارہا سال پیشتر ہرکولیز[۲] ہسپانیہ سے یونان جاتا ہوا گریون[۳] کے بیل ہانک کر لے گیا تھا) یہ بھی کہا۔ کہ ان لوگوں کے ساتھ کئی عجیب و غریب بڑے بڑے جانور بھی ہیں + بہت عرصہ نہ گزرنے پایا۔ کہ پہاڑوں سے لے کر شہر روما کے دروازے تک خستہ تن اور پریشان حال ہزیمت خوردہ پناہ گزینوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ مفصل حالات ان کی زبانی معلوم ہوئے۔ واقعہ یہ تھا۔ کہ ہیملکار[۴] کے بیٹے ہینی بال[۵] نے پچاس ہزار پیادہ فوج۔ نو ہزار سوار اور سینتیس جنگی ہاتھیوں کے ساتھ پہلے تو پرنیز کو عبور کیا تھا۔ پھر دریائے رہون[۶] کے کنارے رومن جرنیل سپیو[۷] کی فوج کو شکست دی تھی۔ اور پھر باوجود اس بات کے کہ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ اور سڑکیں برفوں سے اٹی پڑی تھیں۔ اپنی فوج کے

---

۱ Graian ۲ Hercules ۳ Geryon ۴ Hamilcar

۵ Hannibal ۶ Rhone ۷ Scipio

۲۱۸ ق م کے اواخر خزاں میں الپس کو عبور کیا
روان کو عبور کیا ۲۱۸ ق م
۲۱۸ کے موسم گرما میں ہسپانیہ کو خیرباد کہا
سیگنٹم
روما
۲۱۷
۲۱۶
۲۰۳
سقلیہ
کارتھیج
۲۰۲ میں مدد حاصل
مشرق
روانہ ہوا
واپس کارتھیج

ساتھ صحیح وسلامت الپس کے دروں میں سے گزر آیا تھا۔ اس کے بعد گال قوم کے ساتھ مل کر ایک اور رومن لشکر کو شکست دی۔ پھر ٹریبیا[1] کو عبور کیا جس کے بعد اب پلیسنشیا[2] کا محاصرہ کر رکھا تھا (یہ شہر روما اور الپس کی درمیانی سڑک کے شمالی سرے پر واقع تھا)+

سینیٹ حیران تو بہت ہوا۔ لیکن حسب معمول پریشانی کو پاس نہ آنے دیا۔ بلکہ نہایت مستعدی سے کام لیا۔ شکست وہزیمت کی خبروں کو دبائے رکھا۔ اور حملہ آوروں کو روکنے کے لئے دو اور لشکر روانہ کئے۔ لیکن جھیل ٹراسی مین[3] کے کنارے ایک تنگ سڑک پر ہینی بال نے رومن فوجوں پر اچانک دھاوا بول دیا۔ اور سب افسروں اور بہت سے سپاہیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ روما کے لوگوں میں ایک بھاگڑ سی مچ گئی۔ لیکن سینیٹ نے اپنے حواس قائم رکھے۔ ایک تیسرا لشکر تیار کیا۔ کوئنٹس فیبی اس میکسی مس[4] کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اور اسے پورا پورا اختیار دے دیا۔ کہ سلطنت کے بچانے کے لئے جو تدابیر ضروری سمجھے عمل میں لائے +

فیبی اس[5] جانتا تھا۔ کہ پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑیگا۔ اس کے سپاہی قواعد جنگ سے قطعی ناواقف تھے (روما کے پاس اب لے دے کر بس یہی لوگ رہ گئے تھے)۔ اور مقابلہ ہینی بال کی فوج سے تھا۔ جو کئی میدان مار چکی تھی۔ اور جسے جنگ کی سب چالیں ازبر تھیں+ چنانچہ آمنے سامنے لڑنے سے گریز کیا۔ لیکن ہینی بال کا پیچھا ایک دن کو بھی نہ چھوڑا۔ خورد ونوش کا سب سامان برباد کر ڈالا۔ سڑکوں کو توڑ دیا۔ چھوٹے چھوٹے دستوں پر چھاپے مارتا رہا۔ اور اس طرح کی لڑائی سے کارتھیج کی فوجوں کو اتنا تنگ کیا۔ کہ وہ ست پٹا گئے +

لیکن جو خوفزدہ لوگ روما کی چار دیواری کے اندر جان بچائے بیٹھے تھے۔ وہ چاہتے تھے۔ ایک فیصلہ کن جنگ لڑی جائے۔ اس طرح کی لڑائی سے ان کی

---

[1] Trebia [2] Placentia [3] Trasimene

[4] Quintus Fabius Maximus [5] Fabius

تسلی نہ ہوئی۔ وہ اس تاخیر و توقف کے قائل نہ تھے۔ وارّوؔ[1] نامی ایک شخص ہر جگہ فیبی اُس کی مذمت اور اپنی ستائش کرتا پھرتا تھا۔ کہ میں ہوتا تو یہ کرتا۔ یوں لڑتا۔ یوں دشمن کو شکست دیتا۔ اور فیبی اس نو یونہی ٹال مٹول کر رہا ہے۔ لوگوں نے یک آواز ہو کر وارو کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا۔ لیکن کانیؔ[2] کی لڑائی میں اس نے وہ شکست فاش کھائی۔ کہ رومن تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ستر ہزار سے بھی زیادہ آدمی کام آئے۔ اور ہینی بال سب اطالیہ پہ قابض ہو گیا۔

ہینی بال نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دورہ کیا۔ اور ہر جگہ یہ اعلان کیا۔ کہ میں تم لوگوں کو روما کے استبداد سے نجات دلانے آیا ہوں۔ آؤ سب متحد ہو کر روما کے خلاف جنگ کریں۔ لیکن روما کو پھر ایک بار اپنے حسن تدبر کا صلہ ملا۔ کپواؔ[3] اور سرا کیوزؔ[4] کے سوا کسی نے ہینی بال کا ساتھ نہ دیا۔ جن کا دوست بنا پھرتا تھا سو ہی اس کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ وطن سے دور تھا۔ اس لئے گھبرا گیا۔ کمک کے لئے ایلچیوں کو کارتھیج روانہ کیا۔ لیکن افسوس کارتھیج والے بھی مدد دینے سے قاصر تھے۔

ادھر سمندر پر رومن اچھی طرح مسلط تھے۔ اُن کے پل دار جہازوں کا مقابلہ بھلا کون کر سکتا تھا۔ ہینی بال کو کہیں سے مدد پہنچنے کی توقع نہ رہی۔ رومن فوجوں سے شکست تو نہ کھائی۔ لیکن اپنی فوج روز بروز گھٹ رہی تھی۔ باقی رہے دیہات کے لوگ۔ تو وہ اس خود ساختہ "نجات دہندہ" کو منہ نہ لگاتے تھے۔

کئی سال تک فتح و ظفر نے ساتھ نہ چھوڑا۔ لیکن اس کے بعد اپنے ہی فتح کئے ہوئے علاقے میں گھر گیا۔ تھوڑی دیر کو امید کی ایک جھلک دکھائی دی۔ اس کے بھائی ہسدروبالؔ[5] نے ہسپانیہ میں رومن فوجوں کو شکست دی۔ الپس کو عبور کیا۔ اور ہینی بال کی مدد کو روانہ ہو گیا۔ اپنی آمد کی خبر ایلچیوں کے ہاتھ بھیجی۔ ادھر ایک دوسرے لشکر کو کہلا بھیجا۔ کہ تم ٹائبر کے میدان میں مجھ سے آن ملو۔ لیکن افسوس

---

[1] Varro — [2] Cannae — [3] Capua — [4] Syracuse — [5] Hasdrubal

کہ یہ ایلچی رومنوں کے قابو آ گئے۔ اور ہینی بال کو اس کے بعد کہیں سے کوئی خبر نہ ملی۔ البتہ ایک ٹوکری لڑھکتی ہوئی اس کے خیمے میں آ گری۔ کھول کر دیکھا۔ تو بیچ میں بھائی کا سر لپٹا ہوا تھا۔ سمجھ گیا۔ کہ کارتھیج کی بچی کھچی فوجوں کا کیا حشر ہوا ہوگا +

ہسڈروبال کے مارے جانے کے بعد نوجوان پبلیس سپیو[1] نے دنوں ہی میں ہسپانیہ کو پھر فتح کر لیا + اس کے چار سال بعد رومن لوگ کارتھیج پر ایک فیصلہ کن حملہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہینی بال کو کارتھیج والوں نے واپس بلا لیا۔ وہ کارتھیج پہنچا۔ اور شہر کی حفاظت کے سامان مستحکم کرنے میں مصروف ہو گیا + ۲۰۲ء قبل مسیح کو زاما[2] کی لڑائی میں اہل کارتھیج کو شکست ہوئی۔ ہینی بال بھاگ کر طائر جا بیٹھا۔ وہاں سے ایشیائے کوچک پہنچ کر شامیوں اور مقدونیوں کو روما کے خلاف اکسانے لگا۔ ہینی بال کا تو کچھ نہ بنا۔ لیکن رومنوں کو ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ مشرق میں جا کر علم جنگ بلند کیا۔ اور ایجئین کا بیشتر حصہ اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا +



ہینی بال کی موت

ہینی بال آوارہ و بے وطن کبھی اس شہر کبھی اس شہر میں سر چھپاتا پھرا۔ آخر کار اسے یقین ہو گیا۔ کہ اب میرے بلند ارادوں کا خاتمہ ہے + عزیز وطن یعنی کارتھیج کا شہر تاراج ہو چکا تھا۔ وہاں کے لوگ بے عزتی کی صلح کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بحری فوج غرق ہو چکی تھی۔ کارتھیج رومنوں کی اجازت کے بغیر کسی سے لڑ نہ سکتا تھا۔ اور ہمیشہ تک روما کو خراج ادا کرتے رہنے کی ذلت قبول کر چکا تھا۔ مستقبل تاریک تھا۔ ۱۹۰ء قبل مسیح میں زہر کھا کر مر گیا +

چالیس سال بعد رومن کارتھیج کے ساتھ آخری جنگ لڑے تین سال

---

[1] Publius Scipio
[2] Zama

تک اس قدیم فینیقی نوآبادی کے لوگ اس جواں سال جمہوری طاقت کا مقابلہ کرتے رہے۔ رسد کے رستے بند تھے۔ بھوک کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دئے۔ جو لوگ محاصرے کے بعد بھی زندہ بچ رہے۔ وہ غلام بن کر بازاروں میں فروخت ہوئے۔ شہر کو آگ لگا دی گئی۔ پندرہ دن تک گوداموں محلوں اور مسجدوں سے شعلے بلند ہوتے رہے۔ جب سیاہ ڈھیروں کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ تو رومنوں نے کھڑے ہو کر شہر کو بددعا دی۔ اور پھر اطالیہ کو چل دئے۔ جہاں پہنچ کر خوشیاں منائیں +

اس کے بعد ایک ہزار سال تک بحیرہ روم اہل یورپ کے قبضے میں رہا۔ لیکن جب سلطنت روما کا چراغ بجھ گیا۔ تو ایشیا والوں نے پھر ایک بار اس سمندر پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا حال میں تمہیں حضرت محمدؐ کے بیان میں سناؤنگا +

روما کا عروج

مملکت روما کس طرح خود بخود ہی ظہور میں آئی

روما کی وسیع مملکت محض ایک اتفاق کی بات تھی۔ کسی منصوبے کی تکمیل یا کسی خواب کی تعبیر نہ تھی۔ کسی نامور سپہ سالار یا سیاست دان یا اُچکے نے کبھی کھڑے ہو کر اس بات کا اعلان نہ کیا۔ کہ" دوستو! رومنو! شہریو! ہمیں ایک وسیع مملکت کی بنیاد قائم کرنی چاہیئے۔ میرے ساتھ آؤ۔ کہ ہم تم سب مل کر ہرکیولز کے دروازے سے لے کر جبل طارس تک سب دنیا کو اپنے قبضے میں کر لیں"۔

روما میں کئی ایک نامور سپہ سالار۔ کئی ایک قابل سیاست دان اور کئی ایک اُچکے پیدا ہوئے۔ رومن فوجوں نے دنیا بھر میں اپنی شمشیر کے جوہر دکھائے۔ لیکن مملکت روما کا خیال کسی کے دماغ میں پیدا نہ ہوا۔ روما کے باشندے سیدھے سادھے شہری تھے۔ حکومت کے متعلق لمبی چوڑی خیال آرائیاں کرنے اور قیاسات دوڑانے سے گھبراتے تھے۔ کونسل کے اجلاس میں کوئی سیاست دان گلے کی رگیں پھلا پھلا کر زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگتا۔ تو لوگ اُس کو سننا گوارا نہ کرتے۔ وہ تو کہیئے کہ حالات و واقعات ہی کچھ ایسے تھے۔ کہ رفتہ رفتہ روما کے مقبوضات بڑھتے ہی چلے گئے۔ ورنہ اس میں نہ تو رومنوں کی تمنا کو کچھ دخل تھا نہ حرص کو۔ روما کے لوگ طبعاً ہی کچھ ایسے واقع ہوئے تھے کہ کھیتی باڑی کے کام سے کبھی ان کا جی نہ اُکتاتا۔ اور وطن سے باہر نکلنے کا خیال تک کبھی نہ آتا۔ لیکن جب غنیم حملہ آور ہوتا۔ تو جان بچانا فرض سمجھتے اور جب دشمن بہت طاقتور ہوتا تو مصلحت اسی میں دیکھتے۔ کہ خود جا کر اس کے ملک پر حملہ کر دیں۔ جب اُس کا ملک فتح کر لیتے۔ تو وہیں ڈیرے ڈال دیتے۔ اور

ملک کا سب انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ مبادا جہاں گرد بیری موقع پاکر وہاں قابض ہو جائیں اور پھر روما کو ستانا شروع کردیں +



روما کی سلطنت کیونکر پھیلی ؟

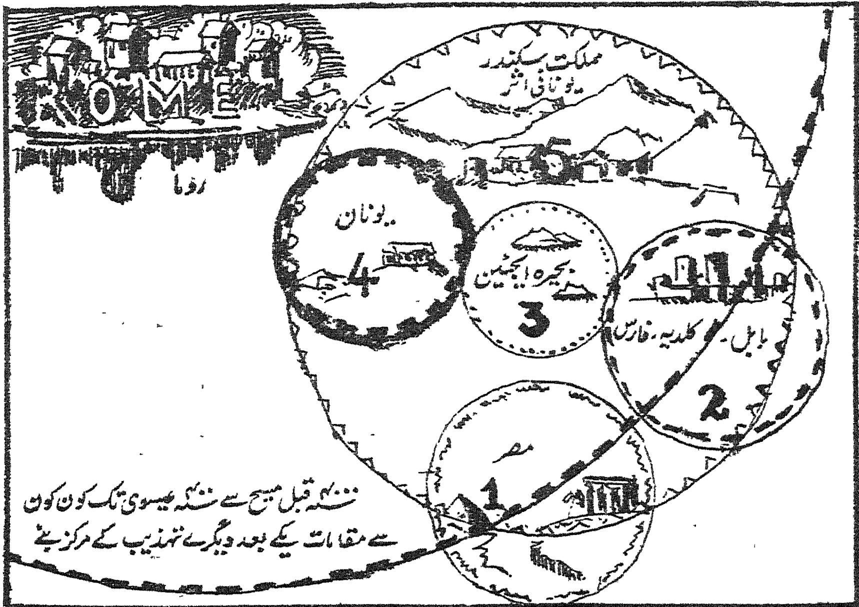
یہ طریقِ کار ہمیں مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن اُس زمانے کے لوگوں کے نزدیک یہ نہایت معمولی بات تھی۔ جیسا کہ ابھی تم پر ظاہر ہو جائیگا +

۲۰۸ سنہ قبل مسیح میں سپیو نے بحیرہ روم کو عبور کر کے افریقہ کی سرزمین پر تلوار کو بے نیام کیا + کارتھیج والوں نے ہینی بال کو واپس بلا لیا۔ ہینی بال کی فوج میں سب کرایہ کے سپاہی تھے۔ جو بہت بیدلی سے لڑے۔ زاما کے قریب ہینی بال کو شکست فاش ہوئی۔ رومنوں نے اطاعت قبول کروانی چاہی۔ اس پر ہینی بال نے (جیسا کہ میں تمہیں پچھلے باب میں بتا چکا ہوں) مقدونیہ اور شام کے بادشاہوں کے پاس جا کر پناہ لی +

یہ دو صوبے جو سکندر اعظم کی مملکت کے باقیات میں سے تھے۔ ان دنوں مصر پر حملہ آور ہونے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔ سوچا یہ تھا کہ نیل کی زرخیز وادی کو فتح کر کے آدھی آدھی آپس میں بانٹ لینگے۔ شاہ مصر کو اس کی اطلاع پہنچی۔ تو اس نے روما سے امداد طلب کی۔ قریب تھا کہ اس کے بعد سازشوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے۔ لیکن رومنوں نے یک لخت ہی اس قصے کو ختم

کردیا۔ وسطِ تھسلی میں سائنوسفالی کے میدان پر ۱۹۷ قبل مسیح میں مقدونیوں کو (جو طریقِ جنگ میں ابھی تک قدیم یونانیوں ہی کی نقل کرتے تھے) رومن افواج نے شکست دی +

اس کے بعد رومن جنوب کی سمت اٹیکا کی طرف بڑھے۔ اور یہ اعلان کیا۔ کہ ہم ہیلینیوں کو مقدونیہ کے پنجے سے چھڑانے آئے ہیں۔ یونانی پھر قریب قریب غلام بن چکے تھے اور آزادی کا صحیح استعمال بھول چکے تھے۔ چنانچہ جب دوبارہ آزادی نصیب ہوئی۔ تو اسے ہضم نہ کر سکے۔ پہلے کی طرح ان کی چھوٹی چھوٹی شہری سلطنتوں نے پھر آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ رومن لوگ ان فضول لڑائی جھگڑوں کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ یوں بھی انہیں یونانیوں سے سخت نفرت تھی۔ کچھ عرصے تک تو درگزر کیا۔ لیکن بالآخر تنگ آکر یونان پر حملہ کر دیا۔ کورنتھ کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ اور ایتھنز کے شورش پسند علاقے پر حکومت کرنے کے لئے ایک صوبہ دار مقرر کیا + گویا مملکت روما



تہذیب کا مغرب کی سمت سفر

لہ Cynoscephalae

کی مشرقی حد مقدونیہ اور یونان تک جا پہنچی +

ہلیسپانٹ[1] کے اس پار مملکت شام واقع تھی۔ جہاں انٹی اوکس سوم[2] حکمران تھا۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے ہینی بال کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ اور جب ہینی بال نے سبز باغ دکھائے تھے۔ تو اطالیہ پر حملہ کرنے کو آمادہ ہو گیا تھا +

روما کے مرد میدان سپیو کے بھائی لوسیس سپیو[3] کو ایشیائے کوچک کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا گیا۔ اس نے میگنیشیا[4] کے قریب سنہ ۱۹۰ قبل مسیح میں شاہ شام کی فوجوں کو شکست دی + تھوڑے ہی عرصے بعد خود انٹی اوکس کی رعایا نے اپنے بادشاہ کو بری طرح زدوکوب کیا۔ اور ایشیائے کوچک روما کا باجگذار بن گیا + گویا روما کی چھوٹی سی شہری جمہوریت نے بحیرہ روم کے بیشتر ساحلی ممالک کو اپنا مطیع بنا لیا +

---

[1] Hellespont. [2] Antiochus III

[3] Lucius Scipo [4] Magnesia

مملکتِ روما

صدیوں کے فتنہ و فساد اور شورش و انقلاب کے بعد روما کی جمہوری حکومت ایک وسیع مملکت بن گئی

جب رومن فوجیں فتح و ظفر کا ڈنکا بجاتی ہوئی میدان جنگ سے واپس آتیں۔ تو شہر کے لوگ بڑے جوش و خروش سے ان کا خیر مقدم کرتے لیکن افسوس کہ ان کامرانیوں سے ملک کو خوشحالی نصیب نہ ہوئی۔ بلکہ برعکس اس کے حالت پہلے سے بدتر ہو گئی۔ آئے دن کی فوج کشی اور ملک گیری کے بکھیڑوں سے کسان بچارے تباہ ہو گئے۔ اور اختیارات سب فاتح سپہ سالاروں (یا ان کے یار دوستوں) کے قبضے میں آ گئے۔ جنہوں نے ضروریات جنگ کے بہانے سے خوب اپنے ہاتھ رنگے۔

قدیم ایام میں جمہوریت روما کے مشاہیر سادگی پسند لوگ تھے۔ اور روما ان کی سادگی پر فخر کرتا تھا۔ لیکن نئے زمانے کے لوگ اپنے آبا و اجداد کے بلند اصول اور ان کی درویشانہ وضع اختیار کرتے ہوئے شرماتے تھے۔ اب تو ملک میں اُمرا کا دور دورہ تھا۔ انہی کی حکومت تھی۔ اور وہ ہمیشہ اپنے ہی بھلے کی سوچتے تھے۔ ایسی حکومت کا وہی حشر ہوا۔ جو ہونا چاہیئے تھا یعنی اسے ہولناک ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کا حال میں ابھی تمہیں سناتا ہوں۔

ڈیڑھ سو سال سے بھی کم عرصے کے اندر اندر روما بحیرہ روم کے کم و بیش تمام ساحلی علاقے پر قابض ہو گیا تھا۔ رومن لوگ جنگ کو کوئی بچوں کا کھیل نہ سمجھتے تھے۔ دشمن ہار جاتے۔ تو پھر اس کی اچھی طرح خبر لیتے۔ اس زمانے کا دستور یہی تھا۔ کہ جنگ میں جو لوگ قید ہو جاتے۔ انہیں غلام بنا لیا جاتا۔ چنانچہ رومنوں نے جب کارتھیج کو فتح کر لیا۔ تو وہاں کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ یونان۔ مقدونیہ۔ ہسپانیہ۔

اور شام کے سرکش لوگوں سے بھی یہی سلوک کیا +

آج سے دو ہزار سال پیشتر ایک غلام کی حیثیت مشین سے زیادہ نہ تھی + جس طرح آج کل دولتمند لوگ اپنا روپیہ کارخانوں میں لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح روما کے امرا یعنی سینیٹ کے ارکان اور جنگی افسر اور سامان جنگ کے تاجر اپنے روپے کا بہترین مصرف یہی سمجھتے تھے۔ کہ اس سے زمین اور غلام خریدیں۔ کوئی نیا ملک فتح کرتے۔ تو وہاں زمین خرید لیتے۔ اور جب بازار میں غلام سستے داموں مل جاتے۔ وہاں غلام مول لے لیتے + تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح کا زمانہ فتوحات کا زمانہ تھا۔ امرا نے دھڑا دھڑ زمین خریدنا شروع کیا۔ کھیتی باڑی کا کام غلاموں سے کرواتے۔ اور ان سے اتنی سخت مشقت لیتے۔ کہ وہ بیچارے کام کرتے کرتے مر جاتے۔ لیکن غلاموں کی بھی کمی نہ تھی۔ کورنتھ اور کارتھیج کے قیدی گلی گلی بکتے تھے۔ ایک غلام مر جاتا تو جھٹ ایک اور خرید لاتے +

اور جو لوگ آزاد کسان تھے۔ ان بیچاروں کا تو برا حال تھا +

اپنے وطن کے خاطر سالہا سال لڑتے رہے۔ مگر اُف تک نہ کی + پندرہ پندرہ بیس بیس سال لڑائیوں میں مارے مارے پھرتے۔ وطن کو لوٹتے تو گھر کے سب لوگ مر کھپ چکے ہوتے اور زمین ویران اور غیر آباد پڑی ہوتی + مگر کسان بل ابھی ویسا ہی تھا۔ پھر نئے سرے میں محنت مشقت میں لگ جاتے۔ ہل جوتتے۔ بیج بوتے۔ اور فصل کاٹ چکتے۔ تو غلہ اور مویشی اور مرغیاں منڈی میں بیچنے کو لے جاتے۔ وہاں مقابلہ بڑے بڑے زمینداروں سے ہوتا۔ جو کھیتی باڑی کا سب کام غلاموں سے کرواتے تھے۔ وہ اپنا مال سستے داموں پر بیچتے۔ کسان بیچارے اپنا سامنہ لے کر رہ جاتے۔ دو ایک سال تک تو آس لگی رہتی۔ لیکن اس کے بعد ہار کر بیٹھ جاتے۔ کچھ بن نہ پڑتا۔ تو گاؤں کو چھوڑ شہر کی راہ لیتے۔ فاقوں سے تو نجات نہ ملتی۔ لیکن شہر میں اپنے جیسے ہزار کنگال نظر آتے۔ ان کے ساتھ مل کر مضافات شہر میں غلیظ جھونپڑوں کے اندر زندگی بسر کرتے۔ افلاس کی وجہ سے خطرناک بیماریوں میں مبتلا رہتے۔ جب شہر میں وبا آتی۔ تو انہی کو اپنا نشانہ بناتی۔ زندگی سے بیزار ہو جاتے۔ اور سوچتے کہ خدایا کیا خدمت وطن کا صلہ یہی ہے + لوگ بددل ہو کر یوں حکومت کے جسم پر ناسور بن جائیں۔ تو فتنہ پرداز اور شورش پسند

لوگ بھی مکھیوں کی طرح ارد گرد بھنبھنانے لگتے ہیں۔ اور سبز باغ دکھا دکھا کر لوگوں کو پھسلاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ بہت عرصہ گذرنے نہ پایا۔ کہ ملک کو ان کی طرف سے خدشہ پیدا ہونے لگا +

لیکن امرا کو اپنی دولت کا گھمنڈ تھا۔ وہ انہیں کب خاطر میں لاتے تھے۔ اپنی فوج اور اپنی پولیس پر نازاں تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے۔ اگر شورش بپا ہوئی۔ تو فوراً اس کا قلع قمع کر دیا جائیگا۔ اپنے خوشنما بنگلوں کی بلند چار دیواری کے اندر اطمینان کے ساتھ باغیچوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے۔ یا ہومر کی نظمیں پڑھ پڑھ کر اپنا جی بہلاتے انہی دنوں ایک یونانی غلام نے ہومر کی نظموں کا یونانی سے لاطینی میں ترجمہ کر دیا تھا +

لیکن بعض وضع دار گھرانے ایسے بھی تھے۔ جہاں لوگوں کے دل سے وطن کی سچی اور بے لوث خدمت کا خیال ابھی معدوم نہ ہوا تھا۔ ان میں سپیو فاتح افریقہ کا خاندان خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سپیو کی بیٹی کورنیلیا[1] نے گراکس[2] نامی ایک رومن سے شادی کر لی تھی۔ کورنیلیا کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام ٹائیبریس[3] تھا۔ دوسرے کا نام گائس[4]۔ دونو نے بڑے ہو کر سیاسیات میں بہت حصہ لیا۔ اور آئین مملکت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اعداد و شمار سے یہ بات ثابت ہوئی تھی۔ کہ ملک بھر کی بیشتر زمین کل دو ہزار امیر گھرانوں کے قبضے میں ہے۔ ٹائیبریس ٹریبیون منتخب ہوا۔ تو آزاد باشندوں کی حمایت پر ڈٹ گیا۔ دو پرانے قانون نئے سرے سے نافذ کرائے جن کی رو سے ایک خاص رقبہ مختص کر دیا۔ کہ اس سے زیادہ زمین کسی ایک شخص کے قبضے میں نہ ہونی چاہیئے + اس پابندی کے عائد کرنے سے اس کا مقصد یہ تھا۔ کہ جس طرح کسی زمانے میں تمام زمین چھوٹے چھوٹے رقبوں میں منقسم تھی۔ اور تقریباً ہر آزاد کسان تھوڑی بہت زمین کا مالک و مختار تھا۔ وہی صورت حالات پھر پیدا ہو جائے۔ یعنی آزاد کسانوں کا طبقہ (جسے وہ ملک کی خوشحالی کے لئے بہت

---

[1] Cornelia [2] Gracchus [3] Tiberius
[4] Gaius

ضروری سمجھتا تھا) از سر نو زندہ ہو جائے۔ لیکن امرا جب اس کا عندیہ معلوم ہوا۔ تو اسے ملک کا دشمن اور ڈاکو سمجھنے لگے۔ شہر میں فساد مچ گیا۔ امیروں نے چند غنڈوں کو کچھ دے دلا کر اس ہر دلعزیز ٹریبیون کے پیچھے لگا دیا۔ ایک دن ٹائیبریس اسمبلی میں داخل ہوا۔ تو یہ بدمعاش اس پر پل پڑے۔ اور اسے اتنا زدوکوب کیا۔ کہ جان سے مار ڈالا۔ دس سال بعد دوسرے بھائی گائس نے اصلاح کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور ذی اقتدار امرا کی ناراضگی کی پروا نہ کی۔ نادار کسانوں کے لئے ایک "قانون غربا" پاس کیا۔ لیکن اس قانون کا اثر یہ ہوا۔ کہ روما کے بیشتر شہریوں کی حیثیت رفتہ رفتہ خیرات خوروں کی سی بن گئی۔ جو ہمیشہ لوگوں کے دست نگر رہنے لگے۔

گائس نے دور دراز حصوں میں نادار لوگوں کی نوآبادیاں قائم کیں۔ لیکن جن کے لئے اتنا اہتمام کیا تھا۔ وہ تو گھر پر بیٹھے رہے۔ اور وہاں اور ہی قسم کے لوگ جا کر آباد ہو گئے۔ خدا جانے ابھی اور کیا گل کھلاتا۔ کہ اتنے میں مارا گیا۔ اور اس کے ساتھی یا تو قتل ہو گئے یا جلاوطن کر دیئے گئے۔ یہ دو بھائی تو شریف خاندان کے سپوت تھے۔ لیکن ان کے بعد جو دو مصلح پیدا ہوئے۔ وہ اور ہی طرح کے لوگ تھے۔ دونو کا پیشہ جنگ تھا۔ ایک کا نام ماریئس[1] تھا۔ اور دوسرے کا نام سلا[2]۔ ایک کثیر التعداد جماعت ہر ایک کے ساتھ تھی۔

سلا زمینداروں کا سردار تھا۔ اور ماریئس (جو ایلپس کے دامن میں ٹیوٹن[3] قوم اور سمبری[4] قوم کو ایک معرکے کی لڑائی میں تہ تیغ کر چکا تھا) اُن آزاد کسانوں کا رہنما تھا۔ جو اپنی زمینوں سے بیدخل ہو چکے تھے۔

اتفاق کی بات دیکھو ۸۸ سنہ قبل مسیح میں سینیٹ کے پاس ایشیا سے تشویشناک اطلاعات پہنچیں۔ متھریڈیٹیز[5] بحیرہ اسود کے ساحلی علاقے کا فرمانروا اور یونانی ماں کا بیٹا سکندر اعظم کی طرح جہانستانی کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ بسم اللہ یہاں

---

[1] Marius [2] Sulla [3] Teutone

[4] Cimbri [5] Mithridetes

سے کی - کہ ایشیائے کوچک میں جس قدر رومن آباد تھے - کیا بوڑھے اور کیا بچے - کیا عورتیں اور کیا مرد سب کو مروا ڈالا - ایسی حرکت کا نتیجہ جنگ کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا - سینیٹ نے شاہِ پونٹس[1] کو قرار واقعی سزا دینے کے لئے ایک لشکر تیار کیا - لیکن سوال یہ تھا - کہ اس لشکر کا سپہ سالار کون مقرر ہو - سینیٹ کا فیصلہ یہ تھا - کہ اس کام کے لئے سلا ہی موزوں ہے - کیونکہ وہ پہلے ہی قونصل کے عہدے پر ممتاز ہے + عوام کہتے تھے - ماریئس کیوں سپہ سالار مقرر نہ ہو - وہ ایک دفعہ چھوڑ پانچ دفعہ قونصل رہ چکا ہے - اور ہمارے حقوق کا حامی ہے +

لیکن سلا آگے ہی فوج کا سپہ سالار تھا - اس کو وہاں سے ہٹا کر کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ مقرر کرنا آسان کام نہ تھا - چنانچہ اُسی کو بھیجا گیا - اس نے وہاں پہنچ کر متھریڈیٹیز کو شکست دی - ماریئس بھاگ کر افریقہ جا بیٹھا - کچھ عرصے بعد جب یہ سنا - کہ سلا ایشیا پہنچ گیا ہے - تو افریقہ سے اطالیہ پہنچا - قسم قسم کے لوگوں کو جو حکومت سے بددل ہو رہے تھے - یکجا کیا - اور روما پر دھاوا بول دیا - قزاقوں اور ڈاکوؤں کی مدد سے جنہیں روپے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ گانٹھ لیا تھا - شہر کے اندر داخل ہوا - سینیٹ کے حمائتیوں میں سے جو لوگ اس کے دشمن تھے - پانچ دن اور پانچ رات تک ان کا قتل عام جاری رکھا - اس کے بعد خود قونصل منتخب ہوا - لیکن پندرہ دن سے جو ہلچل مچی ہوئی تھی - اس سے طبیعت میں ایسا ہیجان پیدا ہو گیا تھا - کہ فوراً ہی مر گیا +

چار سال تک ملک میں سخت بدنظمی رہی + اس کے بعد سلا نے جس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے - باہر ہی سے کہلا بھیجا - کہ میں روما واپس آنے کو تیار بیٹھا ہوں - جہاں پہنچ کر میں اپنے حریفوں کو اُن کی مخالفت کا اچھی طرح مزا چکھاؤں گا - چنانچہ جو کہا تھا - وہ کر دکھایا + کئی ہفتوں تک یہ حالت رہی - کہ اس کے سپاہی جمہوریت پسند شہریوں کو جہاں دیکھتے - وہیں مار ڈالتے - ایک دن ایک نوجوان شخص جو

---

[1] Pontus

رئیس کا بھتیجا تھا۔ ان کے ہتے چڑھ گیا۔ اسے پھانسی دینے لگے۔ تو کسی نے کہا۔ "جانے دو۔ بچہ ہی تو ہے"۔ چنانچہ اس کی جان بخشی کر دی۔ اس نوجوان کا نام جولیس سیزر[1] تھا۔ اس کا مفصل حال ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں سناتا ہوں۔

سلا "ڈکٹیٹر"[2] بن بیٹھا جس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ تمام روم کی ہر شے کا مطلق العنان حکمران تھا۔ اور سیاہ و سفید کا مالک۔ چار سال تک روم پر حکومت کی۔ اکثر مشرقی بادشاہوں کی طرح جو تمام عمر قتل و غارت میں بسر کرنے کے بعد آخری وقت دنیا کے دھندوں سے کنارہ کش ہو کر کھیتی باڑی کا مشغلہ اختیار کر لیتے تھے۔ سلا نے بھی عمر کے آخری سال چین اور اطمینان سے گزارے اور طبعی موت مرا۔

لیکن ملک کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی۔ ایک جرنیل پومپی[3] جو سلا کا بڑا دوست تھا مثرڈیٹیز کے مقابلے کو مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ مثرڈیٹیز اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا تھا) وہاں پہنچ کر مثرڈیٹیز کو پہاڑوں کی طرف بھگا دیا۔ جہاں وہ زہر کھا کر مر گیا۔ کیونکہ جانتا تھا۔ کہ کہیں قید ہو گیا تو رومی بہت بری طرح پیش آئیں گے۔

اس کے بعد پومپی کی بدولت ملک شام پر رومنوں نے تسلط جما لیا۔ پومپی نے یروشلیم کو تباہ کر ڈالا۔ اور سکندر اعظم کی روایات کو از سر نو زندہ کرنے کی غرض سے تمام مغربی ایشیا کا دورہ کیا۔ ۶۲ سنہ قبل مسیح میں روما کو واپس لوٹا۔ بارہ جہاز جن پر کئی ہزیمت خوردہ بادشاہ اور شہزادے اور سپہ سالار سوار تھے۔ اپنے ساتھ لایا۔ جب روما پہنچا۔ تو فتح کی خوشی میں ایک جلوس نکالا۔ اور ان سب کو بازاروں میں پھرایا۔ روما کے لوگ اس کے رستے میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ کیونکہ پومپی اپنے ساتھ اتنا مال غنیمت لایا تھا۔ کہ رومنوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔

گویا ملک کا یہ حال تھا۔ کہ جس کی لاٹھی اسی کی بھینس۔ اس سے چند مہینے پہلے کا ذکر ہے۔ کہ ایک آوارہ مزاج امیرزادہ کیٹی لائن[4] نامی جوئے میں سب کچھ ہار بیٹھا۔ اور کچھ تدبیر بن نہ پڑی۔ تو لوٹ مار پر اتر آیا۔ اور روپیہ بٹورنے کے لئے بادشاہ بننے کا ارادہ کر لیا۔ ایک محب وطن وکیل کو جس کا نام سسرو[5] تھا۔ عین

---

[1] Julius Caesar [2] Dictato [3] Pompey

[4] Catuline [5] Cicero

وقت پر سازش کا پتہ چل گیا۔ اس نے سینیٹ کو آگاہ کر دیا۔ اور کیٹی لائن کو فرار ہونتے ہی بنی + لیکن ایک کیٹی لائن کو بھگا دینے سے کیا بنتا تھا + شہر میں ایسے کئی اور لالچی نوجوان منہ کھولے بیٹھے تھے۔ ضرورت تو اس بات کی تھی۔ کہ روما کی حکومت کسی زبردست شخص کے ہاتھ میں ہو۔ جو خود غرض اور مطلب پرست لوگوں کی پیش نہ چلنے دے +

پومپی نے انتظامی معاملات کی نگہداشت کے لئے ایک مجلس ثلاثہ[1] قائم کی۔ خود اس مجلس نگران کا صدر بنا۔ گائس جولیس سیزر[2] کو جو ہسپانیہ کا گورنر رہ کر بڑا نام پیدا کر چکا تھا۔ اپنا نائب مقرر کیا۔ کراسس[3] نامی ایک شخص کو تیسرا رکن بنایا۔ کراسس معمولی قابلیت کا آدمی تھا۔ اس کے تقرر کی وجہ یہ تھی۔ کہ بے انتہا دولتمند تھا۔ لڑائی کے دوران میں سامان جنگ کا ٹھیکہ دار رہ چکا تھا۔ اور وہاں سے بہت سا روپیہ کما لیا تھا + تھوڑے ہی عرصے بعد کراسس اہل پارتھین[4] کے خلاف ایک جنگ میں شریک ہوا۔ اور مارا گیا +

تینوں میں سے ہوشیار سیزر تھا۔ اس نے سوچا۔ کہ مقبول عام ہونے کے لئے شوکت فاتحانہ کی کسر ابھی کچھ باقی ہے + چنانچہ وہ الپس کو عبور کر کے وہ تمام علاقہ فتح کر لیا جسے آج کل ہم فرانس کہتے ہیں + پھر دریائے رائن[5] کو عبور کرنے کے لئے لکڑی کا ایک مضبوط پل بنایا۔ اور اہل ٹیوٹن کی سرزمین پر حملہ کر دیا + پھر جہازوں میں سوار ہو کر برطانیہ پہنچا۔ وہاں سے خدا جانے کہاں کا کہاں نکل جاتا۔ لیکن ایکا ایکی اطالیہ واپس آنا پڑا۔ اطلاع ملی۔ کہ پومپی عمر بھر کے لئے روما کا ڈکٹیٹر مقرر ہو گیا ہے۔ جس کا مطلب گویا یہ تھا۔ کہ سیزر کے لئے اب وہاں کوئی گنجائش نہیں۔ سیزر کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ لیکن آخر ماریئس کا شاگرد رہ چکا تھا۔ اس کا سکھایا ہوا سبق نہ بھولا۔ اور اسی کی بدولت سینیٹ کے ارکان اور ان کے ڈکٹیٹر کو لوہے کے چنے چبوائے + دریائے روبی کان[6] کو عبور کیا۔

---

[1] Triumvirate [2] Gaius Julius Caesar [3] Crassus

[4] Parthian [5] Rhine [6] Rubicon



سیزر کی مغرب کو روانگی

جو صوبۂ گال کو اطالیہ سے جدا کرتا تھا + جہاں جاتا - لوگ اُسے "عوام کا دوست" سمجھ کر سر پر اٹھا لیتے + چنانچہ بغیر کسی دقّت کے روما میں داخل ہو گیا - پومپی یونان بھاگ گیا - لیکن سیزر نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا - اور اس کے ساتھیوں کو فارسیلس کے قریب شکست دی - پومپی بحیرہ روم کو عبور کر کے مصر پہنچا - ساحل پر قدم رکھا ہی تھا - کہ نوجوان شاہ بطلیموس کے حکم سے مارا گیا چند دن بعد سیزر وہاں پہنچا - اور پہنچتے کے ساتھ ہی گھر گیا - پومپی کے وفادار رومن سپاہیوں نے مصریوں کے ساتھ مل کر سیزر کی فوج پر حملہ کر دیا +

لیکن سیزر کا نصیبہ یاور تھا - فتح و ظفر نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا - پہلے مصریوں کے جہازوں کو آگ لگا دی - (ساحل کے پاس ہی سکندریہ کا مشہور معروف کتب خانہ تھا - چنگاریاں چھت پر آگریں - اور تمام کا تمام کتب خانہ جل کر راکھ ہو گیا) اس کے بعد مصری لشکر پر حملہ کیا - اور انہیں مار کر دریائے نیل میں دھکیل دیا - بطلیموس بھی ڈوب گیا - سیزر نے اس کی بہن کلیوپٹرا کو تخت پر بٹھایا - ساتھ ہی خبر پہنچی - کہ متھریڈیٹز

ے Ptolemy

کے بیٹے فارنیسیز[۱] کے سر میں جنگ کا سودا سمایا ہے۔ سیزر نے شمال کی طرف کوچ کیا۔ اور پانچ دن کے اندر اندر فارنیسیز کو شکست دی۔ فتح کی خبر جن الفاظ میں روما بھیجی۔ وہ تاریخ میں بہت مشہور ہیں۔ صرف تین لفظوں کا پیغام تھا۔ وینی۔ ویڈی[۲]۔ ویچی۔ جس کے معنے ہیں "پہنچا۔ دیکھا۔ فتح کر لیا"۔ اس کے بعد پھر مصر کو لوٹا۔ یہاں ملکہ کلیوپیٹرا پر سو جان سے فدا ہو گیا۔ سنہ ۴۶ قبل مسیح میں حکومت کا کام سنبھالنے کے لئے روما کو پلٹا تو ملکہ اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ چار مہینوں میں سب دشمنوں کو نیچا دکھایا تھا۔ اس لئے روما میں سیزر کے چار جلوس نکالے گئے۔

اس کے بعد سیزر نے سینیٹ کے سامنے اپنے کارناموں کی روداد سنائی۔ سینیٹ نے ممنونیت کا اظہار کیا۔ اور سیزر کو دس سال کے لئے ڈکٹیٹر مقرر کر دیا۔ لیکن ایسا کرنے میں انہوں نے اپنے پاؤں آپ کلہاڑی ماری۔

نئے ڈکٹیٹر نے ممالک روما کی اصلاح کے لئے سرتوڑ کوششیں کیں۔ آزاد باشندوں کو سینیٹ کے ارکان بننے کا حق۔ اور دور دراز کی رعایا کو قدیم رومن دستور کے مطابق شہریت کے حقوق عطا کئے۔ غیر ملکی باشندوں کو موقع دیا۔ کہ وہ ضرورت کے وقت حکومت پر اپنا اثر ڈال سکیں۔ دور دراز صوبوں کو جنہیں بعض متمول خاندان اپنی ذاتی ملکیت سمجھنے لگے تھے۔ از سر نو منظم کیا۔ غرضیکہ کئی ایسے اہم امور انجام دئے جن کی بدولت عوام کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ لیکن ذی اقتدار لوگ اس سے نفرت کرنے لگے۔ پچاس کے قریب نوجوان امیرزادوں نے "جمہوریت کو بچانے کی غرض سے" آپس میں سازش کی۔ اس جنتری کے حساب سے جو سیزر مصر سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ مارچ کی پندرھویں تاریخ کو جب سیزر سینیٹ میں آیا۔ تو اسے قتل کر دیا گیا۔ اور روما کی سلطنت پھر قسمت آزماؤں کی جولانگاہ بن گئی۔

دو شخصوں نے سیزر کی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ ایک تو انٹنی[۳] تھا۔ جو سیزر کا مشیر خاص رہ چکا تھا۔ اور دوسرا اوکٹیوین[۴] جو سیزر کے چچا کا پوتا اور سیزر

---

۱ Pharnaces

۲ Vini, Vidi, Vici

۳ Antony

۴ Octavian

کی جائداد کا وارث تھا۔ اوکٹیوین نے روما کی ... اینٹنی مصر چلا گیا۔ کلیوپیٹرا کو دل سے چاہتا تھا۔ اور اس کی جدائی گوارا نہ تھی۔ (کلیوپیٹرا سے عشق کرنا رومن سپہ سالاروں کی عادت بن گیا تھا)۔

دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ ایکٹیم[1] کی لڑائی میں اوکٹیوین نے اینٹنی کو شکست دی۔ اینٹنی نے خودکشی کر لی۔ اور کلیوپیٹرا اکیلی رہ گئی۔ بڑی کوشش کی۔ کہ اوکٹیوین کو اپنے دامِ حسن میں گرفتار کرے۔ لیکن اس کا جادو نہ چلا۔ اس پر اس نے بھی خودکشی کر لی۔ اور مصر روما کے مقبوضات میں شامل ہو گیا۔

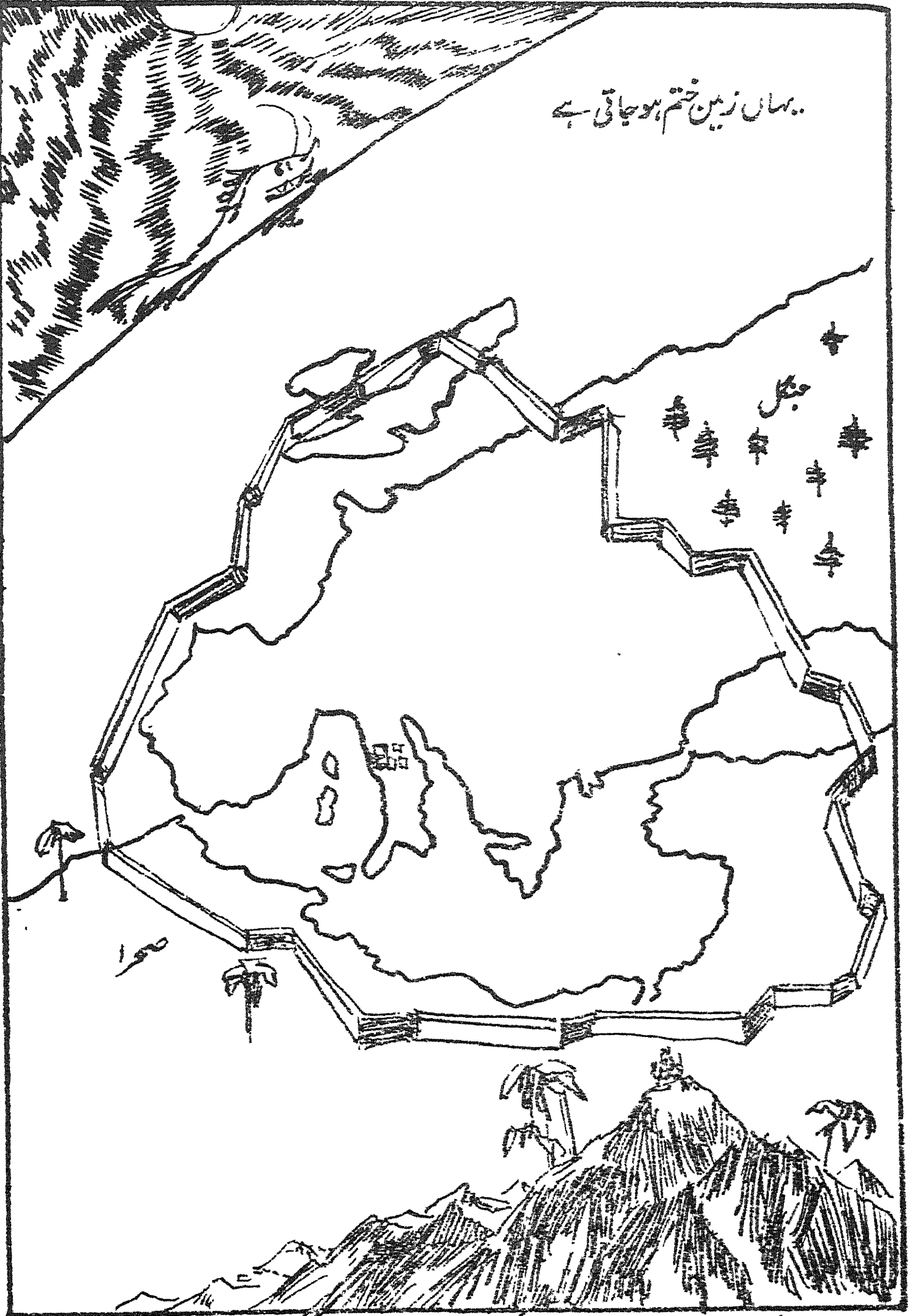
اوکٹیوین بڑا معاملہ فہم نوجوان تھا۔ چچا کی غلطیوں سے سبق سیکھا۔ جانتا تھا۔ کہ لمبے چوڑے القاب اختیار کئے تو لوگ چوکنے ہو جائیں گے۔ چنانچہ جب روما واپس آیا۔ تو ڈکٹیٹر بننے کا مطالبہ نہ کیا۔ صرف عزت مآب کے لقب ہی پر اکتفا کی۔ لیکن چند سال بعد جب سینیٹ نے اسے آگسٹس[2] یعنی "جلالت مآب" کے لقب سے مخاطب کیا۔ تو اس پر معترض نہ ہوا۔ اس کے چند سال بعد عوام اسے سیزر یا قیصر کہہ کر پکارنے لگے۔ اور فوج کے سپاہی جو اسے سپہ سالار سمجھتے تھے۔ امپریٹر یعنی امپیرر (شہنشاہ) کے لفظ سے مخاطب کرنے لگے۔ گویا عوام نے مطلق العنانیت کو بھی تسلیم کر لیا۔ اور روما کی جمہوری حکومت جمہوریت سے ملوکیت یعنی شخصی حکومت بن گئی۔

۱۴ عیسوی تک اوکٹیوین کی بادشاہی اس قدر مستحکم ہو گئی تھی۔ کہ لوگ دیوتاؤں کی طرح اس کی پرستش کرنے لگے۔ اور اس کے جانشین جو دنیا کی وسیع ترین مملکت کے مطلق العنان فرمانروا تھے۔ شاہنشاہ کہلائے۔

دراصل بات یہ ہے کہ روما کے باشندے خانہ جنگی اور طوائف الملوکی سے تنگ آ گئے تھے۔ وہ کہتے تھے چاہے کوئی حکمران ہو۔ لیکن ہمیں فسادات سے نجات دلائے۔ اور چین سے بیٹھنے دے۔ اوکٹیوین نے چالیس سال تک ملک میں امن قائم رکھا۔ ملک گیری کی ہوس بالکل نہ تھی۔ ۹ عیسوی میں اس نے شمال مغربی بیابانوں پر حملہ کرنا چاہا۔ جہاں اہل جرمن آباد تھے۔ لیکن اس کا جرنیل وارس[3] ٹیوٹوبرگ[4] کے جنگلوں

۱۔ Actium ۲۔ Augustus

۳۔ Varus ۴۔ Teutoberg



روما کی عظیم الشان مملکت

میں مع اپنے سپاہیوں کے مارا گیا۔ اس کے بعد رومنوں نے ان وحشی لوگوں کو مہذب بنانے کی کوششیں ترک کر دیں +

اس کی بجائے اندرونی اصلاحات کے اہم مسائل میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ لیکن ملک کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی۔ کہ اس کا سنورنا بہت مشکل تھا۔ دو سو سال تک جنگ اور فسادہی سے نجات نہ ملی تھی۔ اس عرصے میں نوجوانوں کی مسیں بھی بھیگنے نہ پاتی تھیں۔ کہ وہ مارے جاتے تھے۔ آزاد کسانوں کا طبقہ تباہ ہو چکا تھا متمول لوگوں نے کھیتی باڑی کے لئے غلام رکھ لئے تھے۔ آزاد کسان امرا کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ شہروں میں بیکار اور بے خانماں لوگوں کی کثرت تھی۔ جو مشکل سے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ اور جو طرح طرح کے امراض میں مبتلا رہتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سرکاری عہدے داروں کی بھرمار تھی جن کی تنخواہیں تھوڑی تھیں۔ اس لئے رشوت ستانی کا بازار گرم تھا + اس جنگ و جدل کے دور کا سب سے برا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ لوگوں کے منہ کو لہو لگ گیا۔ اور انہیں مردم آزاری اور کشت و خون کا چسکا پڑ گیا +

پہلی صدی عیسوی میں سلطنت روما بظاہر تو ایک عظیم الشان سیاسی عمارت معلوم ہوتی تھی جس کے ایک کونے میں سکندر کی وسیع مملکت سما گئی تھی۔ لیکن اس شاندار محل کے اندر مفلس اور درماندہ اور عاجز اور جفاکش لوگ کروڑوں کی تعداد میں ان چیونٹوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جو ایک بڑے وزنی پتھر کے نیچے کلبل کلبل کر رہے ہوں + محنت یہ کرتے تھے۔ مصیبتیں یہ جھیلتے تھے۔ اور اس مشقت کا پھل کوئی اور لے جاتا تھا۔ خود ڈھور ڈھنگروں کی طرح طویلوں میں رہتے تھے۔ اور تمام عمر بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی +

روما کو بنے ہوئے سات سو تریپن سال گزر چکے ہیں۔ گائس جولیس سیزر اوکٹیویس آگسٹس۔ روما کا عالی نسب جلالت پناہ شہنشاہ قیصر پیلاٹین[1] کی

---

[1] Palatine

بہادری پر اپنے عالیشان محل میں جلوہ افروز ہے۔ اور ایک وسیع مملکت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے +

اُدھر دور دراز ملک شام میں یوسف نجّار کی بیوی مریم اپنے ننھے سے بچّے کو جو بیتؒ اللحم کے ایک اصطبل میں پیدا ہُوا تھا۔ گود میں کھلا رہی ہے +

قدرت کے ڈھنگ نرالے ہیں +

ابھی دیکھنا تھوڑے ہی عرصے میں اصطبل اور محل کا مقابلہ ہوگا +

اور فتح اصطبل کو نصیب ہوگی +

لہ Bethlehem

یوشو انصرانی

یوشوا[1] نصرانی کی سرگزشت - جسے اہل یونان یسوع[2] کے نام سے پکارتے تھے

تعمیر روما کے آٹھ سو پندرھویں سال (جو ہمارے حساب سے ۶۲ عیسوی ہوتا ہے) موسم خزاں میں ایک رومن طبیب ایسکلیپئس کلٹیلس[3] نے اپنے بھتیجے کو جو فوج کے ہمراہ ملک شام کو گیا ہوا تھا - یہ خط لکھا :-

میرے پیارے بھتیجے ! چند دن ہوئے میں ایک مریض کو دیکھنے گیا جس کا نام پال[4] تھا شکل وصورت سے رومن شہری مگر یہودیوں کی اولاد معلوم ہوتا تھا - اچھا خاصہ تعلیم یافتہ آدمی تھا - اطوار و اخلاق نہایت شائستہ تھے - میں نے سن رکھا تھا - کہ مشرقی بحیرہ روم کے علاقے میں سیزریا[5] یا ایسا ہی کوئی شہر ہے - وہاں کوئی مقدمہ تھا - اس کی اپیل کرنے روما آبا ہے - لوگ تو کہتے تھے کہ بڑا سر پھرا آدمی ہے - اور خلاف قانون تقریریں کرتا پھرتا ہے لیکن میں نے اُسے بڑا عقلمند اور بہت ہی بھلا آدمی پایا ۔

ایک دوست کی زبانی جو فوج میں بھرتی ہو کر ایشیائے کوچک گیا تھا - معلوم ہوا - کہ یہی پال وہاں ایفسس[6] کے شہر میں ایک عجیب و غریب نئے خدا کی تبلیغ کرتا پھرتا تھا - میں نے پال سے اس امر کے متعلق دریافت کیا - اور یہ بھی پوچھا - کہ لوگ جو اُس پر رعایا کو ہمارے عزیز و محترم شاہنشاہ کے خلاف اکسانے کی تہمت دھرتے ہیں - وہ کہاں تک ٹھیک ہے - جواب میں کہنے لگا جس بادشاہی کا میں ذکر کرتا ہوں - وہ اس دنیا کی بادشاہی نہیں - کئی اور باتیں بھی کہیں - جو میری سمجھ میں نہ آئیں -

---

[3] Aesculapius Cultellus　[2] Jesus　[1] Joshua

[6] Ephesus　[5] Caesarea　[4] Paul

معلوم ہوتا ہے۔ بخار کی وجہ سے ہذیان ہوگیا تھا +

اس کی شخصیت کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہوا۔ چند دن ہوئے۔ جب میں نے سنا کہ وہ اوسٹیون[1] کی سڑک پر مارا گیا ہے۔ تو مجھے بیحد قلق ہوا۔ میں یہ خط تمہیں اس لئے لکھ رہا ہوں۔ کہ جب تم یوروشلیم جاؤ۔ تو میرے دوست پال کے حالات معلوم کرو۔ وہاں ایک عجیب وغریب یہودی پیغمبر بھی رہا کرتا تھا۔ جو میرے خیال میں پال کا استاد تھا۔ ہو سکے۔ تو اس کی بابت بھی دریافت کرنا۔ ہمارے غلاموں میں اس "مسیح" کی وجہ سے بہت ہیجان پیدا ہو رہا ہے۔ بعض کو جو کھلم کھلا اس نئی بادشاہی کا ذکر کرتے پھرتے تھے۔ سولی پر چڑھا دیا گیا ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ان باتوں میں سچائی کتنی ہے۔ تمہارا مشفق چچا ایسکیلیپس کلٹیلس +

بھتیجے کا نام گلیڈیس انسا[2] تھا۔ اور وہ سات نمبر گیلک[3] پلٹن میں کپتان تھا۔ چھ ہفتے بعد اس کی طرف سے یہ جواب آیا:۔

میرے پیارے چچا۔ آپ کا خط ملا۔ جو کچھ آپ نے کہا تھا۔ میں نے اس کی تعمیل کی +

دو ہفتے ہوئے ہمارے بریگیڈ کو یوروشلیم جانے کا حکم ہوا۔ اس سو سال کے عرصے میں یہاں کئی انقلاب رونما ہو چکے ہیں۔ اس لئے پرانے شہر کی صرف کہیں کہیں کوئی اینٹ باقی رہ گئی ہے۔ ہمیں یہاں ایک مہینہ ہوگیا ہے۔ کل ہم پیٹرہ[4] کی جانب کوچ کرینگے۔ کیونکہ وہاں کے عرب قبائل کچھ عرصے سے ہمیں تنگ کر رہے ہیں۔ آج شام ذرا فرصت تھی۔ تو میں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ لیکن اتنی فرصت نہیں کہ مفصل خط لکھ سکوں +

شہر کے بڑے بوڑھوں سے میں نے بات چیت کی۔ لیکن ان سے کچھ ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ دن ہوئے۔ ایک خوانچے والا ہمارے کیمپ میں آیا۔ میں نے کچھ زیتون خریدے اور پھر اس سے پوچھا۔ کیوں بھئی۔ لوگ جس مسیح کا ذکر کرتے پھرتے

---

[1] Ostion [2] Gladius Ensa [3] Gallic [4] Petra

ہیں۔ اس کا مارا جانا تو تمہارے بچپن کا واقعہ ہوگا۔ تمہیں کچھ یاد ہے؟ کہنے لگا ہاں صاحب اچھی طرح یاد ہے۔ شہر کے پاس ہی گلگوتھا نامی[ا] ایک پہاڑی ہے۔ وہیں یہ واقعہ ہوا۔ میرے ابا یہ کہہ کر مجھے ساتھ لے گئے تھے۔ کہ چل تجھے دکھائیں جوڈیا[۲] کے قوانین توڑنے والوں کا کیا حال ہوتا ہے۔ اس خوانچے والے نے مجھے یوسف نامی ایک شخص کا پتہ دیا۔ جو مسیح کا بڑا دوست تھا۔ اور مجھ سے کہنے لگا۔ اگر آپ کو اور کچھ پوچھنا ہو۔ تو اس سے جا کے پوچھئے ✦

آج صبح میں یوسف کے پاس گیا۔ بڑا بوڑھا آدمی ہے کسی زمانے میں ماہی گیری کا کام کرتا تھا۔ (یہاں پاس ہی میٹھے پانی کی کئی جھیلیں ہیں) حافظہ بہت اچھا تھا۔ اس کی زبانی اس فتنہ و فساد کے حالات مفصل معلوم ہوئے۔ یہ میری پیدائش سے بھی پہلے کا ذکر ہے ✦



ارضِ مقدس

[ا] Golgotha [۲] Judaea

ان دنوں ہمارے شاہنشاہ عالیجا ٹائبیریس کا عہد تھا۔ اور پونٹیس پائلیٹس[1] نامی ایک افسر جوڈیا اور سمیریا[2] کا گورنر تھا۔ یوسف کو اس پائلیٹس کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ لیکن قرائن سے پایا جاتا ہے۔ کہ ایماندار افسر تھا۔ اور خراج وصول کرنے کا کام دیانتداری سے سرانجام دیتا تھا۔ بہرحال ۸۳ء یا ۸۴ء سن میں (یوسف کو ٹھیک یاد نہ تھا) یوروشلیم میں فساد بپا ہو گیا۔ اور پائلیٹس کو وہاں جانا پڑا۔ وہاں لوگوں میں یہ مشہور تھا۔ کہ ایک نوجوان شخص نیزارتھ[3] کے ایک بڑھئی کا بیٹا رومن حکومت کے خلاف بغاوت کی سازش کر رہا ہے۔ تعجب کی بات ہے۔ کہ ہمارے اپنے مخبر جو عموماً ہر بات پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اس سازش سے محض بےخبر تھے۔ انہوں نے تحقیقات کے بعد یہ رپورٹ پیش کی۔ کہ بڑھئی بچارا تو بہت بھلا آدمی ہے۔ اور بالکل بیگناہ ہے۔ لیکن یہودیوں کے قدامت پسند مذہبی رہنما بہت پریشان تھے۔ کیونکہ وہ بڑھئی غریب یہودیوں میں بہت مقبول ہو رہا تھا۔ اور اور انہیں یہ بات ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس نصرانی نے اعلان کر دیا تھا۔ کہ اگر کوئی یونانی یا رومن یا فلسطینی بھی نیک زندگی بسر کرے۔ تو وہ کسی طرح بھی اس یہودی سے کم نہیں جو تمام عمر حضرت موسےٰ کے قوانین کے مطالعے میں صرف کر دیتا ہے پائلیٹس پر اس بات کا تو کچھ اثر نہ ہوا۔ لیکن جب عبادتگاہ کے اردگرد لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ اور لوگ یسوع کو زدوکوب کرنے لگے۔ اور اس کے پیروؤں کو جان سے مارنے کے در پے ہوئے۔ تو اس بڑھئی کی جان بچانے کے لئے پائلیٹس نے اُسے اپنی حراست میں لے لیا۔

معلوم ہوتا ہے۔ پائلیٹس جھگڑے کی اصلیت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ جب کبھی وہ یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں سے پوچھتا۔ کہ معاملہ کیا ہے۔ تو وہ "بدعت۔ بدعت" اور "بغاوت۔ بغاوت" کرنے لگتے۔ اور جوش کے مارے آپے سے باہر ہو جاتے۔ یوسف کا بیان ہے۔ کہ آخرکار پائلیٹس نے یوشوا کو بلایا (اس شخص کا نام یوشوا تھا۔ لیکن یہاں کے یونانی سب اسے یسوع کہتے ہیں) اور

---

[1] Pontius Pilatus [2] Samaria [3] Nazareth

کئی گھنٹوں تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس سے پوچھا۔ وہ کونسے خطرناک عقیدے ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں تم گیلیلی[1] کے کنارے لوگوں میں پھیلاتے رہے ہو۔ یسوع نے جواب دیا۔ مجھے سیاسیات سے کچھ تعلق نہیں۔ مجھے انسانوں کے جسم سے اتنی دلچسپی نہیں۔ جتنی ان کی روح کی فکر ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں۔ کہ لوگ اپنے پڑوسی کو اپنا بھائی سمجھیں اور خدائے واحد سے محبت رکھیں۔ کیونکہ وہی سب جانداروں کا باپ ہے۔

پائیلیٹس کو جو حکمائے یونان کے عقیدوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس میں کوئی باغیانہ بات نظر نہ آئی۔ اس نے اس نیک سیرت پیغمبر کی جان بچانے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ اور سزائے موت کو ملتوی کرتا رہا۔ لیکن یہودی لوگ اپنے رہنماؤں کے اکسانے پر غصے کے مارے دیوانے ہو گئے۔ یوروشیلم میں اس سے پہلے کئی دفعہ فساد ہو چکا تھا۔ اور آس پاس کے رومن سپاہیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ سیزریا میں حکام کو اس مطلب کی رپورٹیں پہنچتی تھیں۔ کہ پائیلیٹس یسوع پر ایمان لے آیا ہے۔ شہر کے لوگ ایک محضر نامے پر دستخط کراتے پھرتے تھے جس میں یہ لکھا تھا۔ کہ پائیلیٹس شاہنشاہ کا دشمن ہے۔ اسے واپس بلا لیا جائے۔ آپ جانتے ہیں۔ ہمارے گورنروں کو خاص طور پر تاکید کی جاتی ہے۔ کہ غیر ملکی رعایا کے ساتھ کھلم کھلا لڑنے سے احتراز کریں۔ ملک کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے پائیلیٹس نے اس قیدی کو مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ یوشوا نے اپنے وقار اور سکون کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور سب دشمنوں کو معاف کر دیا۔ جب اسے سُولی پر چڑھایا گیا۔ تو یوروشیلم کے لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔ اور خونخوار درندوں کی طرح چیخیں مار رہے تھے۔

جب یوسف مجھے یہ باتیں سنا رہا تھا۔ تو اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے چلتے ہوئے میں اسے ایک اشرفی دینے لگا۔ لیکن اس نے قبول نہ کی۔ کہنے لگا۔ جو مجھ سے غریب ہو اُسے دے دینا۔ میں نے آپ کے دوست پال کے متعلق بھی کئی سوالات پوچھے۔ یوسف کی پال سے سرسری سی ملاقات تھی۔ پال خیمہ فروشوں کا کام کرتا تھا۔ لیکن اپنا

---

[1] Galilee

کام چھوڑ چھاڑ کر واعظ بن گیا۔ اور ہر جگہ اس شفیق و رحیم خداوند کا کلام لوگوں کو سنانے لگا۔ جو یہودیوں کے خداوند یہوواہ سے کہیں مختلف تھا + اس کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ پال ایشیائے کوچک اور مصر میں دور دور تک پھرتا رہا۔ جہاں جاتا وہاں غلاموں کو یہ خوشخبری سناتا۔ کہ تم سب ایک شفیق باپ کی اولاد ہو۔ کوئی غریب ہو یا امیر اگر اس نے نیک زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور مصیبت زدوں کی دستگیری کی ہے۔ تو مسرتیں اس کا انتظار کر رہی ہیں +

امید ہے۔ اس خط سے آپ کو اپنے سوالات کا جواب پوری طرح مل جائے گا۔ جہاں تک سلطنت اور حکومت کا تعلق ہے میرے خیال میں اس تمام واقعے میں ایک بات بھی ایسی نہیں جو خطرے کا موجب ہو سکے۔ لیکن ہم رومن لوگ ہمیشہ اس علاقے کے باشندوں کی ذہنیت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں + مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔ کہ آپ کا دوست پال مارا گیا + آپ لوگ سب مجھے اکثر یاد آتے ہیں +

آپ کا فرمانبردار بھتیجا

گلیڈیس انسا

زوالِ روما

مملکت روما کی شام

تاریخ قدیم کی درسی کتابیں تو یہی کہتی ہیں۔ کہ روما کا زوال ۴۷۶ء کا واقعہ ہے۔ کیونکہ یہی وہ سال ہے جس میں روما کا آخری شاہنشاہ تخت سے محروم کر دیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ روما نہ ایک دن میں بنا۔ نہ ایک دن میں بگڑا بنتے بنتے کئی سال صرف ہوئے۔ تو بگڑنے بگڑتے بھی کئی برس گزر گئے۔ مگر جب زوال آیا۔ تو ترقی کے زینے سے ایسا آہستہ آہستہ نیچے اترا۔ کہ لوگوں کو محسوس بھی نہ ہونے پایا + اکثر رومن اس بات سے بیخبر تھے کہ اس چمن میں اب خزاں آ رہی ہے + زمانے کی ناسازگاری کا شکوہ ضرور کرتے۔ جنس کی مہنگائی اور اُجرت کی کمی کا رونا ضرور روتے۔ غلہ اور اون سمیٹ لینے والے زر اندوز تاجروں کو ضرور کوستے۔ کبھی کبھار کسی حد سے زیادہ حریص گورنر کے خلاف اُٹھ بھی کھڑے ہوتے۔ تاہم مسیح کی پیدائش سے چار سو سال بعد تک اکثر لوگوں کی یہ حالت تھی۔ کہ جیسی توفیق ہوتی۔ ویسے اپنا کھا پی لیتے۔ اپنی اپنی فطرت کے مطابق کوئی نفرت کا کوئی الفت کا شیوہ اختیار کر لیتا۔ شمشیر باز پہلوانوں کا کھیل مفت دیکھنے کو ملتا۔ تو تھیٹر چلے جاتے۔ جو غریب ہوتے وہ بڑے شہروں کے غلیظ گلی کوچوں میں بھوکوں مرتے۔ مگر جیسے بھی تھے۔ اس بات کا علم انہیں بالکل نہ تھا۔ کہ اس وسیع مملکت کا کام پورا ہو چکا ہے۔ اور اب دنیا کی کوئی طاقت اسے فنا کے تھپیڑے سے نہیں بچا سکتی +

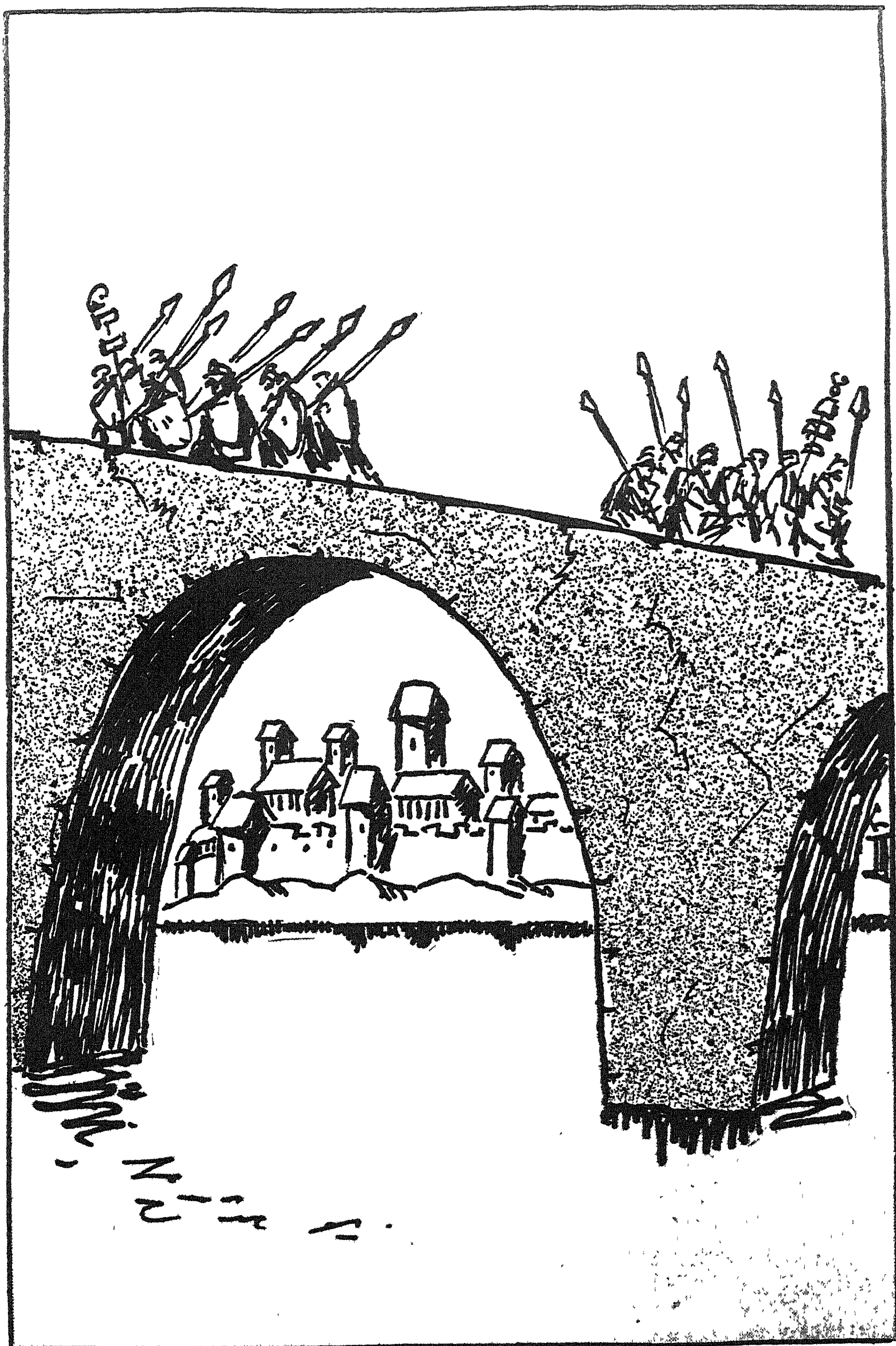
اس شدنی انجام کا احساس بھی کیونکر ہوتا۔ روما کی ظاہری شان و شوکت تو ایسی تھی۔ کہ آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی تھی + صوبوں کے درمیان پختہ سڑکیں بچھی ہوئی تھیں۔ مستعد اور چوکس شاہی پہرہ داروں نے قزاقوں اور رہزنوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ملک کو ان وحشی قبائل کی دستبرد سے بچانے کے لئے جو شمالی یورپ کے

بیابانوں کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ سرحدوں کی سخت پاسبانی کی جاتی تھی۔ دنیا کا چپہ چپہ جلیل القدر روما کا باجگزار تھا۔ اور بڑے بڑے مدبرین ملک اور عمائد سلطنت گزشتہ غلطیوں کی تلافی کرنے اور جمہوریت قدیم کی خوشحالی کو واپس لے آنے کے لئے رات دن اپنا پسینہ بہا رہے تھے +

لیکن اُن خرابیوں کا علاج کسی نے نہ کیا جن کا ذکر میں پچھلے باب میں کر چکا ہوں۔ وہ اندر ہی اندر گھُن کی طرح اس سلطنت کو کھائے جا رہی تھیں۔ جب تک وہ دور نہ ہوتیں۔ ملک کی اصلاح کس طرح ہو سکتی تھی +

سچ پوچھو۔ تو ایتھنز اور کورنتھ کی طرح جو قدیم ہیلس کی شہری سلطنتیں تھیں۔ روما بھی فی الحقیقت۔ کیا اول اور کیا آخر محض ایک شہری سلطنت تھا۔ جس نے سب اطالیہ پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ لیکن روما کا یہاں سے گزر کر تمام مہذب دنیا پر حکومت کر لینا سیاسی ناممکنات میں سے تھا۔ جب روما نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا تو آج نہ کل اس کا زوال یقینی تھا۔ نوجوان آئے دن کی لڑائیوں میں مر کھپ گئے۔ اور کسان طویل عرصے تک فوجی خدمت سرانجام دیتے دیتے اور محصولات ادا کرتے کرتے کنگال ہو گئے۔ تو گداگری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ یا متمول زمینداروں کے ہاں جا کر ملازمت کر لی۔ وہاں انہیں محنت کا معاوضہ کھانے کو روٹی اور رہنے کو جگہ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہ ملتا۔ امیروں نے اپنا کاشتکار بنا کر انہیں اُن بدبخت اور سوختہ اختر انسانوں کے زمرے میں شامل کر دیا۔ جو نہ غلام ہیں نہ آزاد۔ اور جو انسانیت کے رتبے سے گر کر درختوں اور مویشیوں کی طرح محض زمینداروں کے املاک و اراضیات کا ایک جزو بن گئے ہیں +

مملکت اور سلطنت تو بڑی چیز سمجھی جاتی تھی۔ لیکن عام شہریوں کی حیثیت صفر کے برابر تھی۔ باقی رہے غلام۔ سو وہ پال کا کلام سن چکے تھے۔ اور نصرانی بڑھئی یعنی یسوع پر ایمان لے آئے تھے۔ وہ اپنے مالکوں سے کبھی سرکش نہ ہوئے۔ بلکہ اس کے برعکس اپنے مذہب کی تعلیم کے مطابق عجز و انکسار کے ساتھ ان کے احکام کی تعمیل کرتے رہے۔ اتنا ضرور تھا۔ کہ دنیا چونکہ مصائب و آلام کا گھر بن گئی تھی۔ اس لئے دنیاوی دھندوں میں انہیں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ مقرب بارگاہ خداوندی بننے کے لئے وہ نفس کے ساتھ جنگ لڑنے کو تیار رہتے تھے۔ مگر کسی ہوسناک شہنشاہ کی خاطر جو اپنی شان و شوکت



بڑھانے کے لئے اہل پارتھیں یا اہل نومیڈین[1] یا اہل سکاٹ[2] کے ملک پر حملہ کرنے کا آرزومند ہو تلوار اٹھانے کے لئے تیار نہ تھے +

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ شروع شروع کے رومن شاہنشاہ تو رعایا کے رہنما اور ہادی تھے۔ اور یہ وہ صفت ہے جس کی بدولت قدیم زمانے میں بھی قبیلوں کے سردار اپنے ساتھیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے لیکن دوسری اور تیسری صدی کے شاہنشاہ محض فوجی آدمی تھے۔ جنگ اُن کا پیشہ تھا۔ زندگی ہر وقت خطرے میں تھی۔ حفاظت کے لئے محل کے دروازے پر پری ٹوریئن[3] یعنی خاص شاہی پہرہ دار کھڑے رہتے تھے۔ یہ شاہنشاہ یکے بعد دیگرے بڑی سرعت کے ساتھ قتل ہونے لگے۔ ایک مارا جاتا۔ تو اس کا قاتل تخت پر قابض ہو جاتا۔ اور جب اس کے وارث اتنا روپیہ فراہم کر لیتے۔ کہ پہرہ داروں کو رشوت دے کر اپنے ساتھ گانٹھ سکیں۔ تو اسے بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا +

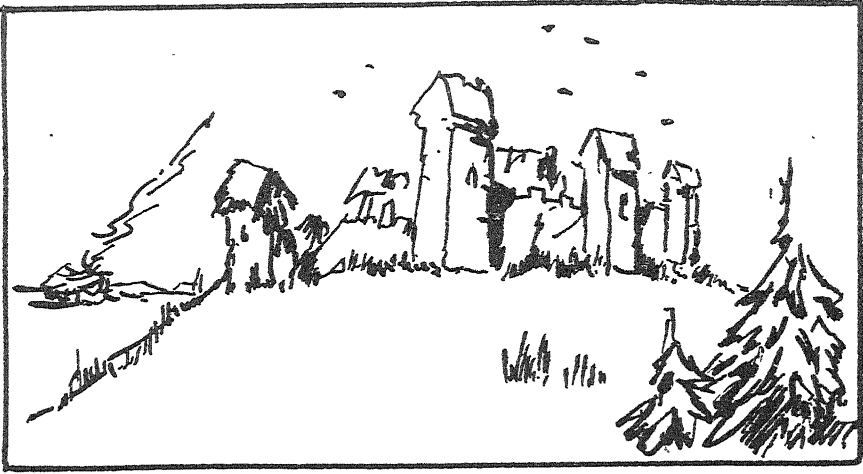
اس دوران میں بربری[4] لوگ شمالی سرحد پر متواتر حملے کر رہے تھے۔ رومنوں کی اب اپنی فوجیں کہاں جو جا کر ان کا انسداد کرتیں۔ اس لئے غیر ملکی باشندوں کی ایک تنخواہ دار فوج مرتب کی۔ لیکن تنخواہ دار سپاہی جو حملہ آور غنیم کا ہم قوم و ہم نسل تھا۔ دشمن کو دشمن نہ سمجھتا۔ اس لئے اس جوش و خروش سے نہ لڑتا۔ جس کی توقع رومنوں سے ہو سکتی تھی + بالآخر تجربے کے طور پر رومنوں نے بعض غیر ملکی قبائل کو اپنی مملکت کی حدود کے اندر لا آباد کیا۔ رفتہ رفتہ ان قبیلوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا + محصولات جمع کرنے والے رومن افسر اتنے حریص اور لالچی تھے۔ کہ بعض اوقات ان سے کوڑی کوڑی چھین کر لے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اہل قبائل نے اس بدسلوکی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر جب کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ تو کوچ کر کے روما جا پہنچے۔ اور وہاں خوب چیخے چلائے +

اس چیخ پکار اور عرض معروض سے تنگ آکر شاہنشاہ قسطنطین[5] نے جو ۳۲۳ء

---

[1] Numidians — [2] Scots — [3] Praetorians

[4] Barbarians — [5] Constantine



رومن شہر بربری حملے کے بعد

سے ۳۳۷ء تک حکمران رہا) دار السلطنت بدلنے کا ارادہ کرلیا۔ اور روما کو چھوڑ کر بازنطیم[1] کو (جو یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارت کی سب سے بڑی گزرگاہ تھا) اپنا دارالخلافہ مقرر کیا۔ مگر شہر کا نام بدل کر قسطنطنیہ[2] کر دیا + شاہ قسطنطین کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹوں نے انتظام و انصرام ملکی میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے مملکت کے دو حصے کر لئے۔ بڑا بھائی روما چلا آیا۔ اور مملکت غرب پر حکومت کرنے لگا۔ چھوٹا بھائی قسطنطنیہ ہی میں رہا۔ اور مملکت شرق کا شاہنشاہ کہلایا +

چوتھی صدی میں قوم ہُن[3] قہر الٰہی بن کر نازل ہوئی + یہ پُراسرار لوگ ایشیا کے رہنے والے شہسوار تھے۔ دو سو سال سے بھی زیادہ عرصے تک شمالی یورپ میں مقیم رہے۔ اور وہاں کشت و خون کا بازار گرم رکھا۔ تا آنکہ ۴۵۱ء میں فرانس کے شہر شالوں سُر مارن[4] کے قریب شکست کھائی + جب ہن ڈینیوب تک پہنچ گئے۔ تو اہل گاتھ[5] کو تنگ کرنے لگے۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے روما پر حملہ آور ہوئے شہنشاہ ویلنس[6]

---

[1] Byzantium — [2] Constantinople

[3] Huns — [4] Chalons-sur-Marne

[5] Goths — [6] Valens

نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن ۳۷۸ء میں ایڈریانوپل[1] کے قریب مارا گیا۔ بیس سال بعد ہی مغربی گاتھ اپنے بادشاہ الارک[2] کی سرکردگی میں مغرب کی طرف بڑھے۔ اور پھر ایک بار روما پر حملہ آور ہوئے۔ لوٹ مار سے احتراز کیا۔ اور صرف چند محلات کے انہدام پر اکتفا کی۔ ان کے بعد وینڈل[3] آئے۔ انہوں نے روما کی قدیم اور شہرہ آفاق احترام روایات کی کچھ پروا نہ کی۔ اس کے بعد اہل برگنڈی[4]۔ کچھ مشرقی گاتھ۔ کچھ ایمانی[5] پھر فرنگی[6] آئے۔ غرضیکہ حملہ آوروں کے سیلاب نے تھمنے کا نام نہ لیا۔ آخر میں روما کی یہ حالت ہو گئی۔ کہ جو حوصلہ مند قزاق چند ڈاکوؤں کو اپنے ساتھ ملا لیتا وہی شہر پر دھاوا بول دیتا۔

۴۰۲ء میں شاہنشاہ بھاگ کر راوینا[7] جا بیٹھا۔ جو سمندر کے کنارے پر واقع تھا۔ اور مستحکم طور پر قلعہ بند تھا۔ لیکن ۴۷۶ء میں اوڈوکر[8] نامی ایک شخص نے سر اٹھایا۔ (یہ ان جرمن تنخواہ دار سپاہیوں کا سپہ سالار تھا۔ جو اطالیہ کے کھیتوں کو آپس میں بانٹ لینا چاہتے تھے) رفتہ رفتہ اتنا زور پکڑا کہ مملکت غربی کے آخری شاہنشاہ راملوس آگسٹولس[9] کو تخت سے اتار دیا۔ اور خود پیٹریشن[10] یعنی حکمران روما بن بیٹھا۔ مملکت شرقی کا شاہنشاہ اپنے دھندوں میں لگا ہوا تھا۔ اس نے اوڈوکر کی بادشاہی کو جھٹ تسلیم کر لیا۔ اوڈوکر مملکت غرب کے باقیات پر دس سال تک حکومت کرتا رہا۔

چند سال بعد مشرقی اہل گاتھ کے بادشاہ تھیوڈورک[11] نے اس نئی حکومت پر حملہ کر دیا۔ راوینا کو فتح کیا۔ اوڈوکر کو اس کے دسترخوان پر قتل کر ڈالا۔ اور مملکت غرب کے کھنڈرات پر اہل گاتھ کی سلطنت کھڑی کر دی۔ لیکن یہ سلطنت بہت عرصے تک قائم نہ رہی۔ چھٹی صدی میں لونگوبارڈ[12] اور سیکسن[13] اور سلافیوں[14] اور آوار[15] کی اقوام نے مل جل کر اطالیہ پر حملہ کر دیا۔ اہل گاتھ کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا۔ اور ایک

---

[1] Adrianople [2] Alaric [3] Vandals

[4] Burgundians [5] Alemanni [6] Franks

[7] Ravenna [8] Odoacer [9] Romulus Augustulns

[10] Patrician [11] Theodoric [12] Longobards

[13] Saxons [14] Slavs [15] Avars

نئی حکومت قائم کر دی جس کا دارالخلافہ پاویا[1] مقرر کیا۔

اس کے بعد روما کو کسی نے نہ پوچھا۔ پرانے شاہی محل ایک نہیں ہزار بار لٹ چکے تھے۔ مدرسے آگ کی نذر ہو چکے تھے۔ علما بھوکوں مر گئے تھے۔ جن بنگلوں میں کبھی امرا جلوہ افروز تھے۔ وہاں اب میلے کچیلے لمبے لمبے بالوں والے بربری رہتے تھے۔ سڑکوں کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ پل سب ٹوٹ چکے تھے۔ تجارت کا بازار سرد تھا۔ وہ تہذیب جو مصریوں اور بابلیوں اور یونانیوں اور رومنوں کی ہزارہا سال کی محنت کا نتیجہ تھی۔ اور جس نے انسان کو ایسی بلندی اور رفعت پر پہنچا دیا تھا۔ جو اس کے قدیم ترین آبا و اجداد کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی۔ یورپ سے رخصت ہو رہی تھی۔

اس میں شک نہیں۔ کہ مشرق میں قسطنطنیہ کا شہر ابھی اور ایک ہزار سال تک ایک مملکت کا مرکز بنا رہا۔ لیکن قسطنطنیہ دراصل یورپ نہیں ایشیا کا شہر تھا۔ اس کی تمام دلچسپیاں مشرق سے وابستہ تھیں۔ اور وہ اپنے مغربی حسب نسب کو فراموش کر چکا تھا۔ رومن زبان کی جگہ اب یونانی زبان نے لے لی تھی۔ رومن ابجد متروک ہو گئی۔ رومن قوانین یونانی رسم الخط میں لکھے جانے لگے۔ اور ان کی توضیح و تشریح یونانی قانون دان کرنے لگے۔ بادشاہ کی حیثیت مشرق کے ایک مطلق العنان بادشاہ کی سی بن گئی جس طرح آج سے تین ہزار سال پہلے تھیبز کے بادشاہ وادی نیل میں دیوتاؤں کی طرح پوجے جاتے تھے۔ ویسے ہی شاہ قسطنطنیہ کی بھی پرستش ہونے لگی جب کلیسائے قسطنطنیہ کے سلاطین نے تبلیغ کے دائرے کو وسعت دینا چاہا۔ تو مشرق ہی کا رخ کیا۔ اور بازنطیم کی تہذیب کو روس کے وسیع بیابانوں تک پہنچا دیا۔

باقی رہے مغربی ممالک سو وہ بربریوں کے رحم پر تھے۔ وہاں تین چار سو سال تک آشفتگی اور غارتگری۔ جنگ و جدل اور کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ ایک چیز اور صرف ایک چیز نے یورپ کو ہلاکت اور فنا سے بچایا۔ ورنہ وہ یقیناً ایک بار پھر درندوں اور وحشیوں کا ملک بن جاتا۔

یہ کلیسا ہی تھا جس نے آن کر یورپ کو اس بہیمیت سے بچا لیا۔ اور کلیسا کیا تھا؟ مسکین اور عاجز مردوں اور عورتوں کا ایک گروہ جو کئی صدیوں سے نصرانی بڑھئی یسوع کا پیرو تھا۔ اُس یسوع کا جو صرف اس لئے سولی پر چڑھایا گیا۔ کہ ملک شام کے ایک چھوٹے سے حقیر سرحدی شہر میں دنگا فساد نہ ہونے پائے۔

[1] Pavia پاویا

کلیسا کا عروج

روما مسیحی دنیا کا مرکز کیونکر بنا

مملکت روما کے سمجھدار اور ذہین فہم لوگ اپنے آباؤ اجداد کے چھوٹے موٹے تو کیا بڑے بڑے دیوتاؤں سے بھی چنداں عقیدت نہ رکھتے تھے۔ سال بھر میں چند مرتبہ عبادت گاہ تک ہو آتے لیکن وہ بھی محض اتباعِ رسم کے طور پر کسی تہوار کے موقع پر بازاروں میں مذہبی جلوس نکلتا۔ تو اسے ایک مصیبت سمجھ کر دیکھ لیتے۔ جیپٹر[1] اور منروا[2] اور نیپٹیون[3] کی عبادت ان کے نزدیک ایک طفلانہ حرکت تھی۔ دل میں سمجھ رکھا تھا۔ کہ پرانے زمانے میں کئی جہالت کی باتیں مروج تھیں۔ یہ دیوتاؤں کی عبادت بھی اسی زمانہ جاہلیت کی نشانی ہے۔ بھلا جو لوگ سٹوئک[4] اور اپیقورسی[5] اور ایتھنز کے اور بڑے بڑے فلسفیوں کا مطالعہ کر چکے ہوں۔ وہ ایسی رسوم کو کیا بھی قابلِ توجہ سمجھتے؟

مذہب نہ رہا۔ تو مذہبی تعصب کیا ہوتا۔ ہر شخص کو اجازت تھی۔ کہ جن دیوتاؤں کو چاہے مانے جس طرح چاہے ان کی پرستش کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہر عقیدے اور ہر مذہب کے لوگوں نے اپنی اپنی عبادت گاہیں بنا لیں۔ کہیں مصری دیوتاؤں کی پرستش ہو رہی ہے۔ کہیں افریقی معبود پوجے جا رہے ہیں کہیں ایشیائی دیوتاؤں کے پرستار جمع ہیں۔ غرضیکہ روما کا شہر معابد کا اچھا خاصا عجائب خانہ بن گیا + حکومت نے اپنی ہر عبادتگاہ میں شاہنشاہ کی ایک مورتی نصب کر رکھی تھی۔ اور ہر شخص پر خواہ وہ رومن ہو یا بابلی۔ یہودی ہو یا یونانی۔ اس کا ظاہری احترام واجب تھا۔ لیکن یہ یونہی ایک رسمی سی بات تھی۔ کسی کو جبراً اپنا ہم عقیدہ بنانا مقصود نہ تھا +

۱؎ Jupiter　۲؎ Minerva　۳؎ Neptune

۴؎ Stoics　۵؎ Epicureans

جب یسوع کے اولین پیرو روما پہنچے - اور اخوتِ انسانی کی تلقین کرنے لگے - تو کسی نے اُن سے تعرض نہ کیا - جہاں بازار میں کوئی عیسائی مبلغ وعظ کرنے کھڑا ہو جاتا - راہ چلتے لوگ اس کی باتیں سننے کو ٹھیر جاتے - روما کا شہر سب دنیا کا دارالسلطنت تھا - بھانت بھانت کے جہاں گرد لوگ اپنے اپنے کیش و دین کی تلقین کرتے پھرتے تھے بیشتر مبلغین جب لوگوں کے سامنے اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرتے - تو یہی کہتے - کہ ہمارے دیوتاؤں پر ایمان لانے والوں کو بڑا اجر ملیگا - دولت و ثروت گھر کی لونڈی بن جائیگی - زندگی ہمیشہ عیش و عشرت میں بسر ہوگی - عُسرت اور دُکھ پاس نہ پھٹکیگا - غرضیکہ طرح طرح کی لذات اور آسائشوں کے سبز باغ دکھاتے - تھوڑے ہی عرصے کے اندر عوام کو ان لوگوں اور عیسائیوں میں ایک نمایاں فرق محسوس ہونے لگا - عیسائیت کی تلقین کرنے والے سونے چاندی کا ذکر تک نہ کرتے تھے - جاہ دنیوی کو ہیچ سمجھتے تھے - اور عُسرت اور انکسار اور حلم اور تواضع کو بڑی خوبیاں بتاتے تھے - اہل روما کو یہ باتیں سن کر بڑا اچنبھا ہُوا جن صفات کی بدولت انہوں نے دنیا پر اپنا تسلّط جمایا تھا - وہ حلم اور انکسار کے بالکل ہی برعکس تھیں - ادھر ان کا آفتاب جاہ و جلال نصف النہار پر تھا - ادھر عیسائی اُن سے آکر یہ کہتے تھے - کہ تمہیں ابدی مسرت مطلوب ہے - تو یہ شان و شوکت اور یہ ٹیپ ٹاپ تمہارے کسی کام نہ آئیگی - لوگوں کو یہ باتیں بڑی نرالی معلوم ہوئیں ؎

عیسائی مبلغ یہ بھی کہتے تھے - کہ اگر ہمارے سچّے خدا کے کلام پر کان نہ دھروگے - تو ایک نہ ایک دن عذاب الیم میں گرفتار ہو جاؤ گے - یہ سن کر رومنوں کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہُوا - کہ اگر ہمارے قدیم دیوتا اس ایشیائی خدا کا مقابلہ نہ کر سکے - تو مفت میں لینے کے دینے پڑ جائیں گے - دل میں طرح طرح کے شک گزرتے - اور بار بار اس نئے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کرتے + رفتہ رفتہ ان لوگوں سے میل ملاقات ہوئی - جو یسوع کا کلام سناتے پھرتے تھے + رومنوں نے انہیں اپنے مذہبی رہنماؤں سے بہت مختلف پایا - دیکھا کہ سب کے سب عُسرت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں - غلاموں اور بے زبان جانوروں پر بڑا ترس کھاتے ہیں - دولت کی ہوس نہیں رکھتے - بلکہ جو تھوڑا بہت پاس ہو - وہ بھی خیرات کر دیتے ہیں - ان کی بے غرض اور بے لوث زندگی کو دیکھ کر رومنوں کا دل اپنے مذہب سے کھٹا ہو گیا - اپنی عبادتگاہوں کو چھوڑ کر عیسائیوں کے زمرے میں شامل ہونے لگے -

جن کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں کسی مکان کے کمرے میں یا باہر کسی کھُلے میدان میں اکٹھے ہو کر اپنے خدا کی پرستش کیا کرتی تھیں +

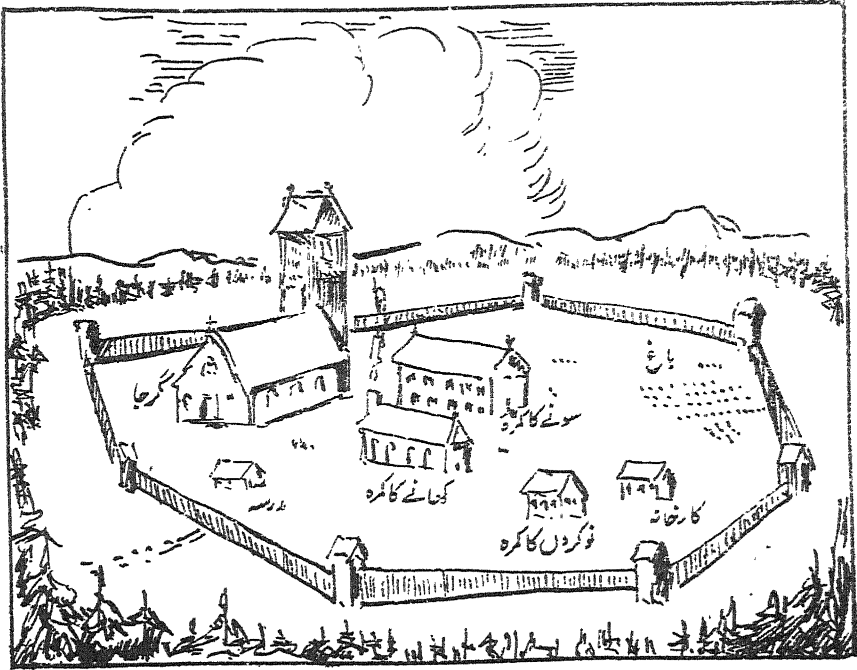
یہ صورت حالات ۱۰۰ یا ۱۵۰ سال تک قائم رہی۔ حتیٰ کہ عیسائیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ چھوٹے چھوٹے گرجاؤں کی غور پرداخت کے لئے پادری منتخب ہوئے۔ ایک صوبے کی تمام چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے اوپر ایک اسقف مقرر ہوا + پطرس[ل] جو پال کے بعد روما آیا تھا۔ روما کا پہلا اسقف قرار پایا۔ اس کے جانشین پاپا[۲] کہلائے۔ (پاپا کے معنے باپ کے ہے) +

کلیسائے مسیحی نے مملکت روما کے اندر رفتہ رفتہ بہت قوت حاصل کر لی + جو شکستہ دل لوگ دنیا سے بیزار ہو چکے تھے۔ انہیں عیسائیت نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جو ہمت اور حوصلے والے لوگ شاہنشاہ روما کی سرکار میں پڑے سڑ رہے تھے۔ انہوں نے ہادئ نصرانی کے معتقدین میں شامل ہو کر وہاں اپنی قیادت کے جوہر دکھائے۔ آخر کار حکومت کے کان کھڑے ہوئے۔ یہ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ کہ سرکار روما مذہب سے لاپرواہ لہٰذا غیر متعصب تھی۔ اس لئے ہر ایک کو اجازت تھی۔ کہ نجات حاصل کرنے کا جو طریقہ اس کے نزدیک اولےٰ ہو۔ بے دھڑک اس پر عمل کرے۔ مگر اس کے ساتھ ہی حکومت اس بات پر بھی مصر تھی۔ کہ کوئی کسی کا دل نہ دُکھائے۔ کسی کو بُرا نہ کہے۔ ہر ایک اپنے اپنے مذہب کی تلقین کرے۔ مگر کسی دوسرے سے نہ اُلجھے +

عیسائیوں نے رواداری کے اصول کو ملحوظ نہ رکھا۔ وہ کھُلم کھُلا کہتے پھرتے تھے۔ کہ صرف ہمارا خدا ہی سچا ہے۔ وہی زمین و آسمان کا حقیقی فرمانروا ہے۔ اور باقی جتنے دیوتا ہیں سب جھوٹے ہیں۔ یہ بات اور مذاہب کے معتقدین کو بُری لگی۔ پولیس نے عیسائیوں کو تنبیہ کی۔ کہ تمہیں ایسی باتیں منہ سے نہ نکالنی چاہئیں۔ مگر اُنہوں نے ایک نہ مانی +

تھوڑے عرصے بعد اور قصے کھڑے ہوئے۔ عیسائیوں نے شاہنشاہ کی تعظیم کرنے اور ضرورت کے وقت فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا۔ مجسٹریٹوں نے ڈرایا دھمکایا۔

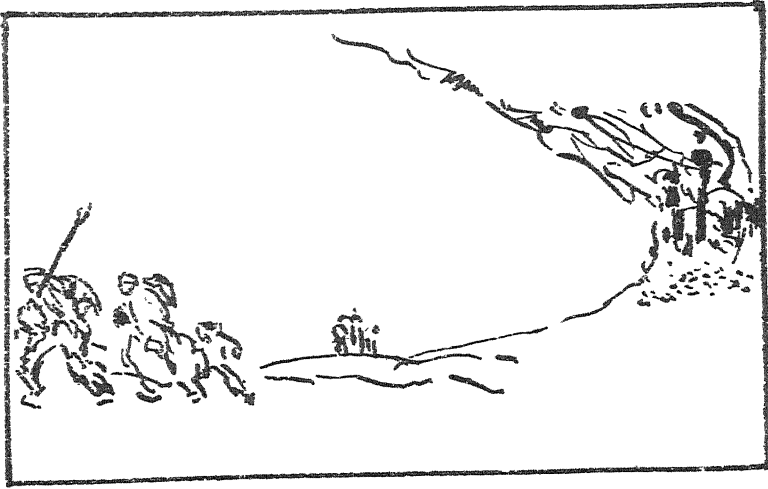
ل Peter ۲ے Pope



عیسائی راہبوں کی خانقاہ

تو عیسائیوں نے جواب میں کہا۔ کہ ہم اس دنیا کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ ہماری آنکھ تو جنت بریں پر لگی ہوئی ہے۔ تم ہمیں موت سے کیا ڈراتے ہو۔ اپنے مذہب اور عقیدے کے لئے جان دینا تو ہمارے لئے عین راحت ہے۔ رومن عجب مخمصے میں پڑ گئے۔ بعض کو موت کی سزا دی لیکن اکثر کو رہا کر دیا۔ شروع شروع میں البتہ عوام بعض دفعہ عیسائیوں کو بازار میں زدوکوب کیا کرتے تھے۔ لیکن اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ ان کے متعلق لوگوں نے عجیب و غریب باتیں مشہور کر رکھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ بچوں کو قتل کر کے کھا جاتے ہیں۔ انہی کی نحوست سے وبا آتی ہے۔ خطرے کے وقت وہ دشمن کے ساتھ مل کر ہم سے غداری کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ عیسائی آگے سے ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔ ان کی طرف سے انتقام کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ اس لئے رومنوں کو اس تفریح میں کچھ زیادہ لطف نہ آتا۔

اس دوران میں روما پر بربریوں کے حملے جاری رہے۔ جب افواج روما ان سے عاجز آ گئیں تو عیسائی مبلغ بروئے کار آئے۔ انہوں نے جا کر اہل ٹیوٹن کی وحشی قوم کو صلح و آشتی کا سبق سکھایا۔ ہمت والے لوگ تھے۔ موت سے ڈرتے نہ تھے۔ اس لئے



اہل گاتھ آرہے ہیں

بے دھڑک اور بڑے شدومد سے لوگوں کو یہ پیغام سناتے پھرتے۔ کہ جو لوگ اپنے گناہوں سے توبہ نہیں کرینگے۔ انہیں آخرت میں سخت عذاب ملیگا۔ ٹیوٹن قوم کے لوگوں پر اس بات کا بڑا اثر ہوا۔ وہ قدیم روما کے علم وفضل کی بہت قدر کرتے تھے مبلغین بھی آخر رومن تھے۔ ان کی بات پر کیونکر کان نہ دھرتے۔ رفتہ رفتہ عیسائی مبلغین کو قوم ٹیوٹن اور قوم فرنگ کے علاقوں میں بہت اقتدار حاصل ہوگیا۔ جو کام سپاہیوں کی پوری پلٹن سرانجام نہ دے سکتی تھی۔ وہ صرف ایک مبلغ کے ہاتھوں تکمیل پا جاتے۔ روما کے شاہنشاہوں نے عیسائی مبلغین کو اپنی مطلب براری کے لئے مفید پایا۔ تو بعض صوبوں میں انہیں قدیم مذہب کے پیروؤں کے برابر حقوق عطا کر دئے لیکن ان مراعات کا خیال چوتھی صدی کے آخری نصف حصے میں پیدا ہوا +

اس زمانے میں روما پر قسطنطین (جسے قسطنطینِ اعظم خدا جانے کیوں کہا جاتا ہے) کی حکومت تھی قسطنطین چشتی سا آدمی تھا لیکن وہ زمانہ ہی ایسے جنگ وجدل کا زمانہ تھا۔ کہ کمزور اور رقیق القلب لوگوں کی دال نہ گل سکتی تھی۔ اس نے اپنی طویل زندگی میں زمانے کے کئی انقلاب دیکھے۔ ایک دفعہ جب دشمن کے ہاتھوں شکست کھائی۔ تو سوچا اس نئے ایشیائی خدا کی طاقت بھی آزما دیکھیں۔ عہد کیا۔ کہ اگر فتح نصیب ہوئی۔ تو عیسائیت کا حلقہ بگوش ہو جاؤنگا۔ دشمنوں کو نیچا دکھایا۔ عیسائیوں کے خدا کی عظمت وجبروت کا قائل

ہوگیا۔ اور ہپ نسمہ سے لیا۔
اس کے بعد کلیسائے مسیحی کو سرکار نے بھی تسلیم کر لیا جس سے عیسائیوں کو بہت تقویت پہنچی۔

لیکن ان کی تعداد بہت قلیل تھی۔ کل آبادی پانچ چھ فیصدی سے زیادہ نہ تھی۔ اپنی ہٹ پر قائم نہ رہتے۔ تو مغلوب ہو جاتے۔ مگر مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ قدیم دیوتاؤں کا نام مٹا کے چھوڑینگے۔ تھوڑے عرصے تک تو شاہ جولین[1] نے جو حکمت و فلسفۂ یونان کا بہت دلدادہ تھا۔ ان دیوتاؤں کو عیسائیت کی دستبرد سے محفوظ رکھا۔ لیکن جب وہ فارس کی ایک مہم میں مجروح ہوا۔ اور زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔ تو اس کے جانشین جووین[2] نے پھر کلیسا کا رتبہ بڑھا دیا۔ قدیم معابد یکے بعد دیگرے بند ہونے گئے۔ حتےٰ کہ شاہنشاہ جسٹنین[3] نے اپنے عہد میں قسطنطنیہ کے اندر سینٹ صوفیہ[4] کا گرجا تعمیر کرایا۔ اور ایتھنز کی درسگاہ فلسفہ کو جس کی بنیاد افلاطون نے رکھی تھی۔ بند کرا دیا۔

گویا قدیم یونانی دنیا کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ دور ختم ہو گیا جس میں ہر انسان اپنا ہادی آپ تھا۔ اور اس کی روح اس کی اپنی تمناؤں اور خواہشوں کے زیر اثر نشو و نما پاتی تھی۔ فلاسفروں نے اعمال و افعال انسانی کے لئے جو اصول و قواعد وضع کئے تھے۔ وہ اتنے غیر معین اور مبہم تھے۔ کہ بہیمیت اور جہالت کے دور کے بعد جب کہ تہذیب و تمدن کا نشان مٹ گیا تھا۔ لوگ اُن سے کچھ بھی ہدایت نہ پا سکے۔ انہیں کسی معین مذہب کی ضرورت تھی۔ اس لئے انہوں نے کلیسا کی طرف رجوع کیا۔

اس بیدینی کے زمانے میں جب کہ انسانوں کے عقیدے متزلزل ہو رہے تھے عیسائی مذہب ایک چٹان کی مانند کھڑا تھا۔ اور اپنے اصولوں پر جنہیں وہ سچا اور مقدس سمجھتا تھا۔ بڑی مضبوطی سے قائم تھا۔ اس عزم اور استقلال اور جرأت کی وجہ سے عیسائیت نے دلوں میں گھر کر لیا۔ اور جن نامساعد حالات نے سلطنت روما کا تختہ الٹ دیا۔ وہ عیسائیت کو ذرا بھی گزند نہ پہنچا سکے۔

---

[1] Julian [2] Jovian [3] Justinian.
[4] St. Sophia

لیکن سچ پوچھو۔ تو اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا۔ پانچویں صدی میں تھیوڈورک[1] کی رومن گاتھک سلطنت کے مٹ جانے کے بعد اطالیہ کا ملک بیرونی حملہ آوروں سے کم و بیش بالکل مامون ہوگیا۔ اہل گاتھ کے جانشین یعنی اہل لومبارڈ۔ اہل سیکسن اور سلافی بے بضاعت اور غیر ترقی یافتہ لوگ تھے۔ چنانچہ روما کے اسقفوں نے روما کی آزادی اور خودمختاری پر آنچ نہ آنے دی۔ تھوڑے عرصے بعد اطالیہ کے جزیرہ نما میں جہاں جہاں قدیم مملکت روما کے صوبے باقی رہ گئے تھے۔ سب نے روما کے ڈیوکوں[2] یعنی اسقفوں کو اپنا روحانی اور سیاسی سردار تسلیم کرلیا۔

حالات و واقعات پکار پکار کر کسی زبردست شخصیت کو برسرکار آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ آخر ۵۴۰ء میں ایک شخص پیدا ہوا۔ جس کا نام گریگوری[3] تھا۔ گریگوری قدیم روما کے امرا کی اولاد تھا۔ اور امیر شہر رہ چکا تھا۔ اس کے بعد راہب بن گیا۔ اور پھر اسقف مقرر ہوا۔ اور آخر کار معتقدین نے اسے سینٹ پیٹر کے گرجے میں لاکر پاپا بنا دیا۔ مگر اس کی مرضی کے خلاف۔ کیونکہ اس کا دل یہی چاہتا تھا۔ کہ وہ انگلستان میں جاکر عیسائیت کی تبلیغ کرے۔ صرف چودہ سال حکومت کی۔ لیکن اس کی وفات تک تمام مغربی یورپ کی مسیحی دنیا نے پاپائے روما کو کلیسا کا سردار اور رہنما تسلیم کرلیا۔

البتہ مشرق والوں نے سرتسلیم خم نہ کیا۔ قسطنطنیہ میں وہی پرانا دستور جاری رہا۔ کہ جو آگسٹس اور ٹائبریس کے جانشین ہیں۔ وہی ملک کے فرمانروا بھی ہیں۔ اور مسلّم دین کے قسیس اعظم بھی۔ ۱۴۵۳ء میں مملکت مشرق کو ترکوں نے فتح کرلیا۔ قسطنطنیہ سر ہوگیا۔ اور قسطنطین پیلیولوگس[4] مقدس صوفیہ کے گرجے کی سیڑھیوں پر مارا گیا۔

اس سے چند سال پہلے اس کے بھائی طامس[5] کی بہن زوئی[6] نے روس کے بادشاہ آئون سوم[7] سے شادی کرلی تھی۔ اس طرح سے ماسکو کے گرینڈ ڈیوک قسطنطنیہ کی روایات کے علمبردار بن گئے۔ عقابوں کا جوڑا جو قدیم بازنطیم کا شاہی نشان تھا۔ اور جو اس زمانے

---

[1] [2] Duks [3] Gregory

[4] Constanine Paleologus [5] Themas [6] Zoe

[7] Ivan III

کی یاد دلاتا تھا۔ جب روما کی سلطنت مشرقی اور مغربی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ جدید روس کا شاہی نشان قرار پایا۔ زار پہلے تو محض امیر الامرا تھا۔ لیکن رومن شاہنشاہوں کے تتبع میں اس نے بھی اُن کا سا وقار اور علو اختیار کر لیا۔ جس کے سامنے کیا غریب کیا امیر سب کی حیثیت حقیر غلاموں کی سی بن گئی +

دربار کی تزئین و آرائش مشرقی طرز کے مطابق کی گئی۔ یہ طرز مملکت مشرق کے شاہنشاہوں نے ایشیا اور مصر سے سیکھی تھی۔ رُوس کے شاہنشاہوں کا ٹھاٹھ بزعم خود سکندر اعظم سے کم نہ تھا۔ یہ رعب اور دبدبے کی حکومت جو مملکت بازنطین مرتے مرتے ماسکو کے ورثہ میں چھوڑ گئی۔ رُوس کے وسیع میدانوں میں چھ صدیوں تک قائم رہی۔ دنیا کو کیا معلوم تھا۔ کہ یہ وراثت کتنی منحوس ثابت ہو گی۔ آخری شخص جس نے قسطنطنیہ کے شاہی عقابوں والا تاج اپنے سر پر پہنا۔ زار نکولسؔ تھا۔ اس کا قتل حال ہی کا واقعہ ہے اس کی نعش کوئیں میں پھینک دی گئی۔ اس کے بیٹے اور بیٹیاں سب مارے گئے۔ تمام شاہی حقوق یک قلم منسوخ کر دئے گئے۔ اور کلیسا کو پھر اُسی درجے پر پہنچا دیا گیا۔ جو اسے شہر روما میں قسطنطین کے زمانے سے پہلے نصیب تھا +

حضرت محمدؐ

صحرائے عرب کے ایک چرواہے کا حال جو رسالت کے درجے کو پہنچا۔ اور جس کے فدائیوں نے خدائے واحد کے نام کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے کم وبیش تمام دنیا کو فتح کر ڈالا

کارتھیج اور ہنی بال کا حال بیان کرنے کے بعد پھر ہم نے کبھی سامیوں کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن تمہیں یاد ہوگا۔ کہ دنیائے قدیم کی تاریخ کے صفحے صفحے پر ان کا تذکرہ پایا جاتا تھا۔ بابلی اور اسیری اور فنیقی اور یہودی اور آرمینی اور کلدانی جنہوں نے مغربی ایشیا پر تین چار ہزار سال تک حکومت کی۔ سب کے سب سامی النسل تھے۔ مشرق کی طرف سے ایرانیوں اور مغرب کی طرف سے یونانیوں نے ان پر حملہ آور ہو کر انہیں مغلوب کر لیا تھا۔ لیکن سکندر اعظم کی وفات کے ایک سو سال بعد سامی النسل فنیقیوں کی نوآبادی یعنی کارتھیج بحیرہ رُوم میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے رومنوں سے زور آزمائی کر رہی تھی۔ ساتویں صدی میں اس نسل کا ایک اور قبیلہ بر روئے کار آیا۔ اور اہل مغرب کے مقابلے میں حریف بن کر ڈٹ گیا۔ یہ لوگ عرب کے رہنے والے گڈریے تھے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک صحرا میں ریوڑ چراتے رہے تھے۔ اور بادشاہی کا خیال کبھی بھول کر بھی انہیں نہ آیا تھا؂

لیکن حضرت محمدؐ کی تعلیم کا یہ اثر ہوا۔ کہ انہوں نے گھوڑوں پر زین کس لی۔ انہیں ایڑ لگائی۔ اور ایک صدی کے اندر اندر خدائے واحد اور محمد رسول اللہ صلعم کا نام فرانس کے کسانوں تک پہنچا دیا؂

رسولؐ عربی عبداللہ اور آمنہ کے فرزند تھے۔ ان کی زندگی کے حالات حیرت انگیز ہیں۔ مکے میں پیدا ہوئے اور وہیں آس پاس بکریاں چرانے کا کام کرتے تھے۔ مسلمانوں

کا عقیدہ ہے۔ کہ خدا کی طرف سے ان پر وحی نازل ہوتی تھی۔ جبرئیل علیہ السلام انہیں خدا کا پیغام آکر سناتے۔ اور وحی نازل ہونے کی حالت میں جو کلمات دہن مبارک سے نکلے۔ انہی کے مجموعے کا نام قرآن شریف ہے + کاروبار کے سلسلے میں تمام عرب کا سفر کیا۔ اور یہودی اور عیسائی تاجروں سے سابقہ پڑا۔ رفتہ رفتہ ان پر انکشاف ہوا۔ کہ ایک اکیلے خدا کی پرستش کرنا ہی سب سے احسن ہے + اہل عرب آباؤ و اجداد کی لکیر کے فقیر تھے۔ اور انہی کی طرح پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے تھے۔ مکے کے مقدس شہر میں ایک چوکور عمارت تھی جس کا نام کعبہ تھا۔ یہاں طرح طرح کے اصنام جمع کر رکھے تھے۔ اور یہی گویا ان کی سب سے بڑی عبادتگاہ تھی +

رسالت کے بعد آپ حضرت خدیجہ کو جو بیوہ تھیں۔ اور جن کے ہاں رسالت مآبؐ ملازم تھے عقد نکاح میں لائے۔ اپنے ہموطنوں کو یہ خوشخبری سنائی۔ کہ میں ہی وہ نبی ہوں جس کے آنے کی بشارت تمہیں کئی بار مل چکی ہے۔ خدا نے مجھے اس کام پر مامور کیا ہے۔ کہ میں کل روئے زمین کے رہنے والوں کو نیکی اور پاکبازی کا راستہ دکھاؤں لوگوں نے ان کا مضحکہ اڑایا۔ اور جب دیکھا۔ کہ جناب رسول خدا اپنے مسلک سے ٹلنے والے نہیں۔ تو انہیں مار ڈالنے کے درپے ہوئے۔ وہ انہیں نعوذ باللہ دیوانہ سمجھتے تھے۔ اور ان کے افعال کو سخت سے سخت سزا کا مستوجب + جب جناب رسول خدا دشمنوں سے تنگ آ گئے۔ تو ایک دن رات کے وقت اپنے اصحابی حضرت ابوبکر کو اپنے ساتھ لیا۔ اور ترک وطن کے ارادے سے مدینے کا رُخ کیا۔ یہ واقعہ ۶۲۲ء کا ہے۔ اسی سال کو سال ہجرت کہتے ہیں۔ اور مسلمانوں کا سن یہیں سے شروع ہوتا ہے +

مدینے میں پہنچ کر انہوں نے حق کی تبلیغ کو بدستور جاری رکھا۔ جن لوگوں نے ان کی ہدایت سے فیض پایا یعنی جنہوں نے شیوۂ تسلیم و رضا کو قبول کیا۔ وہ ان کے زمرے میں شامل ہوئے اور مسلم کہلائے۔ سات سال تک مدینے کی زمین کو اپنے قدموں سے مفتخر فرمایا۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی۔ تو مکے پر حملہ آور ہوئے۔ اہل مدینہ کی فوج کو ساتھ لے کر صحرا کو عبور کیا۔ اور مکے کو فتح کر لیا +

اُس دن سے لے کر روز وصال تک کامیابی نے ان کا ساتھ دیا +

اسلام کی کامیابی کی دو وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے۔ کہ اسلام کے اصول بہت

سیدھے سادھے اور دلنشین ہیں۔ اسلام نے دنیا کو جو سبق سکھایا۔ وہ صرف یہ تھا۔ کہ خدا کی پرستش کرو۔ جو عظیم الکبین اور رحمان اور رحیم ہے + والدین کی عزت اور اطاعت کرو۔ داد دستد میں ایمانداری اور دیانت کو ہاتھ سے جانے نہ دو۔ نخوت و تکبر سے گریز کرو۔ مساکین کی دستگیری کرو۔ مریضوں کی تیمارداری کرو۔ شراب نہ پیو۔ اور کھانے پینے میں اعتدال کو مدنظر رکھو۔ خدا کے دربار میں باریابی حاصل کرنے کے لئے کسی مُلّا یا پادری کی وساطت ضروری نہیں۔ بارگاہ خداوندی کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہیں مسجد کہتے ہیں۔ وہ ایک قطعۂ زمین یا ایک کھلی عمارت کا نام تھا۔ جہاں لوگ جمع ہو کر خدا کی پرستش اور احکام الٰہی کا مطالعہ کرتے۔ نہ وہاں تصاویر آویزاں تھیں۔ نہ بیٹھنے کو کرسی یا کوئی اور نشست موجود تھی مسلمان کا مذہب اس کے سینے کے اندر تھا۔ وہ بخشش کے لئے کسی کلیسا یا پاپا کا محتاج نہ تھا۔ دن میں پانچ مرتبہ کعبے کی طرف منہ کر کے سادہ الفاظ میں خدا کے حضور میں دعا مانگتا۔ خدا کی مصلحت میں مین میخ نہ نکالتا۔ اور جو کچھ اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا اُس سے منہ نہ موڑتا +

ان خیالات و عقائد کی بدولت مسلمانوں کو تسکین قلب حاصل ہوئی۔ وہ نہ اپنی زندگی سے بیزار تھے۔ نہ دنیا سے غیر مطمئن۔ اور اس قسم کی ذہنی کیفیت سے ہمیشہ خوشگوار نتائج پیدا ہوتے ہیں +

عیسائیوں کے مقابلے میں اہل اسلام کی کامیابی کی دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ جب ایک مسلمان سپاہی میدان جنگ میں اُترتا تو ایک عجیب مسرت اور طمانیت قلب کے ساتھ + رسول عربی نے انہیں بتا دیا تھا۔ کہ اگر جنگ میں کام آؤ گے۔ تو شہید کہلاؤ گے۔ اور ابدالآباد تک جنت میں رہو گے۔ برخلاف اس کے عیسائی موت اور حیات بعد الموت کے اندھیرے سے ڈرتے تھے۔ اس لئے وہ اس دنیا کی نعمتوں کے ترک کرنے پر بخوشی آمادہ نہ ہوتے۔ آج کل بھی مسلمان سپاہیوں کا یہ حال ہے۔ کہ اہل یورپ کی توپوں کے منہ پر بلا خوف و خطر آ چڑھتے ہیں۔ اور اپنی جسارت اور شجاعت سے دشمنوں کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں +

رفتہ رفتہ عرب کے بیشتر قبائل نے رسول خدا کو اپنا سردار تسلیم کر لیا۔ آنحضرتؐ لوگوں کو خدا کا پیغام سناتے رہے۔ اور ان کی زندگی کو منظم بنانے کے لئے بمقتضائے

الٰہی نئے نئے قوانین انہیں بتاتے رہے۔ بالآخر ۷ رجون ۶۳۲ء کو اس دنیا سے رحلت فرمائی۔

رسول اللہ کے بعد اُن کے خُسر حضرت ابوبکر ان کے جانشین ہوئے۔ ان کی زندگی بھی رسول اللہ کی ابتدائی زندگی کی طرح مصائب کا شکار رہی۔ دو سال کے بعد حضرت ابوبکر کا انتقال ہؤا۔ اور حضرت عمر بن خطاب خلیفہ بنے۔ حضرت عمر نے دس سال کے اندر اندر مصر۔ ایران۔ فنیقیہ۔ عراق اور فلسطین کو فتح کر لیا۔ اور دمشق کا شہر مسلمانوں کی پہلی عالمگیر مملکت کا دارالخلافہ قرار پایا۔

حضرت عمر کے بعد رسول اللہ کے داماد یعنی ان کی صاحبزادی حضرت فاطمہ کے شوہر حضرت علی خلیفۃ المسلمین منتخب ہوئے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد خلافت کا حق موروثی سمجھا جانے لگا۔ اور اہل اسلام کو ایک وسیع اور عظیم الشان سلطنت کی عنان گیری نصیب ہوئی۔ نِنوا کے کھنڈروں کے قریب دجلہ کے کنارے ایک شہر تعمیر کیا جس کا نام بغداد رکھا۔ عرب شہسواروں کے رسالے مرتب کئے۔ دین خدا کی تبلیغ کے لئے گھر سے چل پڑے اور دور دور تک نکل گئے۔ ۷۱۱ء میں طارق نامی ایک مسلمان سپہ سالار نے اس آبنائے کو عبور کیا۔ جسے قدیم زمانے میں ہرکیولز کا دروازہ کہتے تھے اور یورپ کے ساحل پر جا اُترا۔ جس پہاڑی نے سب سے پہلے اس کے قدم چُومے اس کا نام جبل الطارق پڑ گیا۔

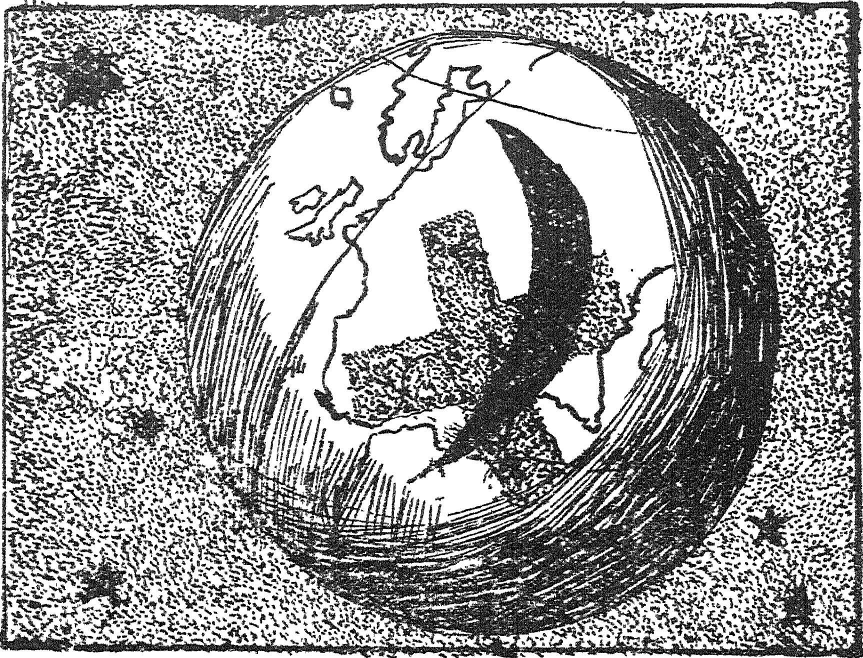
بارہ سال بعد زیریز ڈے لا فرنٹیرا[1] کی لڑائی میں طارق نے قوم وسی گوتھ[2] کے بادشاہ کو شکست دی جس کے بعد افواج اسلامی نے شمال کی سمت کوچ کر کے ہینی بال کا رستہ اختیار کیا۔ اور پرینیز کے دروں کو عبور کر لیا۔ ڈیوک آف ایکویٹینیا[3] مقام بورڈو کے قریب مزاحم ہؤا لیکن شکست کھائی اور مسلمان درآنہ پیرس کی سمت بڑھے۔ لیکن ۷۳۲ء میں (یعنی رسول اللہ کی وفات کے ایک سو سال بعد) ٹورز[4] اور پوائیٹرز[5] کے درمیانی علاقے میں انہیں شکست ہوئی۔ اس دن فرنگی سردار چارلس مارتول

---

[1] Xeres de la Frontera [2] Visigoths [3] Duke of Aquitania

[4] Tours. [5] Poitiers.

نے گویا یورپ کو مسلمانوں کے ہاتھوں مفتوح ہو جانے سے بچا لیا۔ اہل اسلام کو فرانس سے تو نکال دیا لیکن ہسپانیہ میں ان کا اقتدار زائل نہ ہونے پایا۔ وہاں عبدالرحمٰن نے قرطبہ میں ایک سلطنت قائم کی جو علوم و فنون کے اعتبار سے زمانۂ وسطیٰ میں یورپ کے تمام ممالک میں ممتاز تھی +



ہلال اور صلیب کی کشمکش

یہ فاتحین مراکش نژاد لوگ تھے۔ اس لئے انہیں مُور کہتے ہیں۔ مُوروں کی سلطنت سات سو سال تک قائم رہی۔ ان کا آخری شہر یعنی غرناطہ ۱۴۹۲ء میں فتح ہوا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے۔ جب کولمبس ابھی نئی دنیا کی دریافت کو روانہ نہ ہوا تھا + لیکن ہسپانیہ سے بیدخل ہونے کے بعد مسلمانوں نے ایشیا اور افریقہ میں اپنی تلوار اور سیاست کے جوہر دکھائے اور گم کردہ اقتدار کو پھر حاصل کر لیا۔ آج بھی دنیا میں مسلمانوں کی تعداد عیسائیوں سے کسی صورت کم نہ ہوگی +

شارلمان (چارلس اعظم)

شارلمانؔ شاہ اہل فرنگ کو شاہنشاہ کا لقب کیونکر ملا۔ اور اس نے پہلے زمانے کی طرح پھر ایک بار تمام دنیا کو ایک ہی مملکت میں شامل کرنے کی کس طرح کوشش کی

پواتیئرزؔ کی لڑائی نے یورپ کو مسلمانوں کے غلبے سے تو بچا لیا۔ لیکن اس فتح سے اُس بدنظمی اور بدامنی کا انسداد نہ ہُوا۔ جو رومن آئین اور رومن نظم و نسق کے مٹ جانے پر پیدا ہو گئی تھی۔ شمالی یورپ کی طرف سے تو خیر شورش کا کوئی احتمال نہ تھا۔ وہاں کے لوگ یسوع مسیح پر ایمان لے آئے تھے۔ اور پاپائے روما کا بیحد ادب و احترام کرتے تھے۔ لیکن دور دراز کے پہاڑوں میں جو لوگ آباد تھے۔ ان کی طرف سے ہمیشہ خدشہ لگا رہتا تھا۔ غریب پاپا کو جب ان کا خیال آتا۔ تو سہم جاتا۔ ہر وقت یہی ڈر رہتا۔ کہ پھر کہیں بربریوں کا ایک سیلاب نہ اُمڈ آئے۔ اور بڑھتے بڑھتے روما تک نہ آن پہنچے + اس لئے ضروری تھا۔ کہ تقدس مآب پاپائے روما صرف اپنے روحانی پیشوا ہونے پر ہی تکیہ نہ کریں۔ بلکہ کسی ذی اقتدار طاقتور صاحب شمشیر سے اتحاد کر رکھیں۔ تاکہ آڑے وقت میں کوئی تو ان کی پشت پناہ بن سکے +

روما کے پاپا نرے متقی ہی نہ تھے۔ بلکہ دنیاوی معاملات کو بھی خوب اچھی طرح سمجھتے تھے جب اس خطرے کو محسوس کیا۔ تو ادھر اُدھر کوئی دوست ٹٹولنے لگے۔ آخر کار قبیلۂ فرنگؔ پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ زوال روما کے بعد جتنے جرمن قبائل شمال مغربی یورپ پر قابض ہو گئے تھے۔ فرنگیوں کا قبیلہ ان سب میں سے ہونہار تھا۔ اس کے

۱؎ Charlemagae ۲؎ Poitiers ۳؎ Frenks

اولین بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ نے جس کا نام میرووِیک[1] تھا۔ ۴۵۱ء میں رومنوں کی مدد کی تھی۔ اور اُسی کی مدد سے رومنوں نے قوم ہُن کو کاتالون[2] کی لڑائی میں شکست دی تھی۔ اس کے جانشین ایک عرصے تک مملکت روما کے مقبوضات کو چوہوں کی طرح کترتے رہے۔ یہاں تک کہ ۴۸۶ء میں اسی خاندان کا ایک بادشاہ کلووِس[3] نامی (جدید فرانسیسی میں اسے لُوئی[4] کہینگے) کھلم کھلا رومنوں سے الجھ پڑا۔ لیکن کلووس کے جانشین بودے نکلے۔ وہ محض نام کے بادشاہ تھے۔ سلطنت کا تمام کاروبار امیر محل یعنی وزیر اعظم کے ہاتھ میں تھا۔

چارلس مارٹول کے بعد اس کا بیٹا پستہ قد پیپن[5] امیر محل مقرر ہوا۔ پیپن کو آقا ایسا ملا۔ جو رات دن پرستش و عبادت اور دینیات کے مطالعے میں مصروف رہتا تھا۔ ملکی معاملات سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وزیر اعظم کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ کیا کرنا چاہئے۔ ناچار پاپا سے مشورہ طلب کیا۔ معاملہ فہم پاپا نے جواب میں کہلا بھیجا۔ کہ جس کے ہاتھ میں اختیارات ہیں۔ وہی سلطنت کا مختار ہے۔ پیپن اشارے کو سمجھ گیا۔ شاہ چیلڈرک[6] کو یہ مشورہ دیا۔ کہ حضور آپ اللہ والے ہیں۔ آپ کو ان بکھیڑوں سے کیا نسبت۔ ان دھندوں کو چھوڑیئے۔ اور کسی راہب خانے میں بیٹھ کر عمر کا باقیماندہ حصہ خدا کی یاد میں بسر کیجئے۔ بادشاہ سلطنت سے کنارہ کش ہو کر راہب بن گیا۔ اور پیپن باقی جرمن قبائل کی رضامندی حاصل کرکے خود تخت پر بیٹھ گیا۔ گویا میرووک کا خاندان ہمیشہ کے لئے سلطنت سے بے دخل ہو گیا۔ لیکن پیپن آدمی تھا عیار۔ اس رتبے پر مطمئن نہ ہوا۔ محض وحشی قبیلوں کی سرداری سے اس کی ہوس پوری نہ ہوئی۔ اس لئے دھوم دھام کا ایک جلسہ کیا۔ شمال مغربی یورپ کے مشہور عیسائی مبلغ بونی فاچے[7] کو بلایا۔ اور مذہبی رسوم کے مطابق اس کی زبان سے اپنی بادشاہی کا اعلان کرایا۔ بونی فاچے نے اُسے "بادشاہ بفضل اللہ" یعنی بادشاہ منجانب اللہ کا لقب عطا کیا۔ تاجپوشی کے موقع پر جو دعا پڑھی گئی۔ اس میں "بفضل اللہ" کے الفاظ کا اضافہ کر دینا ایسی کونسی مشکل بات تھی۔ مگر جب اس فقرے نے ایک دفعہ خطبہ تاجپوشی

---

[1] Merovech. [2] Catalaun. [3] Clovis.
[4] Louis [5] Pepin. [6] Childeric
[7] Boniface.

میں جگہ پالی - تو ڈیڑھ ہزار سال تک پھر کوئی اس پر قلم نہ پھیر سکا +

پیپن کلیسا کا بیحد احسان مند تھا - چنانچہ پاپا کو دشمنوں سے بچانے کے لئے دو دفعہ اطالیہ کا سفر کیا - راوینا اور اس کے علاوہ کئی اور شہروں کو اہل لونگو بارڈ سے چھین کر پاپا کے حوالے کر دیا - پاپا نے انہیں ریاستہائے پاپائی میں شامل کر لیا - یہ ریاستیں آج سے پچاس سال پہلے تک خود مختار رہیں +

پیپن کی وفات کے بعد روما اور ایکس لاچیپل[1] یا نموگن[2] یا انگل ہائیم[3] (شاہان فرنگ کا صدر مقام معین نہ تھا - ارکین سلطنت اور خاصان بارگاہ کو ساتھ لئے شہر شہر پھرتے رہتے تھے) کے باہمی تعلقات خوشگوار تر ہوتے گئے - بالآخر بادشاہ اور پاپا دونوں نے باہمی مصالحت سے ایک ایسا قدم اٹھایا - جس کا تاریخ یورپ پر بعد میں بہت گہرا اثر پڑا +

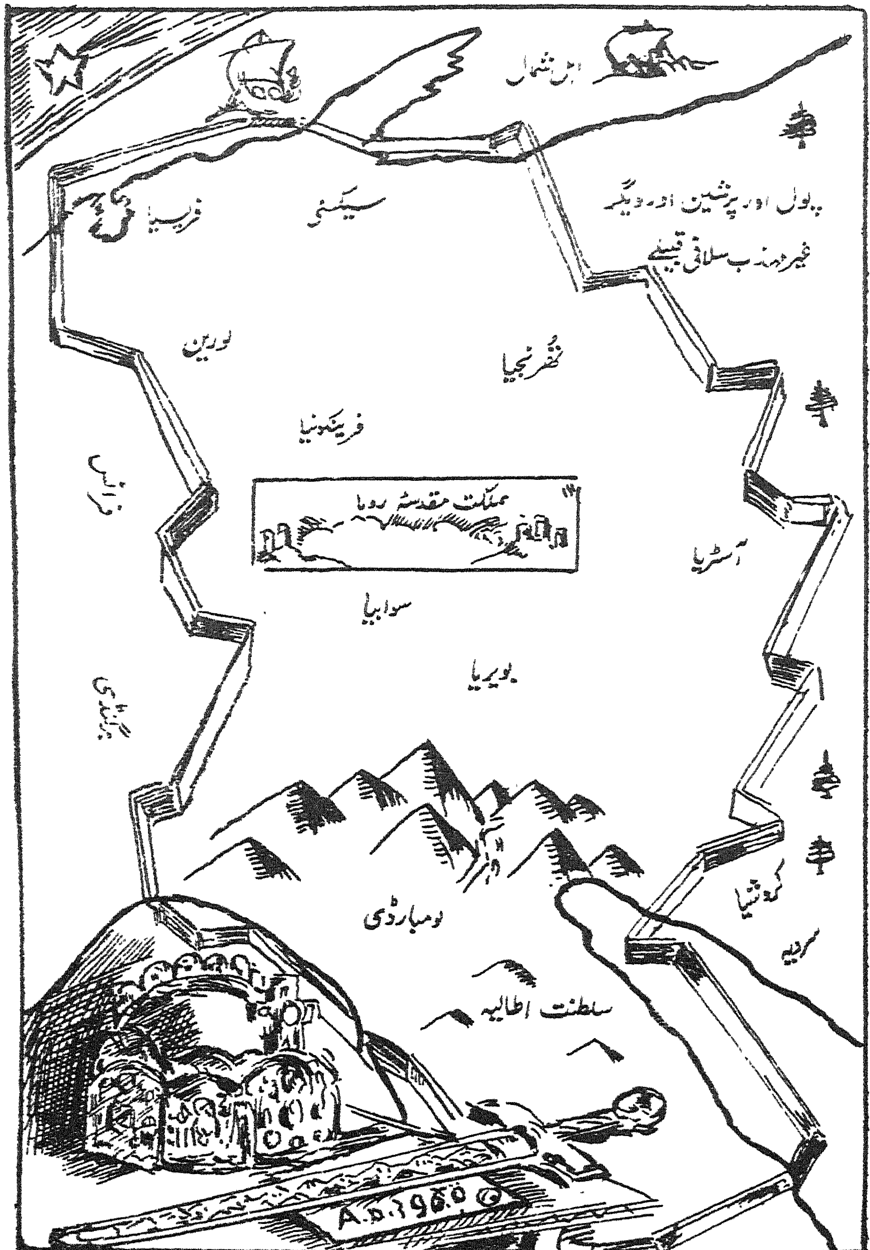
۷۶۸ء میں پیپن کے بعد چارلس جو شارلمان یا چارلس اعظم کے نام سے مشہور ہے - تخت پر بیٹھا - اس نے مشرقی جرمنی میں اہل سیکسن کی سرزمین کو فتح کیا - اور شمالی یورپ کے بیشتر حصے میں شہر آباد کئے اور راہب خانے تعمیر کئے - پھر عبدالرحمٰن کے بعض دشمنوں کی درخواست پر مُوروں سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہسپانیہ پر حملہ کر دیا لیکن کوہ پرنیز میں اہل باسک کے وحشی قبائل نے چھاپہ مارا اور شارلمان کو ناچار پسپا ہونا پڑا - یہی وہ موقعہ تھا - جہاں فرنگی سردار رولینڈ[4] نے افواج شاہی کی پسپائی کو کامیاب بنانے کی خاطر اپنے تمام ساتھیوں سمیت جنگ میں کام آ کر فرنگیوں کی نمک حلالی اور وفا داری کا ثبوت دیا +

آٹھویں صدی کے آخری دس سال شارلمان کو جنوبی علاقے کے معاملات سے مہلت نہ ملی + رومن بدمعاشوں کے ایک جتھے نے پاپائے روما لیو سوم[5] پر حملہ کر دیا - اور اسے مردہ سمجھ کر بازار میں چھوڑ گئے - بعض رحمدل لوگوں نے اس کی مرہم پٹی کی - اور انہی کی مدد سے پاپا جان بچا کر چارلس کے کیمپ میں بھاگ آیا - چارلس سے مدد طلب کی - تو

---

[1] Aix-la-Chapelle, [2] Nymwegen. [3] Ingelheim.

[4] Roland. [5] Leo III.



جرمن قوم کی مقدس رومن سلطنت

فرنگیوں کے ایک لشکر نے فوراً شورش کو فرو کرکے لیو کو واپس محلِ لیٹران[1] میں پہنچا دیا۔ (یہ محل قسطنطین کے وقت سے پاپاؤں کا مسکن چلا آتا تھا)۔ یہ دسمبر ۷۹۹ء کا واقعہ ہے۔ اگلے سال موسم سرما میں شارلمان جوان دنوں روما میں مقیم تھا۔ سینٹ پیٹر کے قدیم گرجا کے اندر کرسمس کی دعا میں شامل ہوا۔ جب عبادت سے فراغت پا چکا۔ تو پاپائے روما نے دستِ خاص سے اُسے تاجِ شاہی پہنایا۔ اسے رومنوں کا شاہنشاہ تسلیم کیا۔ اور آگسٹس کے لقب سے جو کئی سو سال سے متروک ہو چکا تھا سرفراز فرمایا۔

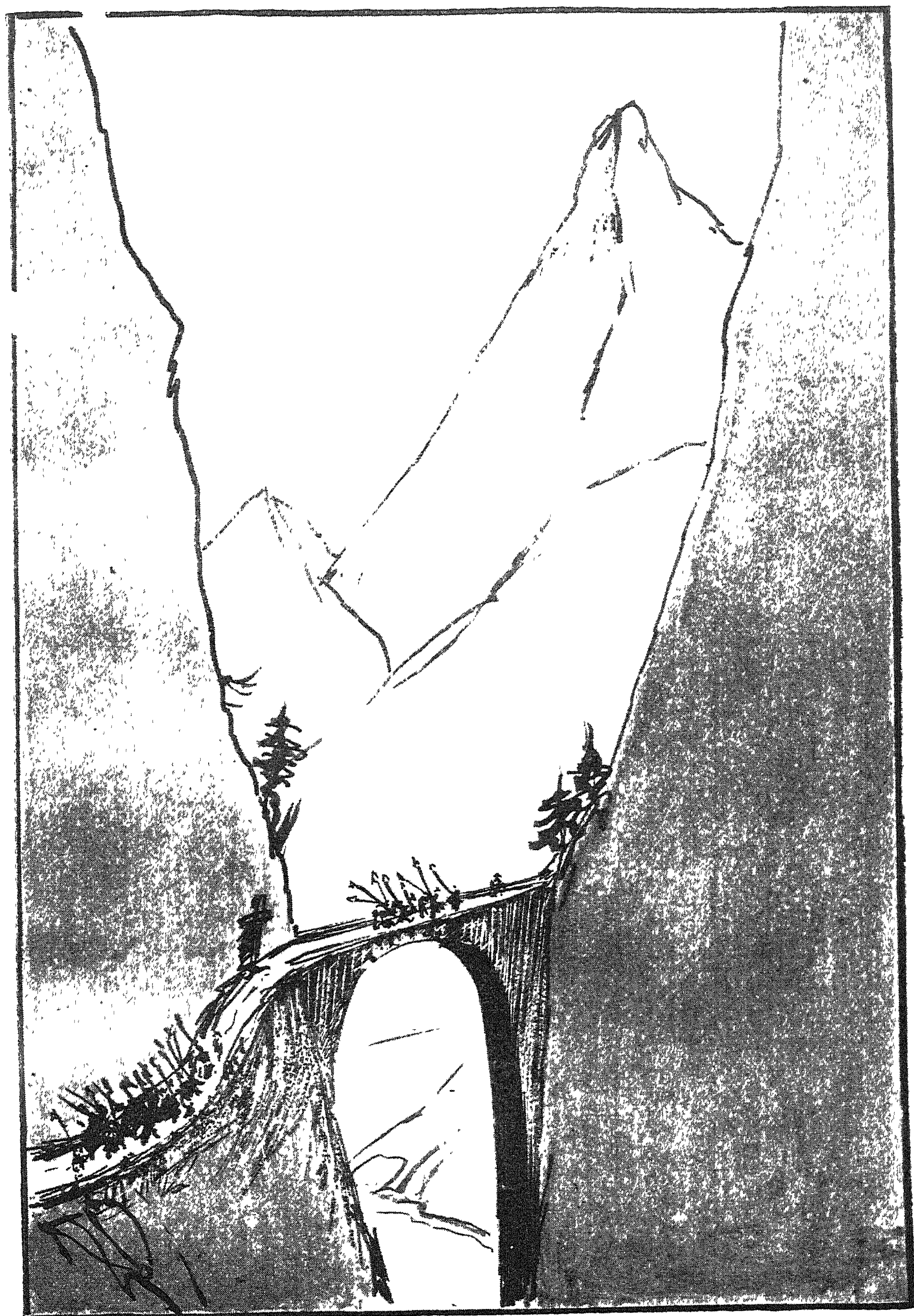
گویا شمالی یورپ ایک بار پھر مملکت روما میں شامل ہو گیا۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ اب کے بار تختِ شاہی پر رومن نہیں ایک جرمن سردار متمکن تھا جس کے علم کا تو یہ حال تھا۔ کہ لکھنا بالکل نہ جانتا تھا۔ اور پڑھنے کی قابلیت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن تلوار کا دھنی تھا۔ اس لئے کچھ عرصے تک کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور ملک کو امن نصیب ہوا۔ اور تو اور شاہ قسطنطنیہ نے بھی جسے روما کا رقیب سمجھنا چاہیئے۔ شارلمان کو تعریف و تحسین کا ایک خط لکھا۔ اور اسے "برادرِ عزیز" کے الفاظ سے مخاطب کیا۔

لیکن افسوس کہ یہ اولوالعزم بزرگ ۸۱۴ء میں اس دنیا سے چل بسا۔ ادھر اس کی آنکھیں بند ہوئیں۔ ادھر بیٹوں اور پوتوں نے حرص کے پنجوں سے ایک دوسرے کا منہ نوچنا شروع کیا۔ ۸۴۳ء میں عہدنامۂ وردون[2] کی رو سے اور ۸۷۰ء میں عہدنامہ مرسن[3] کی رو سے مملکت چارلس کے حصے بخرے ہوئے۔ عہدنامہ مرسن کے مطابق مملکت فرنگ کو دو برابر حصوں میں منقسم کیا گیا۔ مغربی علاقے کا وارث تاریخ میں "تڈر چارلس" کے نام سے مشہور ہے۔ اس علاقے میں قدیم مملکت روما کا صوبہ گال بھی شامل تھا۔ جہاں کے باشندوں کی زبان رفتہ رفتہ رومنوں کی سی ہو گئی تھی۔ فرنگیوں نے تھوڑے ہی عرصے کے اندر اپنی زبان چھوڑ کر یہ زبان اختیار کر لی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آج کل فرانس میں جہاں درحقیقت جرمن نسل کے لوگ آباد ہیں۔ لاطینی الاصل زبان بولی جاتی ہے۔

مشرق کا علاقہ دوسرے پوتے کے حصے میں آیا۔ اس علاقے کو رومن لوگ اپنی زبان میں جرمینیا[4] کہتے تھے۔ رومن کبھی اس پر قابض نہ ہوئے تھے۔ البتہ آگسٹس نے

ھ[1] Lateran.   ھ[2] Verdun.   ھ[3] Merson-on-the-Meuse.

ھ[4] Germania.



پہاڑ کا درہ

اس مشرق اقصیٰ کو فتح کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کا شکار ریٹ میں ٹیوٹوبرگ کے جنگلوں میں مارا گیا تھا۔ اور یہاں کے باشندے رومن تہذیب سے محروم رہ گئے تھے۔ ٹیوٹن زبان میں عوام کو "تھیوٹ"[۱] کہتے تھے۔ عیسائی مبلغ جرمن زبان کو "لنگوا تھیوٹسکا"[۲] یا "لنگوا ٹیوٹسکا"[۳] یعنی عوام کی زبان کہتے تھے۔ "ٹیوٹسکا" کا لفظ بدل کر ڈیوٹش[۴] بن گیا۔ اسی لئے جرمن لوگ اپنے ملک کو "ڈیوٹش لینڈ"[۵] کہتے ہیں ۔

بہت عرصہ گزرنے نہ پایا کہ تاج شاہی جانشینان چارلس کے سر سے گر کر لڑھکتا لڑھکتا اطالیہ کے میدانوں میں جا پہنچا۔ وہاں کئی چھوٹے چھوٹے والیان ریاست حکمران تھے۔ انہیں ایک مشغلہ سا ہاتھ آ گیا۔ جس کو موقع ملتا وہی تاج چھین کر لے جاتا۔ وہ اس میں خون تک بہانے سے دریغ نہ کرتا۔ بلکہ بعض اوقات تو پاپائے روما بھی منہ تکتے رہ جاتے کوئی ان کی اجازت تک کا طلبگار نہ ہوتا۔ چنانچہ پاپائے روما پھر دشمنوں میں گھر گیا۔ مدد کے لئے شمال کی طرف ہاتھ پھیلایا۔ لیکن اب کی بار مغربی فرنگستان سے استمداد نہ کی۔ بلکہ اس کے ایلچیوں نے کوہ الپس کے پار جا کر ایک سیکسن والئی ریاست اوٹو[۶] نامی کا دامن جا پکڑا۔ اوٹو جرمن قبیلوں میں سب سے بڑا سردار مانا جاتا تھا ۔

تمام سیکسنوں کی طرح اوٹو بھی اطالیہ کے نیلے نیلے آسمانوں اور رنگین مزاج حسین باشندوں کا فریفتہ تھا۔ جھٹ مدد کو آن موجود ہوا۔ لیو ہشتم[۷] پاپائے روما نے اس سعادتمندی کے صلے میں اسے شاہنشاہ کا لقب عطا فرمایا۔ اور اس دن سے چارلس کی قدیم سلطنت کا مشرقی نصف حصہ "جرمن قوم کی مقدس رومن مملکت" کہلایا ۔

یہ مملکت جسے ایک سیاسی عجوبہ سمجھنا چاہئے۔ دس نہیں بلکہ آٹھ سو انتیس سال تک یونہی قائم رہی۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں جب کہ یورپ میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس مملکت کی دھجیاں تاریخ کی کوڑی پر پھینک دی گئیں۔ وہ بیرحم شخص جس کے ہاتھوں قدیم جرمن مملکت کے پرخچے اڑ گئے۔ کارسیکا[۸] کے ایک وکیل کا

---

۱ Thiot. ۲ Lingua theotisca. ۳ Lingua teutisca.

۴ Deutsch. ۵ Deutsohland. ۶ Otto.

۷ Leo VIII. ۸ Corsica.

بیٹا تھا۔ اور جمہوریۂ فرانس کی سرکار میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا۔ اپنی شہرۂ آفاق گارڈ رجمنٹوں کے بل پر اس نے تمام یورپ پر اپنا سکہ جمایا۔ اور جب اس سے ہوس پوری نہ ہوئی۔ تو روما سے پاپا کو بلوا بھیجا۔ اس کے سامنے جرنیل نپولینؔ نے تاج شاہی اپنے سر پر رکھا۔ اور شارلمان کی روایات کا علمبردار بن بیٹھا۔ سچ پوچھو۔ تو تاریخ عالم بھی انسانی زندگی کا آئینہ ہے۔ بظاہر ہزار تبدیلیاں واقع ہوں۔ مگر دراصل بات وہی رہتی ہے ؛

ک General Napoleon.

اہلِ شمال

دسویں صدی میں لوگ اہلِ شمال[1] کے قہر سے کیوں پناہ مانگتے تھے

تیسری اور چوتھی صدی میں جرمن قبائل مملکت روما کی سرحدیں گھس آئے تھے۔ تاکہ روما کو لوٹ کر اس سرزمین کی مال و دولت پر ہاتھ صاف کریں۔ آٹھویں صدی میں یہی لوگ خود غارتگری کا شکار بن گئے۔ حملہ آور جنہیں اہل شمال کہا جاتا ہے۔ ڈنمارک[2] اور سویڈن[3] اور ناروے[4] کے باشندے تھے۔ ہر چند کہ یہ لوگ جرمنوں کے بھائی بند تھے۔ تاہم جرمن اس بات کے لئے تیار نہ تھے۔ کہ ان کے ہاتھوں یوں خراب وخستہ ہوں۔

اہل شمال مستعد اور تجربہ کار جہازران تھے۔ یہ تو معلوم نہیں۔ کہ انھوں نے قزاقی کا وطیرہ کیوں اختیار کر لیا۔ لیکن ایک دفعہ جب انہیں لُوٹ مار کا چسکا پڑ گیا۔ تو پھر کوئی ان کا ہاتھ نہ روک سکا۔ ان کا دستور یہ تھا۔ کہ کسی دریا کے دہانے پر کسی فرنگی یا فریسی[5] گاؤں کے پُرامن لوگوں پر ایکا ایکی نازل ہوجاتے۔ مردوں کو قتل کر کے عورتوں کو بھگا لے جاتے۔ جہازان کے بہت تیز تھے۔ ان میں بیٹھ کر تھوڑی ہی دیر میں کہیں سے کہیں نکل جاتے بادشاہ یا شاہنشاہ کی فوجیں بعد میں پہنچتیں۔ تو انہیں سلگتے ہوئے کھنڈروں کے سوا حملہ آوروں کا کوئی سراغ نہ ملتا۔

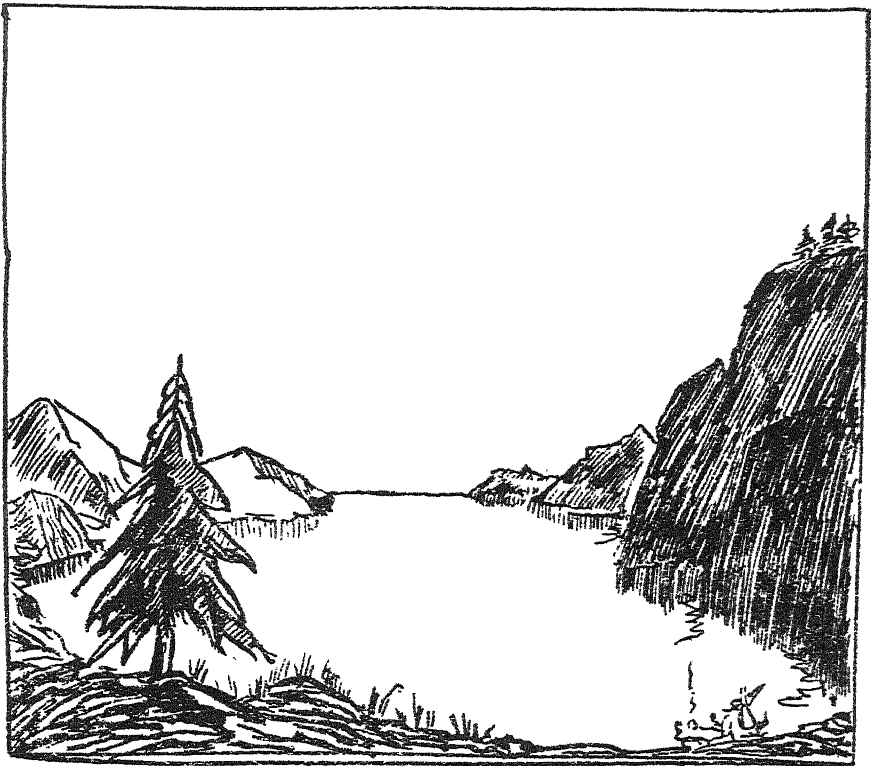
شارلمان کی وفات کے بعد جب بدنظمی کا دور دورہ ہوا۔ تو اہل شمال کو خوب موقع ہاتھ آیا۔ اپنے بیڑے میں سوار ہوکر باری باری ہر ایک ملک پر حملہ کر دیا۔ اور ان کے ملاحوں نے ہالینڈ[6] اور فرانس اور انگلستان اور جرمنی کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی خودمختار سلطنتیں قائم کرلیں۔ یہاں تک کہ اطالیہ میں بھی گھس آئے۔ ذہین لوگ

۱؎ Norsemen. ۲؎ Denmark. ۳؎ Sweden.

۴؎ Norwa y. ۵؎ Frisian. ۶؎ Holland.

تھے۔ رعایا کی زبان دنوں میں سیکھ لی اور اپنے آباؤ اجداد کے غیر شائستہ اطوار کو ترک کر کے مہذب بن گئے۔ قدیم اہلِ شمال کو وائیکنگ[1] کہا جاتا تھا۔ جس کے معنی ہیں "بحری قزاق" دیکھنے کو ان کی وضع قطع بہت دلفریب تھی۔ لیکن درحقیقت یہ بڑے بیرحم اور غلیظ لوگ تھے۔

دسویں صدی کے شروع میں ایک وائیکنگ جس کا نام رولو[2] تھا۔ ساحل فرانس پر پے در پے حملہ آور ہوا تھا۔ شاہ فرانس میں اتنا بل کہاں کہ ان قزاقوں کے مقابلے پر ڈٹ جاتا۔ اس کی بجائے رشوت دے کر جان بچانی چاہی۔ رولو کو یہ لالچ دیا۔ کہ اگر تم میری سلطنت کی تخریب سے باز آجاؤ۔ تو میں نارمنڈی[3] کا صوبہ تمہاری نذر کرتا ہوں۔ رولو نے اس تجویز کو منظور کرلیا۔ اور نارمنڈی کا "ڈیوک" بن گیا۔

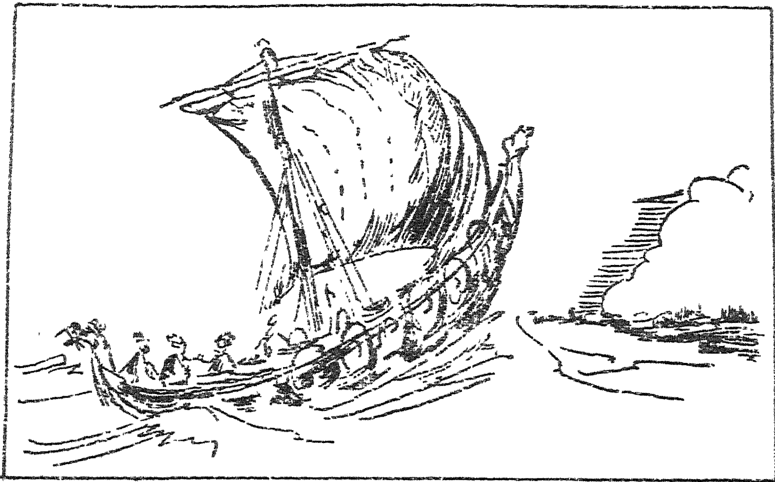


اہلِ شمال کا وطن

---

[1] Viking. [2] Rollo. [3] Normandy.

لیکن رومیوں اور انگلستان میں فتح و تسخیر کا جنون تو ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ سرزمین یورپ سے انگلستان چند گھنٹوں کا سفر تھا۔ رودبار کے پار لہلہاتے کھیت اور سفید چٹانیں دور سے دکھائی دیتی تھیں۔ بدنصیب انگلستان بڑے بڑے دکھ اٹھا چکا تھا۔ دوسو سال تک رومیوں کی نوآبادی رہ چکا تھا۔ رومیوں کے بعد شلیسوگ[1] کے دو جرمن قبائل اہل اینگلز[2] اور اہل سیکسن کے ہاتھوں فتح ہوا تھا۔ اس کے بعد اہل ڈین[3] نے ملک کے بیشتر حصے کو تسخیر کر کے کنٹ[4] کی سلطنت قائم کی تھی۔ لیکن اس کے بعد اہل ڈین کا بوریا بستر بھی بندھ گیا۔ اور اب وہاں ایک سیکسن بادشاہ ایڈورڈ دی کنفیسر[5] تخت پر متمکن تھا۔ لیکن ایڈورڈ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اور اس کے اولاد بھی کوئی نہ تھی۔ چنانچہ والیانِ نارمنڈی کی ہوسِ تسخیر کے لئے رستہ بالکل صاف تھا۔



اہل شمال کا رُوس کو سفر

۱۰۶۶ء میں ایڈورڈ اس دنیا سے چل بسا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی نارمنڈی کے شاہ ولیم[6] نے رودبار کو عبور کر کے ہیسٹنگز[7] کی لڑائی میں ویسکس[8] کے

---

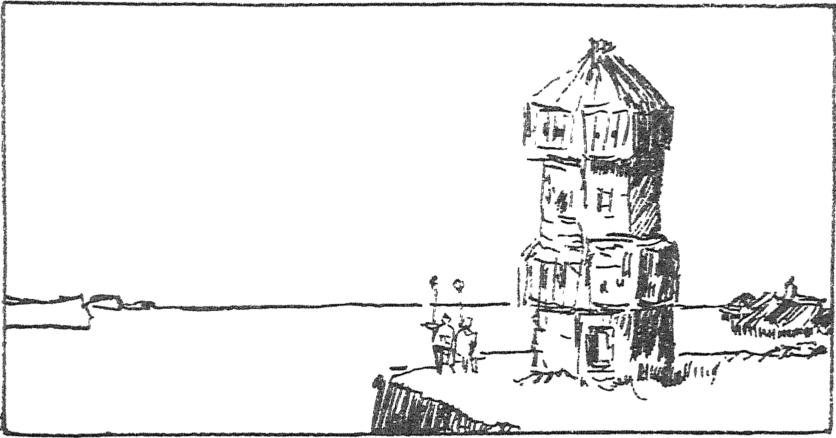
[1] Schleswig. [2] Angles. [3] Denes.

[4] Cnut. [5] Edward the Confessor [6] William.

[7] Hastings. [8] Wessex



اہل شمال کی دنیا



اہلِ نارمنڈی سمندر پار کی زمین کو دیکھ رہے ہیں

بادشاہ ہیرلڈ[1] کو جو تختِ شاہی پر قابض ہو چکا تھا شکست دے کر مار ڈالا - اور خود شاہ انگلستان بن بیٹھا ✤

پہلے میں تمہیں بتا چکا ہوں - کہ ۸۰۰ء میں ایک چھوٹے سے قبیلے کا سردار ہوتے ہوتے فرمانروائے مملکت روما کے درجے تک پہنچ گیا تھا - اسی طرح ۱۰۶۶ء میں ایک شمالی قزاق کا پوتا اپنے زورِ بازو سے شاہ انگلستان کے تخت پر قابض ہو گیا ✤

اب تمہیں کہو - کیا پریوں کی کہانیاں تاریخ کی داستانوں سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز ہوتی ہیں ؟

---

[1] Harold.

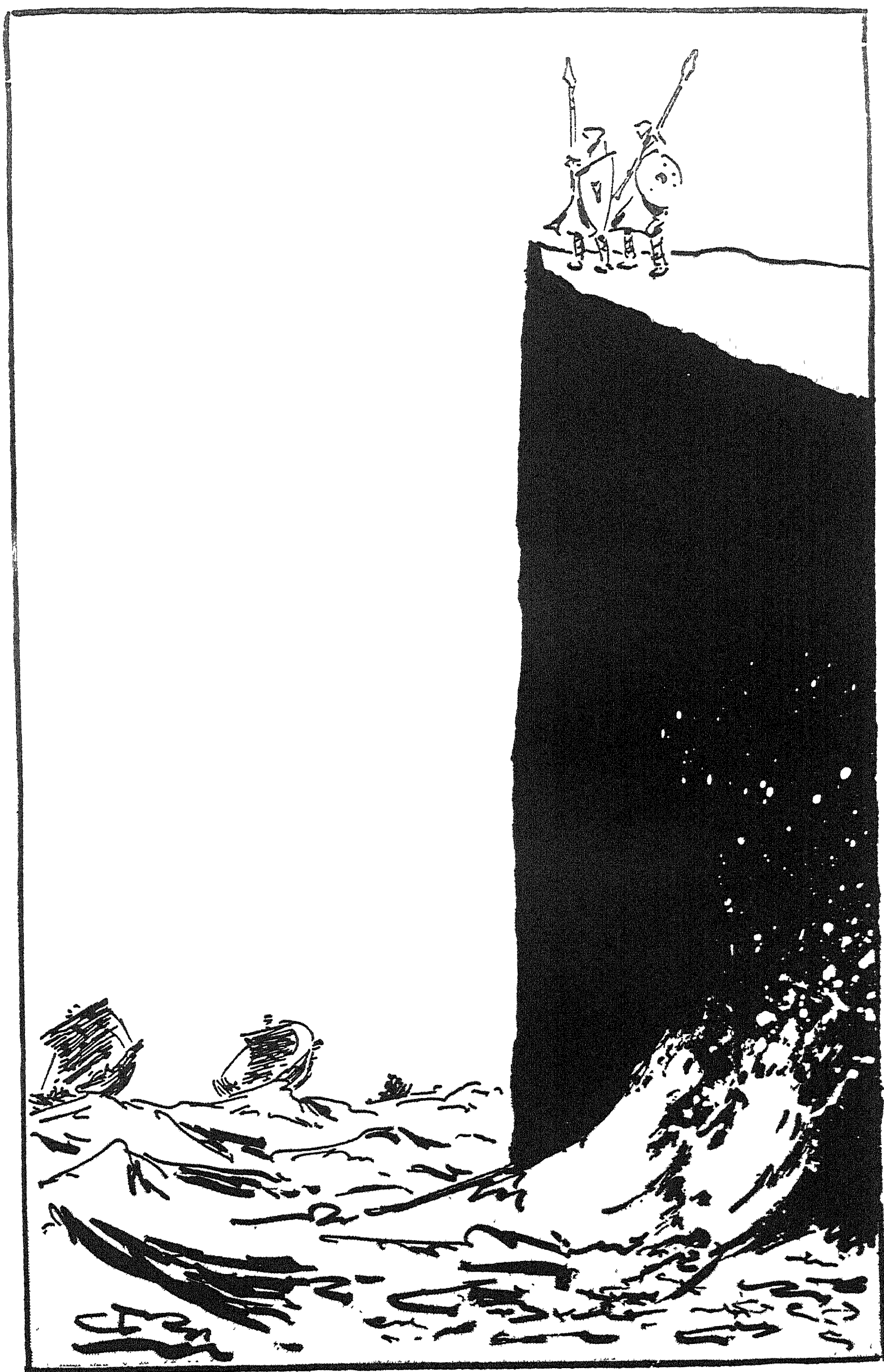
جاگیرداریاں

وسطی یورپ پر تین سمت سے حملے ہوئے جن کی وجہ سے یہ علاقہ ایک لشکرگاہ بن گیا + نظام جاگیرات کی بدولت جو پیشہ ور سپاہی اور حاکم پیدا ہوئے۔ اگر وہ نہ ہوتے۔ تو یورپ تباہ ہو جاتا

۱۰۰۰ء میں یورپ کی یہ حالت تھی۔ کہ لوگ مصائب و آلام سے تنگ آگئے تھے۔ اور زندگی سے اس قدر بیزار تھے۔ کہ جب کسی نے پیشین گوئی کی کہ قیامت آنے والی ہے۔ تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور جوق درجوق خانقاہوں کا رُخ کیا۔ تاکہ جب حساب کا وقت آن پہنچے۔ تو وہ خدا کی عبادت میں مصروف پائے جائیں +

کسی غیر معلوم تاریخ کو جرمن نسل کے قبائل اپنے قدیم ایشیائی وطن کو چھوڑ کر یورپ میں آن بسے تھے جب آبادی بڑھی۔ اور وہ مقبوضہ علاقے میں نہ سما سکے۔ تو انہوں نے مملکت روما کا رُخ کیا۔ اور اس مملکت کے مغربی حصے کو تباہ کر ڈالا۔ مشرقی حصہ چونکہ ان مہاجر قوموں کے رستے سے ہٹ کر واقع تھا۔ اس لئے وہ بچ گیا۔ اور وہاں روما کی قدیم تہذیب و عظمت کے دھندلے سے نشان سلامت رہ گئے +

اس کے بعد بدنظمی کا دور شروع ہوا۔ یہ چھٹی اور ساتویں صدی کا واقع ہے۔ (اور یہی زمانہ فی الحقیقت "زمانہ تاریک" کہلانے کا مستحق ہے) اس طوائف الملوکی کے زمانے میں جرمن قبیلوں نے عیسائیت کا مذہب اختیار کر لیا۔ اور اسقف روما کو کل دنیا کا مذہبی پیشوا یعنی پاپا تسلیم کر لیا + نویں صدی میں شارلمان کے حسن تدبیر کی بدولت مملکت روما از سرِ نو زندہ ہوئی۔ اور مغربی یورپ کے بیشتر علاقے نے متحد ہو کر واحد سلطنت کی شکل اختیار کر لی + دسویں صدی میں اس سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مغربی حصہ علیحدہ ہو کر سلطنت فرانس کہلایا۔ مشرقی حصے کا نام "جرمن قوم کی مقدس رومن مملکت"



نارمنوں کی آمد

پڑ گیا۔ اور یہ دراصل کئی سلطنتوں کی متحدہ صورت کا ایک نام تھا۔ اس مملکت کے فرمانروا اپنے آپ کو سیزر اور آگسٹس کے جانشین سمجھتے تھے ۔

لیکن شاہان فرانس کا اقتدار محل شاہی کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اور مملکت مقدسۂ روما کا یہ حال تھا۔ کہ رعایا میں جو لوگ ذرا قوی ہوتے ۔ وہ اپنے نفع کی خاطر من مانی کارروائیاں کرتے۔ اور حکومت ان سے باز پرس نہ کر سکتی ۔

عوام کی حالت قابل رحم تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ مغربی یورپ کے منتشر ممالک کو تین اطراف سے حملے کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ جنوب کی سمت شمشیر زن مسلمان حکمران تھے۔ مغربی ساحل پر اہل شمال کا غلبہ تھا۔ مشرقی سرحد تمام کی تمام غیر محفوظ پڑی تھی (بجز اس چھوٹے سے ٹکڑے کے جہاں کوہ کارپتھین[1] کی دیوار کھڑی تھی) اور قوم ہن۔ اہل ہنگری سلافیوں اور تاتاریوں کے رحم پر تھی ۔

قدیم روما کا امن و سکون اب محض ایک افسانہ تھا جسے لوگ یاد کر کر کے آہیں بھرتے تھے۔ اب تو یہ حالت تھی۔ کہ جو قوم جنگ کے لئے تیار نہ ہوتی۔ اس کا فنا ہو جانا یقینی تھا۔ قدرتی طور پر لوگ جنگ کو موت پر ترجیح دیتے۔ چنانچہ یورپ کی سرزمین میدان کارزار بن گئی اور لوگوں کو جیدار رہنماؤں کی تلاش ہوئی۔ بادشاہ اور شاہنشاہ دونو بہت دور تھے۔ اہل سرحد کو (سنہ ۱۰۰۰ء میں یورپ کا چپہ چپہ سرحد بنا ہوا تھا) بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ خود ہی اپنی حفاظت کی تدبیر سوچیں ۔ جو شاہی افسر سرحدی علاقوں کے انتظام کے لئے بھیجے جاتے۔ لوگ ان کی اطاعت فوراً قبول کر لیتے۔ مگر صرف اس شرط پر کہ وہ انہیں دشمنوں سے بچائیں ۔

تھوڑے ہی عرصے میں وسطی یورپ میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن گئیں۔ کسی پر کوئی ڈیوک۔ کہیں کوئی بیرن۔ کہیں کوئی اسقف حکمران تھا۔ اور ہر ایک نے جنگ کے لئے اپنے آپ کو منظم کر رکھا تھا ۔ ان ریاستوں کے حاکم یعنی شاہی جاگیردار ان جاگیروں کے عوض جو انہیں عطا ہوئی تھیں۔ بادشاہ کی اطاعت کا حلف اُٹھا چکے تھے۔ اور بادشاہ کو تھوڑا بہت خراج بھیجنے کا وعدہ کر چکے تھے ۔ لیکن پایہ تخت بہت دور تھا۔

---

[1] Carpathian.

اور اس زمانے میں سفر کرنا جان جوکھوں کا کام۔ اس لئے گو بادشاہ کے ملازم تھے ۔ تاہم بہت حد تک خود مختار تھے ۔ اور اپنے اپنے علاقے میں بالکل بادشاہوں کی طرح حکومت کرتے تھے +

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا ۔ کہ گیارھویں صدی کے لوگوں کو یہ طرز حکومت کسی طرح بھی گراں گزرتی تھی + لوگ جاگیرداری کے حامی تھے ۔ کیونکہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نظام نہ صرف مفید بلکہ ضروری تھا + والئے علاقہ ایک سنگین قلعے میں رہتا ۔ جو کسی چٹان کی بلندی پر واقع ہوتا ۔ یا اس کے ارد گرد گہری خندق کھدی ہوتی ۔ رعایا کی آبادی دور نہ ہوتی ۔ تاکہ خطرے کے وقت لوگ جاگیردار کے قلعے میں پناہ لے سکیں + یہی وجہ ہے ۔ کہ یورپ کے اکثر شہر ایسے ہی قلعوں کے ارد گرد آباد ہوئے +

لیکن اوائل زمانہ وسطیٰ کے یہ جاگیردار یا نائٹ[ف] محض تنخواہ دار سپاہی نہ تھے ۔ حکومت کا کام بھی انہی کے سپرد تھا ۔ مقدمات کا فیصلہ بھی یہی کرتے تھے ۔ پولیس کے فرائض بھی یہی سر انجام دیتے تھے + کبھی رہزنوں اور قزاقوں کی سرکوبی کرتے ۔ تاکہ پھیری والے تاجر جو گیارھویں صدی کے سب سے بڑے سوداگر تھے ۔ بلا روک ٹوک اپنا کام کر سکیں ۔ کبھی سمندر یا دریا کے ساحل پر بند تعمیر کراتے ۔ تاکہ کھیتیاں سیلاب سے محفوظ رہیں (چار ہزار سال پہلے دنیا کے اولین امرا بھی مصر میں یہی کچھ کرتے تھے)+ داستان گو گویئے جو بہادر شہسواروں اور نامور سپہ سالاروں کی داستانیں دیس دیس لوگوں کو سناتے پھرتے تھے ۔ وہ بھی جاگیرداروں کے ہاں سے انعام و اکرام پاتے ۔ اور گرجے اور خانقاہیں بھی جاگیرداروں ہی کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتیں ۔ خود تو لکھ پڑھ نہ سکتے تھے (لکھنا پڑھنا مردانگی کے منافی سمجھا جاتا تھا) لیکن حساب کتاب رکھنے کے لئے اور اپنے علاقے میں جو لوگ پیدا ہوں یا مر جائیں یا جن کی شادی ہو جائے ۔ ان کا نام پتہ لکھنے کے لئے پادریوں کو بطور منشی کے ملازم رکھ چھوڑا تھا +

پندرھویں صدی میں بادشاہوں نے پھر زور پکڑا ۔ اور انہیں اس بات کا احساس ہوا ۔ کہ ہم مامور من اللہ ہیں ۔ جاگیرداروں کا اقتدار بہت گھٹ گیا ۔ ان کی

ف Knight.

وہ پہلی سی حیثیت باقی نہ رہی۔ جب قوت زائل ہو گئی۔ تو عضو معطل بن کر رہ گئے۔ اور لوگ ان سے اکتا گئے۔ لیکن زمانۂ تاریک میں اگر یہ جاگیردار نہ ہوتے۔ تو یورپ قطعی تباہ ہو جاتا۔ ان میں اچھے برے سبھی قسم کے لوگ تھے۔ لیکن بارھویں اور تیرھویں صدی کے اکھڑ جاگیردار بالعموم اپنے فرائض منصبی بہت تندہی سے بجا لاتے تھے۔ ان کا وجود سمند ترقی کے لئے ایک تازیانہ تھا۔ اس زمانے میں علم و فن کا آفتاب جس نے مصر اور یونان اور روما کی دنیا کو منور کیا تھا۔ بادلوں میں پنہاں تھا۔ اگر یہ نائٹ اور ان کے رفقائے کار یعنی راہب نہ ہوتے۔ تو تہذیب کا آخری نام و نشان بھی مٹ جاتا۔ اور انسان پھر جنگلوں اور غاروں میں حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگتا۔

شہسواروں کے اصول

یہ ایک قدرتی امر تھا۔ کہ زمانہ وسطیٰ کے پیشہ ور سپاہیوں کے دل میں اپنی تنظیم کا خیال پیدا ہوتا۔ تاکہ موقع آن پڑے۔ تو ایک دوسرے کی حفاظت کرسکیں۔ اسی خیال کے ماتحت شہسواروں یعنی نائٹوں کا سلسلہ قائم ہوا۔ اور شِوَلری[لہ] کی بنیاد پڑی۔ جو اس سلسلے کے بنیادی اصولوں کے مجموعے کا نام ہے +

یہ سلسلہ کب اور کیونکر شروع ہوا۔ اس کے متعلق ہمارے معلومات بہت محدود ہیں + لیکن جب یہ منتظم و منظم ہوگیا۔ تو اس کی بدولت دنیا بھر کی حاجت روائی ہوئی کیونکہ ان دنوں دنیا کو اس بات کی سخت ضرورت تھی۔ کہ بعض ایسے اخلاقی اصول وضع کئے جائیں۔ جن سے اس زمانے کے وحشیانہ طور طریقوں کی اصلاح ہو۔ اور زمانہ تاریک میں پانچ صدیوں تک جن مظالم نے لوگوں کی زندگی حرام کر رکھی تھی۔ ان میں کچھ تخفیف ہو + اُن اہل سرحد کی اصلاح کرنا جنہوں نے اپنی تمام عمریں مسلمانوں اور اہل ہُن اور اہل شمال کے ساتھ لڑنے میں صرف کردی تھیں۔ کچھ آسان کام نہ تھا۔ وہ بدعہد لوگ تھے۔ صبح کے وقت ظلم وتعدی سے توبہ کرتے اور شام پڑنے سے پہلے سب قیدیوں کو قتل کر ڈالتے + لیکن جس چیز کا نام ترقی ہے۔ وہ سالہا سال کی لگاتار محنت اور مسلسل عرق ریزی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ آخر کار ایک ایسا دن بھی آن پہنچا۔ کہ بدعہد سے بدعہد شہسوار بھی اس سلسلے کے اخلاقی قواعد کی پابندی پر مجبور ہوگئے۔ اور اگر ان پر عمل نہ کرتے۔ تو اس انحراف کی سزا بھگتنی پڑتی +

یورپ کے مختلف علاقوں میں مختلف قواعد رائج تھے۔ مگر سب کے بنیادی اصول دو تھے۔ خدمت خلق اور فرض شناسی + زمانہ وسطیٰ میں خدمت خلق کا درجہ بہت اونچا سمجھا جاتا تھا۔ نوکری کو لوگ ذلّت نہ سمجھتے تھے۔ بشرطیکہ دیانتداری اور تندہی سے کی

لہ Chivalry

جائے + باقی رہی فرض شناسی سو وہ ایک سپاہی کی بہترین خوبی سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔ کہ زندگی کی حفاظت کے لئے اکثر ایسے فرائض کی بجا آوری ضروری ہوتی۔ جن کا احساس طبیعت کو بہت گراں گزرتا تھا +

ایک نوجوان شہسوار کو حلفیہ یہ عہد کرنا پڑتا کہ خدا اور بادشاہ دونو کا وفادار خادم ہونگا۔ اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورتوں کو ترجیح دونگا۔ عجز و انکسار کی زندگی بسر کرونگا۔ اپنے کارناموں کے متعلق لافیں نہ مارونگا۔ اور جو لوگ تکلیف میں ہوں ان کی دستگیری کرونگا۔ (مسلمان اس میں شامل نہ تھے۔ ان کو تو دیکھتے ہی مار ڈالنا فرض تھا) +

غور سے دیکھئے۔ تو یہ قواعد فی الحقیقت حضرت موسئے کے دس احکام ہیں۔ صرف انہیں زمانہ وسطیٰ کی ذہنیت کے مطابق ایک نئی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ لوگ انہیں بخوبی سمجھ سکیں۔ ان قواعد کی بنا پر رفتہ رفتہ نشست و برخاست اور میل ملاقات کے نئے نئے طریقے وضع ہوئے۔ شہسوار اور امراشاہ آرتھر کی گول میز کے مشاہیر اور شاہ شارلمان کے نامور مصاحبوں کی تقلید کرنے لگے۔ (داستان گو مطرب اکثر ان لوگوں کے افسانے سنایا کرتے تھے۔ اور اگر تم ان کا حال پڑھنا چاہو۔ تو اس کے متعلق کئی کتابیں موجود ہیں جن کی فہرست آخر میں دی گئی ہے) ان کے دل میں یہ ہوس پیدا ہوئی۔ کہ ہم بھی لینسلاٹ کی سی شجاعت اور رولینڈ کی سی وفاشعاری کی مثال قائم کر کے ان کی طرح زندہ جاوید ہو جائیں۔ وقار کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور گفتگو میں احتیاط اور ملائمت سے کام لیتے تھے۔ تاکہ باوجود اپنے افلاس اور انکسار کے سچے نائٹ کہلائیں اور احترام کی نظروں سے دیکھے جائیں +

اس طرح شہسواروں کا یہ سلسلہ اُس اخلاق عالیہ کا مکتب بن گیا۔ جو معاشرتی زندگی کے کُل پرزوں میں تیل کا کام کرتا ہے۔ شولری کا لفظ خوش اخلاقی کا مرادف بن گیا۔ اور لوگ بہر بات میں جاگیردار اور قلعے دار اُمرا کی تقلید کرنے لگے + جو لباس وہ پہنتے یا جو چیزیں ان کے دستر خوان پر آتیں یا جس طرح سے وہ کسی خاتون سے رقص کی درخواست کرتے۔ وضعدار لوگ اُسی کو مستحسن سمجھتے۔ انہی کی بدولت لوگوں نے چھوٹی چھوٹی ہزارہا باتیں ایسی سیکھیں۔ جن سے زندگی دلچسپ اور خوشگوار بن جاتی ہے +

لیکن انسان فانی ہے۔ اس کے بنائے ہوئے کھیل بھی ایک نہ ایک دن بگڑ جاتے

ہیں + جب شہسواروں کا یہ سلسلہ مفید نہ رہا - تو قدرت نے اسے منتشر کر دیا +
صلیبی جنگوں کے بعد (جن کا حال تمہیں اگلے باب میں سنایا جائیگا) تجارت کو از سر نو فروغ ہُوا - رات رات میں شہروں کے شہر آباد ہو گئے - ان شہروں کے باشندوں نے خوب روپیہ کمایا - قابل معلم نوکر رکھے - اور اُمرا کے ساتھ برابری کے دعوے کرنے لگے -
بارود کی ایجاد نے شہسواروں کی برتری کا خاتمہ کر دیا - اور جنگ میں ان کی ہنرمندی بیکار رہ گئی - لڑائیوں کے لئے کرائے کے سپاہی بھرتی کئے جانے لگے جن سے یہ توقع فضول تھی - کہ وہ شہسواروں کی طرح میدان جنگ کو شطرنج کی بساط سمجھ کر بڑے رکھ رکھاؤ اور تکلف کے ساتھ تمام مراسم و قواعد کا خیال رکھ کر لڑینگے شہسوار بیکار ہو گئے - تاہم وہ اپنے اصولوں پر ویسے کے ویسے قائم رہے - لیکن چونکہ یہ اصول اب عملی زندگی میں بیکار ثابت ہو چکے تھے - اس لئے شہسواروں کے تکلفات تمسخر اور مضحکے کا سامان بن گئے - کہا جاتا ہے کہ جلیل القدر ڈان کوئکزوٹ[1] دے لامانشا سچے شہسواروں کی نسل کا آخری جانشین تھا اس کی وفات کے بعد اس کی شمشیر جوہر دار اور اس کی زرہ بکتر اس کا قرضہ چکانے کے کام آئی +

لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طرح یہ تلوار کئی لوگوں کو ورثے میں پہنچی - وادیٔ فورج[2] کی ناامیدی کے زمانے میں یہی تلوار واشنگٹن کے ہاتھ میں تھی - اور جب گارڈن نے یہ کہا - کہ جن لوگوں کی حفاظت کا کام میرے سپرد کیا گیا ہے - انہیں میں چھوڑ نہیں سکتا - اور یہ کہہ کر خرطوم کے محصور قلعے میں موت کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو گیا - تو یہی تلوار اُس کی رفیق بنی +

اور میں سمجھتا ہوں - کہ یورپ کی جنگ عظیم میں بھی فتح اس تلوار کی بدولت حاصل ہوئی +

---

[1] Don Quixote de la Mancha. [2] Valley Forge.

اِدھر پاپا اُدھر شاہنشاہ

زمانۂ وسطیٰ کے لوگوں کی دو رُخی وفاداری کی وجہ سے پاپاؤں اور مملکت مقدسہ روما کے شاہنشاہوں کے درمیان عرصے تک لڑائی رہی

اگلے وقتوں کے طور طریقے مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ خود آپ کے دادا جان بھی جنہیں آپ روز دیکھتے ہیں۔ اپنے خیالات اور لباس اور اطوار کے لحاظ سے ایک بالکل ہی جُدا دنیا کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر جن لوگوں کی کہانی میں اب آپ کو سنانے والا ہوں۔ اُنہیں تو پچیس پشتیں گزر چکی ہیں۔ ان کا سمجھنا اور بھی دشوار ہے۔ اس لئے آپ کو یہ باب ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ پڑھنا پڑیگا +

زمانۂ وسطیٰ میں عام لوگ بڑی سادہ اور بے رنگ سی زندگی بسر کرتے تھے۔ جو آزاد باشندے تھے۔ وہ اپنی آزادی کے باوجود سفر بہت ہی کم کرتے۔ اور عمر بھر اپنے آس پاس کے علاقے سے باہر قدم نہ رکھتے۔ پڑھنے کو چھپی ہوئی کتابیں نہ تھیں۔ صرف قلمی مسودے تھے۔ اور اُن کی تعداد بھی بہت تھوڑی تھی۔ چند محنتی راہب بعض بعض لوگوں کو پڑھنا لکھنا اور تھوڑا سا حساب سکھا دیا کرتے تھے۔ لیکن سائنس اور تاریخ اور جغرافیہ کے علوم یونان اور روما کے ساتھ ہی زمین میں دفن ہو گئے تھے +

گذشتہ زمانے کے تاریخی حالات لوگ سُنی سنائی داستانوں اور قصّوں ہی سے تھوڑے بہت اخذ کر لیا کرتے تھے۔ بیٹا باپ سے سن کر اپنے بچوں کو سنا دیتا۔ اور یونہی یہ داستانیں سینہ بسینہ ایک پشت سے دوسری پشت تک پہنچ جاتیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں تھوڑا بہت ردّ و بدل ضرور ہو جاتا۔ لیکن بڑے بڑے تاریخی واقعات جُوں کے تُوں سلامت رہتے +

شروع زمانۂ وسطیٰ میں تاریخ روما کی درسی کتابیں تو موجود نہ تھیں۔ اس لئے اس زمانے

کے لوگ کئی ایسی باتوں سے محض بیخبر تھے جنہیں آج کل کا بچہ بچہ جانتا ہے لیکن سلطنت روما جو ہمارے نزدیک محض ایک نام ہے ان کے لئے ایک زندہ چیز تھی۔ وہ اسے اچھی طرح محسوس کرتے تھے۔ وہ پاپا کو برضا و رغبت اپنا روحانی سردار مانتے تھے۔ کیونکہ وہ روما میں رہتا تھا۔ اور روما کی سطوت و جبروت کا آئینہ دار تھا۔ اور جب شارلمان اور شارلمان کے بعد اوٹو اعظم نے ایک عالمگیر سلطنت کے تصور کو از سرِ نو زندہ کیا۔ اور مملکت مقدسہ روما کی بنیاد ڈالی۔ تاکہ دنیا پھر ایک بار اپنی اصلی حالت پر واپس آجائے۔ تو اس زمانے کے لوگوں نے اس کارنامے کو بہت ہی سراہا +

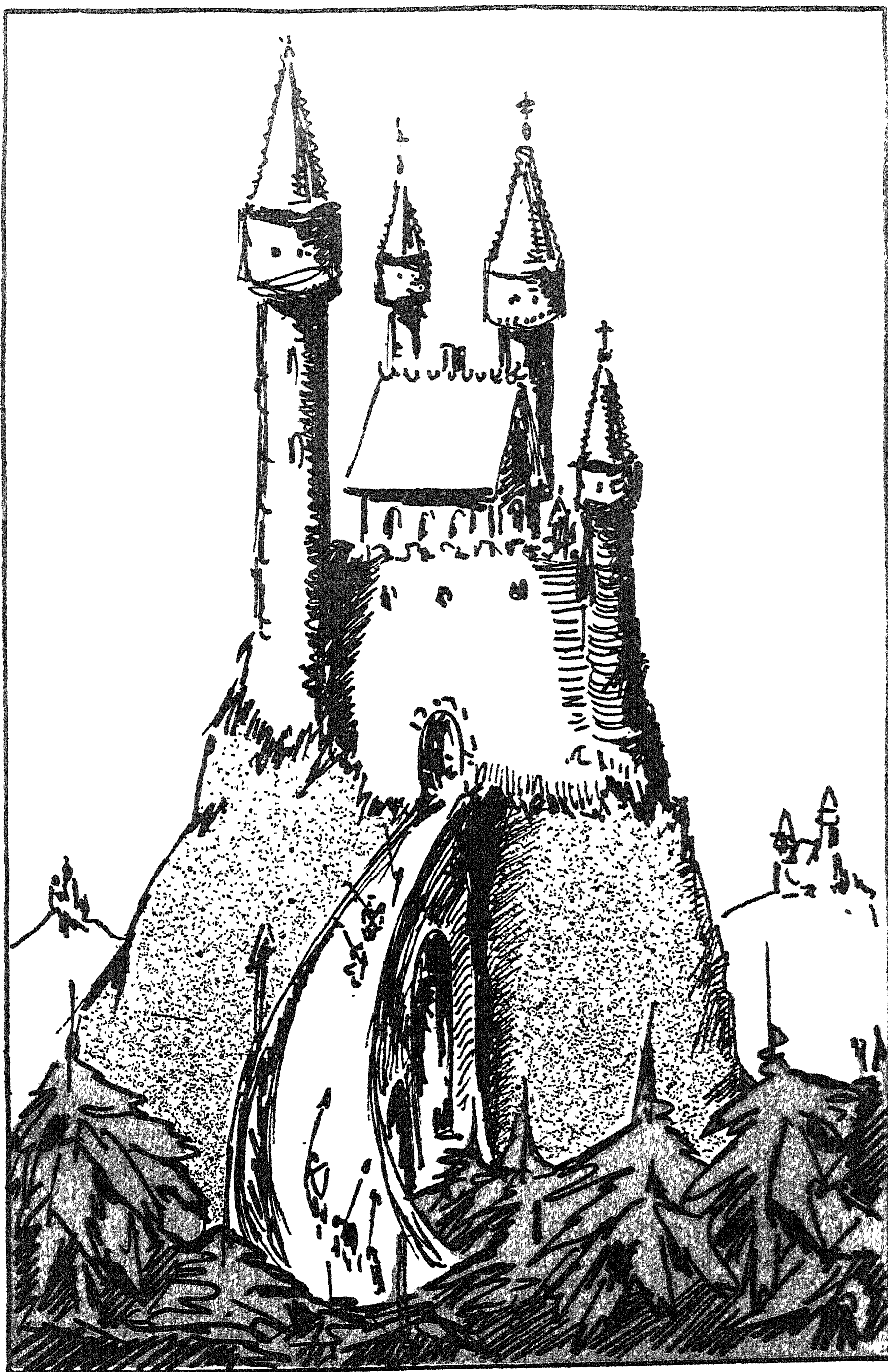
لیکن رومن روایات کے وارث اور علمبردار ایک نہیں دو تھے۔ اور ان دونو میں بہت فرق تھا۔ اس لئے زمانہ وسطیٰ کے وفادار شہری عجب مشکل میں پڑ گئے۔ زمانہ وسطیٰ کے سیاسی نظام کا بنیادی اصول بہت ہی سیدھا اور نہایت معقول تھا۔ وہ یہ کہ رعایا کی جسمانی بہبود کا ذمہ وار دنیاوی آقا یعنی شاہنشاہ ہے۔ اور رُوحوں کا محافظ روحانی آقا یعنی پاپا +

لیکن یہ اصول عملی طور پر بہت بے ڈھنگا ثابت ہؤا۔ شاہنشاہ ہمیشہ کلیسا کے معاملات میں دخل دیتا رہتا تھا۔ پاپا شاہنشاہ کے ملکی انتظامات میں ٹانگ اڑاتا رہتا۔ شاہنشاہ پاپا سے کہتا۔ تم بیچ میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو۔ پاپا شاہنشاہ سے کہتا۔ تم کون ہوتے ہو؟ بات بڑھ جاتی اور جنگ کی نوبت آن پہنچتی +

ایسے حالات میں لوگ بیچارے کیا کرتے۔ سچے عیسائی تو پاپا اور بادشاہ دونو کے فرمانبردار تھے لیکن جب ان دونو میں جنگ چھڑ جائے۔ تو کس کو اچھا کہیں اور کس کو بُرا؟ پاپا سے مل جائیں۔ تو وفادار رعایا کیونکر کہلائیں؟ اور بادشاہ کی حمایت کریں۔ تو مذہب کیونکر قائم رہے؟

اس گتھی کا سلجھانا بہت مشکل تھا۔ بادشاہ طاقتور ہوتا اور مالدار۔ تو فوج کو ترتیب دے کر الپس کو عبور کر لیتا۔ روما پر دھاوا بول دیتا۔ پاپا کو اس کے اپنے محل کے اندر محصور کر دیتا۔ اور تقدس مآب کو اس کے سوا چارہ نہ ہوتا۔ کہ یا بادشاہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ یا پھر جو آن پڑے اُسے بھگتیں +

لیکن بیشتر یہی ہوتا۔ کہ شاہنشاہ پاپا کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکتے۔ اس صورت میں



قلعه

پاپا کی طرف سے بادشاہ اور اس کی تمام رعایا کے نام اس مطلب کا ایک حکم امتناعی جاری ہوجاتا۔ کہ تمام گرجے بند ہوجائیں۔ جو پیدا ہو اُسے بپتسمہ نہ ملے۔ جو مرنے والا ہو۔ اس کی توبہ قبول نہ کی جاتی۔ گویا ملک کا نصف کاروبار بالکل ہی بند ہوجاتا +

پاپا کا عتاب اس سے کبھی بڑھ جاتا۔ تو رعایا سے کہہ دیتا۔ کہ تم پر بادشاہ کی اطاعت واجب نہیں رہی۔ چنانچہ انہیں بغاوت پر اُکسایا جاتا۔ روحانی آقا کی بات نہ مانتے۔ تو گنہگار رہتے۔ اور جو اس کے کہے پر عمل کرتے اور پکڑے جاتے۔ تو بادشاہ انہیں پھانسی پر لٹکا دیتا +

چنانچہ بیچاروں کی زندگی حرام ہوجاتی۔ سب سے زیادہ مصیبت ان لوگوں نے اٹھائی جو گیارھویں صدی کے آخری نصف حصے میں شاہنشاہ ہنری[۱] چہارم کی رعایا تھے۔ ہنری چہارم جرمنی کا شاہنشاہ تھا۔ پاپا گریگوری[۲] ہفتم سے اس کی ٹھن گئی۔ دونوں ایک چھوڑ دو دو لڑائیاں ہوئیں نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ لیکن تقریباً پچاس سال تک یورپ چین کی نیند نہ سویا +

گیارھویں صدی کے وسط میں اصلاح کلیسا کی تحریک بڑے زوروں پر تھی۔ اس سے پہلے پاپاؤں کا انتخاب بہت بیقاعدہ تھا۔ شاہنشاہوں کی بھلائی اسی میں تھی۔ کہ کوئی ایسا شخص پاپا مقرر ہو۔ جو ان کے ڈھب کا ہو۔ تاکہ یہ جب چاہیں اپنا اُلو سیدھا کر سکیں۔ چنانچہ انتخاب کے موقع پر اکثر رونما آجایا کرتے تھے۔ اور اپنا رسوخ اور اقتدار کسی ایسے امیدوار کی حمایت میں صرف کر دیتے تھے۔ جو ان کے مفید مطلب ہوتا +

۱۰۵۹ء میں صورت حالات کچھ اور ہو گئی۔ پاپا نے نکولس[۳] ثانی نے ایک حکم جاری کیا جس کی رُو سے روما اور روما کے گرد و نواح میں جس قدر گرجے تھے۔ ان کے بڑے بڑے پادریوں کی ایک مجلس مرتب کی گئی۔ اور آئندہ کے لئے پاپا کے انتخاب کا حق اس مجلس کو سونپ دیا گیا +

۱۰۷۳ء میں اس مجلس نے ہلڈابرینڈ[۴] نامی ایک پادری کو جس کا وطن ٹسکنی[۵] اور

---

[۱] Henry. [۲] Gregory. [۳] Nicholas.

[۴] Hildebrand. [۵] Tuscany.

جس کے ماں باپ غریب لوگ تھے۔ پاپا منتخب کیا۔ پاپا مقرر ہونے کے ساتھ اس نے گریگوری ہفتم کا لقب اختیار کر لیا۔ آدمی بڑی ہمت والا تھا۔ جی دار۔ اور عقیدے کا پکا۔ اپنے مقدس عہدے کے اختیارات میں کسی کی چوں وچرا کا روادار نہ تھا۔ پاپائے روما کو نہ صرف کلیسائے مسیحی کا مطلق العنان بادشاہ بلکہ دنیاوی معاملات میں بھی سب کا سردار سمجھتا تھا۔ اس کا اصول یہ تھا۔ کہ اگر پاپا چھوٹے موٹے جرمن شہزادوں کو شاہنشاہی کے رتبے پر فائز کر سکتا ہے۔ تو انہیں وہاں سے معزول کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ کوئی ڈیوک ہو یا بادشاہ یا شاہنشاہ۔ پاپائے روما سب کے قوانین و احکام پر جب چاہے قلم پھیر سکتا ہے۔ اور جو شخص پاپا کے اختیارات میں ذرہ برابر بھی شک لائے اس کی خیر نہیں ۔

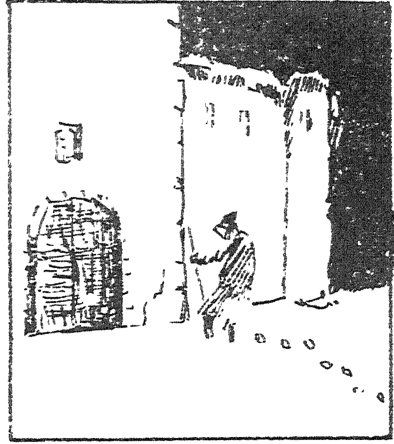
گریگوری نے اپنے ایلچی یورپ کے ہر ایک دربار میں بھیج کر شاہان ملک کو اپنے نئے قوانین سے آگاہ کیا۔ ولیم فاتح[1] نے تو انہیں سر آنکھوں پر رکھا۔ لیکن ہنری چہارم نے جو چھ برس کی عمر ہی سے اپنی رعایا کے ساتھ لڑتا چلا آیا تھا۔ پاپا کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا۔ اس نے جرمن اسقفوں کی ایک مجلس منعقد کی۔ گریگوری پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے۔ اور مجلس نے اُسے پاپائی کے عہدے سے معزول کر دیا ۔

پاپا نے اس کا انتقام یوں لیا۔ کہ ہنری چہارم کو کلیسا کے حلقے سے خارج کر دیا۔ اور جرمن شہزادوں سے اس بات کا مطالبہ کیا۔ کہ تم اپنے نالائق شاہنشاہ کو برطرف کر دو۔ شہزادے پہلے ہی ہنری سے بیزار بیٹھے تھے۔ انہوں نے پاپا سے درخواست کی۔ کہ آپ اوگسبرگ[2] کے مقام پر تشریف لائیے۔ تاکہ آپ کی مدد سے ہم کسی اور شخص کو اپنا شاہنشاہ منتخب کر لیں ۔

گریگوری روما سے شمال کی سمت چل پڑا۔ ہنری کوئی نادان بچہ تو نہ تھا۔ جو خطرے کو محسوس نہ کرتا۔ جانتا تھا۔ کہ پاپا سے صلح کرنی پڑیگی۔ اور فوراً کرنی پڑیگی۔ چنانچہ پاپا ذرا دم لینے کو کنوسّا[3] کے مقام پر ٹھہرا۔ تو ہنری بھی عین کڑاکے کی سردی میں ایلپس

---

[1] William the Conquero.. [2] Augsburg. [3] Conossa



ہنری چہارم کنوسا کے مقام پر

کو عبور کرکے وہیں جا پہنچا۔ ۲۵۔ جنوری سے ۲۷۔ جنوری ۱۰۷۷ء تک تین دن متواتر صبح سے شام تک ہنری راہبوں کے کپڑے پہنے ایک تائب گنہگار کی طرح قلعہ کنوسا کے دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ (بظاہر تو لباس راہبوں کا تھا۔ لیکن اس کے نیچے گرم کپڑے پہن رکھے تھے) آخرکار پاپا کے حضور میں باریابی ہوئی۔ اور اس کے تمام گناہ بخش دئے گئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد اپنا توبہ توڑ ڈالی۔ جونہی جرمن واپس پہنچا۔ پھر اپنی حرکتوں پر اتر آیا۔ چنانچہ پاپا نے پھر اُسے کلیسا کے دائرے سے خارج کر دیا۔ پھر جرمن اسقفوں کی مجلس منعقد ہوئی۔ گریگوری کو پھر معزول کر دیا گیا۔ ہنری نے پھر الپس کو عبور کیا۔ لیکن ابکے ایک بہت بڑی فوج اس کے ساتھ تھی۔ روما کا محاصرہ کیا۔ گریگوری کو سلیرنو[1] بھگا دیا۔ جہاں وہ جلاوطنی کے عالم میں راہیٔ ملک بقا ہوا یعنی اس پہلی جنگ کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ جونہی ہنری نے واپس جرمنی میں قدم رکھا۔ پاپا اور شاہنشاہ کی باہمی کشمکش پھر شروع ہوگئی +

تھوڑے عرصے بعد جرمنی کا تاج و تخت خاندان ہوہن ستوفن[2] کے قبضے میں آیا۔ یہ پہلے شاہنشاہوں سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے۔ گریگوری کا یہ دعوے تھا۔ کہ چونکہ روما کے اُسقف قیامت کے روز خدا کے حضور میں اپنے تمام پیروؤں کے اعمال کے جوابدہ ہونگے۔ اس لئے ان کا رتبہ شاہنشاہوں سے بلند تر ہے۔ کیونکہ خدا کے نزدیک شاہنشاہ بھی انہی بھیڑوں کے گلے میں شامل ہیں۔ جن کی رکھوالی پاپاؤں کے سپرد ہے +

خاندان ہوہن ستوفن کے شاہنشاہ فریڈرک[3] نے جو باربروسا[4] یعنی "سرخ ریش" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک اور ہی راگ الاپنا شروع کیا۔ اس کا دعوے یہ تھا۔ کہ میرے مورث

---

[1] Salerno. [2] Hohenstaufen. [3] Fredrick.
[4] Barbarossa.

کو یہ مملکت خود خدا کی طرف سے ملی تھی۔ اور اس مملکت میں اطالیہ اور روما بھی شامل ہیں چنانچہ اس نے ان دو صوبوں کو جو بقول اُس کے اسی مملکت کے کھوئے ہوئے حصے تھے۔ پھر سے مفتوح کرنے کی کوشش کی۔ باربروسا تیسری صلیبی لڑائی کے دوران میں ایشیائے کوچک میں کہیں ڈوب کر مر گیا۔ لیکن اس کے بیٹے فریڈرک ثانی نے اس جنگ کو جاری رکھا۔ فریڈرک ثانی جوانی کا زمانہ صقلیہ کی اسلامی تہذیب کے زیرِ اثر بسر کر چکا تھا۔ اس لئے پاپاؤں نے اس پر بے دینی کا الزام لگایا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ فریڈرک ثانی شمال کے اکھڑ عیسائیوں بجیر مہذب اور ناشائستہ جرمن سرداروں اور دغا باز اور سازشی لطالوی پادریوں سے سخت متنفر تھا۔ لیکن وہ اپنے دل کی بات کبھی زبان پر نہ لایا تھا۔ برعکس اس کے اس نے ایک صلیبی لڑائی میں شامل ہو کر یروشلم کو مسلمانوں سے چھین لیا۔ چنانچہ اسے شہر مقدس کا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ لیکن پاپا اس پر بھی مطمئن نہ ہوئے۔ انہوں نے فریڈرک کو تخت سے محروم کر دیا۔ اور اس کے اطالوی مقبوضات چارلس آف آنژو[1] کے سپرد کر دیئے۔ (یہ چارلس فرانس کے اُس شاہنشاہ لوئی کا بھائی تھا۔ جو بعد میں سینٹ لوئی کے نام سے مشہور ہؤا)۔ اس پر پھر جنگ چھڑ گئی۔ ہوہن ستوفن کے آخری شاہنشاہ کونراد[2] پنجم نے جو کونراد چہارم کا بیٹا تھا۔ کھوئی ہوئی سلطنت پھر حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن شکست کھائی۔ نیپلز[3] کے مقام پر اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ لیکن بیس سال بعد فرانسیسی جن کی طرف سے اہلِ صقلیہ سخت بددل ہو رہے تھے۔ تمام کے تمام مارے گئے۔ گویا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا +

پاپاؤں اور شاہنشاہوں کے باہمی تنازعوں کا فیصلہ تو کبھی نہ ہؤا لیکن کچھ عرصے بعد دونوں نے ایک دوسرے سے کنارہ کشی اختیار کر لی +

۱۲۷۳ء میں روڈلف آف ہیپس برگ[4] شاہنشاہ منتخب ہؤا۔ اس نے اتنی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔ کہ تاجپوشی کے لئے روما چلا جاتا۔ لیکن پاپاؤں نے اس سے کچھ تعرض نہ کیا۔ بلکہ جرمنی سے الگ تھلگ ہی رہے۔ اس سے بالآخر امن و امان قائم

---

[1] Anjou. [2] Conrad. [3] Naples.

[4] Rudolph of Hapsburg.

ہو گیا۔ لیکن پورے ۲۰۰ سال کا عرصہ جس کے دوران میں اندرونی نظم و نسق کا کام سرانجام پاسکتا تھا۔ اور جو بیفائدہ لڑائیوں میں ضائع ہو گیا۔ وہ پھر ہاتھ نہ آیا +

دنیا کا سلسلہ ایسا ہے۔ کہ ایک کی ابتری میں دوسرے کی بہتری کی صورت نکل آتی ہے پاپاؤں اور شاہنشاہوں کی آویزش میں موقع سے فائدہ اُٹھاکر اطالیہ کے چھوٹے چھوٹے شہروں نے بہت کچھ آزادی حاصل کر لی۔ اور حسب موقع کے مطابق کبھی اس سے کبھی اس سے اتحاد کر کے اپنے اقتدار کو بڑھا لیا۔ جب لوگ ہزاروں کی تعداد میں ایکبار ہی ارض مقدس کو چل دئے۔ اور انہیں جہازوں میں لاد کر سمندر پار پہنچانے کے لئے انتظامات کرنے پڑے۔ تو ان ہی چھوٹے چھوٹے شہروں کے باشندوں نے یہ کام سنبھالا۔ صلیبی لڑائیاں ختم ہوتے تک ان لوگوں نے بہت سا روپیہ جمع کر لیا۔ اور اپنے شہروں کو خوب اچھی طرح مستحکم بنالیا۔ اس طاقت اور دولت کے بل پر پاپا اور شاہنشاہ دونو سے بے نیاز ہو گئے +

کلیسا اور سلطنت کی باہمی لڑائی ہوئی۔ اور مال غنیمت ایک تیسرے فریق یعنی زمانۂ وسطیٰ کے شہریوں کے ہاتھ آیا +

صلیبی لڑائیاں

لیکن جب ترکوں نے ارض مقدس پر قبضہ کر لیا۔ اور مشرق سے مغرب کو تجارت کی راہیں بند کر دیں۔ تو آپس کے سب جھگڑے مٹ گئے اور یورپ نے مذہبی جنگ پر کمر باندھ لی

عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان تین صدیوں تک صلح رہی بجز دو سلطنتوں (یعنی ہسپانیہ اور مشرقی مملکت روما) کے جو گویا یورپ کے دروازوں پر یورپ کی محافظ بنی بیٹھی تھیں۔ مسلمانوں نے ساتویں صدی میں شام کو فتح کر لیا تھا۔ اور اب ارض مقدس پر قابض تھے۔ لیکن وہ حضرت عیسے ؑ کو خدا کا نبی مانتے تھے۔ (گو حضرت محمد ؐ کو ان سے افضل سمجھتے تھے)۔ اس لئے جو عیسائی زائر مزار مقدس کے مقام پر شاہنشاہ قسطنطین کے تعمیر کردہ گرجے میں مسیح کی عبادت کرنا چاہتے۔ مسلمان ان سے تعرض نہ کرتے تھے۔ لیکن گیارھویں صدی کے شروع میں ایشیا کے ایک بادیہ نشین قبیلے کے لوگ جو سلجوقی یا ترک کہلاتے تھے۔ مغربی ایشیا میں اسلامی سلطنت پر قابض ہو گئے۔ صلح و آشتی کا خاتمہ ہو گیا۔ ترکوں نے ایشیائے کوچک کا تمام علاقہ مشرقی رومن شاہنشاہوں سے چھین لیا۔ اور مشرق و مغرب کی تجارت کا رستہ مسدود ہو گیا۔

شاہنشاہ الیکسز[1] یوں تو اپنے مغربی عیسائی بھائیوں سے بہت میل جول نہ رکھتا تھا۔ لیکن اس موقع پر اس نے یہ کہہ کر سب عیسائیوں سے مدد مانگی۔ کہ اگر ترک قسطنطنیہ پر قابض ہو گئے۔ تو تمام یورپ معرض خطر میں پڑ جائیگا۔

---

[1] Alexis.

جن اطالوی شہروں نے ایشیائے کوچک اور فلسطین کے ساحل پر آبادیاں قائم کر رکھی تھیں ۔ انہیں اپنے مقبوضات کی فکر پڑ گئی ۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے ظلم اور عیسائیوں کی مظلومی کی دردناک داستانیں مشہور کر دیں ۔ اور تمام یورپ میں جوش و اضطراب کی لہر دوڑ گئی +

پاپا پاپے اربن[1] دوم ریمز کا رہنے والا فرانسیسی تھا اور کلونی[2] کے مشہور مدرسے کا فارغ التحصیل تھا ۔ یہ وہی مکتب ہے ۔ جہاں گریگوری دوم نے تعلیم پائی تھی ۔ ترکوں کے کارنامے سن کر اس کے دل میں خیال پیدا ہوا ۔ کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع یہی ہے ۔ ادھر یورپ کی اقتصادی حالت ابتر ہو رہی تھی ۔ کاشتکاری کے طریقے وہی دقیانوسی تھے ۔ جو رومنوں کے زمانے سے چلے آتے تھے ۔ اناج کی ہمیشہ قلت رہتی تھی ۔ لوگ بیکاری اور قحط کے ہاتھوں تنگ تھے ۔ اور بے اطمینانی اور شورش کا خطرہ ہر وقت دامنگیر تھا ۔ ادھر مغربی ایشیا کا علاقہ ایک ایسا علاقہ تھا ۔ جہاں قدیم زمانے میں کروڑوں لوگ خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے ۔ پاپا نے دل میں کہا کیا ہی اچھا ہو ۔ اگر یورپ کی کچھ آبادی اس علاقے کو فتح کر کے وہیں آباد ہو جائے +

چنانچہ ۱۰۹۵ء میں فرانس کے شہر کلیرمونٹ[3] کے مقام پر پاپا نے کونسل میں کھڑے ہو کر تقریر کی ۔ مسلمانوں کے مظالم کو بالتفصیل بیان کیا ۔ اور ایشیائے کوچک کی زرخیزی اور شادابی کی ایک ایسی رنگین تصویر کھینچی ۔ کہ حضرت موسےٰ کے زمانے کی دودھ اور شہد کی نہریں آنکھوں کے سامنے بہتی ہوئی دکھائی دینے لگیں ۔ اس نے فرانس کے شہسواروں اور یورپ کے تمام باشندوں کو تلقین کی کہ اپنی بیویوں کو چھوڑ دو ۔ اپنے بچوں کو چھوڑ دو ۔ اور فلسطین کو ترکوں سے نجات دلاؤ +

یورپ بھر میں مذہبی جنون کا سیلاب پھیل گیا ۔ اور لوگوں نے عقل و خرد کو بالکل ہی پس پشت ڈال دیا ۔ جو لوہار تھا اس نے اپنے ہتھوڑے کو ۔ جو بڑھئی تھا اُس نے اپنے آرے کو ہاتھ سے رکھ دیا ۔ دکانیں بند کر دیں ۔ اور ترکوں کا خون بہانے کے ارادے سے مشرق کا رُخ کیا ۔ بچے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے کہ فلسطین پہنچ کر ان خونخوار

---

[3] Clermont. [2] Cluny. [1] Urban II.

ترکوں کو محض اپنے معصوم جوش اور مسیحی پاکدامنی کے زور سے نیچا دکھائیں۔ لیکن ان مذہبی دیوانوں میں سے نوّے فیصدی کو ارض مقدس دیکھنا بھی نصیب نہ ہؤا۔ روپیہ ان کے پاس نہ تھا۔ اس لئے پیٹ بھرنے کے لئے یا بھیک مانگتے یا چوری کرتے۔ کوئی شاہراہ ایسی نہ رہی جہاں لوگوں کا مال ان کی دستبرد سے محفوظ ہو۔ چنانچہ لوگوں نے طیش میں آکر انہیں مار ڈالنے سے بھی دریغ نہ کیا +

صلیبیوں کا پہلا لشکر مخلص عیسائیوں کے ایک بے ترتیب ہجوم۔ مفرور دیوالیوں۔ قلاش امیروں اور بھگوڑے مجرموں پر مشتمل تھا۔ جو نیم مجنوں پطرس راہب اور والٹر مفلس کی سرکردگی میں غیر مسیحیوں سے نبرد آزما ہونے کو گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ پہلا کام انہوں نے یہ کیا۔ کہ رستے میں جو یہودی ملے۔ ان سب کو موت کے گھاٹ اتارا۔ لیکن ہنگری سے بھی آگے نہ بڑھنے پائے تھے۔ کہ سب کے سب مارے گئے +

کلیسا کو اس تلخ تجربے سے نصیحت ہوئی۔ اور تحقیق ہؤا۔ کہ ارض مقدس کو آزاد کرانے کے لئے محض جوش و خروش سے کام نہ چلیگا۔ نیک نیتی اور حوصلہ مندی کے علاوہ تنظیم بھی ضروری ہے۔ چنانچہ دو لاکھ آدمیوں کی ایک فوج کو مرتب و منظم کرنے میں ایک سال کا عرصہ صرف کیا۔ اور ان کو گوڈفرے آف بوئیاں[۱] ۔ رابرٹ ڈیوک آف نارمنڈی۔ اور رابرٹ کاؤنٹ آف فلانڈرز ایسے فنون جنگ کے ماہر اور تجربہ کار امرا کے زیر کمان رکھا +

۱۰۹۶ء میں دوسرے صلیبی لشکر نے اپنا طویل سفر شروع کیا۔ قسطنطنیہ پہنچ کر شہسواروں نے شاہنشاہ کے دربار میں خراج عقیدت پیش کیا۔ کیونکہ قدیم روایات فنا ہونے کے لئے بھی ایک عرصہ چاہتی ہیں۔ اور ایک رومن شاہنشاہ گو وہ مفلس اور کمزور ہی کیوں نہ ہو پھر بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جب ایشیا پہنچے۔ تو جہاں جس مسلمان کو پایا وہیں اس پر ہاتھ صاف کیا۔ یوروشلیم پر دھاوا بول دیا۔ وہاں کی مسلم آبادی کو بیدردی سے تہ تیغ کر ڈالا۔ اور خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے زہد و ممنونیت کے آنسو بہاتے ہوئے مزار مقدس پر پہنچے۔ لیکن ترکوں نے کمک کے پہنچتے ہی پھر

---

[۱] Bouillon.

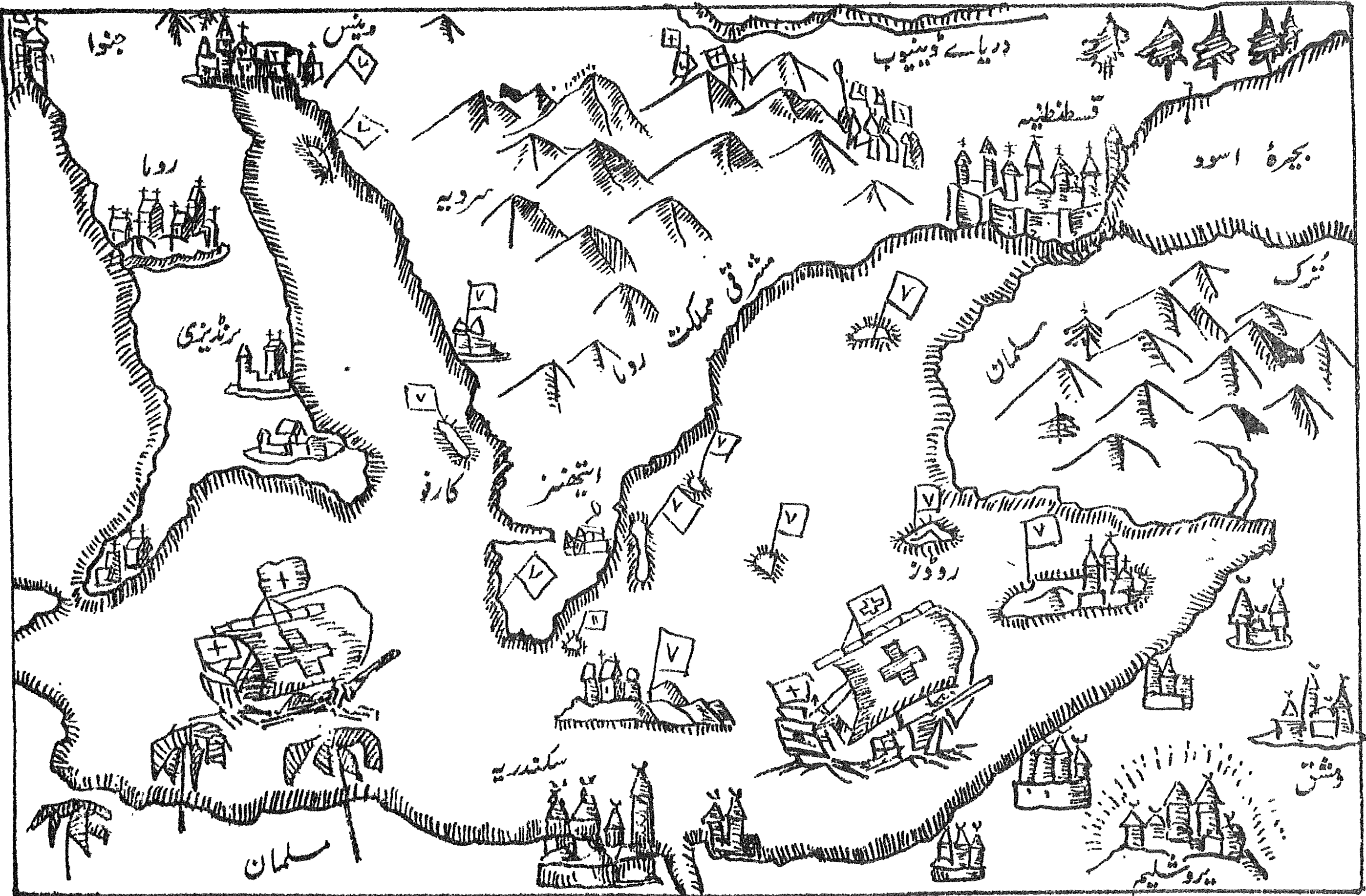
زور پکڑا - یروشلیم کو دوبارہ فتح کر لیا - اور پھر سلطان صلیب کو قتل کر ڈالا ۔



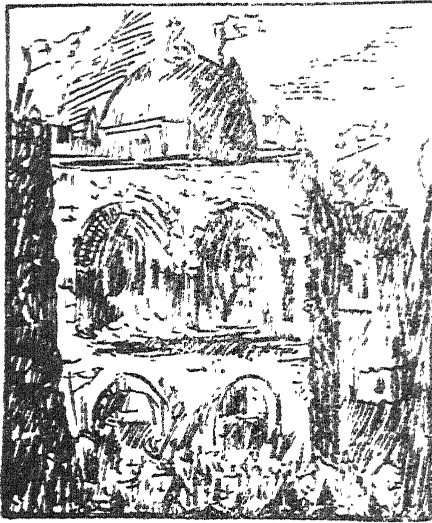
پہلی صلیبی جنگ

اس کے بعد دو سو سال کے عرصے میں سات صلیبی جنگیں برپا ہوئیں - رفتہ رفتہ صلیبی سپاہی رستے کے نشیب و فراز سے واقف ہو گئے ۔ خشکی کے سفر کو بہت صبر آزما اور پُر خطر پایا - اس لئے کوہ الپس کو عبور کر کے جنوا یا وینس پہنچ کر جہاز پر سوار ہو جاتے اہل جنوا اور اہل وینس نے ان مسافروں کی آمد و رفت سے خوب ہاتھ رنگے - کرائے کی بڑی بڑی رقمیں وصول کیں - اور اگر صلیبیوں کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہوتا (اور ان میں کے بیشتر لوگ تھے بھی نادار) تو ان لالچی اطالویوں کو اس سے بھی دریغ نہ تھا - کہ کرایے کے بدلے میں ان سے خدمت کرانے - مثلاً وینس سے ایکر[1] تک کا کرایہ ایک مفلس صلیبی یوں ادا کرتا - کہ مالکان جہاز کی خاطر سپاہیوں کا کام کرتا - اور ان کی طرف سے کسی جنگ میں شامل ہوتا ۔ اس طریقے سے وینس نے ایڈریاٹک کے ساحل کے ساتھ ساتھ اندرون یونان اور قبرص اور کریٹ[2] اور روڈز[3] میں اپنے مقبوضات میں بہت سا اضافہ کر لیا - چنانچہ اسی سلسلے میں ایتھنز بھی اہل وینس کی نو آبادی بن گیا ۔

Rhodes. ۳ـہ   Crete. ۲ـہ   Acre. ۱ـہ



صلیبی جنگوں کی دنیا



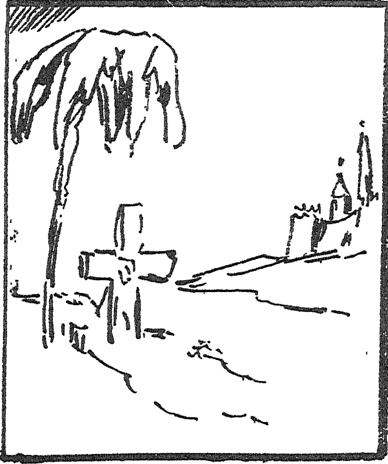
صلیبی یروشلم پر قبضہ کر رہے ہیں

لیکن ارضِ مقدس کا مسئلہ جوں کا توں رہا۔ شروع شروع کے جوش ختم ہو گئے تو تھوڑے عرصے کے لئے صلیبی مہم میں شامل ہونا ہر شریف زادے کی تعلیم کا ایک جزو سمجھا جانے لگا۔ اس لئے فلسطین میں جنگ کرنے کے لئے سپاہی ہر وقت آسانی سے دستیاب ہو جاتے۔ لیکن وہ پہلے کا سا جوش اب باقی نہ رہا تھا۔ صلیبی شروع شروع میں تو مسلمانوں سے سخت نفرت اور مشرقی مملکتِ روما اور آرمینیا کے عیسائیوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اور صلیبی جنگ شروع بھی انہی جذبات کے ماتحت ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں ان لوگوں کی ذہنیت بدل گئی۔ وہ بازنطینی یونانیوں کو جو کئی بار نہ صرف ان کو بلکہ خود خداوندِ صلیب کو دھوکا دے چکے تھے۔ نیز آرمینیوں اور ان کے قرب وجوار کی تمام قوموں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اور اس کے برعکس انہیں اپنے دشمن ترک اپنی عالی ظرفی اور انصاف پسندی کی وجہ سے دن بدن محبوب تر معلوم ہونے لگے۔

ان خیالات کا کھلم کھلا اظہار کرنا ناممکن تھا۔ تاہم ایک صلیبی جب جنگ سے لوٹ کر آتا۔ تو اپنی وضع قطع اور آداب و اطوار میں مسلمانوں کی نقل کرتا جن کے مقابلے میں یورپ کے عام امیر یا شہسوار اُسے بالکل ہی گنوار معلوم ہوتے تھے۔ صلیبی فلسطین سے کھانے کی نئی نئی چیزیں مثلاً آڑو اور پالک کا ساگ بھی اپنے ساتھ لایا۔ اور اپنے باغ میں ان کے پودے لگائے۔ اور خود ان کو مزے لے لے کر کھاتا رہا۔ وہ اکثر اوقات کسی سوتی کپڑے یا ریشم کی بڑی سی عبا بھی پہن لیتا۔ جو یوں تو ساسانیوں کا لباس تھا۔ لیکن اس زمانے تک تمام مسلمانوں میں رائج ہو چکا تھا۔ اور خاص مسلمانوں کا لباس سمجھا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ صلیبی لڑائیاں شروع تو اس لئے ہوئی تھیں۔ کہ غیر مسیحیوں کو جسارت اور بیدینی کی سزا دی جائے۔ لیکن اثر ان کا یہ ہوا۔ کہ ان کی بدولت یورپ

کے کروڑوں نوجوانوں نے تہذیب اور تمدن کا سبق سیکھا ٭

فن جنگ اور فن سیاست کے نقطہ نظر سے صلیبی جنگیں بالکل ناکام رہیں۔ یوروشلیم اور کئی اور شہر ہاتھ میں آکر نکل گئے۔ شام اور فلسطین اور ایشیائے کوچک میں دس بارہ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ لیکن ترکوں نے پھر انہیں فتح کرلیا۔ اور جب ۱۲۴۴ء میں مسلمان یوروشلیم پر قطعی طور پر قابض ہوگئے۔ تو ارض مقدس کی حالت پھر وہی ہوگئی۔ جو ۱۰۹۵ء سے پہلے تھی ٭



صلیبی کی قبر

لیکن یورپ کی ذہنیت میں ایک نمایاں فرق آگیا۔ اہل مغرب نے مشرق کا نور اور مشرق کا حسن جب ایک دفعہ دیکھ لیا۔ تو انہیں اپنے بے رونق قلعے رہنے کے قابل معلوم نہ ہوئے۔ وہ اپنی زندگی کو زیادہ وسیع بنانا چاہتے تھے۔ اور یہ وسعت نہ کلیسا انہیں دے سکتا تھا نہ شہنشاہ ٭

یہ وسعت اور آزادی انہیں شہروں میں نصیب ہوئی ٭

زمانۂ وسطیٰ کا شہر

زمانۂ وسطیٰ کے لوگ یہ کیوں کہتے تھے کہ "شہر کی ہوا آزاد ہوا ہے"

زمانۂ وسطیٰ کا ابتدائی دور آباد کاری کا دور تھا۔ مملکت روما کی شمال مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ جو جنگلوں اور پہاڑوں اور دلدلوں کا علاقہ تھا۔ ایک نئی قوم اُسے عبور کر کے مغربی یورپ کے میدانوں پر قابض ہو گئی تھی۔ اور جیسا کہ آباد کاروں کا قاعدہ ہے۔ جوشِ عمل سے بیقرار تھی۔ ان لوگوں نے جنگلوں کے جنگل صاف کر ڈالے۔ اور اسی جوشِ عمل میں اگر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کا موقع آ گیا۔ تو اس سے بھی دریغ نہ کیا۔ ایسے لوگ بھلا شہروں میں رہنا کیونکر پسند کرتے۔ وہ آزادی کی زندگی چاہتے تھے۔ انہیں لطف اسی میں آتا تھا۔ کہ ہوا میں لہلاتے ہوئے مرغزاروں میں اپنے گلے چرائیں۔ اور پہاڑوں کی تازہ کھلی ہوا میں سانس لیں۔ ایک مقام پر چندے قیام کرتے۔ وہاں سے اُکتا جاتے تو کہیں اور چل دیتے۔

ان میں سے جو کمزور تھے۔ وہ مر کھپ گئے۔ جو طاقتور مرد اور بہادر عورتیں تھیں۔ وہی زندہ بچیں۔ چنانچہ ان کی نسل میں سے کمزور لوگ چھٹ گئے۔ اور صرف مضبوط و توانا لوگ باقی رہ گئے۔ ان لوگوں کو زندگی کی دلکشیوں اور آرائشوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ مصروف اس قدر رہتے تھے۔ کہ سارنگی بجانے یا شعر لکھنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ اور بحث مباحثے تو انہیں پسند ہی نہ تھے۔ گاؤں میں پڑھا لکھا شخص صرف پادری ہی ہُوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور شخص پڑھ لکھ جائے۔ تو اسے کچھ نکھٹو بلا سا سمجھا جاتا۔ جن باتوں کا عملی زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہ ہوتا۔ وہ پادری سے جا کر حل کراتے۔ اس عرصے میں جرمن سردار فرنگی بیرن اور شمالی ڈیوک مختلف علاقوں پر قابض ہو گئے۔ گویا ایسے ممالک پر حکومت کرنے لگے۔ جو کسی زمانے میں روما کی عظیم الشان مملکت میں شامل تھا۔ عظمت رفتہ کے کھنڈروں کے درمیان انہوں نے اپنی ایک دنیا بنا ڈالی۔ جسے دیکھ

دیکھ کر دہ خوش ہوتے تھے۔ اور جسے ہر لحاظ سے کامل اور بے عیب سمجھتے تھے +
اپنے قلعے اور ارد گرد کے علاقے میں اپنی عقل وفہم کے مطابق اچھے خاصے نبٹ لیتے۔
اور جہاں تک انسان ضعیف البنیان کے بس میں ہے۔ کلیسا کے احکام کی تعمیل کرتے۔
اپنے بادشاہ یا شاہنشاہ کے صرف اس حد تک وفادار تھے۔ کہ کبھی معتوب نہ ہوتے۔
اور مصلحت بھی اسی میں تھی۔ کیونکہ شاہنشاہ کو دور تھے۔ لیکن طاقتور اور خطرناک تھے۔
غرضیکہ اپنی مقدور کے مطابق حق پرستی کی زندگی بسر کرتے۔ نہ پڑوسیوں کا حق چھینتے۔
نہ اپنا حق چھوڑتے +

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ اُس زمانے کا نظام زندگی تمام عیوب ونقائص سے پاک تھا۔ آبادی کا بیشتر حصہ کاشتکاروں پر مشتمل تھا۔ جو گایوں اور بکریوں کے طویلوں میں رہتے تھے۔ اور انہی کی طرح زمین کا ایک جزو سمجھے جاتے تھے۔ نہ خوش تھے نہ ناخوش۔ لیکن ہو ہی کیا سکتا تھا۔ زمانہ وسطیٰ کا خدا بصیر وخبیر تھا۔ اس کی حکمت میں کون شک لا سکتا تھا۔ اگر اس خدائے دانا وبینا کی مرضی یہی تھی۔ کہ بعض لوگ سردار ہوں۔ بعض ان کے کاشتکار ہوں۔ تو کلیسا کے وفادار فرزندوں کو یہ مناسب نہ تھا۔ کہ اس میں مین میخ نکالیں۔ اس لئے جب کاشتکاروں کو طرح طرح کے مصائب برداشت کرنے پڑتے۔ تو وہ اُف تک نہ کرتے جس طرح بھیڑوں بکریوں کو اچھی خوراک نہ دی جائے یا ان کی رہائش کا انتظام خاطر خواہ نہ ہو۔ تو وہ مر جاتے ہیں۔ بعینہ ان مویشیوں کی طرح کاشتکار بھی اکثر مر جاتے۔ ایسے موقع پر حالات کی اصلاح کے لئے کوئی نہ کوئی ترکیب تو عمل میں لائی جاتی۔ لیکن اس پر زیادہ وقت یا توجہ صرف نہ کی جاتی۔ غرضیکہ اگر دنیا کی تہذیب ان سرداروں اور کاشتکاروں اور ان کے نظام زندگی سے آگے نہ بڑھنے پاتی۔ تو اہل یورپ کی زندگی اس وقت بارھویں صدی کے لوگوں کی سی ہوتی۔ یعنی اگر ان کی ڈاڑھ میں درد ہوتا۔ تو منتر پڑھ کر اس پر پھونکتے۔ اور طبیب کو اور اس کی حکمت وطبابت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے۔ کیونکہ علم اور حکمت مسلمانوں اور بیدینوں کے ہاں سے آئی تھی۔ اس لئے اس سے کوئی فائدہ نہ ہو سکتا۔ اور اس پر یقین کرنا کفر تھا +

جب تم بڑے ہو گے۔ تو تمہیں کئی ایسے لوگ ملینگے۔ جو "ترقی" کے قائل نہیں۔ وہ

آج کل کے بعض لوگوں کی بدادعائیوں سے یہ نتیجہ نکالینگے۔ کہ دنیا ویسی کی ویسی ہے لیکن خدا کرے تمہیں ان کی باتوں پر یقین نہ آئے۔ ذرا سوچو۔ ہمارے آباؤ اجداد نے صرف پچھلی ٹانگوں کے بل چلنا دس لاکھ سال کے عرصے میں سیکھا۔ پہلے صرف غوں غاں کرتے پھرتے تھے۔ پھر ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے قابل ہوئے۔ لیکن اس میں کئی صدیاں گزر گئیں۔ تحریر کے فن کو دیکھو جس کی بدولت ہم اپنے خیالات آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ چھوڑ جاتے ہیں۔ اور جس کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ اس فن کو ایجاد ہوئے صرف چار ہزار سال گزرے ہیں۔ اور قدرت کی طاقتوں کو تسخیر کرکے انہیں انسان کا غلام بنانا تمہارے داداجان کے زمانے میں بھی نئی بات سمجھی جاتی تھی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم ازحد تیز رفتار رکھتے ترقی کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم جسمانی آسائشوں کی طرف ذرا ضرورت سے زیادہ متوجہ ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ بات بھی نہ رہیگی۔ اور پھر ہم ایسے ایسے مسئلوں پر بھی غور کرنے لگینگے۔ جن کا جسمانی صحت اور روپے پیسوں اور کل پرزوں سے کوئی تعلق نہیں۔

اگلے وقتوں کو آہیں بھر بھر کر یاد نہ کرنا چاہئے۔ کئی لوگ جب زمانۂ وسطیٰ کے تعمیر شدہ خوبصورت گرجاؤں کو دیکھتے ہیں۔ اور ان کے چپّے سے ایک ہزار سال پہلے کے شہروں کا آج کل کے عجلت زدہ۔ پُرشور پٹرول اور موٹروں کی بدبو والے شہروں سے مقابلہ کرتے ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ زمانۂ وسطیٰ میں ہر ایک خوبصورت گرجے کے گرد ایسی بدنما۔ بدوضع تنگ و تاریک کوٹھڑیوں اور جھونپڑیوں کی بستی تھی۔ کہ ان کے مقابلے میں آج کل کے ذلیل ترین مکان بھی عالیشان محل معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ کہ بہادر لینسلاٹ[1] اور عالی حوصلہ پاک طینت جوانمرد پارسی فال[2] (جو جام مقدس کی تلاش میں نکلا تھا)۔ پٹرول کی بُو سے مامون تھے۔ لیکن اس زمانے کی بدبوئیں اپنی قسم کی تھیں۔ شہروں کا یہ حال تھا کہ غلاظت اور نجاست کے ڈھیر بازاروں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ یہ اُسقف کا محل ہے تو اس کے ارد گرد چاروں طرف سؤروں کے طویلے ہیں۔ لوگ ہیں کہ کئی کئی دن منہ ہاتھ نہیں دھوتے۔ کوٹ ہے تو دادا کے وقت کا۔

---

[1] Lancelot. [2] Porsifal.

اور ٹوپی ہے تو نانا کی میراث۔ اور صابن تو ایک ایسی نعمت تھی کہ شاید ہی اس زمانے میں کسی انسانی جسم کو نصیب ہوئی ہو۔ میں اُن لوگوں کی ضرورت سے زیادہ مذمت کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن جب ہم پرانی کتابوں میں یہ پڑھتے ہیں۔ کہ شاہ فرانس نے اپنی محل کی کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ اور دیکھا۔ کہ پیرس کے بازاروں میں سؤر اپنی تھوتھنیوں سے مٹی کھود رہے ہیں۔ اور ان میں سے اس قدر تعفن نکلا۔ کہ شاہ فرانس بیہوش ہو گئے۔ یا جب ہم کسی پرانے مسودے میں اس زمانے کی وباؤں کی تفصیلات پڑھتے ہیں۔ تو اس وقت یقین ہو جاتا ہے۔ کہ یہ جو ہم ترقی ترقی کی رٹ لگا رہے ہیں۔ یہ محض اشتہار بازوں کی بڑ نہیں۔ اس میں حقیقت بھی ضرور ہے +

حق یہی ہے۔ کہ گذشتہ چھ سو سال کی ترقی شہروں کے بغیر ممکن نہ ہوتی۔ اس لئے ان کا حال میں ذرا تفصیل سے بیان کرونگا محض دو تین صفحوں میں چند سیاسی واقعات کا بیان کر دینا اس بارے میں کافی نہ ہوگا +

مصر اور بابل اور اسیریا کی قدیم دنیا شہروں کی دنیا تھی۔ فینیقیہ کی تاریخ بھی دو شہروں یعنی سیدون اور طائر کی تاریخ ہے۔ مملکت روما بھی ایک شہر کی بنا پر قائم ہوئی تھی۔ فن تحریر۔ فنون لطیفہ۔ سائنس۔ ہیئت۔ فن تعمیر۔ ادب۔ ناٹک (کہاں تک گنواتا جاؤں) سب شہروں کی پیداوار ہیں +

تقریباً چار ہزار سال تک یہ لکڑی کا بنا ہوا شہد کی مکھیوں کا سا چھتہ جسے ہم شہر کہتے ہیں۔ تہذیب کی کارگزاریوں کا مرکز بنا رہا۔ اس کے بعد مہاجر قوموں کے ریلے آئے۔ مملکت روما برباد ہو گئی۔ شہر جلا دئے گئے۔ اور یورپ پھر مرغزاروں اور چھوٹے چھوٹے دیہات کی دنیا بن کر رہ گیا۔ گویا زمانۂ تاریک میں تہذیب کی سرزمین بنجر پڑی رہی +

صلیبی جنگوں نے اس سرزمین کو پھر ایک نئی کاشت کے لئے تیار کیا۔ لیکن جب فصل پک کر تیار ہوئی۔ تو اس سے فائدہ آزاد شہروں کے شہریوں نے اٹھایا +

سنگین فصیلوں سے محصور قلعوں اور راہب خانوں یعنی اُن سرداروں اور راہبوں کی قیام گاہوں کا حال میں تم سے بیان کر چکا ہوں۔ جو جسم انسانی اور روح انسانی کے محافظ تھے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ چند اہل حرفت مثلاً قصائی اور نانبائی اور چند

شمولِ ان سان۔ قلعے کے پاس آکر آباد ہو جاتے سرداروں کی خدمت کرتے اور خطرے کے وقت ان کے سائے میں پناہ لیتے۔ بعض اوقات سردار انہیں اجازت دے دیتا کہ چاہو تو اپنے گھروں کے گرد ایک جنگلا سا بنا لو۔ تاہم وہ ہمیشہ اُس طاقتور سردارِ قلعہ کی نظرِ التفات کے محتاج تھے۔ اور اسی کے رحم پر زندگی بسر کرتے جب اس سے سامنا ہوتا۔ گھٹنے ٹیک کر کھڑے ہو جاتے۔ اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتے۔

اس کے بعد صلیبی جنگوں کا زمانہ آیا۔ اور بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں ہجرت کے زمانے میں تو میں شمال مشرق سے چل کر مغرب میں آباد ہو گئی تھیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں لاکھوں آدمی مغرب سے سفر کر کے جنوب مشرق کے تہذیب یافتہ علاقوں میں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ دنیا ہماری چار دیواری سے کہیں وسیع ہے۔ اچھے اچھے کپڑے۔ آرام دہ مکان اور پُراسرار ایشیا کے نئے نئے لذیذ کھانے نظر آئے۔ گھروں کو لوٹے تو طبیعت کو انہیں چیزوں کی جستجو ہوئی۔ ان کی مانگ پیدا ہوئی۔ زمانہ تاریک میں صرف پھیری والے ہی تجارت کرتے تھے۔ اُنہوں نے ان اشیا کو بھی اپنے بقچے میں شامل کر لیا۔ اور چھکڑوں پر لاد کر گلی گلی پھرنے لگے۔ اس بین الاقوامی جنگ کے بعد جرم بہت بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ ہر سوداگر نے اپنی حفاظت کے لئے لڑائی سے واپس آئے ہوئے چند سپاہیوں کو نوکر رکھ لیا۔ اور پہلے سے زیادہ بڑے پیمانے پر تجارت کرنے لگا لیکن اس کا کام دقتوں سے خالی نہ تھا۔ جب کسی دوسرے سردار کے علاقے میں داخل ہوتا۔ تو طرح طرح کے محصول ادا کرنے پڑتے۔ تاہم کام فائدہ مند تھا۔ اس لئے حوصلہ نہ ہارا۔

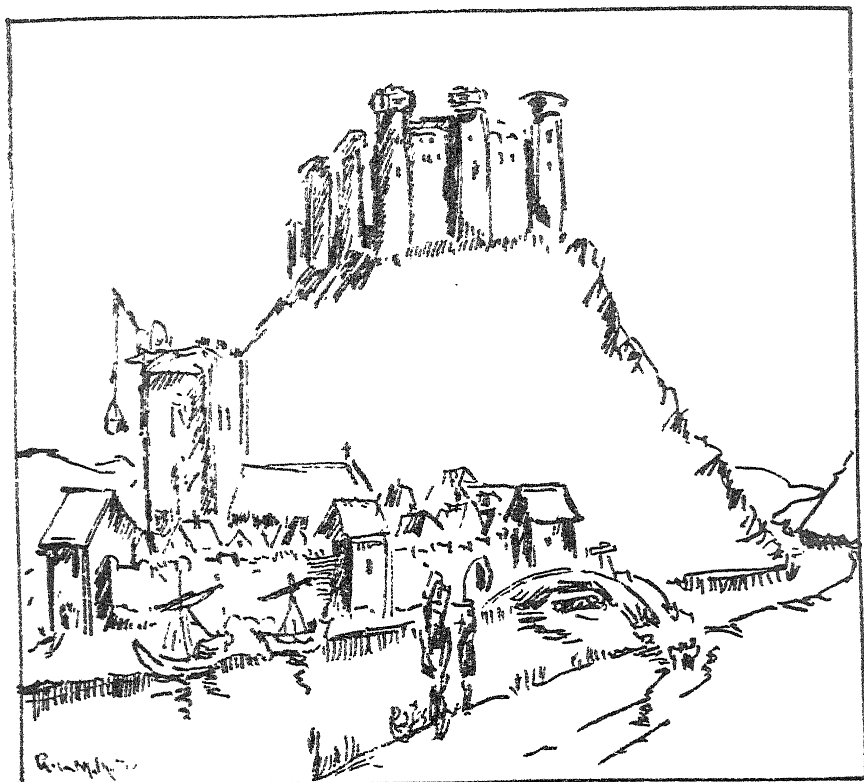
بعض سوداگر ہمت والے لوگ تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ جو اشیا ہم باہر سے منگاتے ہیں۔ یہ تو یہاں بھی بن سکتی ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے گھر کے ایک حصے میں ایک کارخانہ سا بنا لیا۔ سوداگری ترک کر دی۔ اور صنعت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ان کا مال نہ صرف سردارِ قلعہ اور راہبِ اعظم کے ہاں بلکہ آس پاس کے قصبوں میں بھی بک جاتا۔ سردار اور راہب تو اس کی قیمت انڈوں اور شراب کی شکل میں ادا کرتے یا بعض اوقات اس کے بدلے میں شہد دے دیتے۔ جو اُن دنوں شکر کی جگہ استعمال ہوتا تھا۔ لیکن دور دراز کے قصبوں کے خریدار نقد قیمت ادا کرتے۔ چنانچہ کارخانوں

کے مالکوں اور سوداگروں کے پاس سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جمع ہو گئے جس سے ان کی حیثیت زمانۂ وسطیٰ کے نظام تمدن میں بہت بڑھ گئی +

تمہارے لئے ایک ایسی دنیا کا تصور جس میں روپے کا وجود ہی ندارد ہو۔ بہت مشکل ہے۔ آج کل کے شہروں میں روپے کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ دن بھر ہم جیب میں دھات کی چھوٹی چھوٹی ٹکلیاں اٹھائے پھرتے ہیں۔ جن سے ہم اپنا کام چلاتے ہیں۔ اخبار پڑھنا ہو۔ ٹرین یا موٹر میں سفر کرنا ہو۔ کھانا کھانا ہو۔ غرضیکہ ہر کام کے لئے ان سکوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن زمانۂ وسطیٰ میں ہزارہا لوگ ایسے تھے۔ جنہوں نے مرتے دم تک کبھی کسی سکے کی شکل نہ دیکھی تھی۔ یونان اور روما کا زروسیم کھنڈروں ہی میں دفن ہو کر رہ گیا تھا۔ ان دو سلطنتوں کے زوال کے بعد جو زمانہ آیا۔ وہ نقل وطن کا زمانہ تھا۔ اور اہل دنیا کا پیشہ زیادہ تر کھیتی باڑی تھا۔ ہر کسان اپنا غلہ بوتا۔ خود مویشی پالتا۔ اور اس کی تمام ضروریات گھر ہی میں پوری ہو جاتیں +

زمانۂ وسطیٰ کے سردار اور امرا بڑے بڑے زمیندار تھے۔ انہیں اس بات کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ کہ وہ اشیاء کی قیمت روپے سے ادا کریں۔ ان کی اپنی زمین اتنا کچھ مہیا کر دیتی تھی۔ کہ کھانے پینے کی تمام اشیا اور پہننے کے لئے کپڑے اُن کے اور اُن کے خاندان کے لئے اسی میں سے نکل آتے۔ عمارت کے لئے پتھر آس پاس کی پہاڑیوں سے کھود لیا جاتا۔ اور لکڑی اُن کے لئے اپنے جنگلات سے کٹ کر آجاتی۔ تھوڑی بہت چیزیں جو باہر سے منگانی پڑتیں۔ ان کے بدلے میں یہاں سے کچھ چیزیں مثلاً شہد یا انڈے یا ایندھن بھیج دیتے +

لیکن صلیبی لڑائیوں کی وجہ سے یہ پرانا زراعتی نظام بالکل تہ و بالا ہو گیا۔ سردار عالی وقار گھر سے ارض مقدس کو روانہ ہوئے۔ تو ہزارہا میل کا سفر۔ کرایہ بھی جابجا ادا کرنا ہے۔ راستے میں ٹھیرنا بھی ہے۔ گھر پہ تو کسی چیز کی ضرورت ہوئی۔ تو اس کے بدلے میں سو پچاس انڈے اٹھا کے بھجوا دئے۔ لیکن وینس کے تانبائی کی خاطر اب گھر سے ایک ہزار انڈا یا لکڑیوں کے بیس گٹھے کیونکر سفر میں ساتھ لے جائیں۔ اور پھر وہ دکاندار مانگتے بھی نقد تھے۔ چنانچہ سردار صاحب گھر سے چلتے وقت تھوڑا سا سونا اپنے بٹوے میں رکھ لیتے۔ تم کہو گے کہ سونا کہاں سے ملتا۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ



قلعہ اور شہر

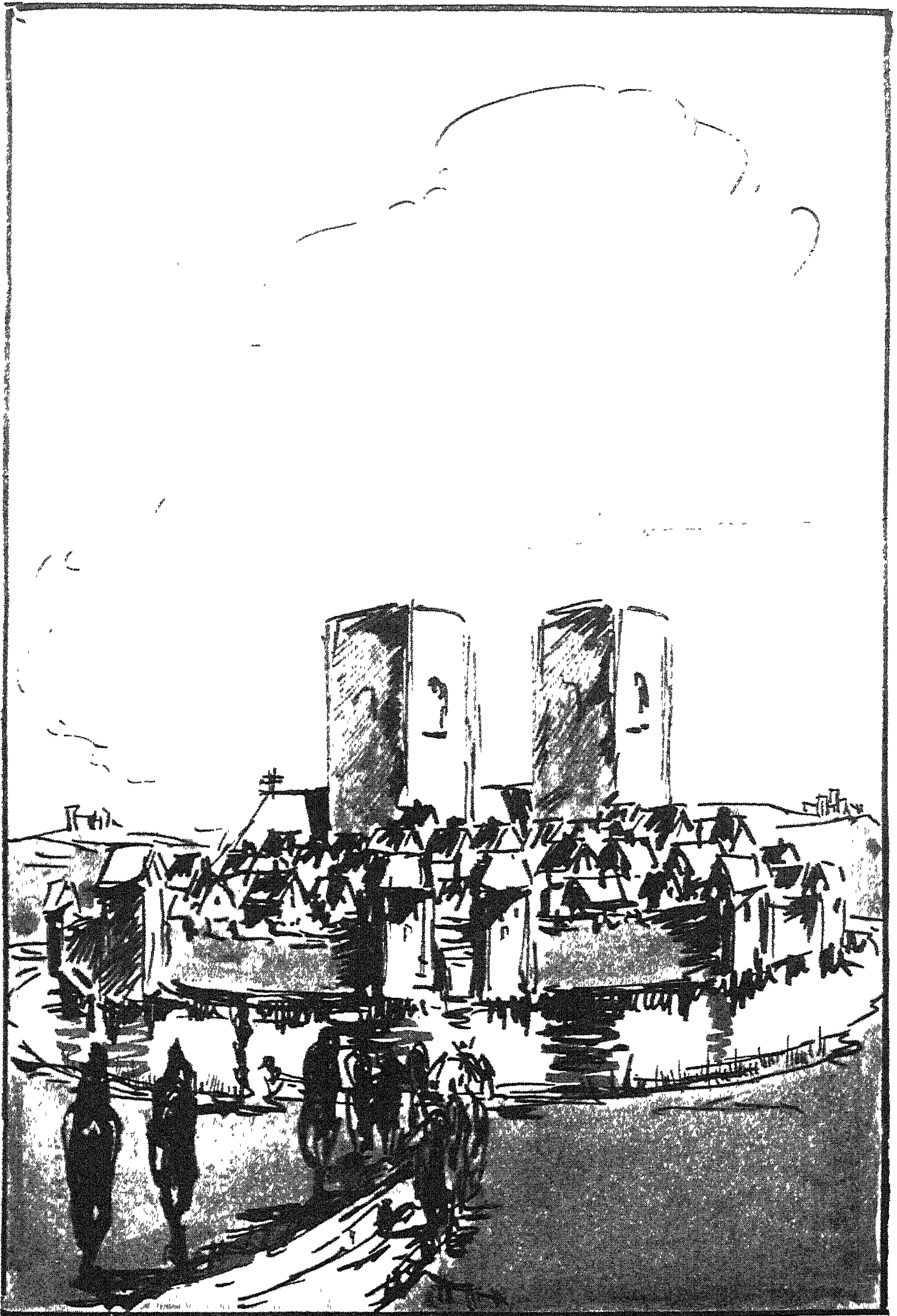
قدیم خاندان لانگوبارڈ کے افراد نے جنہیں اب لمبارڈ کہتے تھے۔ مہاجنوں کا کام شروع کر رکھا تھا۔ (یہ لوگ صرافوں کی سی ایک میز کے سامنے بیٹھ کر اپنا کام کرتے تھے جس کو بینکو یا بدینک کہتے تھے) نواب صاحب کو روپے کی ضرورت ہوتی۔ تو سو دو سو اشرفیاں ان مہاجنوں کے ہاں سے لے آتے۔ اور اس کے بدلے میں اپنی زمین ان کے پاس رہن رکھ دیتے۔ تاکہ خدانخواستہ میدان جنگ میں کام آجائیں۔ تو مہاجن روپے سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں +

مگر یہ طریقہ قرض اٹھانے والے کے حق میں آخر بہت نقصان دہ ثابت ہوتا۔ سردار کا دیوالہ نکل جاتا۔ اور لمبارڈ زمین پر قابض ہو جاتے۔ نواب صاحب کے لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کہ کسی اپنے سے زیادہ خوشحال سردار کے ہاں چل کر اپنی سپہ گری کے بل پر ملازمت اختیار کر لیں +

یہ نہ کرتے تو شہر میں یہودیوں کے محلے کا رُخ کرنا پڑتا۔ وہاں پچاس یا ساٹھ فیصدی سود پر روپیہ مل جاتا۔ لیکن اتنا زیادہ سود ادا کرنا حماقت معلوم ہوتا۔ بہت سوچتے کہ کیا کیا جائے۔ اس چھوٹے سے شہر کے چند لوگ روپے پیسے والے ہوتے۔ جو نواب صاحب کو بچپن سے جانتے تھے۔ بڑوں کی آپس میں اچھی خاصی دوستی رہ چکی تھی۔ نواب صاحب سوچتے۔ ان سے روپیہ مانگوں۔ امید ہے۔ بہت زیادہ سود نہ لینگے۔ اپنے منشی کو بلاتے (ایک راہب کو منشی کے طور پر ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ جو خط پتر بھی لکھ دیتا اور حساب کتاب بھی رکھتا) شہر کے جو مشہور سوداگر تھے۔ ان کو خط لکھواتے۔ اور ان سے قرض مانگ بھیجتے۔ شہر کے لوگ جوہری کے ہاں (جو پڑوس کے گرجاؤں کے لئے ظروف بنایا کرتا تھا) جمع ہوتے۔ اور نواب صاحب کی درخواست پر غور کرتے نہ انکار کر سکتے۔ نہ سود لے سکتے۔ اول تو سود لینا مذہبًا حرام دوسرے سود کے بدلے میں ملتا کیا۔ یہی آٹا دانہ اور اس کی تو پہلے ہی بہتات ہو رہی تھی ؀

شہر کا درزی خاموش طبیعت آدمی تھا کسی سے بات نہ چیت۔ اپنی میز کے سامنے بیٹھا دن رات ٹانکے لگایا کرتا۔ اس سے اس کی طبیعت کچھ فلسفیانہ ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ بھائیو سود تو ہم لینے سے رہے۔ اور اس کے بغیر ہمیں کیا پڑی ہے۔ کہ اپنا روپیہ سردار صاحب کے حوالے کر دیں۔ اور خود اس کے فائدے سے محروم ہو رہیں۔ میں تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ سردار صاحب کی زمین میں سے جو ندی گزرتی ہے۔ وہاں مچھلیاں پکڑنے کی ممانعت ہے۔ اور مچھلیاں پکڑنے کا شوق ہم سب کو ہے۔ یہ کیوں نہ کریں۔ کہ سردار صاحب سے کہیں۔ حضور یہ سو اشرفیاں آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ سود ہم نہیں مانگتے۔ لیکن آپ ہمیں اتنا لکھ دیجئے۔ کہ ہم آپ کے دریا میں مچھلیاں پکڑیں۔ تو ہمیں کوئی نہ روکے۔ اس طرح انہیں تو سو اشرفیاں مل جائینگی۔ اور ہمارا شوق پورا ہو جائیگا۔ میری دانست میں یہ سودا بہت اچھا رہیگا ؀

سردار صاحب نے سوچا۔ یہ تو بہت سہل ترکیب ہے۔ چنانچہ فوراً اس پر رضامند ہو گئے۔ لیکن اس تجویز کو قبول کیا۔ تو گویا اپنے پاؤں پر آپ کلھاڑی ماری۔ منشی نے اقرار نامہ لکھ کے تیار کیا۔ سردار صاحب نے اس پر اپنا نشان ثبت کیا (کیونکہ لکھنا پڑھنا



قرونِ وسطیٰ کا ایک قصبہ

تو وہ جانتے نہ تھے) اور ارض مقدس کو روانہ ہو گئے۔ دو سال کے بعد بالکل کنگال ہو کر واپس لوٹے۔ دیکھا کہ شہر کے سب لوگ قلعے کی چار دیواری کے اندر جو تالاب ہے اس میں مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ جز بز ہوئے۔ اپنے کارندے کو بھیج کر سب کو باہر نکلوا دیا لوگ اس وقت تو چلے گئے۔ لیکن رات کے وقت تاجروں کا وفد سردار صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور مودبانہ عرض گزارا ہوا۔ کہ خدا کا شکر ہے۔ آپ سفر سے بخیر و عافیت واپس آ گئے۔ اس کی آپ کو مبارک ہو۔ ہمیں بے انتہا افسوس ہے۔ کہ مچھلیاں پکڑنے والوں کو دیکھ کر آپ کو تکلیف ہوئی۔ لیکن حضور کو یاد ہو گا۔ کہ حضور نے خود ہی اس بات کی اجازت ہم غریبوں کو دے رکھی ہے۔ درزی نے وہ اقرار نامہ نکال کر دکھا یا۔ جو دو سال سے جوہری کے صندوق میں محفوظ پڑا تھا۔

سردار صاحب بہت پریشان ہوئے۔ لیکن روپے کی انہیں پھر ضرورت تھی جب اطالیہ میں تھے۔ تو وہاں چند ہنڈیوں پر دستخط کر آئے تھے۔ جو اب مشہور اطالوی مہاجن سیلوسترو دے میدیچی[1] کے قبضے میں تھیں۔ کل دو مہینے ان کی میعاد تھی۔ اور رقم تھی اچھی خاصی یعنی فلیمش طلا کے تین سو چالیس پاؤنڈ۔ ان حالات میں گو دل غصّے سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ کچھ کہا بھی تو یہی کہ مجھے اور کچھ روپے کی ضرورت ہے۔ سوداگروں نے کہا۔ اس وقت تو ہم رخصت چاہتے ہیں۔ سوچ کر جواب دینگے۔

تین دن کے بعد پھر آئے۔ اور کہنے لگے۔ کہ ہمیں منظور ہے۔ آپ ہمارے آقا ہیں۔ آپ کے آڑے آنا ہمارا فرض ہے۔ روپیہ حاضر ہے۔ مگر اس کے بدلے میں ہمیں ایک اور اقرار نامہ (چارٹر[2]) اس مطلب کا لکھ دیجئے۔ کہ اس شہر کے سوداگروں اور آزاد شہریوں کو میری طرف سے اجازت ہے۔ کہ وہ اپنی ایک کونسل منتخب کر لیں جس کو شہر کا تمام انتظام سونپ دیا جائیگا۔ اور ہم قلعے والے اس میں بالکل دخل نہ دینگے۔

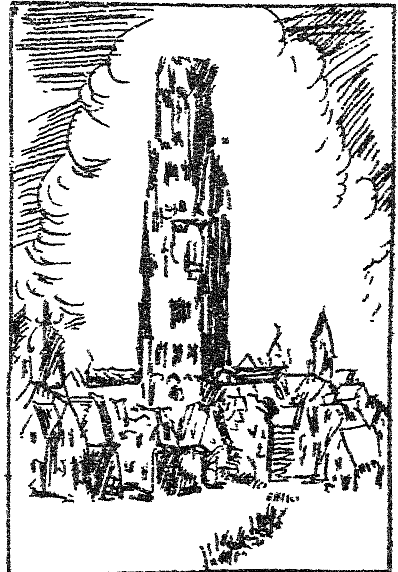
اس پر سردار قلعہ بہت ناراض ہوئے۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ روپے کی ضرورت نے بے بس کر رکھا تھا۔ اقرار نامہ پر دستخط کر دیا۔ ہفتہ بھر بھی گزرنے نہ پایا کہ اپنے کئے پر پچھتانے لگے۔ اپنے سپاہیوں کو جمع کر کے جوہری کے مکان پر جا دھمکے۔ اور

---

[1] Salvestrodei Medici [2] Charter.

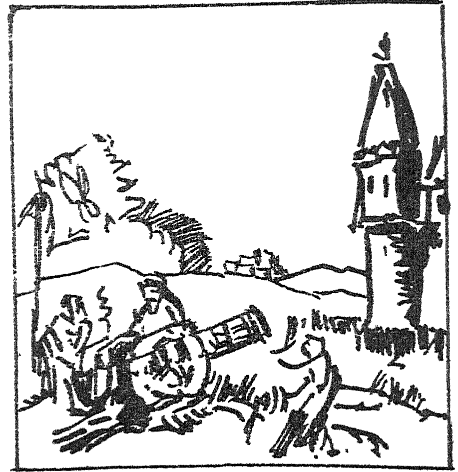
لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر جن اقرار ناموں پر دستخط کر چکے تھے۔ وہ وہاں سے زبردستی چھین لائے۔ اور انہیں جلا ڈالا۔ شہر کے لوگ منہ تکتے رہ گئے۔ لیکن پھر جب دوبارہ سردار صاحب کو اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے روپے کی ضرورت ہوئی۔ تو کسی نے پھوٹی کوڑی بھی نہ دی۔ جوہری کے ہاں جو حرکت کر آئے تھے۔ اس کے بعد ان کی ساکھ قائم نہ رہی۔ چنانچہ پھر خفیف ہونا پڑا۔ تلافی پر آمادگی ظاہر کی۔ قسط وار روپیہ لینا منظور کیا۔ لیکن شہر والوں نے پہلی قسط ہاتھ پر تب دھری۔ جب وہ اقرار نامے پھر از سر نو لکھوا لئے۔ بلکہ ابکی بار تو ایک اور عہد نامہ ایزاد ہو گیا جس کی رو سے شہر والوں کو ایک "ٹاؤن ہال" بنانے کی اجازت بھی مل گئی۔ اس میں ایک مضبوط برج بنایا گیا۔ کہا تو یہ گیا۔ کہ یہاں سب کاغذات محفوظ رکھا جائیگا۔ تاکہ چوری یا آگ کا اندیشہ نہ رہے لیکن فی الحقیقت یہ سردار اور اس کے سپاہیوں کی چیرہ دستیوں سے بچنے کے لئے پیش بندی ہو رہی تھی +

صلیبی لڑائیوں کے بعد کی صدیوں میں یورپ کے حالات کم و بیش ایسے تھے۔ جیسے اس مثال کے ذریعے اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ شہر کے متعلق جو اختیارات تھے۔ وہ رفتہ رفتہ قلعے والوں سے شہر والوں کے پاس منتقل ہوتے رہے۔ اس بید عملی کے سلسلے میں کبھی کبھی ادھر بعض درزی اور جوہری مارے گئے۔ ادھر ایک آدھ قلعہ آگ کی نذر ہو گیا۔ لیکن بتدریج شہر تو متمول اور سردار مفلس ہوتے چلے گئے۔ اس کے سوا سرداروں کو چارہ نہ رہا۔ کہ اپنے گزارے کے لئے روپے کے بدلے شہری آزادی کے حقوق شہریوں کے حوالے کرتے جائیں۔ چنانچہ شہروں نے خوب ترقی کی۔ جو غلام پیشہ لوگ بھاگ گئے تھے۔ انہیں شہر کی فصیل کے اندر پناہ ملی۔ اور چندسال وہاں سکونت پذیر ہوئے۔ تو آزادی



ٹاؤن ہال کا برج

بھی حاصل ہوگئی۔ ارد گرد کے اضلاع میں جو لوگ رہتے تھے۔ وہ بھی وہیں آن بسے۔ انہیں اپنی نئی نئی اہمیت کا احساس ہُوا۔ اور اس پر فخر کرنے لگے۔ شہر میں جو پرانی منڈی تھی کسی زمانے میں اس کے آس پاس انڈوں اور بھیڑوں اور شہد اور نمک کا تبادلہ ہُوا کرتا تھا۔ اب انہوں نے وہاں گرجا اور دوسری عمارتیں عوام کے لئے تعمیر کرائیں۔ پھر دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ہمارے بچے ہم سے بہتر اٹھیں۔ چنانچہ راہبوں کو تنخواہیں دے دے کر شہر میں بلایا اور مکتب بنا کر انہیں وہاں استاد مقرر کیا۔ کہیں سن پاتے۔ کہ فلاں شخص لکڑی کے تختوں پر تصویریں اچھی بنا سکتا ہے۔ تو اُسے شہر میں بلا کر اس کا وظیفہ مقرر کر دیتے اور اپنے گرجا اور ٹاؤن ہال کی دیواروں پر کتاب مقدس کے مناظر کی تصاویر اُس سے بنوا لیتے +



بارُود

سردار صاحب اپنے وسیع قلعے کے ویران اور بے رونق ایوان میں بیٹھے اس نوخیز ثروت و امارت کو دیکھتے رہتے۔ اور اس دن کو پچھتاتے جب اپنے حقوق اور اختیارات خود اپنے ہاتھ سے شہر والوں کے حوالے کر دئے تھے۔ لیکن مجبور رہتے۔ شہر والوں کے ہاں اب دولت کی ریل پیل تھی۔ وہ اب سردار کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آزاد باشندے تھے۔ دو تین سو سال کی کشمکش اور سخت محنت اور مشقت کے بعد انہیں جو کچھ حاصل ہُوا تھا۔ اس سے دست بردار ہونے پر وہ کسی طرح آمادہ نہ تھے +

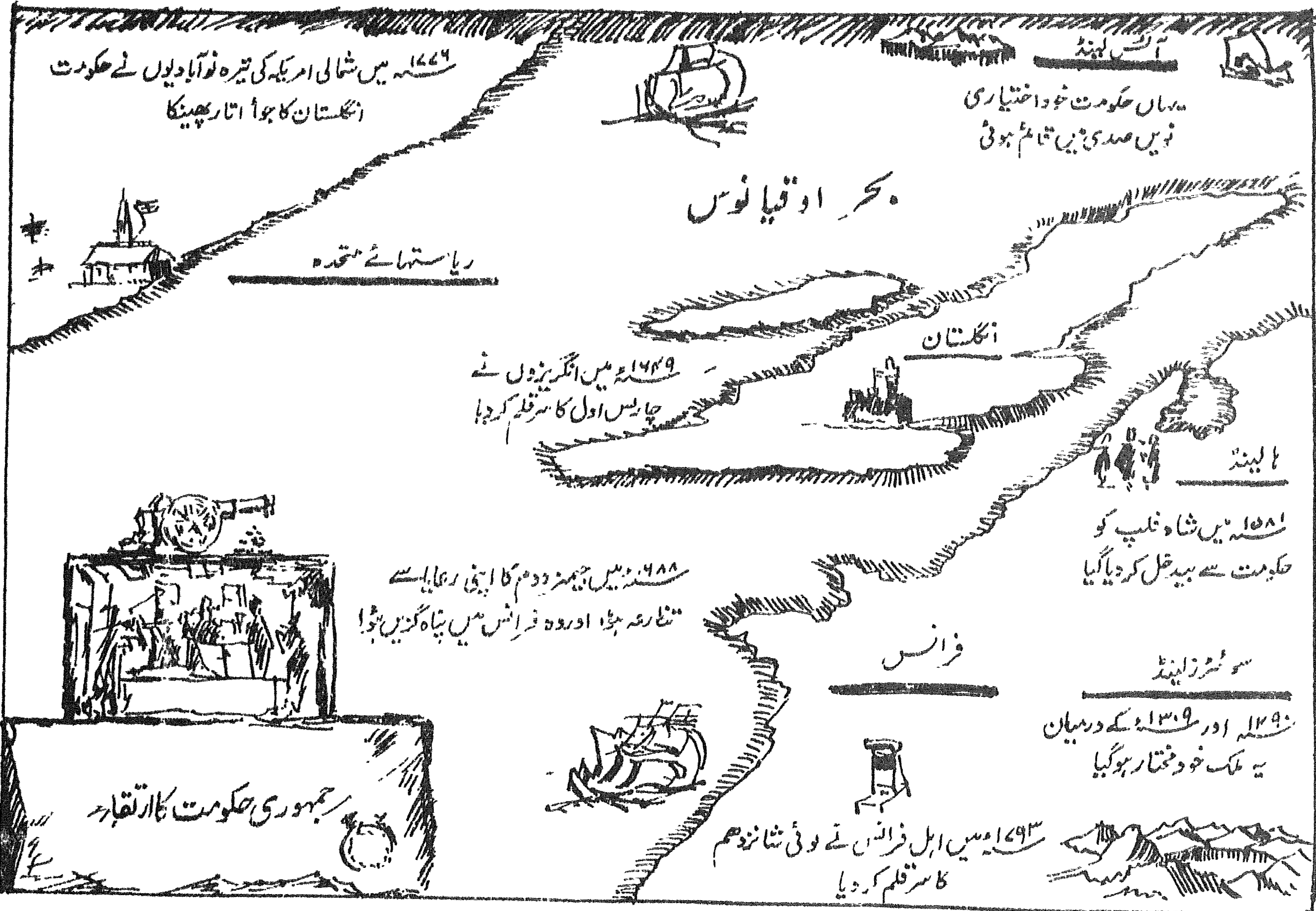
زمانہ وسطیٰ کی حکومت خود اختیاری

شہریوں نے ملک کی شاہی کونسلوں میں آواز بلند کرنے کا حق کیونکر منوایا

جب تک لوگ خانہ بدوش تھے۔ اور دیس دیس گلے چراتے پھرتے تھے۔ اس وقت تک سب انسان برابر تھے۔ اور سب کے سب ہی اپنے قبیلے کی بہبود کے ذمہ وار سمجھے جاتے تھے۔

لیکن جب خانہ بدوشی کی زندگی چھوڑ کر تمدن کی زندگی اختیار کی۔ تو بعض متمول ہو گئے۔ بعض مفلس رہ گئے۔ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ جنہیں محنت مشقت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اور جو فراغت کی وجہ سے سیاسیات میں بخوبی حصہ لے سکتے تھے۔

جیسا کہ تم پڑھ چکے ہو۔ مصر۔ عراق۔ یونان اور روما میں یہی ہؤا۔ مغربی یورپ کی جرمن آبادی میں بھی جب جنگ و جدال کا دور ختم ہؤا۔ تو حکومت کا یہی حال تھا۔ سب سے اوپر ایک شاہنشاہ تھا۔ جسے جرمن قوم کی وسیع رومن مملکت کے سات یا آٹھ بڑے بڑے بادشاہ اپنے میں سے منتخب کر لیتے تھے۔ کہنے کو تو اس شاہنشاہ کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ لیکن فی الواقع اس کے قبضے میں کچھ بھی نہ تھا۔ حکمران بادشاہوں کی حکومت بہت ہی کمزور تھی۔ اور فی الحقیقت قوت و طاقت زمیندار رئیسوں کے ہاتھ میں تھی جن کی تعداد کئی ہزار تک پہنچی ہوئی تھی۔ ان روساء کی رعایا کاشتکاروں یا غلام پیشہ لوگوں پر مشتمل تھی۔ شہروں کی تعداد کم تھی۔ متوسط درجے کا طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیکن تیرھویں صدی میں (گویا تقریباً ایک ہزار سال کے بعد دوبارہ) متوسط الحال یعنی سوداگروں کے طبقے نے میدان تاریخ میں پھر اپنی صورت دکھائی۔ رفتہ رفتہ ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اور جیسا کہ ہم پچھلے باب میں



حکومت خود اختیاری کیونکر پھیلی

پڑھ چکے ہیں۔ قلعے والوں سے بھی اختیارات چھین لئے۔

اب تک بادشاہ اپنی کارفرمائیوں میں صرف امرا اور اسقفوں کی خوشنودی کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن صلیبی لڑائیوں کے بعد تاجروں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر متوسط طبقے کو نظرانداز کرنا مشکل تھا۔ ورنہ شاہی خزانہ خالی کا خالی رہ جاتا۔ دل میں تو بادشاہ سلامت ان شہریوں کو گایوں اور سؤروں سے بہتر نہ سمجھتے تھے۔ لیکن مجبور تھے جن کے دست نگر ہوں ان کو کیونکر دھتکار دیں۔ تاہم مقدور کے مطابق مزاحمت ضرور کی۔

انگلستان میں رچرڈ شیردل کی غیر موجودگی میں (جو گیا تو ارض مقدس کو تھا لیکن جس کے سفر کا بیشتر حصہ آسٹریا کے ایک زندان میں گزرا) حکومت کی باگیں رچرڈ کے بھائی جان کے ہاتھ میں تھیں۔ جو فن سپہگری میں رچرڈ سے کمتر۔ لیکن بدانتظامی میں اس کا ہم پلہ تھا۔ حکومت سنبھالتے ہی نارمنڈی اور فرانسیسی مقبوضات کے بیشتر حصے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ پھر قوم ہوبن سنتوفن کے مشہور دشمن پاپائے انوسنٹ سوم سے لڑائی مول لی جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جس طرح دو سو سال پہلے گریگوری ہفتم نے شاہنشاہ ہنری چہارم کو کلیسا سے خارج کر دیا تھا۔ انوسنٹ سوم نے جان کو خارج کر دیا۔ اور جس طرح ۱۰۷۷ء میں ہنری چہارم بے عزتی کی صلح کرنے پر مجبور ہو گیا تھا ۱۲۱۳ء میں جان کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

لیکن جان پر اس کا ذرا اثر نہ ہوا۔ اور اس واقعے کے بعد بھی اس کی بے عنوانیوں میں فرق نہ آیا۔ حتےٰ کہ اس کی باجگزار رعایا نے تنگ آ کر سر اٹھایا۔ اور اس سے وعدہ لیا۔ کہ وہ آئندہ عدل گستری سے انحراف اور رعایا کے قدیم حقوق کو پامال نہ کریگا۔ دریائے ٹیمز میں ایک جزیرہ تھا۔ وہاں رنی میڈ[1] کے گاؤں کے قریب ۱۵ ار جون ۱۲۱۵ء کو جان نے ایک عہدنامے پر دستخط کئے جسے بڑا عہدنامہ (میگنا کارٹا[2]) یا قرطاس اعظم کہا جاتا ہے۔ اس عہدنامے میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ بادشاہ کے قدیم فرائض اور رعایا کے حقوق کا مختصر مگر زوردار فقروں میں اعادہ تھا۔ رعایا کے

---

[2] Magna Carta   [1] Runnymede.

بیشتر حصے یعنی کاشتکاروں کے حقوق کا تو اس میں ذکر نہ تھا۔ لیکن تاجروں کے بڑھتے ہوئے طبقے کے بعض حقوق اور محافظات قطعی طور پر تسلیم کر لئے گئے۔ یہ عہد نامہ اہم اس لئے ہے۔ کہ اس سے پیشتر کبھی کسی بادشاہ کے اختیارات کی یوں واضح طور پر حد بندی نہ ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ دستاویز ٹھیٹھ زمانہ وسطیٰ کی دستاویز تھی۔ وہ یوں کہ اس کو عام انسانوں سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ عام انسانوں کی اگر کوئی حیثیت تھی۔ تو یہ کہ بعض اوقات وہ بھی دیگر اموال و املاک کی طرح ذی حیثیت لوگوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ اور اس صورت میں ان کو بادشاہ کے ظلم سے بچانا ویسا ہی ضروری تھا۔ جیسے کسی امیر کی شکار گاہ اور اُس کے مویشیوں کو شاہی ملازموں کی دستبرد سے محفوظ رکھنا ؛

لیکن چند ہی سال بعد شاہی کونسلوں میں نئے نئے حالات رونما ہوئے ؛

جاآن نے قرطاس اعظم پر عمل کرنے کا وعدہ تو کیا تھا۔ لیکن طبیعت اور فطرت کا پست تھا۔ جتنے وعدے کئے تھے سب ایک ایک کرکے توڑ ڈالے۔ لیکن حسن اتفاق سے بہت عرصہ نہ جیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ہنری سوم تخت پر بیٹھا جس نے قرطاس اعظم کو ازسرنو تسلیم کیا۔ اس دوران میں صلیبی شہسوار رچرڈ ملک کا بہت سا روپیہ برباد کر چکے تھے۔ یہودی مہاجنوں کا قرضہ چکانے کے لئے بادشاہ سلامت کو روپے کی ضرورت ہوئی۔ بڑے بڑے زمیندار اور اسقف جو بادشاہ کے مشیر سلطنت تھے۔ چاندی سونے سے بادشاہ کی مدد کرنے کے قابل نہ تھے۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ شہروں کے چند نمائندوں کو بڑی کونسل کے اجلاس میں بلایا جائے۔ ۱۲۶۵ء میں وہ پہلی مرتبہ حاضر ہوئے۔ ان کی حیثیت صرف ماہرین مالیات کی تھی۔ بحث مباحثہ میں شامل ہونے کا انہیں حق حاصل نہ تھا۔ صرف محصولات کے مسئلے پر ان کا مشورہ طلب کیا جاتا تھا ؛

لیکن رفتہ رفتہ "عوام" کے یہ نمائندے ہر معاملے میں مشورہ دینے کو بلائے جانے لگے۔ اور امرا۔ اسقفوں اور شہر کی نمائندوں کی یہ مجلس اچھی خاصی پارلیمنٹ بن گئی۔ جس میں سلطنت کے اہم مسائل پر بحث ہونے لگی ؛

اس طرح کی ایک مشاورتی مجلس کا قائم کرنا اور اُسے بعض انتظامی اختیارات سونپ دینا یہ انگریزوں کی اختراع نہ تھی (گو عام لوگوں کا خیال یہی ہے۔ کہ اس کے موجد

انگریز ہیں) اور نہ ہی اس طرح کی حکومت صرف انگلستان ہیں پائی جاتی تھی - یورپ کے ہر ملک میں یہی طریقہ رائج تھا بعض ممالک مثلاً فرانس میں زمانہ وسطی کے بعد اقتدار شاہی اس قدر جلد بڑھا - کہ پارلیمنٹ کا اقتدار صفر کے برابر ہو گیا - یوں تو شہروں کے نمائندے فرانسیسی پارلیمنٹ کے اجلاس میں ۱۳۰۲ء میں شامل ہوئے لیکن پانچ صدیوں سے پہلے اس پارلیمنٹ کو اتنی قوت نصیب نہ ہوئی کہ متوسط طبقے کے حقوق منوا سکتی اور بادشاہ پر زور ڈال سکتی - لیکن فرانسیسیوں نے اس تاخیر کی تلافی یوں کی - کہ انقلاب فرانس میں بادشاہ اور پادریوں اور امراسب کو یکقلم نیست و نابود کر دیا - اور عوام کے نمائندے ہی ملک کے حکمران قرار پائے - ہسپانیہ میں شاہی کونسل میں عوام کے نمائندے بارھویں صدی کے پہلے نصف حصے میں شامل ہوئے - مملکت جرمن کے اندر بعض بڑے بڑے شہروں کو شاہی شہروں



سوئیزرلینڈ کا آزاد ملک

کا رتبہ عطا ہؤا - یعنی ان کے نمائندوں کو شاہی کونسل میں شنوائی کا حق بخشا گیا + ملک سویڈن میں عوام کے نمائندے ۱۳۵۱ء کے پہلے اجلاس کے موقع پر شاہی کونسل میں حاضر ہوئے - ڈنمارک میں ڈین ہولف[1] یعنی پرانی قومی انجمن ۱۳۱۴ء میں

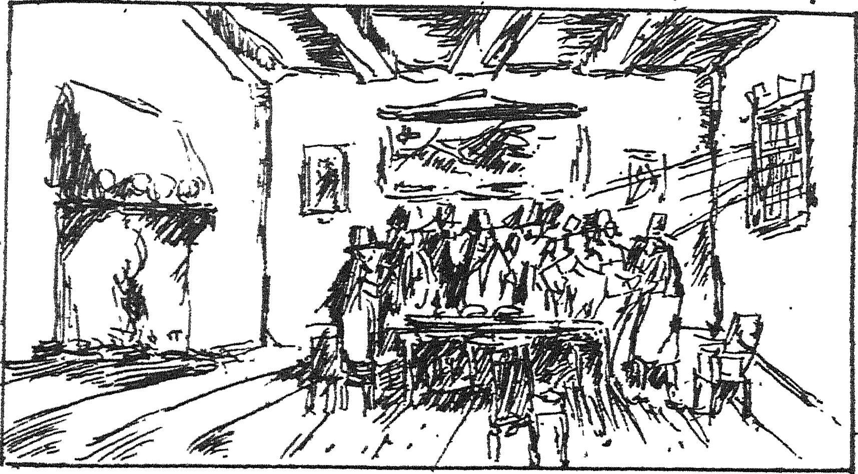
---

[1] Danehof.

میں ازسرنو مرتب کی گئی۔ اور گو امرا نے ادھر بادشاہ اور ادھر عوام کے اختیارات پھر اپنے قبضے میں لے لئے۔ تاہم عوام کے نمائندے اپنے اختیارات سے بالکل ہی بیدخل کبھی نہ ہونے پائے +

یورپ کے شمالی ممالک میں جمہوریت کی داستان خاص طور پر دلچسپ ہے۔ آئس لینڈ میں آل تھنگ یعنی آزاد زمینداروں کی انجمن کل جزیرے کے معاملات سرانجام دیتی تھی۔ نویں صدی میں اس انجمن کے اجلاس باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہونے لگے۔ اور اب ایک ہزار سال سے یہی دستور چلا آتا ہے +

سوئٹیرزلینڈ کے آزاد باشندوں نے اپنی مجلسوں کو زمیندار پڑوسیوں کے حملوں سے بہت کامیابی کے ساتھ بچائے رکھا +



فلپ دوم

ہالینڈ میں مختلف اضلاع اور تعلقوں کی کونسلوں میں عوام کے نمائندے تیرھویں صدی ہی میں شامل کر لئے گئے +

سولھویں صدی میں ان چھوٹے چھوٹے اضلاع میں سے کئی ایک نے مل کر بادشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ عام مجلس میں حلف اٹھا کر بادشاہ کی اطاعت کو ترک کیا۔ پادریوں کو مباحثوں سے خارج کر دیا۔ امرا کی طاقت کو توڑ دیا۔ اور نئی جمہوری حکومت کے تمام تر اختیارات اپنے قبضے میں لے لئے۔ دو سو سال تک شہری کونسلوں کے نمائندوں نے بغیر کسی بادشاہ کے بغیر اسقفوں کے اور بغیر امرا کے ملک پر حکومت کی۔ شہر کا رتبہ سب سے بلند تسلیم کیا گیا۔ اور شہری ملک کے حاکم بن گئے +

زمانۂ وسطیٰ کی دُنیا

زمانۂ وسطیٰ کے لوگوں کا اس دنیا کے متعلق جس میں خُدا نے اُن کو پیدا کیا تھا۔ کیا خیال تھا

سن اور تاریخ کی ایجاد بنی نوع انسان کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ اور اب تو ان کے بغیر گزارہ مشکل ہے۔ لیکن اگر احتیاط سے کام نہ لیا جائے۔ تو تاریخیں عجیب عجیب طرح سے دھوکا دے جاتی ہیں۔ ان کا ایک نقصان تو یہ ہے۔ کہ ان کی وجہ سے انقلابات زمانہ وقت کے بہت ہی زیادہ پابند معلوم ہونے لگتے ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں۔ مثلاً جب میں زمانۂ وسطیٰ کا ذکر کرتا ہوں۔ تو اس سے ہرگز میری یہ مراد نہیں ہوتی۔ کہ ۳۱ر دسمبر ۴۷۶ء کو یکلخت سب یورپ کے لوگ یک زبان ہو کر پکارے۔ کہ آہا! اب مملکت روما کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اب ہم زمانۂ وسطیٰ میں رہتے ہیں +

شارلمان کے فرنگی دربار میں بھی ایسے لوگ موجود تھے۔ جن کی عادات و اطوار اور جن کا نقطۂ نظر بالکل رومنوں کا سا تھا۔ جب بڑے ہو گے۔ تو تمہیں معلوم ہو گا۔ کہ آج کل بھی بعض ایسے لوگ موجود ہیں۔ جن کی ذہنیت بالکل اُن قدیم انسانوں کی سی ہے۔ جو تہذیب کی آمد سے پہلے غاروں میں رہتے تھے۔ ہر زمانے اور ہر نسل میں ہر دوسرے زمانے اور ہر دوسری نسل کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ اور کبھی ایک زمانے کا جوڑ ایک دوسرے زمانے کے ساتھ اس طرح کا نہیں ہوتا۔ کہ ایک یکلخت ختم ہؤا۔ تو دوسرا ایکا ایکی شروع ہو گیا۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہم زمانہ وسطیٰ کے بہت سے عام لوگوں کا مطالعہ کر کے تمہیں یہ بتلائیں۔ کہ اس زمانے میں اوسط درجے کے انسانوں کے خیالات مسائل حیات کے متعلق عام طور پر یہ تھے +

سب سے پہلے تمہیں یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ زمانہ وسطیٰ کے لوگ اپنے آپ کو آزاد اور اپنی زندگی کے مختار ہرگز نہ سمجھتے تھے۔ کہ جہاں چاہیں جائیں۔ اور اپنی اپنی قابلیت

ہمت یا قسمت کے مطابق جس طرح چاہیں۔ اپنی زندگی کو ڈھالیں۔ وہ اپنے آپ کو نظام کائنات کا محض ایک جزو سمجھتے تھے جس نظام میں کہ شدہ و غلام۔ پاپائے وبیدین۔ غریب امیر۔ بھکاری اور چور دلیر و کم ہمت سبھی قسم کے لوگ شامل ہیں۔ وہ تقدیر الٰہی پر راضی تھے۔ اور اس میں چون وچرا کی گنجائش نہ سمجھتے تھے۔ گویا زمانہ حال کے لوگوں سے بہت ہی مختلف تھے۔ جو کسی بات کو قطعی اور فیصلہ شدہ نہیں سمجھتے اور ہر وقت اپنی مالی اور سیاسی اصلاح میں کوشاں رہتے ہیں +

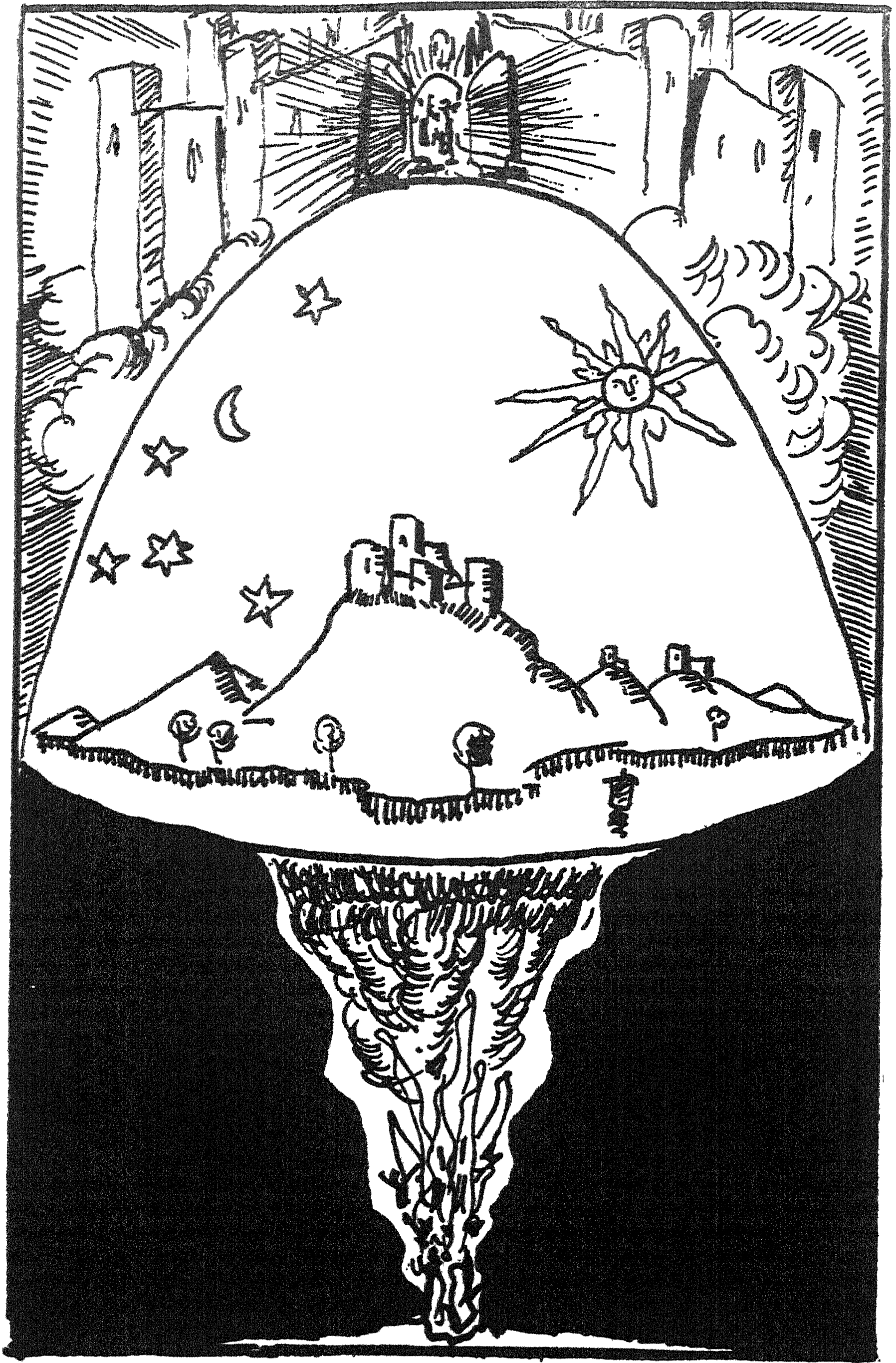
تیرھویں صدی کے لوگوں کے لئے آخرت کی دنیا (یعنی ایک پُر فضا جنت اور ایک ہولناک دوزخ) بے معنی الفاظ یا مبہم مذہبی تصورات سے بہت زیادہ حقیقت رکھتی تھی۔ وہ اسے فی الواقع سچ سمجھتے تھے۔ اور کیا تاجر پیشہ لوگ اور کیا شہسوار سبھی اپنی دنیاوی زندگی کا بیشتر حصہ اس آنے والی زندگی کی تیاری میں صرف کر دیتے تھے۔ زندگی اگر مفید اور نیک ہو۔ اور اس کا انجام عزت اور آبرو کے ساتھ ہو۔ تو آج کل کے لوگ ایسی موت کو رومنوں اور یونانیوں کی طرح آمنا کہتے ہیں۔ اور ساٹھ سال کی کشمکش اور محنت و مشقت کے بعد بلاخوف و اضطراب آخری نیند سو جاتے ہیں +

لیکن زمانۂ وسطیٰ میں موت بہت ہولناک چیز سمجھی جاتی تھی۔ انسانی پنجر کی ہڈیاں اور بے گوشت و پوست کے منہ چڑاتی ہوئی انسانی کھوپری یہ اس کے نشان تھے۔ وہ کسی وقت انسان سے الگ نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے شکار کو اپنے بے سُرے ساز سے جگاتی تھی۔ کھانے پر اس کے ساتھ بیٹھتی تھی۔ اور جب بیچارہ انسان کسی لڑکی کو ساتھ لے کر سیر کو نکلتا تھا۔ تو موت جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں سے انہیں دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی۔ اگر بچپن میں تمہیں بھی پریوں کی دلفریب کہانیوں کی بجائے قبرستانوں اور تابوتوں۔ اور مہلک بیماریوں کے قصے سنائے جاتے۔ تو تمہاری زندگی بھی تمام تر آخری ساعت کے ڈر اور روزِ حساب کے خوف میں گزرتی۔ زمانۂ وسطیٰ کے بچوں کا یہی حال تھا۔ ان کی دنیا بیشمار شیطانوں اور بھوتوں سے آباد تھی جس میں فرشتوں کا گزر ممکن تو تھا۔ مگر شاذ و نادر۔ آنے والی زندگی کے ڈر سے بعض اوقات ان کی طبیعت میں انکسار اور تقویٰ پیدا ہو جاتا۔

لیکن اکثر اوقات اس کا اثر الٹا ہوتا۔ یعنی ان میں رحم کا مادہ کم ہو جاتا۔ اور وہ ہمیشہ اپنے جذبات کے تختۂ مشق بنے رہتے۔ کسی شہر کو فتح کرتے۔ تو پہلے تمام بچوں اور عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے اور پھر بے انتہا عقیدت کے ساتھ کسی مقدس مقام پہ جا کر ان ہاتھوں سے جو ابھی معصوموں کے خون سے آلودہ تھے۔ مغفرت کی دعا مانگتے۔ اور نہ صرف دعا مانگتے بلکہ آنسوؤں کے دریا بہاتے اور اپنے گناہوں کا بصد عجز والحاح اعتراف کرتے۔ دوسرے دن پھر بغیر کسی تامل کے ساسانیوں کے ایک دستے کو بیرحمی کے ساتھ تہ تیغ کر ڈالتے۔

اس مثال میں میرا اشارہ صلیبی شہسواروں کی طرف تھا۔ تم کہو گے کہ وہ لوگ تو نائٹ تھے۔ ان کی طرز زندگی یقیناً عام لوگوں سے مختلف ہو گی۔ یہ سچ ہے لیکن ان باتوں میں عوام بھی اپنے آقاؤں کی مانند تھے۔ ان سب کی مثال اس گھوڑے کی سی تھی۔ جو سائے سے یا کاغذ کے ایک پرزے سے ڈر جاتا ہے۔ خدمت کے موقع پر بڑی وفاداری اور تندہی سے کام کرتا ہے۔ لیکن جب اس کے توہم پرست تصوّر کو کہیں پرچھائیں نظر پڑے۔ تو بھاگ اٹھتا ہے۔ اور بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتا ہے۔

لیکن ان بیچاروں پر کوئی حکم صادر کرنے سے پہلے یہ غور کر لینا چاہیئے۔ کہ ان کی زندگی کن ناموافق حالات میں گزرتی تھی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ لوگ تہذیب سے آشنا نہ تھے۔ مگر بنتے مہذب تھے۔ شارلمان اور اوٹو اعظم کہلاتے تو "رومن شاہنشاہ" تھے۔ لیکن ان کو اصلی رومن شاہنشاہوں سے وہی نسبت تھی۔ جو جشتان کے بادشاہ کو سویڈن یا ڈنمارک کے تعلیم یافتہ فرمانرواں سے ہے۔ وحشی لوگ تھے۔ جن کا مسکن تہذیب کے کھنڈروں میں تھا۔ لیکن جس تہذیب کو ان کے آباؤ اجداد نے تاراج کیا تھا۔ اس سے انہوں نے کچھ بھی فیض حاصل نہ کیا۔ وہ تو ان باتوں سے بھی بے خبر تھے۔ جنہیں آج کل کے زمانے میں بارہ سال کا بچہ تک جانتا ہے۔ کتاب ان کے پاس لے دے کے صرف ایک تھی یعنی انجیل۔ اور اسی کو وہ مخزن علوم سمجھتے تھے۔ لیکن انجیل کے جن حصوں نے چہرۂ تاریخ کو اپنی تعلیم سے رونق بخشی ہے۔ وہ عہد جدید کے وہ حصے ہیں جن میں محبت اور عفو کی تلقین کی گئی ہے۔ ہیئت یا علم حیوانات



زمانہ وسطیٰ کی دنیا

یا علم نباتات یا اقلیدس کے موضوعات پر یہ مقدس کتاب چنداں قابل اعتماد نہیں۔ بارھویں صدی میں زمانۂ وسطیٰ کے کتب خانے میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہوا یعنی لوگ اب اس عظیم الشان انسائیکلوپیڈیا کو بھی پڑھنے لگے۔ جسے چوتھی صدی قبل مسیح میں یونانی فلسفی ارسطو نے مرتب کیا تھا۔ یہ بات اب تک مجھے عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کہ کلیسائے مسیحی ادھر تو تمام یونانی فلسفیوں پر بوجہ ان کی بے دینی اور ان کے کفر کے لعنت بھیجتا تھا۔ اور ادھر سکندر اعظم کے استاد کو اس قدر احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں۔ کہ مسیحیوں کے نزدیک انجیل کے بعد دوسرا درجہ ارسطو ہی کا تھا +

ارسطو کی تصانیف بہت چکر کاٹ کر یورپ پہنچیں۔ پہلے یونان سے سکندریہ گئیں۔ پھر جب مسلمانوں نے ساتویں صدی میں مصر کو فتح کیا۔ تو ان کا یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوا۔ وہاں سے مسلم افواج کے ساتھ ہسپانیہ پہنچیں۔ جہاں ارسطو کا فلسفہ قرطبہ کی یونیورسٹی کے درس میں شامل ہوا۔ پھر جب عیسائی طلبا اعلٰے حاصل کرنے کی غرض سے ہسپانیہ پہنچے۔ تو انھوں نے اس عربی نسخے کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ ہوتے ہوتے یہ مشہور کتابیں شمال مغربی یورپ کی درسگاہوں میں پڑھائی جانے لگیں۔ پوری طرح انہیں سمجھ تو کوئی نہ سکتا تھا۔ لیکن ان کے نزدیک یہ بھی ان کی عظمت کی ایک نشانی تھی +

آسمان اور زمین کے درمیان جس قدر اشیا ہیں۔ ان کی ماہیت کیا ہے۔ اور یہ مشیت ایزدی کے سلسلے میں کیونکر منسلک ہیں۔ ایسے ایسے مسائل کے جوابات زمانۂ وسطیٰ کے علما نے محض ارسطو اور انجیل کی مدد سے دریافت کرنے کی کوشش کی۔ یہ علما جن کو "اہل مکتب" کہا جاتا تھا۔ فی الحقیقت بہت ذہین اور روشن دماغ تھے۔ لیکن ان کے معلومات تمامتر کتابوں سے اخذ کئے ہوئے تھے۔ مشاہدے اور تجربے کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ کبھی کسی مچھلی یا کیڑے پر لکچر دینے کی باری آتی۔ تو خود بھی انجیل اور ارسطو کا مطالعہ کرتے اور طلبا کو بھی انہیں کتابوں کے پڑھنے کی تاکید کرتے یہ نہ کرتے کہ کسی ندی میں جا کر مچھلی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یا کتب خانے سے باہر نکل کر پھولوں کی کسی کیاری میں کیڑوں کی عادات کا مطالعہ کریں۔

البرٹس اعظم[1] اور طامس اکوآئینس[2] جیسے علماء نے بھی کبھی یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ کہ فلسطین کی مچھلیاں اور مقدونیہ کے کیڑے کہیں یورپ کی مچھلیوں اور کیڑوں سے مختلف تو نہیں +

بعض اوقات جب کبھی علما کے زمرے میں راجر بیکن[3] کی مانند کوئی صاحبِ جستجو آدھمکتا۔ اور خردبینوں اور دوربینوں کے ذریعے سے تجربے شروع کر دیتا۔ اور مچھلیوں اور کیڑوں کو اٹھا کر عین درسگاہ میں لے آتا۔ اور وہاں ثابت کرتا۔ کہ یہ ان جانوروں سے مختلف ہیں۔ جن کا ذکر انجیل یا ارسطو میں آیا ہے۔ تو اہلِ مکتب اس کی جسارت کو ملامت کی نظروں سے دیکھتے۔ اور کہتے۔ کہ بس صاحب۔ یہ تنجاوز ہم سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب بیکن نے یہ کہا کہ مشاہدہ کا ایک گھنٹہ مطالعے کے دس سال سے بہتر ہے۔ پھر جب اس نے یہ بھی کہا۔ کہ ارسطو کے مطالعے سے خاک بھی فائدہ نہیں پہنچا۔ اور اگر اس کی تصانیف کا ترجمہ نہ ہوتا۔ جب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ تو اہلِ مکتب حکام کے پاس پہنچے۔ اور کہنے لگے۔ کہ یہ شخص سلطنت کے لئے سخت خطرناک ہے۔ یہ چاہتا ہے۔ کہ ہم ارسطو کی تصانیف کا مطالعہ اصل یونانی زبان میں کریں۔ جب ہمارے آباو اجداد کئی سو سال سے اسی لاطینی ترجمے سے فیض یاب ہوتے آئے ہیں۔ تو یہ شخص یونانی کے پیچھے کیوں بھاگتا ہے؟ یہ مچھلیوں اور کیڑوں کے جسم کو چیر پھاڑ کر ان کا مطالعہ کیوں کرتا ہے۔ ہمیں تو یہ شبہ ہے۔ کہ یہ شخص کوئی مفسد جادوگر ہے۔ جو اپنے کالے جادو سے موجودہ نظام کو برہم کرنے کے درپے ہے۔ اہلِ مکتب نے اس شدومد اور اس چرب زبانی سے کام لیا۔ کہ حکام بھی ڈر گئے۔ اور بیکن کو تصنیف کے کام سے منع کر دیا۔ چنانچہ بیکن دس سال تک کچھ نہ لکھ سکا۔ جب دوبارہ قلم اٹھایا۔ تو اپنا تلخ تجربہ نہ بھولا۔ اگلی بار اپنی کتابیں ایسے پُراسرار خط میں لکھیں۔ کہ اس کے ہمعصر انہیں بالکل نہ پڑھ سکتے تھے۔ جب کلیسا نے لوگوں کو ایسے ایسے سوالات اٹھانے سے منع کرنا شروع کیا جن کی وجہ سے شک اور بے دینی کے پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ تو اہلِ قلم بھی اپنے

---

[1] Albertus Magnus [2] Thomas Aquinas [3] Roger Bacon

خیالات کو قلمبند کرنے کے لئے بیکن کی طرح پر اسرار رسم الخط استعمال کرنے لگے +

اس احتساب سے حکام اور ان کے ہمخیال لوگوں کا مقصد یہ نہ تھا کہ حق کو لوگوں تک پہنچنے سے روکا جائے۔ بلکہ برعکس اس کے جو لوگ یوں بیدینوں کے درپے رہتے تھے۔ ان کی نیت نیک تھی۔ انھیں اس بات پر کامل یقین تھا۔ کہ حقیقی زندگی عقبیٰ کی زندگی ہے۔ اور یہاں کا چند روزہ قیام محض اس کی تیاری ہے۔ ان کا عقیدہ تھا۔ کہ ضرورت سے زیادہ علم تسکینِ قلب کا دشمن ہے۔ اس سے لوگوں کے دماغ میں سودا سما جاتا ہے۔ ان کے دل میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں جن کے ہوتے ہوئے روح کو کبھی نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہذا بہت زیادہ علم کا نتیجہ جہنم ہے۔ زمانۂ وسطیٰ کے اہل مکتب جب دیکھتے کہ ان کا کوئی شاگرد انجیل اور ارسطو سے (جن کو وہ وحی منجانب اللہ سمجھتے تھے) بھٹک کر اپنی عقل کے بل پر تجربے اور مشاہدے کے میدان میں کودنا چاہتا ہے۔ تو ان کی وہی کیفیت ہوتی تھی۔ جو بچے کو آگ کے قریب جاتے ہوئے دیکھ کر ماں کی ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر ماں جانتی ہے۔ کہ آگ کو چھوا۔ تو بچے کی انگلیاں جل جائینگی۔ اس لئے اگر زبردستی بھی روکنا پڑے تو تامل نہیں کرتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا۔ کہ اس کو بچے سے محبت نہیں۔ یا اگر بچہ اس کا کہا مان لے۔ تو وہ اسے پیار نہ کریگی۔ اسی طرح زمانہ وسطیٰ میں جو لوگ انسان کی روح کے محافظ تھے۔ وہ عقائد کے معاملے میں بہت سخت گیر تھے لیکن یوں خلق خدا کی خدمت میں دن رات کوشاں رہتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا۔ وہ محتاجوں کی دستگیری کرتے تھے۔ اور زمانہ وسطیٰ کی تاریخ میں ایسے ہزارہا نیک مردوں اور متقی عورتوں کے اشارات جابجا نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے حتی المقدور بنی نوع انسان کی زندگی کو کم تکلیف دہ بنانے میں اپنی عمریں صرف کر دیں +

ایک غلام پیشہ انسان ایک غلام پیشہ انسان تھا۔ اور اس کی حیثیت کو بدلنا قطعاً ناممکن لیکن زمانہ وسطیٰ کے خدائے عز وجل نے جہاں اس حقیر انسان کی تقدیر میں یہ لکھا تھا۔ کہ یہ عمر بھر غلاموں کا کام ہی کرتا رہے۔ وہاں اسے ایک غیر فانی روح بھی عطا فرمائی تھی۔ اس لئے اس کے حقوق کی نگہداشت ضروری تھی۔ تاکہ وہ ایک نیک مسیحی کی زندگی گزارے۔ اور نیک مسیحی کی موت مرے۔ جب بوڑھا یا

ضعیف ہو جاتا۔ اور کام کاج کے قابل نہ رہتا۔ تو یہ ضروری سمجھا جاتا۔ کہ اس کا آقا اس کی خبر گیری کرے۔ اس لئے گو ایک غلام پیشہ شخص کی زندگی بے رنگ و بے رونق تھی۔ لیکن اسے فردا کا ذکر کبھی نہ ستاتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اس کا مستقبل محفوظ ہے۔ اسے کبھی ملازمت سے برخاست نہیں کیا جاسکتا۔ سو وہ کبھی بے گھر نہ ہوگا۔ (ہر چند کہ اس گھر کی چھت ٹپکتی ہے) اور وہ کبھی بھوکا نہ مریگا +

اس قسم کی بیفکری سوسائٹی کے سب طبقوں میں پائی جاتی تھی۔ شہروں میں دکاندار اور پیشہ ور لوگوں نے اپنی اپنی برادریاں بنا لیں تھیں۔ تاکہ کسی شخص کو بے روزگاری کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ اس طرح سے گو اہل ہمت کو ترقی کی تحریک نہ ہوتی۔ اور سست اور کاہل لوگوں کو کبھی اپنی سستی کی سزا نہ ملتی۔ تاہم مزدور پیشہ لوگوں میں ایک خاص اطمینان اور خوشحالی کا احساس پایا جاتا تھا۔ جو آج کل کی گرم بازاری میں کہیں نہیں ملتا۔ زمانہ وسطیٰ کے لوگ اس بات سے بھی آگاہ تھے۔ کہ اگر کوئی متمول شخص سب کا سب غلہ یا صابن یا مچھلیاں خرید کے رکھ لے اور پھر اسے منہ مانگی قیمت پر بیچے تو لوگوں کے لئے کس قدر آزار کا باعث ہوسکتا ہے۔ اس لئے حکام ٹھوک کی تجارت کو پسندیدہ نہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے تو اشیا کی قیمتیں تک مقرر کر رکھی تھیں۔ اور کوئی دکاندار مقررہ قیمت سے زیادہ پر مال بیچنے کا مجاز نہ تھا +

زمانہ وسطیٰ میں خرید و فروخت میں مقابلے کو ناپسند کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا۔ کہ ایک دوسرے کے مقابلے پر چیزیں بیچنا اور اس طرح سے تاجروں میں رقابت اور زندگی میں افراتفری پیدا کرنے سے کیا حاصل۔ جبکہ روز حساب آنے والا ہے۔ اور عنقریب یہ مال و دولت کسی کام نہ آئیگی۔ اور حقیر سے حقیر انسان بھی اگر وہ نیک ہے تو جنت کے دروازے اس پر کھل جائینگے۔ اور بڑے سے بڑا امیر بھی اگر وہ بدکردار ہے تو جہنم کے غار اس کو نگل جائینگے +

الغرض زمانہ وسطیٰ کے لوگوں کو اس بات کی تلقین کی جاتی تھی۔ کہ تم اپنے خیالات اور اعمال میں مکمل آزادی کے طالب نہ بنو۔ کہیں کہیں اپنے اوپر یہ چند بندشیں عائد کر لو۔ تاکہ جسمانی افلاس اور روحانی افلاس سے مامون ہو جاؤ +

لوگ بھی عموماً اس اصول کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کا ایمان تھا۔ کہ ہماری زندگی چند

روزہ ہے - اور ہمیں اس دنیا میں اس غرض کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کہ ہم یہاں رہ کر عاقبت کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ چنانچہ انہوں نے دیدہ و دانستہ اس دنیا سے منہ موڑ لیا جو رنج و آلام اور گناہ اور ظلم سے بھری ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی۔ تا کہ سورج کی روشنی ان کی نظر کو اس نور آسمانی سے منحرف کر کے اپنی طرف متوجہ نہ کر لے جس کا ذکر کتاب مکاشفہ میں آیا ہے۔ اور جس کی بدولت ان کی روح ابدالآباد تک مسرت سے معمور رہیگی۔ اس دنیا کے عیش اور مسرت سے انہوں نے نظر پھیر لی۔ تا کہ آئندہ زندگی کی برکتوں سے مالا مال ہوں۔ حیات ارضی ان کے نزدیک ایک لعنت تھی جس سے نجات پانا ان کے اختیار میں نہ تھا۔ اس لئے موت کو وہ ایک شاندار دن کی صبح تصور کرتے تھے +

رومنوں اور یونانیوں نے کبھی حیات بعد الموت کے متعلق اپنے دل کو پریشان نہ کیا تھا۔ وہ اپنی جنت اسی دنیا میں بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی کو ان لوگوں کے لئے جو غلام نہ تھے۔ بہت ہی دلکش بنا رکھا تھا۔ ان کے بعد زمانہ وسطیٰ آیا۔ اور لوگوں کے عقائد بالکل ہی منقلب ہو گئے۔ پہلے تو وہ دنیا ہیچ تھی۔ اور یہ دنیا سب مسرتوں کی سرمایہ دار۔ اب جنت اس دنیا کی حدود سے پرے کہیں بادلوں کی سرزمین کے بھی اُس پار واقع تھی۔ اور یہ دنیا کیا اعلےٰ اور کیا ادنےٰ کیا غریب اور کیا امیر۔ کیا عاقل اور کیا جاہل سب کے لئے دار المحن بن گئی۔ حالات اب اب اس بات کے متقاضی تھے۔ کہ ذہن انسانی پھر اس پہلے عقیدے کی طرف رجوع ہو۔ اس کا حال میں تمہیں اگلے باب میں بتاؤنگا +

زمانۂ وسطیٰ کی تجارت

صلیبی لڑائیوں کی وجہ سے بحیرہ روم میں پھر تجارت کا بازار گرم ہُوا۔ ایشیا اور افریقہ کے ساتھ لین دین کا سلسلہ قائم ہُوا اور اطالیہ کے شہر اس تجارت کے مرکز بن گئے

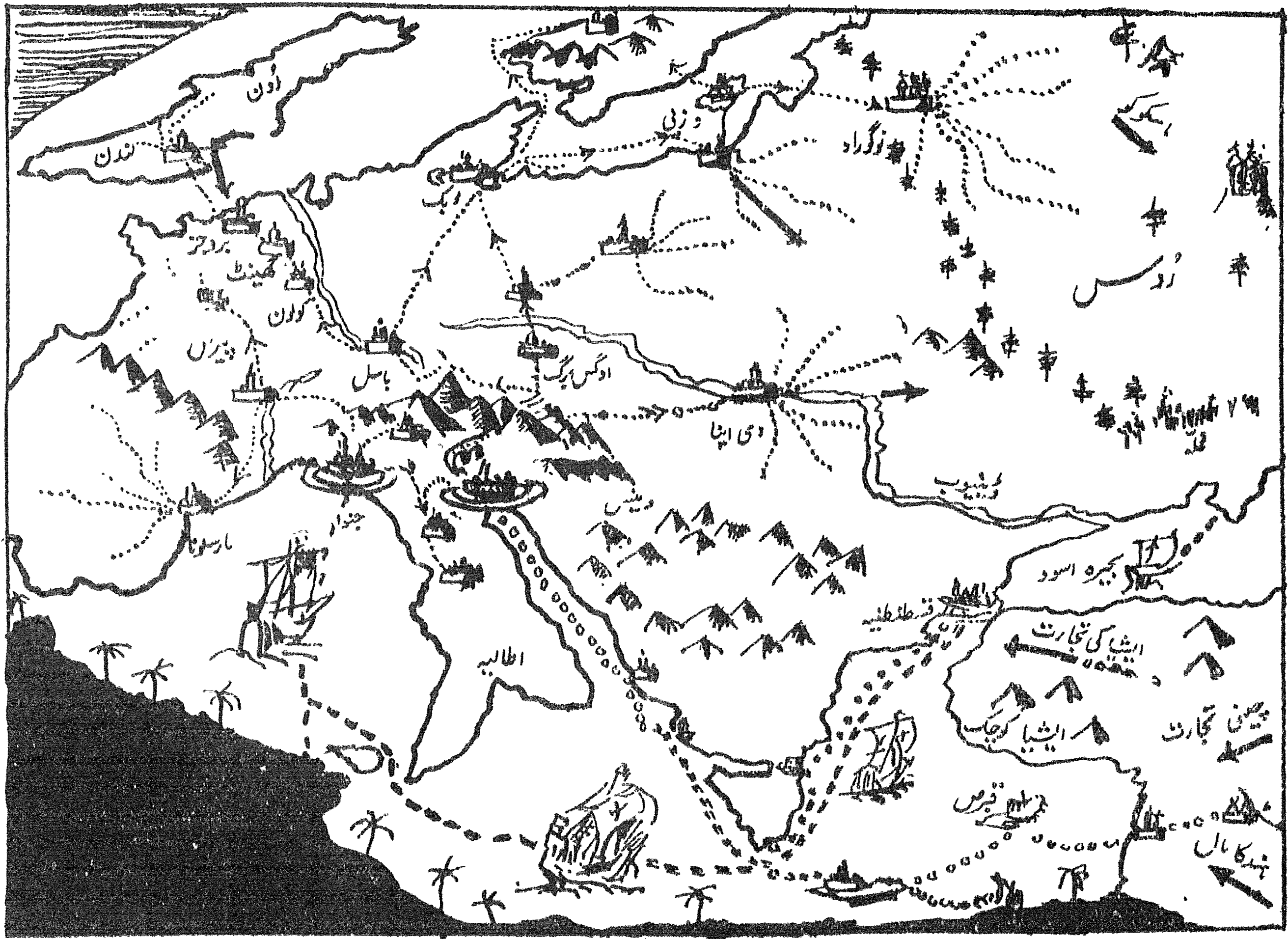
زمانۂ وسطیٰ کے اواخر میں جن شہروں نے سب سے پہلے اپنی گمشدہ اہمیت کو دوبارہ حاصل کیا۔ وہ اطالیہ کے شہر تھے۔ اس کی تین وجوہ تھیں۔ اول تو اطالوی جزیرہ نما۔ رومنوں کی بدولت بہت ہی پہلے سے آباد اور مہذب ہوگیا تھا۔ اس لئے تہذیب کے سامان مثلاً سڑکیں اور شہر اور مکتب جس قدر وہاں پائے جاتے تھے۔ یورپ بھر میں اور کہیں نہ تھے۔

اس میں شک نہیں۔ کہ بربریوں نے جہاں یورپ کے باقی حصوں کو تاخت و تاراج کیا۔ وہاں اطالیہ کے شہروں کو بھی گزند پہنچائے بغیر نہ چھوڑا۔ لیکن اطالیہ میں غارت کرنے کو اتنا کچھ موجود تھا۔ کہ جہاں بہت کچھ تباہ ہُوا۔ وہاں بہت کچھ بچ بھی رہا۔ دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ پاپا کا مسکن اطالیہ میں تھا۔ اور پاپا سردار تھا ایک ایسے وسیع سیاسی نظام کا جس کے مقبوضات میں اراضی اور غلام اور عمارتیں اور جنگل اور دریا شامل تھے اور جس کے ماتحت باقاعدہ عدالتیں تک ہُوا کرتی تھیں اس لئے پاپا کا مسلسل اور متواتر خراج ادا ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وینس[1] اور جنوا[2] کے سوداگروں اور جہازوں کے مالکوں کی طرح پاپا کے مقرر کردہ حکام بھی بجز سونے یا چاندی کے اور کسی شکل میں خراج قبول نہ کرتے تھے۔ اہل شمال کو روپا

---

[1] Venice

[2] Genoa



زمانہ وسطی کی تجارت

کے دور دراز شہر میں خراج بھیجنا ہوتا۔ تو ضروری تھا۔ کہ وہ اپنی مویشی اور انڈوں اور گھوڑوں اور پیداوار کو کہیں بیچ کر اس کے بدلے میں روپیہ حاصل کریں نتیجہ اس کا یہ ہوا۔ کہ اطالیہ میں سب سے زیادہ سونا اور چاندی جمع ہوگئی۔ بنسری وجہ یہ تھی۔ کہ صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں جو لوگ لڑنے جاتے تھے۔ وہ اطالوی شہروں ہی سے جہاز میں سوار ہوتے۔ اور جب واپس آتے۔ جب بھی یہیں اترتے۔ اس لئے یہاں کے تاجروں نے اپنے نرخ بے انتہا بڑھا دئے۔ اور خوب ہاتھ رنگے ✤

صلیبی لڑائیوں کے بعد جب یورپ کے لوگوں کو ایشیا کے مال کا چسکا پڑ چکا تھا۔ تو اس مال کی تجارت کے مرکز بھی اطالیہ ہی کے شہر بنے ✤

ان شہروں میں سے شہرت اور تمول کے اعتبار سے شاید ہی کوئی شہر وینس کے پائے کو پہنچتا ہو۔ وینس ایک جمہوری سلطنت تھی۔ جو سمندر کے دلدلی کنارے پر بنی تھی۔ چوتھی صدی میں جب بربریوں نے اطالیہ پر حملہ کیا تھا۔ تو لوگ ملک چھوڑ کر یہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ چنانچہ لوگوں نے یہاں نمک بنانے کا کام اختیار کر لیا۔ زمانہ وسطیٰ میں نمک بہت کم پایا جاتا تھا۔ اور بہت مہنگا بکتا تھا۔ کئی سو سال تک وینس کے لوگ اس اشد ضروری جنس کے اجارہ دار بنے رہے تھے۔ (ضروری اس لئے کہتا ہوں۔ کہ انسانوں کو ایک خاص مقدار نمک کی نہ ملتی رہے۔ تو بھیڑوں کی طرح بیمار پڑ جاتے ہیں) اس اجارہ داری سے شہر کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یہاں کے رہنے والے پاپا تک کے منہ آجاتے تھے۔ شہر متمول ہوگیا۔ تو جہاز بننے لگے۔ اور ایشیا سے تجارت کا سلسلہ شروع ہوا۔ صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں سپاہی ارض مقدس کو انہی جہازوں پر جایا کرتے تھے۔ جو لوگ نادار تھے۔ اور کرایہ ادا نہ کر سکتے تھے۔ ان سے جنگی خدمت لی جاتی تھی۔ اور اس طرح سے اہل وینس نے بحیرہ ایجین۔ ایشیائے کوچک اور مصر میں اپنی مقبوضات اور نو آبادیوں کو بہت وسیع کر لیا تھا ✤

چودھویں صدی کے آخر میں وینس کی آبادی دو لاکھ تک پہنچ گئی۔ گویا وینس زمانہ وسطیٰ کا سب سے بڑا شہر بن گیا۔ شہر کی حکومت چند متمول سوداگر پیشہ گھرانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور عوام کو اس میں کچھ دخل حاصل نہ تھا۔ لوگ ایک سینیٹ

اور ایک ڈوج[1] یا ڈیوک[2] کو منتخب کر لیتے تھے۔ لیکن اصل حکومت ایک خاص مجلس کے ہاتھ میں تھی۔ جو تاریخ میں مجلس عشرہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجلس کے پاس بہت سے جاسوس اور پیشہ ور قاتل ملازم تھے۔ جو سب شہریوں کی جاسوسی کرتے۔ اور جس کسی کو مجلس کی ظالمانہ حکمت عملی کے لئے خطرناک پاتے چپکے سے اس کا کام تمام کر دیتے۔

فلورنس[3] کی حکومت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہاں جمہوریت کا راج تھا۔ اور جمہوریت بھی ایسی کہ بات بات پر ہنگامہ اور شور بپا ہو جاتا تھا۔ فلورنس کا شہر اس شاہراہ پر واقع تھا۔ جو شمالی یورپ سے روما کو جاتی تھی۔ اس محل وقوع سے فائدہ اٹھا کر بہت سا روپیہ کمایا۔ اور اسے کارخانوں میں لگایا۔ اہل فلورنس ایتھنز کی تقلید کرنا چاہتے تھے۔ امرا۔ پادری۔ پیشہ ور برادریوں کے ارکان سب کے سب شہر کے انتظامی معاملات میں حصہ لیتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ شہر میں ایک ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ لوگوں میں ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف فریق بن جاتے تھے۔ اور جہاں ایک فریق کو کونسل میں اقتدار حاصل ہو جاتا۔ دوسرے فریق کے لوگوں کو سخت سزائیں دیتے تھے۔ ان کا مال ضبط کر لیتے تھے۔ اور شہر بدر کر دیتے تھے۔ جب کئی صدیوں تک جمہوریں یہ صف آرائیاں جاری رہیں۔ تو جو لابد تھا وہی ظہور میں آیا۔ ایک طاقت ور گھرانے نے قوت پکڑ لی اور نہ صرف شہر بلکہ گرد و نواح کے علاقے پر بھی قدیم یونانی خود مختار بادشاہوں کی طرح حکومت کرنے لگا۔ اس خاندان کا نام میڈیچی[4] تھا۔ ان کے آباؤ اجداد اطبا تھے۔ اس لئے ان کا نام میڈیچی پڑ گیا جس کے معنے اطبا ہیں۔ بعد میں انہوں نے مہاجنوں کا پیشہ اختیار کر لیا۔ جہاں جہاں تجارت کا مرکز تھا۔ وہاں انہوں نے اپنی شاخیں کھول رکھی تھیں۔ آج کل بھی جن لوگوں کا پیشہ یہ ہے۔ کہ وہ مال رہن رکھ کر روپیہ قرض دیتے ہیں۔ اور اس پر نفع لیتے ہیں۔ ان کی دکان کے باہر بطور نشان کے تین گیند لٹکے رہتے ہیں۔ یہ نشان

---

[1] Doge [2] Duke [3] Florence [4] Medici

اہل میدیچی کے وقت سے چلا آتا ہے۔ کیونکہ تین گیندوں کا نشان ان کے خاندانی نشان میں شامل تھا۔ اس خاندان کو اس قدر اقتدار نصیب ہوا۔ کہ یہ فلورنس پر حکومت کرنے لگے۔ اپنی لڑکیاں فرانس کے بادشاہوں سے بیاہیں۔ اور جب مرے تو ایسے ایسے عالیشان مقبروں میں دفن ہوئے۔ جو رومن شاہنشاہوں کے شایانِ شان تھے +

وینس کا بڑا حریف جنوا کا شہر تھا۔ یہاں کے سوداگر زیادہ تر یونس اور بحیرہ اسود کے کنارے جو غلے کی منڈیاں تھیں۔ ان سے تجارت کرتے تھے۔ اسی طرح اور بھی کئی شہر تھے۔ تعداد میں دوسو سے بھی زیادہ کوئی بڑا کوئی چھوٹا۔ اور ان میں کا ہر ایک شہر بذات خود تجارت کی ایک بڑی منڈی تھا۔ سب ایک دوسرے کے جانی دشمن۔ اور تجارت کے میدان میں ایک دوسرے کی بیخکنی کے درپے تھے +

یہی وہ منڈیاں تھیں۔ جہاں پہلے ایشیا اور افریقہ کا مال لایا جاتا۔ اور پھر یہاں سے مغرب اور شمال کو بھیجا جاتا +

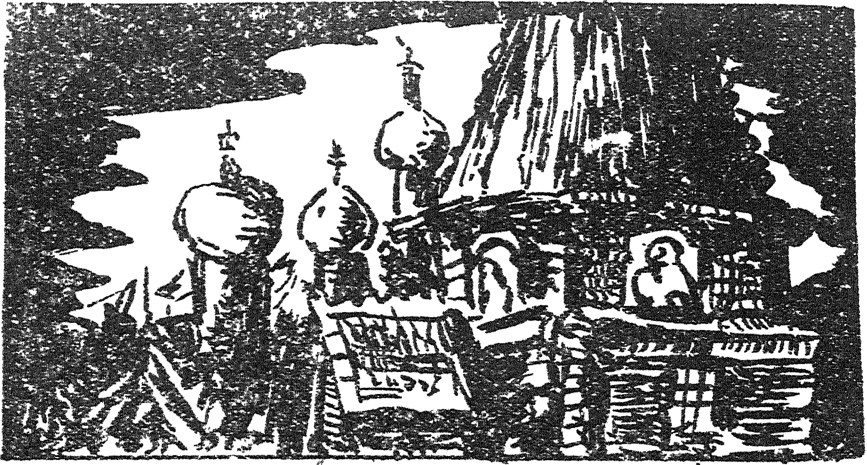
جنوا کا مال پانی کے رستے مارسیلز پہنچتا۔ اور وہاں سے جہازوں میں لاد کر رون[ا] کے کنارے جو شہر آباد تھے۔ وہاں پہنچایا جاتا۔ ان شہروں سے پھر تمام شمالی اور مغربی فرانس میں جاتا +

اہل وینس اپنا مال شمالی یورپ میں خشکی کے رستے بھیجتے۔ یہ شاہراہ قدیم الایام سے چلی آتی تھی۔ اسی سے درہ برینر[۲] عبور ہوتا تھا۔ اور یہی وہ دروازہ تھا۔ جس میں سے داخل ہو کر بربریوں نے اطالیہ پر حملہ کیا تھا۔ انسبرک[۳] سے گزر کر مال باسل[۴] پہنچتا وہاں سے یا تو رائن[۵] کے رستے بحیرہ شمالی اور انگلستان کو بھیجا جاتا۔ یا اسے اوگزبرگ[۶] بھیج دیتے۔ جہاں فگر[۷] نامی ایک خاندان اپنی وساطت سے اسے نورم برگ[۸]۔ لائپزگ[۹] اور بحیرہ بالٹک کے شہروں تک پہنچا دیتے۔ اس خاندان کے لوگ مہاجن بھی تھے اور کارخانہ دار بھی۔ دولت یوں جمع کی تھی۔ کہ اپنے مزدوروں کو اُجرت

---

[۱] Rhone　[۲] Brenner　[۳] Innsbruck
[۴] Basel　[۵] Rhine　[۶] Augsburg
[۷] Fugger　[۸] Nuremberg　[۹] Leipzig

کے جو پیسے دیا کرتے تھے۔ انہیں تھوڑا تھوڑا سا تراش لیا کرتے تھے) ان شہروں کے علاوہ مال وزبی[1] بھی بھیجا جاتا۔ یہ شہر گوٹ لینڈ[2] کے جزیرے پر واقع تھا۔ شمالی بالٹک کو مال یہیں سے پہنچتا تھا۔ اور نوو گوراد[3] کی جمہوریت سے بھی اس شہر کے تعلقات براہ راست تھے۔ (نووگوراد روس کا قدیم تجارتی مرکز تھا۔ جو سولھویں صدی کے وسط میں آئیون[4] سفاک کے ہاتھوں تباہ ہوا)



نووگوراد اعظم

شمال مغربی یورپ کے ساحل پر جو چھوٹے چھوٹے شہر آباد تھے۔ ان کی داستان جدا ہے۔ لیکن کچھ کم دلچسپ نہیں۔ بات یہ ہے کہ زمانہ وسطیٰ میں مچھلی بہت کھائی جاتی تھی۔ آئے دن روزے رکھنے پڑتے تھے۔ اور روزے کے دن کسی اور قسم کے گوشت کھانے کی اجازت نہ تھی۔ جو لوگ سمندر اور دریاؤں سے دور رہتے تھے انہیں محض انڈوں پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ تیرھویں صدی میں ہالینڈ کے ایک ماہی گیر نے ہیرنگ[5] مچھلی سکھانے کی ایک ترکیب نکالی جس سے مچھلیاں دور دور دساور میں بھیجی جانے لگیں۔ چنانچہ بحیرہ شمال میں جو مچھلی کی شکارگاہیں تھیں ان کی

---

[1] Wisby [2] Gotland [3] Novgorod

[4] Ivan the Terrible [5] Herring

اہمیت بہت بڑھ گئی۔ لیکن تیرھویں صدی میں ہیرنگ مچھلی بحیرہ شمالی سے نقل مکان کر کے بحیرہ بالٹک میں آ گئی۔ اس لئے بحیرہ بالٹک کے کنارے جو شہر آباد تھے۔ وہ مچھلی کی تجارت کے مرکز بن گئے۔ اور انہوں نے اس سے خوب روپیہ کمایا۔ اور دنیا بھر کے لوگ مچھلی پکڑنے کے لئے جہازوں میں سوار ہو کر بالٹک پہنچنے لگے۔ ہیرنگ مچھلی کا شکار خاص خاص موسموں میں ہوتا ہے۔ سال کا باقی حصہ یہ مچھلی گہرے سمندر میں جا کر انڈے دینے میں گذارتی ہے۔ اس بیکاری کے زمانے میں ماہی گیروں کے جہاز شمالی اور وسطی روس کی گندم ڈھو ڈھو کر جنوبی اور مغربی یورپ کو لے جاتے۔ اور واپسی پر وینس اور جنوا سے مصالحے اور ریشم اور ایشیائی قالین لاکر بروجز[۱] اور ہیمبرگ[۲] اور بریمن[۳] میں پہنچاتے۔

اس آمد و رفت نے رفتہ رفتہ ایک بین الاقوامی نظام تجارت کی شکل اختیار کر لی۔ جس کا سلسلہ بہت طویل و وسیع تھا۔ اس کے ایک سرے پر تو بروجز اور گھینٹ[۴] کے شہر تھے۔ (جہاں پیشہ ور لوگوں کی برادریاں اس قدر طاقت پکڑ گئی تھیں کہ شاہان فرانس و انگلستان سے جنگ آزمائی بھی ہو لیتی تھیں۔ یہاں انہوں نے مزدوروں پر اس قدر ظلم ڈھائے۔ کہ بالآخر آقا و ملازم دونو تباہ ہو گئے)۔ اور دوسرے سرے پر شمالی روس میں نوگوراد کی جمہوریت تھی۔ نوگوراد کا شہر عالیشان اور متمول تھا۔ لیکن زار آئیون نے اسے برباد کر ڈالا۔ یہ سفاک بادشاہ سوداگروں سے ہمیشہ بدظن رہتا تھا۔ شہر پر قابض ہونے کے بعد اس نے ایک مہینے کے اندر اندر ساٹھ ہزار انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور جو بچ گئے انہیں بھکاریوں سے بھی بدتر بنا کے چھوڑا۔

سمندری ڈاکوؤں اور غیر منصفانہ محصولات اور ظالمانہ قوانین سے بچنے کے لئے شمال کے سوداگروں نے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا نام انہوں نے "ہنسا"[۵] رکھا۔ جس کا مستقر لوبک[۶] میں تھا۔ اور جس میں ایک سو سے زیادہ شہر اپنی مرضی سے شامل ہو گئے۔ اس انجمن نے اپنا ایک جنگی بیڑا رکھا۔ جو سمندر میں پہرہ دیتا تھا۔ جب شاہان انگلستان و ڈنمارک نے اراکین ہنسا کے حقوق میں دخل دینے کی جرأت

---

[۱] Bruges [۲] Hamburg [۳] Bremen
[۴] Ghent [۵] Hansa [۶] Lubeck

کی۔ تو اسی جنگی بیڑے نے انہیں شکست فاش دی۔ اور اُن کی جسارت کا انہیں مزا چکھایا +

اس تجارت کا حال دلچسپ افسانے سے کم نہیں۔ تاجروں کو طرح طرح کے سفر پیش آتے تھے اور کبھی دشوار گزار پہاڑوں اور کبھی گہرے سمندروں سے گزرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ان کی جہاں گردی کا قصہ ایسے ایسے عجیب و غریب اور رنگین واقعات کی داستان ہے کہ دل اُن کے سنانے سے نہیں اُکتاتا۔ لیکن یہ داستان طویل اس قدر ہے۔ کہ میں اسے یہاں مختصر طور پر بھی بیان نہیں کر سکتا۔ اور پھر میں یہ بھی سمجھتا ہوں۔ کہ اتنا کچھ پڑھ



ہنسا کا جہاز

چکنے کے بعد تمہارے دل میں اتنا شوق پیدا ہوگا۔ کہ تم اور اور کتابیں زمانہ وسطیٰ کے متعلق ضرور پڑھو گے۔ جہاں یہ باتیں تفصیل کے ساتھ بیان کی ہونگی +

جیسا کہ میں نے تمہیں بتانے کی کوشش کی ہے۔ زمانہ وسطیٰ میں ترقی کی رفتار بہت

سست تھی۔ جو لوگ ذی اقتدار تھے۔ ان کا ایمان تھا۔ کہ "ترقی" کا خیال ایک شیطانی وسوسہ ہے۔ اسے دماغ سے نکال ڈالنا چاہیئے۔ اور چونکہ وہ ہر چیز کے مالک تھے۔ اس واسطے غلام پیشہ لوگوں اور ان پڑھ سرداروں سے اپنی بات بآسانی منوا سکتے تھے۔ کہیں کہیں کوئی دل گردے والا انسان ہمت کر کے سائنس کے میدان میں کود پڑتا تھا۔ لیکن اُسے اپنی آزاد خیالی کی سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ اور اگر اس کی جان بچ جاتی۔ اور اہل احتساب صرف بیس سال کی قید ہی پر اکتفا کرتے۔ تو وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔

جس طرح دریائے نیل کا سیلاب مصر قدیم کی وادی میں پھیل گیا تھا۔ اسی طرح بارھویں اور تیرھویں صدی میں بین الاقوامی تجارت کا سیلاب مغربی یورپ میں پھیل گیا۔ اور جب اُترا تو خوشحالی کی ایک زرخیز تہ چھوڑ گیا۔ خوشحالی آئی تو فراغت اپنے ساتھ لائی۔ فرصت کی گھڑیوں کو لوگوں نے یوں استعمال کیا۔ کہ ادب اور فن اور موسیقی میں دلچسپی لینے لگے۔

چنانچہ اہل عالم کے سینوں میں پھر اُسی ذوق تجسس کا طوفان اٹھا جس نے انسان کو کسی زمانے میں دوسرے دودھ پلانے والوں جانوروں سے ممتاز بنا دیا تھا۔ جن بہادر جوشیلے لوگوں نے تحصیل علم کی شاہراہ پر سب سے پہلے قدم اٹھانے کی جرأت کی۔ وہ ان شہروں میں آ کر سکونت پذیر ہوئے۔ جن کے فروغ کا حال میں تمہیں پچھلے باب میں بتا چکا ہوں۔

انہوں نے کمر ہمت باندھ لی۔ اپنی تنگ کوٹھڑیوں اور مطالعہ کے تاریک حجروں کے روزن کھول دئے۔ دریائے نور ان کے گرد آلود کمروں میں موجیں مارنے لگا۔ اور تاریکی کے زمانے میں جن جن کونوں میں جالے لگ گئے تھے۔ وہ سب روشن ہو گئے۔

جب گھر کو صاف کر چکے۔ تو گھر کے باغ کو آراستہ کیا۔

شہر کی چار دیواری سے نکل کر کھلے میدانوں میں آئے۔ چمکتے ہوئے آسمان اور لہلہاتے مرغزاروں سے نظر کو سیراب کیا۔ اور بول اٹھے۔ کہ یہ دنیا خوب دنیا ہے۔ اور ہم خوش نصیب ہیں۔ کہ یہاں آباد ہیں۔

جب مسرت کا یہ نعرہ چار دانگ عالم میں بلند ہوا۔ تو زمانۂ وسطیٰ ختم ہوا۔ اور ایک نئی دنیا کا آغاز ہوا۔

نشاۃ ثانیہ یعنی نئی زندگی

لوگوں کو پھر ایک بار یہ محسوس کرنے کی جرأت ہوئی۔ کہ زندگی بڑی نعمت ہے۔ اور محض زندہ رہنا ہی بہت بڑی مسرت کا باعث ہے۔ انہوں نے روما اور یونان کی قدیم اور دلکش تہذیب کے باقیات کو قعر فنا سے باہر نکالا۔ اور اس کارنامے پر اس قدر نازاں ہوئے۔ کہ اسے نشاۃ ثانیہ یعنی تہذیب کا نیا جنم تصور کرنے لگے

نشاۃ ثانیہ کسی سیاسی یا مذہبی تحریک کا نہیں بلکہ ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ زمانہ نشاۃ میں لوگوں نے مادرِ کلیسا کی فرمانبرداری سے منہ نہ موڑا۔ انہوں نے بادشاہوں اور شہنشاہوں اور امرا اور روسا کی اطاعت سے انحراف نہ کیا۔

لیکن زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بالکل بدل چکا تھا۔ ان کا لباس اب اور تھا۔ زبان مختلف تھی۔ مکان نئے ڈھنگ کے تھے۔ بودوباش نرالی تھی۔

اب وہ زمانہ نہ رہا تھا۔ جب لوگ اپنے تمام خیالات اور اپنی تمام جدوجہد عقبےٰ کی بھلائی کی نذر کر دیتے تھے۔ اب لوگوں میں یہ شوق پیدا ہؤا۔ کہ روئے زمین ہی پر جنت بنا ڈالیں۔ اور حق یہ ہے۔ کہ اس میں انہیں حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی۔

میں تم سے بارہا کہہ چکا ہوں۔ کہ ہر واقعے کے متعلق یہ بتانا کہ کس سن میں ظہور پذیر ہؤا اکثر گمراہی کا باعث ہوتا ہے۔ لوگ اس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنے لگتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں۔ زمانۂ وسطیٰ تاریکی اور جہالت کا زمانہ تھا۔ اور پھر ایک دن مقررہ وقت پر جب گھڑیال کا گھنٹہ بجا۔ تو کھٹ سے نشاۃ ثانیہ کا دور شروع

ہو گیا۔ اور شہر اور محلات یک لخت ہی علم و فن اور جذبۂ تحقیق کے نور سے جگمگا اُٹھے۔
فی الحقیقت تاریخوں کا یوں مقرر کرنا بالکل ہی ناممکن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تیرھویں صدی زمانۂ وسطیٰ میں شمار ہونی چاہیئے۔ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں۔ لیکن کیا اس زمانے میں صرف جہالت اور جمود ہی کا دور دورہ تھا؟ ہرگز نہیں۔ لوگ جوشِ عمل سے بھرے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی سلطنتوں کی بنیادیں اسی زمانے میں رکھی گئیں۔ تجارت کا بازار گرم ہوا۔ اور سوداگری کے بڑے بڑے مرکز قائم ہوئے۔ قلعے کی برجیوں اور دمدموں اور ٹاؤن ہال کی نکیلی چھت سے بھی بڑھ کر نئے گوتھک طرز کے گرجا نے اپنا نفیس و نازک کلس بلند کیا۔ جا بجا حرکت کے آثار نظر آتے تھے۔ ٹاؤن ہال کے جلیل القدر اور طاقتور اراکین جنہیں اپنی نئی نئی دولت کی وجہ سے اپنے زور و قوت کا پورا احساس ہو چکا تھا۔ اپنے زمیندار آقاؤں کے ساتھ زور آزمائی کر رہے تھے۔ پیشہ ور برادریوں کے اراکین جنہیں اب یہ اہم حقیقت معلوم ہو چکی تھی۔ کہ اکثریت بڑی طاقت ہے۔ ٹاؤن حال کے جلیل القدر اور طاقتور اراکین سے اُلجھ رہے تھے۔ اس چھینا جھپٹی کے دور میں بادشاہ اور ان کے زیرک مشیر اپنا اُلّو سیدھا کرنے لگے۔ اور شہری کونسل کے اراکین اور پیشہ ور برادریوں کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے طرح طرح کے فوائد سے اپنی جیبیں بھر لیں۔

شام کے وقت بازاروں کی روشنی بہت مدھم ہوا کرتی۔ اس لئے لوگ رات ہونے پر سیاسی اور اقتصادی معرکہ آرائیوں کا شغل بند کر دیتے۔ ایسے وقت میں ان کی ضیافت طبع کے لئے داستان گو مطرب بہادری اور جنگ اور عشق و وفا کے افسانے حسین خاتونوں کو سنایا کرتے۔ اسی اثنا میں نوجوان لوگ ترقی کی سست رفتار سے اُکتا گئے۔ اور جوق در جوق یونیورسٹیوں میں جمع ہونے لگے۔ لیکن یہ بات ذرا تفصیل سے بیان کرنے کے قابل ہے۔

زمانۂ وسطیٰ کی ذہنیت "بین الاقوامی ذہنیت" تھی۔ اس کا سمجھنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں ابھی کھول کر بیان کرتا ہوں۔ آج کل کے لوگ "قومی ذہنیت" رکھتے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو امریکن کہتا ہے۔ کوئی انگریز۔ کوئی فرانسیسی۔ کوئی اطالوی۔ ہر ایک اپنی اپنی زبان بولتا ہے۔ اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنی اپنی یونیورسٹی کا رُخ

کرتا ہے۔کسی خاص مضمون میں مہارت حاصل کرنا چاہے۔جو اس کے اپنے ملک میں نہیں سکھایا جاتا۔ تو البتہ کسی اور ملک کا سفر اختیار کرتا ہے لیکن اس حالت میں بھی پہلے وہاں کی زبان سیکھتا ہے۔ اور پھر مثلاً میونک یا میڈرڈ یا ماسکو جاکر وہاں کسی درسگاہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن تیرھویں یا چودھویں صدی کے لوگ شاذ ہی اپنے آپ کو ایک دوسرے سے یہ سوچ کر ممیز کرتے تھے۔ کہ ہم انگریز یا فرانسیسی یا اطالوی ہیں۔ وہ صرف یہ کہتے تھے کہ ہم شیفیلڈ یا بورڈو یا جنوا کے شہری ہیں۔چونکہ سب کے سب ایک ہی کلیسا کے زیر سایہ رہتے تھے۔ اس لئے ایک طرح سے سب ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے تھے۔ اور چونکہ تمام تعلیم یافتہ لوگ لاطینی بول سکتے تھے۔ اس لئے لاطینی نے ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔چنانچہ مختلف ممالک باشندے ایک دوسرے سے یوں منقطع نہ رہے۔ جس طرح آج کل کے لوگ ہیں۔ اور یورپ کی وہ حالت نہ تھی۔جو اس زمانے میں ہے۔ جبکہ زبانوں کے تباین کی وجہ سے ہر ملک ایک نرالی دنیا بن گیا ہے۔ اور چھوٹی قومیں سب سے زیادہ اس کا خمیازہ بھگت رہی ہیں۔ مثال کے طور پر اُس رواداری اور خوشدلی کے مبلغ ایراسمسؔ کو لیجئے۔جس نے اپنی کتابیں سولھویں صدی میں تصنیف کیں۔ ایراسمس ہالینڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کی تصنیفات سب لاطینی زبان میں تھیں۔جس کے پڑھنے والے ہر ملک میں پائے جاتے تھے۔ گویا سب دنیا کے لوگ اس کا مطالعہ کر سکتے تھے۔ وہ آج کل زندہ ہوتا۔ تو ہالینڈ کی زبان میں لکھتا۔ اور صرف پچاس ساٹھ لاکھ لوگ (یعنی صرف ہالینڈ کے باشندے) اس سے مستفید ہوتے۔ باقیماندہ یورپ اور امریکہ تک اس کی تصنیفات پہنچانے کے لئے بیس مختلف زبانوں میں اُن کا ترجمہ کرانا پڑتا۔ اس پر بہت سا روپیہ خرچ آتا۔ اور شاید کوئی تاجر کتب اتنی زحمت گوارا بھی نہ کرتا۔ نہ اپنے روپے کو یوں خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار ہوتا۔

آج سے چھ سو سال پیشتر یہ بندشیں مفقود تھیں۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد

ٹ Erasmus

ان پڑھ تھی۔ لیکن جن لوگوں کو قلم چلانے کا مشکل فن اچھی طرح آتا تھا۔ وہ علم وفضل کی بین الاقوامی جمہوریت کے افراد تھے۔ ایک ایسی جمہوریت جو پورے براعظم میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور جو زبان یا قومیت کے امتیازات سے بالاتر تھی۔ یونیورسٹیاں گویا اس جمہوریت کے قلعے تھیں۔ لیکن یہ قلعے جدید زمانے کے قلعوں کی طرح صرف سرحدوں ہی پر واقع نہ تھے۔ جہاں ایک استاد اور چند طلبا اکٹھے مل جاتے۔ وہیں ایک یونیورسٹی قائم ہو جاتی۔ گویا اس لحاظ سے بھی زمانہ وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کا دور ہمارے زمانے سے مختلف تھا۔ آج کل جب کبھی کوئی نئی یونیورسٹی قائم کی جاتی ہے۔ تو یہ عمل اکثر یوں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کہ پہلے بعض متمول لوگوں کے دل میں رفاہ عام کا خیال اٹھتا ہے۔ یا کسی مذہبی فرقے کو اپنے پیروؤں کی دیکھ بھال کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ یا حکومت کو ڈاکٹروں اور وکیلوں اور معلموں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس خیال کے ماتحت بہت سا روپیہ ایک بینک جمع کر دیا جاتا ہے۔ یہ گویا یونیورسٹی کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر اس روپے سے تجربہ گاہیں۔ درسگاہیں اور اقامت گاہیں تعمیر ہوتی ہیں سب سے آخر میں پیشہ ور معلموں کو ملازم رکھا جاتا ہے۔ داخلے کے امتحان ہوتے ہیں۔ اور یونیورسٹی کا کام شروع ہوتا ہے +

لیکن زمانہ وسطیٰ کا طریقہ اور تھا۔ کوئی فاضل اپنے آپ سے کہتا۔ میں نے ایک عظیم دریافت کی ہے۔ چاہیئے۔ کہ میں اور لوگوں کو بھی اس سے مستفید کروں۔ چنانچہ جہاں اس کو سننے والے مل جاتے۔ وہیں وہ اپنے علم کی اشاعت کرنے لگتا۔ اس کی باتیں دلچسپ ہوتیں۔ تو لوگوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ دلچسپ نہ ہوتیں تو لوگ پل بھر کو ٹھہر جاتے۔ اور پھر اپنی راہ لیتے۔ رفتہ رفتہ بعض نوجوان اس فاضل شخص کے اشارات سننے کو روزانہ آنے لگتے۔ اپنے ساتھ ایک کاپی ایک قلم اور سیاہی کی ایک بوتل بھی لے آتے۔



زمانہ وسطیٰ کی تجربہ گاہ

اور جو باتیں انہیں اہم معلوم ہوتیں انہیں لکھ لیتے۔ کسی دن مینہ برسنے لگتا۔ تو استاد اور شاگرد سب کے سب کسی مکان کے نچلے کمرے میں یا خود پروفیسر کے حجرے میں جا بیٹھتے۔ جہاں استاد کرسی پر بیٹھ جاتا اور لڑکے فرش پر + یہ تھا یونیورسٹی کا آغاز + اس میں پروفیسروں اور طلبا کی جو جماعت تھی جس کو یونیورسٹیاس[1] کہتے تھے ۔ وہی اصل چیز تھی۔ باقی وہ عمارت جس میں درس دیا جاتا تھا۔ اس کی کچھ حقیقت نہ سمجھی جاتی تھی +

مثال کے طور پر میں تمہیں نویں صدی کا ایسا ہی ایک واقعہ سناتا ہوں۔ نیپلز[2] کے قریب سیلرنو[3] کے شہر میں بہت سے حاذق حکیم رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے وہ لوگ جو حکمت اور طبابت سیکھنا چاہتے تھے۔ دور دور سے کھنچے چلے آئے۔ اور تقریباً ایک ہزار سال تک (یعنی ۱۸۱۱ء تک) سیلرنو کی یونیورسٹی میں ہیپوکریٹیز[4] کا درس ہوتا رہا (ہیپوکریٹیز یونان کا ایک بہت بڑا طبیب تھا۔ جو پانچویں صدی قبل مسیح میں گزرا ہے) +

ابے لارڈ[5] کی مثال لیجئے۔ یہ نوجوان برٹینی[6] کا پادری تھا۔ بارھویں صدی کے اوائل میں اس نے پیرس پہنچ کر وہاں منطق اور دینیات پر لیکچر دینے شروع کئے۔ جو اس قدر دلکش ثابت ہوئے۔ کہ ہزارہا نوجوان پیرس کو کھنچے چلے آئے۔ جو پادری ابے لارڈ سے اختلاف رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے اس کی تردید شروع کی۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ پیرس انگریزوں اور جرمنوں اور اطالویوں اور سویڈن اور ہنگری کے رہنے والے طلبا سے بھر گیا۔ جو دن رات مباحثوں میں مشغول رہتے تھے۔ چنانچہ دریائے سین کے ایک چھوٹے سے جزیرے پر جو قدیم گرجا تھا۔ اس کے ارد گرد رفتہ رفتہ پیرس کی یونیورسٹی ظہور میں آنے لگی +

اطالیہ کے شہر بولونیا[7] میں گراٹیان[8] نامی ایک راہب رہتا تھا۔ اس نے ان لوگوں کے فائدے کے لئے جن کو کلیسا کے قوانین سے واقفیت رکھنا ضروری تھا۔

---

[1] Univer sitas [2] Naples [3] Salerno
[4] Hippocrates [5] Abelard [6] Brittany
[7] Bologna [8] Gratian

ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے شائع ہونے پر بہت سے نوجوان پادریوں اور ان کے علاوہ کئی اور لوگوں نے گراتیان کے خیالات بالتفصیل سننے کے لئے بولونیا کا رخ کیا۔ سرائے والوں اور اقامت گاہوں کے اخراجات سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنی ایک انجمن (یعنی یونیورسٹی) بنالی۔ یہی بولونیا کی یونیورسٹی تھی +

اس کے بعد پیرس کی یونیورسٹی میں کوئی جھگڑا ہوا۔ اور غیر فرانسیسی طلبا وہاں سے نکال دئے گئے۔ اس زمانے میں انگلستان کے بادشاہ ہنری دوم نے تمام انگریزی کلارکوں (یعنی خواندہ لوگوں) کو جو غیر ممالک میں تعلیم پا رہے تھے۔ واپس بلا لیا۔ انگلستان میں سب یکجا ہو گئے۔ اور جو اساتذہ اور طلبا پیرس سے خارج کر دئے گئے تھے۔ انہوں نے آکسفورڈ میں یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح ۱۲۲۲ء میں بولونیا کی یونیورسٹی میں پھوٹ رونما ہوئی۔ غیر مطمئن اساتذہ (اور ان کے طلبا) وہاں سے ہجرت کر کے پیڈوا[ل] چلے آئے۔ اور وہاں انہوں نے اپنی ایک یونیورسٹی بنا ڈالی۔ یورپ بھر میں کیا ہسپانیہ اور کیا پولینڈ۔ کیا فرانس اور کیا جرمنی سب مقامات پر یونیورسٹیوں کی ابتدا اسی طریقے پر ہوئی +



نشاۃ ثانیہ

اس میں شک نہیں کہ ان اساتذہ کی تعلیم آج کل کی تعلیم کے مقابلے میں بالکل ہی ابتدائی اور مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن جو بات میں ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ زمانۂ وسطیٰ خصوصاً تیرھویں صدی کا زمانہ بالکل ہی جمود و جہالت کا زمانہ نہ تھا۔ نوجوانوں میں زندگی اور جوش کے آثار پائے جاتے تھے۔ تحقیق کا جذبہ حجاب کے اندر ہی سہی لیکن مضطرب ضرور تھا۔ اور نشاۃ ثانیہ کا دور اسی بےکلی اور اچپلاہٹ کا نتیجہ تھا +

ل Padua

لیکن زمانۂ وسطیٰ کے اختتام اور نئے دور کے آغاز سے ذرا پہلے یورپ میں ایک ایسا بے یارومددگار شخص گزرا ہے جس کا صرف نام ہی نہیں بلکہ اس کے حالات بھی تمہیں معلوم ہونے چاہئیں۔ اس شخص کا نام وانتے[1] تھا۔ اس کا باپ خاندان الی گیری[2] میں سے تھا۔ اور فلورنس میں وکالت کرتا تھا۔ وانتے ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا۔ اور اپنے آبائی شہر میں پرورش پائی۔ اس کے بچپن کا زمانہ وہ تھا۔ جب جیوتو[3] کلیسائے صلیب مقدس کی دیواروں پر سینٹ فرانسس کی زندگی کے مناظر کی تصاویر نقش کر رہا تھا۔ تاہم اس زمانے میں اہل گیلف[4] یعنی پاپا کے حامیوں اور اہل گبلائن[5] یعنی شاہنشاہ کے طرفداروں کے مابین جنگ و جدال کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ اور جب وانتے سکول کو جاتا۔ تو راہ میں اس کی سہمی ہوئی اور خوفزدہ آنکھوں کو اکثر کشت و خون کے مناظر دکھائی دیتے۔

بڑا ہو کر وہ پاپا کے حامیوں میں شامل ہوا۔ گویا باپ کے نقش قدم پر چلا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ آج کل بھی کئی لوگ سیاسی معاملات میں صرف اس لئے قدامت پسند ہیں۔ کہ ان کے بزرگ قدامت پسند تھے۔ اور کئی لوگ صرف اسی لئے لبرل ہیں کہ ان کے گھر کے لوگ لبرل خیالات کے ہیں۔ لیکن چند سال کے بعد وانتے کو یہ محسوس ہوا۔ کہ اگر اطالیہ کی سرزمین نے متفق و متحد ہو کر ایک شخص کی رہبری قبول نہ کی۔ تو چھوٹے چھوٹے شہر آپس کے بغض اور حسد اور رقابت اور بدنظمی کا شکار ہو جائینگے۔ اور ملک تباہ ہو جائیگا۔ اس کے بعد وہ شاہنشاہ کے طرفداروں کی صف میں جا ملا۔

وہ یہ آس لگائے بیٹھا تھا۔ کہ کوہ الپس کے اُس پار سے کوئی غیبی امداد ملک کو نجات دلائیگی۔ اُسے امید تھی۔ کہ کوئی طاقتور شاہنشاہ اپنے زور و قوت سے پھر امن اور اتحاد قائم کریگا۔ لیکن اس کی امید بر نہ آئی۔ ۱۳۰۲ء میں شاہ پرست فلورنس سے نکال دئے گئے۔ اس اخراج کے دن سے لے کر اُس دن تک جب کہ ۱۳۲۱ء

---

[1] Dante [2] Alighieri [3] Giotto

[4] Guelph [5] Ghibellines

میں ریونا[1] کے سنسان کھنڈروں میں اس نے فرشتہ اجل کو لبیک کہا دانتے کی زندگی ازحد بے سروسامانی کی حالت میں گزری - وہ دربدر اور بے خانماں پھرتا رہا - جن امرا نے بکمال لطف و مہربانی اپنے دسترخوان پر اسے جگہ دی - ان کے نام آج کسی کو یاد بھی نہ ہوتے - لیکن انہیں خدا نے بقائے دوام بخشی محض اس لئے کہ آڑے وقت میں انہوں نے اس مفلس شاعر کی دستگیری کی تھی - اس دشت نوردی کے زمانہ میں دانتے کو اپنی زندگی کا وہ دور یاد آیا - جب وہ دریائے آرنو کے کنارے اس امید پر ٹہلا کرتا تھا - کہ شائد کہیں بی ایٹریس[2] پورتیناری کے روئے انور کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جائے - (یہ حسینہ شاہ پرستوں کے اخراج سے بارہ سال پہلے مرچکی تھی - اور کسی اور شخص کی منکوحہ تھی) اُسے وہ دن یاد آئے - جب وہ اپنے وطن کے سیاسی رہنماؤں میں شمار ہوتا تھا - اور اُسے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی - کہ وہ اپنے اعمال و افعال کو دنیا کے سامنے حق بجانب ثابت کرے +



دانتے

اس کی زندگی کی تمام تمنائیں ایک ایک کرکے مایوسی کا شکار ہو چکی تھیں - اس نے اپنے وطن کی خدمت ازحد وفاداری سے کی تھی - لیکن ایک بددیانت عدالت کے سامنے اس پر خیانت کا الزام عائد کیا گیا تھا - اور اسے حکم دیا گیا تھا - کہ اگر تم نے پھر کبھی فلورنس کی چار دیواری میں قدم رکھا - تو تمہیں زندہ جلا دیا جائیگا - اپنے ضمیر کے سامنے اور اپنے ہمعصروں کی نظر میں اپنی سچائی اور بیگناہی ثابت کرنے کے لئے اس شاعر نے اپنی تصنیف میں ایک خیالی دنیا تخلیق کی - اور ایک ایک

---

[1] Pavenna

[2] Beatrice Portinari

کر کے وہ تمام حالات وضاحت کے ساتھ بیان کئے جن کی وجہ سے اُس کو شکست و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس نے اس حرص اور بغض اور حسد کا نقشہ کھینچا جس نے اس کے رنگین وحسین ومحبوب وطن کو بدکردار اور خود غرض شاہنشاہوں کے خونخوار سپاہیوں کی جولانگاہ بنا ڈالا تھا +

جو داستان دانتے نے اپنی تصنیف میں بیان کی ہے۔ وہ یوں ہے کہ ۱۳۰۰ء کے ایسٹر سے پہلے جمعرات کے دن دانتے ایک گھنے جنگل میں رستہ بھول گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک چیتا اور ایک شیر ببر اور ایک بھیڑیا اسے آگے گزرنے نہیں دیتے۔ جب بالکل مایوس ہو گیا۔ تو درختوں کے بیچ میں ایک سفید صورت دکھائی دی۔ یہ روما کا شاعر اور فلاسفر ورجل[1] تھا۔ جسے دوشیزۂ مقدس نے اور بے ائیرس نے جو بلند آسمان سے اپنے سچے عاشق کی نگہبانی کر رہی تھی۔ اس کارخیر کے لئے بھیجا تھا۔ اس کے بعد ورجل دانتے کو پہلے اعراف اور پھر جہنم کی سیر کراتا ہے۔ دونو ساتھی طبقاتِ جہنم کی گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ حتےٰ کہ سب سے گہرے غار میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں خود معلم الملکوت ابدی برف میں منجمد کھڑا ہے۔ اور اس کے گرد بڑے بڑے سیاہ کار۔ غدار۔ دروغ گو۔ اور وہ لوگ جنہوں نے دغا اور فریب سے اپنی زندگی کو کامیاب بنایا تھا۔ جمع ہیں۔ لیکن اس ہیبت ناک مقام پر پہنچنے سے پہلے رستے ہی میں ان تمام لوگوں سے بھی دانتے کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ جنہوں نے اس کے محبوب وطن کی تاریخ میں کوئی نہ کوئی حصہ لیا تھا۔ شاہنشاہ اور پاپا۔ جری شہسوار اور ممسک سود خوار سب کے سب وہاں نظر آئے۔ جو یا تو ابدی لعنتوں میں گرفتار تھے یا روز نجات کا انتظار کر رہے تھے۔ جب انہیں اعراف سے نکال کر جنت میں جگہ دی جائیگی +

دانتے کی نظم ایک حیرت انگیز تصنیف ہے۔ اور ایک مختصر مجموعہ ہے۔ ان سب باتوں کا جنہیں تیرھویں صدی کے لوگ عمل میں لاتے تھے۔ یا محسوس کرتے تھے۔ یا جن سے خوف کھاتے تھے۔ یا جن کے آرزو مند تھے۔ اور اس کے ہر صفحے پر فلورنس کے

---

[1] Virgil

اس خانماں خراب بے یارو مددگار شاعر کی شخصیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ جس کی مایوسی اور ناکامی سایے کی مانند ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ پھرتی رہی +

خدا کی قدرت دیکھئے۔ کہ جب موت زمانۂ وسطیٰ کے اس اُداس شاعر کی آنکھیں بند کرنے کو تھی۔ تو ایک اور شخصیت عالم ظہور میں آئی۔ جو نشاۃ ثانیہ کے انسانوں کی صف اول میں شمار ہوئی۔ اریتسو[1] کے چھوٹے سے شہر میں ایک وکیل کے گھر فرانچیسکو پترارکا[2] پیدا ہوا +

فرانچیسکو کا باپ اور دانتے سیاسی معاملات میں ہم خیال تھے۔ وہ بھی باقی لوگوں کے ساتھ ہی شہر بدر ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ پترارکا (آج کل اسے پترارک کہتے ہیں) فلورنس سے دور پیدا ہوا۔ پندرہ سال کا تھا۔ تو باپ کا پیشہ سیکھنے کے لئے فرانس کے شہر مونت پیلیر کو بھیجا گیا۔ لیکن قانون سے اسے نفرت تھی۔ اس لئے وکیل بننے کو اس کا دل نہ چاہتا تھا۔ اُسے مطالعے اور شعر کا شوق تھا۔ اور چونکہ شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اس لئے اس کی مراد بر آئی۔ انسان کرنے پر آئے۔ تو کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ بہت سفر کیا۔ اور کبھی فلانڈرز میں کبھی رائن کے کنارے جو خانقاہیں تھیں ان میں۔ کبھی پیرس اور کبھی لیژ میں اور آخر کار روما میں قلمی نسخے نقل کرتا رہا + پھر ووکلوس[3] کے خوفناک پہاڑوں کے درمیان ایک تنہا وادی میں جا کر رہنے لگا۔ وہاں مطالعہ اور تصنیف کا شغل جاری رکھا۔ رفتہ رفتہ اس کے اشعار اور اس کا علم و فضل اتنے مشہور ہوئے۔ کہ ادھر پیرس کی یونیورسٹی اور ادھر شاہ نیپلز نے معلمی پیش کی + جب دعوت قبول کر کے گھر سے چلا۔ تو روما میں سے گزرنا پڑا۔ وہاں کے لوگ بھی اس کی شہرت سے ناواقف نہ تھے۔ انہیں معلوم تھا۔ کہ یہی وہ شخص ہے جس نے بھولے بسرے قدیم رومن مصنفوں کو ازسر نو تالیف کیا ہے۔ چنانچہ وہ بڑی عزت سے پیش آئے۔ اور اس شاہی شہر کے قدیم فورم میں ملک الشعرا کا تاج (جو لورل کے پتوں سے گوندھا جاتا ہے) اسے پہنایا +

اس کے بعد زندگی بڑے مزے میں گزری۔ جہاں جاتا عزت و توقیر قدم چومتی۔

---

[1] Arezzo [2] Francesco Petrarca [3] Vaucluse

اس کی تصنیفات میں وہ تمام باتیں پائی جاتی تھیں جن کے سننے کا لوگوں کو سب سے زیادہ شوق تھا۔ لوگ دینیات کی بحثوں سے اُکتا گئے تھے۔ چنانچہ دانتے بچارا جہنم کے غاروں میں مارا مارا پھرا اور کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ لیکن پٹرارک کے کلام میں عشق اور فطرت اور آفتاب کا تذکرہ رہتا تھا۔ اس کے کلام میں وہ رونا دھونا نہ پایا جاتا تھا۔ جو پچھلی نسل کے مصنفین کی عادت ہی بن گیا تھا۔ جب پٹرارک کسی شہر میں پہنچتا۔ تو لوگوں کے ہجوم اس کی آؤ بھگت کے لئے جمع ہو جاتے۔ گویا کوئی سپہ سالار ہے۔ جو میدان میں فتح پا کر وطن کو لوٹا ہے۔ حسن اتفاق سے اس کا نوجوان دوست بوکےچیو[1] بھی اس کے ہمراہ ہوتا۔ تو لوگ اور بھی خوش ہوتے۔ وہ تو اپنے زمانے کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ جذبۂ شوق سے بیقرار۔ ہر چیز کا مطالعہ کرنے کو تیار ہر وقت پرانے گرد آلود کتب خانوں کی کرید میں مشغول۔ کہ شاید ورجل یا اووِڈ[2] یا لوکریشس[3] یا کسی اور پرانے لاطینی شاعر کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔ وہ تو سچے عیسائی تھے۔ اور یہی دو کیا ہر ایک سچا عیسائی تھا۔ لیکن سچے عیسائی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں۔ کہ انسان منہ بسورتا پھرے یا میلے کچیلے کپڑے پہنے رہے محض اس لئے کہ ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ زندگی خوب شے ہے۔ مقتضائے فطرت یہی ہے کہ انسان خوش رہے۔ اس کا تمہیں ثبوت چاہئے؟ بہت اچھا۔ ایک بیلچہ لو اور زمین کو کھودو۔ کیا ملا؟ پرانے زمانے کے خوبصورت مجسمے۔ دلکش وضع کے مرتبان۔ قدیم عمارتوں کے کھنڈر۔ یہ سب ان لوگوں کے کارنامے ہیں جن کی سلطنت کا جواب آج تک پیدا نہیں ہوا۔ ایک ہزار سال تک انہوں نے سب دنیا پر حکومت کی۔ وہ طاقتور تھے۔ متمول تھے۔ خوش شکل تھے۔ (ذرا شاہنشاہ آگسٹس کے اس مجسمے کو تو دیکھو) اس میں شک نہیں کہ وہ مسیحیت کے نور سے محروم تھے۔ اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکینگے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا۔ کہ انہیں اعراف میں جگہ مل جائے۔ جہاں حال ہی میں دانتے ان سے ملاقات کر آیا تھا۔

---

[1] Boccaccio [2] Ovid [3] Lucretius

لیکن جنت نہ سہی تو نہ سہی۔ جب قدیم روما اپنے جوبن پر تھا۔ تو یہ لوگ زندہ تھے۔ ایک فانی انسان کے لئے یہی جنت کافی ہے۔ اور بہرحال دنیا میں دوبارہ کون واپس آتا ہے؟ جب تک زندہ ہو خوش رہو۔ اور عیش کرو۔ کیونکہ زندگی خوب شئے ہے +

مختصر الفاظ میں یہ وہ جذبہ تھا۔ جو اطالیہ کے کئی چھوٹے چھوٹے شہروں کے ٹیڑھے بینکے بازاروں اور گلیوں میں سما رہا تھا +

یہ تو تم جانتے ہو۔ کہ "بائیسکل کا خبط" یا "موٹر کار کا خبط" ایسے فقروں سے ہماری کیا مراد ہوتی ہے۔ ایک شخص بائیسکل ایجاد کرتا ہے۔ وہ لوگ جو ہزارہا سال سے تکلیف اور دقّت کے ساتھ اور نہایت سست رفتار سے ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت کرنے کے عادی تھے۔ انہیں یکلخت ہی پہیوں پر لڑھکتے پھرنے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ پھر کوئی ہشیار مستری ایک موٹر کار ایجاد کرتا ہے۔ اب اس بات کی ضرورت نہیں رہتی۔ کہ لگاتار پاؤں گھماتے رہیئے۔ آپ اطمینان سے بیٹھئے۔ پٹرول کے چند قطرے آپ کا سب کام کر دینگے۔ اب جس کو دیکھئے موٹر کار کا دیوانہ ہے۔ ہر جگہ اور ہر مجمع میں رولس رائس اور فورڈ اور انجن اور پٹرول کی گفتگو ہو رہی ہے + لوگ پٹرول کے نئے نئے ذخیرے دریافت کرنے کے لئے دنیا کا گوشہ گوشہ چھان مارتے ہیں۔ سماٹرا اور کانگو میں جنگلوں کے جنگل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تاکہ ربڑ کی بہم رسانی میں دقّت پیدا نہ ہو۔ ربڑ اور تیل اس قدر عزیز ہو جاتے ہیں۔ کہ قومیں آپس میں جنگ پر تُل جاتی ہیں۔ دنیا بھر کے دماغ میں موٹر کار کا خبط سما جاتا ہے۔ اور ننھے ننھے بچے "اماں اور ابا" بعد میں کہتے ہیں۔ موٹر کا لفظ پہلے سیکھتے ہیں +

چودھویں صدی میں اطالوی قوم روما کی مدفون دنیا کے آثار وصنادید اور ان کے حسن اور دلفریبی پر فدا تھی۔ رفتہ رفتہ یہ شوق مغربی یورپ کی سب قوموں میں سرایت کر گیا۔ جہاں کہیں کوئی پرانا گمشدہ قلمی نسخہ دریافت ہو جاتا۔ شہر بھر اس کی خوشی میں چھٹی مناتا۔ کوئی شخص صرف ونحو کی ایک کتاب لکھتا۔ تو اس کا وہ شہرہ ہوتا۔ جو آج کل کسی نئی مشین کے موجد کا ہوتا ہے۔ "ماہر انسانیات" یعنی وہ عالم جو اپنا وقت اور اپنا دماغ بجائے دینیات کی بیہودہ بحث وتحقیق کے بنی نوع انسان

کے مطالعے میں صرف کرتا تھا۔ اس کی اتنی عزت و توقیر ہوتی تھی۔ کہ اس کے مقابلے میں وہ بہادر سپہ سالار جو وحشیوں کے کئی جزیرے فتح کرتا تا۔ ہیچ سمجھا جاتا تھا۔

اس تمام علمی جد و جہد کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے قدیم فلاسفوں اور مصنفوں کے مطالعے کو بہت تقویت پہنچی۔ ترک پھر یورپ پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ قسطنطنیہ جو قدیم سلطنت روما کے باقیات کا دارالحکومت تھا۔ نرغے میں آگیا تھا۔ ۱۳۹۳ء میں شاہنشاہ بیتوئل پیلیوگس[لہ] نے امانوئیل کرائسو لوراس[لٰے] کو مغربی یورپ کے اضلاع میں بھیجا۔ تاکہ وہ قدیم بازنطیم کی حالت زار بیان کرے اور کمک لے کر آئے۔ لیکن کسی نے دستگیری نہ کی۔ رومن کیتھولک عقیدے کے لوگ یونانی کیتھولک فرقے کے پیروؤں کو بیدین اور بدکردار سمجھتے تھے۔ اور خوش تھے کہ انہیں اپنی گناہوں کی سزا ملنے کو ہے۔ لیکن گو بازنطینیوں سے بیزار تھے۔ تاہم ان قدیم یونانیوں سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ جن کے آبا و کارواں نے جنگ ٹرائے کے پانسو سال بعد باسفورس کے کنارے قسطنطنیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اور ارسطو اور ہومر اور افلاطون کی تصانیف سے براہ راست بہرہ اندوز ہونے کے لئے یونانی زبان سیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے پاس نہ کتابیں تھیں۔ نہ قواعد زبان سے واقف تھے۔ نہ استاد دستیاب ہو سکتے تھے۔ چنانچہ جب فلورنس کے حکام نے کرائسولوراس کی آمد کی خبر سنی۔ تو چونکہ اہل فلورنس کو یونانی سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے اسے پیغام بھیجا۔ کہ کیا آپ ہمیں یہاں آکر یونانی سکھا سکتے ہیں؟ کرائسولوراس نے منظور کرلیا۔ گویا یونانی کا پہلا پروفیسر بنا۔ ہزارہا شائقین علم نوجوان بھیک مانگ فلورنس پہنچے۔ اور وہاں طویلوں اور تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں رہے۔ محض اس لئے کہ یونانی کی ابجد سیکھیں۔ اور گردانیں یاد کریں۔ اور سوفوکلیز اور ہومر کی صحبت سے مستفید ہو سکیں۔

یونیورسٹیوں میں قدیم اہل مکتب جو اپنی دقیانوسی دینیات اور فرسودہ منطق

لہ Manuel Paleologus — لٰے Emmanuel Chrysoloras

پڑھا رہے تھے۔ عہد عتیق کے پوشیدہ معانی و مطالب کی تصریح کر رہے تھے۔ اور ارسطو کے اس نسخے کو حرز جاں بنائے بیٹھے تھے۔ جو یونانی سے عربی۔ عربی سے ہسپانوی۔ ہسپانوی سے لاطینی میں ترجمہ ہؤا۔ اس نئی علمی تحریک کو دیکھکر پہلے تو بہت پریشان اور پھر از حد ناراض ہوئے۔ ان کے زعم میں جسارت اور بیحیائی اب برداشت سے بڑھ چلی تھی۔ نوجوانوں نے یونیورسٹیوں میں آنا بند کر دیا تھا۔ اس کی بجائے وہ کسی حواس باختہ "ماہر انسانیات" کا لکچر سننے چلے جاتے۔ جس نے "تہذیب کے نئے جنم" کی رٹ لگا رکھی تھی +

چنانچہ اہل مکتب حکام وقت کے پاس گئے اور اپنا دکھ روئے لیکن حکام کو ان کی شکایات سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اب اہل مکتب کا وہ زور نہ رہا تھا۔ صرف کہیں کہیں ان کی شنوائی ہوئی۔ مگر وہ بھی اس لئے کہ یہ اُن مذہبی مجنونوں سے جا ملے۔ جو نہ خود دنیا کا لطف اٹھا سکتے تھے۔ نہ دوسروں کو اٹھاتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اس عظیم الشان نئی زندگی کے مرکز یعنی فلورنس کے اندر قدامت پسند اور نئے خیال کے لوگوں کے مابین زوروں کا مقابلہ ہؤا۔ زمانۂ وسطیٰ کے عقائد و خیالات کا سب سے بڑا حامی ساونارولا[1] نامی ایک ترش رُو اور حسن کا مخالف راہب تھا۔ اس نے بڑا زور دکھایا۔ مقدس مریم آنشیں کی خانقاہ کے کشادہ ایوانوں میں کھڑے ہو کر وہ روزانہ کڑکتی اور گرجتی آوازمیں عذاب الٰہی کی بشارت سنایا کرتا اور کہا کرتا "توبہ کرو۔ اپنی بیدینی سے توبہ کرو۔ اور اُس ناپاک مسرت سے توبہ کرو۔ جو تمہیں پلید چیزوں سے حاصل ہوتی ہے"۔ اُسے طرح طرح کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اور آسمان پر دہکتی ہوئی تلواریں بجلی کی طرح کوندتی دکھائی دیں۔ چھوٹے بچوں کو وعظ سنایا۔ تاکہ وہ بھی کہیں ان غلطیوں کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ جن کے بدلے میں ان کے والدین جہنم مول لے چکے تھے۔ پھر پیغمبری کا دعوےٰ کیا۔ اور خدائے اعظم کی خدمت کرنے کے لئے لڑکے بوائے سکاؤٹوں کے دستے مرتب کئے۔ لوگ اس قدر خوفزدہ ہوئے۔ کہ ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ اور حسن و مسرت کے شوق کو گناہ عظیم سمجھنے

---

[1] Savonarola

لگے اور کفارہ ادا کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ جن کتابوں اور مجسموں اور تصویروں کو بڑے اہتمام سے جمع کیا تھا۔ ان کا شہر کے بڑے چوک میں انبار لگا دیا۔ جس کو ساونارولا نے اپنے ہاتھ سے مشعل دکھائی۔ لوگوں نے اس تقریب پر ہولی منائی۔ مقدس گیت گائے اور ازحد فحش ناچ ناچے۔

لیکن جب راکھ ٹھنڈی ہو گئی۔ تو لوگ اپنے کئے پر پچھتائے۔ اب انہیں ہوش آیا۔ کہ ہم نے اس مذہبی دیوانے کے کہنے میں آ کر اپنی محبوب ترین چیزوں کو غارت کر دیا ہے۔ یا تو ساونارولا کے اشارے پر چل رہے تھے۔ یا اب اس کے اس قدر مخالف ہو گئے۔ کہ اسے قید خانے میں ڈال دیا۔ اور طرح طرح کے عذاب پہنچائے۔ لیکن وہ تائب نہ ہوا۔ اپنی دھن کا پکا اور نیت کا نیک تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو پاک اور مقدس بنانے کی کوشش کی تھی۔ اور جو اس کے ہمخیال نہ تھے۔ انہیں بلا حیل وحجت مٹا دیا تھا۔ وہ اپنا فرض یہی سمجھتا تھا۔ کہ گناہ وسیہ کاری کی بیخکنی کرے۔ تصانیف کفار اور حسن کا فر کی محبت کلیسا کے ایک سچے فرزند کی آنکھوں میں بہت بڑا گناہ تھا۔ لیکن اب اس کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ وہ ایسے عقائد کی خاطر لڑ رہا تھا جو فرسودہ ہو چکے تھے۔ پاپائے روما نے بھی اس کے بچانے کے لئے انگلی تک نہ ہلائی۔ بلکہ اس کے برعکس جب اہل فلورنس ساونارولا کو گھسیٹ کر تختۂ دار پر لے گئے۔ اور اسے پھانسی پر لٹکا دیا۔ اور پھر اس کی لاش کو برسر عام جلایا۔ اور ہجوم نے خوشی کے مارے چیخیں ماریں اور نعرے لگائے۔ تو پاپا نے اہل فلورنس کو "وفادار" کے لقب سے یاد کیا۔ اور ان کے کئے کو بہت سراہا۔

اس کا انجام بہت حسرتناک لیکن اٹل تھا۔ ساونارولا اگر گیارھویں صدی میں ہوتا۔ تو بہت بڑا تسلیم کیا جاتا۔ لیکن پندرھویں صدی میں اس کا ناکام رہنا لابدی تھا۔ جب پاپائے روما بھی "انسانیات" کی طرف راغب ہو جائے۔ اور اس کا محل رومن اور یونانی صنادید کا سب سے بڑا عجائب خانہ بن جائے۔ تو سمجھ لیجئے کہ زمانہ وسطیٰ ختم ہو گیا۔ کسی نے اس کو نیک فال سمجھا کسی کو یہ بُرا معلوم ہوا۔ لیکن اس بات میں شک کی گنجائش نہیں۔ کہ پرانے خیالات کو واپس لانا اب ناممکن ہو گیا تھا۔

اظہار کا زمانہ

لوگوں کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کہ زندگی میں جو لطف و مسرت حاصل ہونے لگا تھا۔ اس کا اظہار کریں۔ اُنہوں نے اس مسرت کو سنگتراشی اور شعر اور تعمیرات اور مصوّری اور مطبوعات کے ذریعے ادا کیا

سنہ ۱۴۷۱ء ایک ایسے ضعیف العمر پارسا شخص کا سال وفات ہے جس نے بانوے سال کی عمر میں سے بہتر سال کوہ سینٹ[1] اگنیز کی خانقاہ کی چار دیواری کے اندر گزارے جو دریائے ایسل[2] کے کنارے زول[3] کے پرانے ڈچ[4] ہنسیاٹک شہر کے قریب واقع تھی۔ یہ شخص برادر طامس کے نام سے مشہور تھا۔ اور چونکہ کیمپن[5] کے گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے لوگ اسے طامسِ کیمپس[6] کہتے تھے۔ بارہ سال کی عمر میں ڈیونٹر[7] بھیجا گیا۔ جہاں گیرہارڈ گروٹ نے جو پیرس۔ کولون اور پراگ کی یونیورسٹیوں کا فارغ التحصیل اور ایک مشہور خانہ بدوش واعظ تھا۔ برادران منکسر کے نام سے نیک بندوں کی ایک انجمن قائم کر رکھی تھی۔ یہ لوگ پادری نہیں بلکہ عام دنیا دار لوگ تھے۔ کوئی معمار تھا کوئی ترکھان۔ روزی کمانے کا شغل جاری تھا۔ لیکن اپنی بود و باش میں یسوع کے اولین حواریوں کی سنت پر چلتے تھے۔ اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک نہایت اعلےٰ مکتب

---

[1] Mt. St. Agnes — [2] Ysel — [3] Zwolie

[4] Dutch Hanseatic — [5] Kempen — [6] Thomas a Kempis

[7] Deventer — [8] Gerhard Groot

کھول رکھا تھا۔ جہاں غریب گھرانوں کے ذہین بچوں کو آبائے کلیسا کی دانش و حکمت سکھاتے تھے۔ اسی مکتب میں طامس نے بھی لاطینی کی گردانیں اور نسخوں کا نقل کرنا سیکھا۔ تعلیم سے فارغ ہؤا۔ تو رہبانیت کا عہد کیا۔ کتابیں پیٹھ پر باندھیں اور زوول کا رُخ کیا۔ دنیا کی شورش سے تنفر تھا۔ اس لئے جب خانقاہ میں داخل ہؤا۔ اور دروازے بند کر لئے تو اطمینان کا سانس لیا +

طامس کا زمانہ شور و فساد اور وبا کا زمانہ تھا + وسطی یورپ کے ملک بوہیمیا میں جوہانس ہُس[1] کے فرمانبردار عقیدتمندوں نے ایک ہولناک جنگ بپا کر رکھی تھی۔ اور اپنے رہبر ہُس کی موت کا انتقام لے رہے تھے۔ جو جان وائیکلف[2] نامی ایک انگریز مذہبی مصلح کا دوست اور پیرو تھا۔ کانسٹنس[3] کی کونسل نے ہُس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم سوئٹزرلینڈ آ کر پاپا، شہنشاہ تیئیس مشیرانِ پاپا، تینتیس اسقفوں، ڈیڑھ سو خانقاہ داروں اور ایک سو سے زیادہ شہزادگان اور امرا کے سامنے جو اصلاحِ کلیسا کی غرض سے جمع ہوئے تھے۔ اپنے عقائد کی تصریح کرو۔ تو ہم تمہیں صحیح و سلامت واپس پہنچانے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اسی کونسل نے بد عہدی کر کے ہُس موت کا حکم سنایا اور اُسے زندہ جلا دیا گیا تھا +



جان ہُس

مغرب میں فرانس ایک سو سال سے انگریزوں کو اپنے مقبوضات سے نکالنے کے لئے لڑ رہا تھا۔ اور حال ہی میں جون آف آرک[4] کی طفیل شکست کھاتے کھاتے بچا تھا۔ اس جنگ کا خاتمہ ہؤا۔ تو مغربی یورپ پر کُلّی اقتدار حاصل کرنے کے لئے فرانس اور برگنڈی[5] ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ اور پھر قتل و خون کا بازار گرم ہؤا +

---

[1] Johannes Huss [2] John Wycliffe [3] Constance

[4] Joan of Arc [5] Burgundy

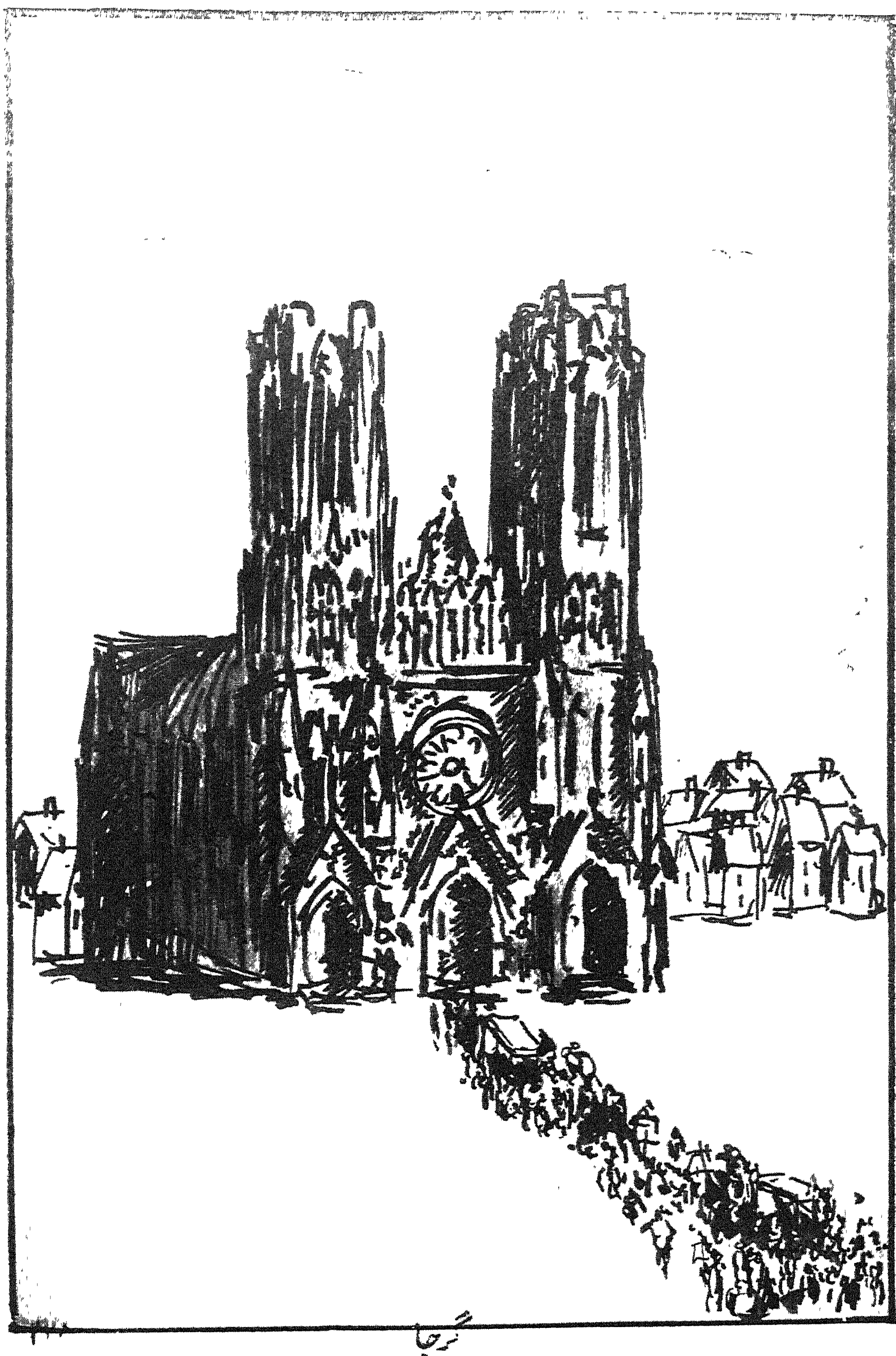
جنوب میں دو پاپا تھے - ایک روما میں - دوسرا جنوبی فرانس کے شہر اوینیان[1] میں - اور دونوں ایک دوسرے پر دھڑا دھڑ لعنتیں بھیج رہے تھے - مشرق بعید میں ترک مملکت روما کے بچے کھچے مقبوضات کو تباہ و برباد کر رہے تھے - اور اہل روس نے اپنے تاتاری آقاؤں کا قلع قمع کرنے کے لئے آخری بار ایک صلیبی جنگ لڑنے کا تہیہ کر لیا تھا ٭

لیکن برادر طامس اپنے گوشۂ خلوت میں ان قصوں سے بالکل بیخبر تھا - وہ اپنے مسودوں اور اپنے خیالات میں مگن تھا - اس خدا کے عاشق نے اپنے جذبات کو ایک کتاب کی صورت میں ڈھالا جس کا نام اس نے تقلید یسوع رکھا - اس کتاب کا ترجمہ اتنی زبانوں میں ہو چکا ہے - کہ سوائے انجیل کے اور کسی تصنیف کو نصیب نہیں ہؤا - اور جہاں جہاں کتاب مقدس پڑھی جاتی ہے - وہاں اس کی تلاوت بھی ہوتی ہے - کروڑوں لوگوں کی زندگی اس کتاب سے متاثر ہو چکی ہے - جس کے مصنف کا نصب العین ان سادہ الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے - کہ میری آرزو بس اتنی ہے - کہ میری رفیق کوئی چھوٹی سی کتاب ہو - اور میں اپنی عمر کے دن چپ چاپ گوشہ تنہائی میں گزار دوں "٭

اس نیک بندے کی زندگی زمانہ وسطیٰ کے ارفع ترین خیالات کی آئینہ بردار ہے - ان کے چاروں طرف نشاۃ ثانیہ کی ظفریاب قوتیں صف آرا تھیں - اور ماہرین انسانیات ایک جدید تہذیب کے طلوع کے شادیانے بجا رہے تھے - لیکن زمانہ وسطیٰ کے عقائد نے ایک بار پھر اپنی زائل شدہ قوت کو حاصل کرنے کی کوشش کی - خانقاہوں کی اصلاح ہوئی - راہبوں نے عیش و عشرت اور سیہ کاری کی زندگی ترک کر دی - نیک نیت اور پاکباز بندوں نے بے لوث اور بے عیب زندگی کی مثال قائم کر کے لوگوں کو بھی نیکی اور تسلیم کے رستے پر لانے کی کوشش کی - لیکن نئی تہذیب ان لوگوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھی - خلوت اور زہد کا زمانہ گزر گیا تھا - " اظہار " کا دور شروع ہو گیا تھا ٭

---

[1] Avignon



گرجا

مجھے افسوس ہے کہ اپنا مطلب بیان کرنے کے لئے مجھے ایسے بڑے بڑے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ کاش کہ میں یہ ساری داستان چھوٹے چھوٹے سہل الفاظ میں بیان کرسکتا۔ لیکن یہ میری طاقت سے باہر ہے۔ اقلیدس کی کتاب لکھنی ہو تو بڑے بڑے الفاظ سے مانوس ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح تاریخ میں اور تاریخ ہی پہ کیا موقوف ہے۔ سب زندگی کے مطالعے کا یہی حال ہے۔ تمہیں عربی اور فارسی اور لاطینی اور یونانی کے کئی عجیب و غریب الفاظ سیکھنے پڑینگے۔ جس قدر جلد تم ان سے واقف ہو جاؤ۔ اتنا ہی بہتر ہے +

جب میں یہ کہتا ہوں۔ کہ نشاۃ ثانیہ کا دور اظہار کا دور تھا۔ تو میرا مطلب یہ ہے۔ کہ لوگوں اب صرف اس بات پر قانع نہ رہے تھے۔ کہ وہ چپکے بیٹھے سنتے رہیں۔ اور شاہنشاہ یا پاپا انہیں حکم دیتا رہے کہ تم یوں کرو یا یوں سوچو۔ لوگ خود بھی کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ اپنے اپنے خیالات کو خود کوئی شکل دیں۔ ان کا کسی نہ کسی طرح "اظہار" کریں۔ اگر کوئی شخص سیاست میں دلچسپی رکھتا۔ مثلاً جیسے (فلورنس کا مورخ نکولو میکیاولی[1] تھا)۔ تو وہ اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتا۔ کہ کتابیں لکھتا۔ جن میں وہ لوگوں کو بتاتا۔ کہ ایک کامیاب سلطنت میرے خیال میں اس طرح کی ہونی چاہیئے۔ اور ایک کامیاب حاکم کا تصور میرے ذہن میں یوں ہے۔ اگر اُسے مصوری کا شوق ہوتا۔ تو دلکش خطوں اور خوشنما رنگوں سے جو لطف اُسے حاصل ہوتا تھا۔ اس کا اظہار وہ تصویروں کے ذریعے کرتا۔ مثلاً جیسے جیوتو اور فرا انجیلیکو[2] اور ریفیل[3] اور ہزارہا لوگوں نے کیا۔ جن کے نام آج ان لوگوں کو ازبر ہیں۔ جو دلکش اور حسین چیزوں کی قدر کرنا جانتے ہیں +

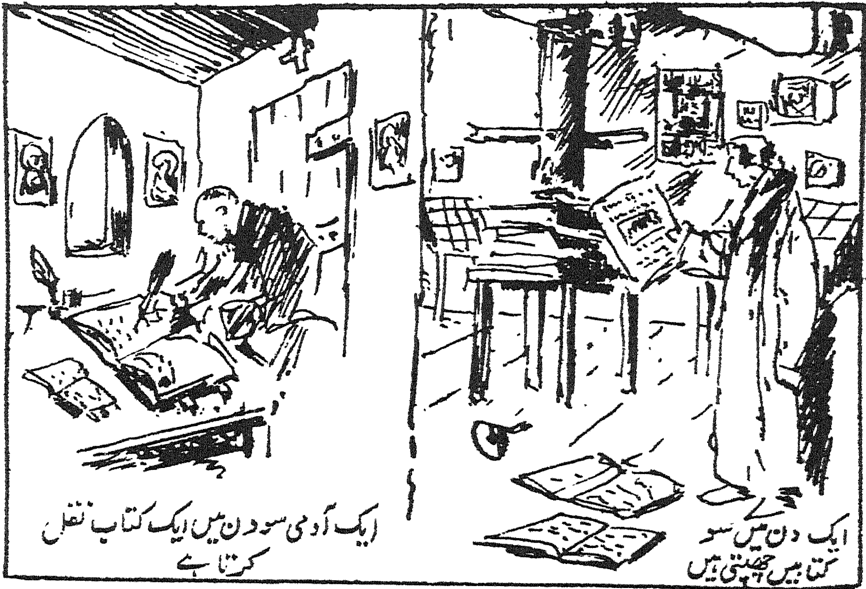
اگر خطوں اور رنگوں کے شوق کے ساتھ ہی علم جر ثقیل اور قوت آبی میں بھی دلچسپی ہوتی۔ تو اس کا نتیجہ لیونارڈو ڈا ونچی[4] جیسے شخص کی شکل میں ظاہر ہوتا۔ جس نے تصویریں بھی بنائیں۔ غباروں اور ہوائی جہازوں سے تجربے بھی کئے۔

---

[1] Niccolo Macchiavelli [2] Fra Angelico

[3] Rafael [4] Leonardo da Vinci

لومبارڈی کی دلدلوں کو بھی انجن کے ذریعے ان کا پانی کھینچ کر خشک کیا۔ اور کائنات کی تمام اشیا کے مشاہدے سے جو لطف اسے حاصل ہوتا تھا۔ اس کا اظہار نثر میں مصوری اور سنگتراشی کے ذریعے اور عجیب و غریب کلوں کی شکل میں کیا۔ جب کوئی قوی ہیکل شخص مثلاً مائیکل انجیلو[1] یہ محسوس کرتا۔ کہ مُوقلم میرے مضبوط ہاتھوں کے لئے موزوں نہیں۔ تو وہ سنگتراشی اور تعمیر کا کام شروع کر دیتا۔ اور سنگ مرمر کے بڑے بڑے پتھروں کو ہتھوڑوں سے توڑ توڑ کر اور آہنی اوزاروں سے تراش تراش کر ہیبت ناک مجسمے بناتا یا سینٹ پطرس کے گرجا کی عمارت کے نقشے کھینچتا۔ جو فتحمند کلیسا کے جلال و جبروت کے "اظہار" کا سب سے باوقار ذریعہ ہے۔



قلمی نسخے اور چھپی ہوئی کتابیں

تمام اطالیہ (اور تھوڑے ہی عرصے میں تمام یورپ) ایسے مردوں اور ایسی عورتوں سے بھر گیا۔ جن کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا۔ کہ وہ علم اور حُسن اور دانش کے خزانوں میں اپنی اپنی مقدور کے مطابق کچھ نہ کچھ اضافہ کر جائیں۔ جرمنی کے شہر منیز[2] کے اندر

---

[1] Michael Angelo.　[2] Mainz

جوہان گوٹنبرگ[1] نے حال ہی میں کتابوں کو نقل کرنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ پرانے چوبی چھاپوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے ایک ایسی ترکیب نکالی تھی۔ جس کے ذریعے پیسے کے حروف کو جوڑنے سے الفاظ کے نسخے کے صفحے جوڑے جا سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اسی چھاپے کی ایجاد کی وجہ سے وہ ایک ایسے مقدمے میں پھنس گیا جس میں اس کا سب روپیہ غارت ہوگیا۔ اور جب وہ مرا تو کوڑی کوڑی کو محتاج تھا۔ لیکن اس کی مخترع طبیعت نے اپنے "اظہار" کے لئے جو رستہ ڈھونڈا۔ اس کی وجہ سے اب تک اس کا نام زندہ و روشن ہے +

بہت عرصہ گزرنے نہ پایا۔ کہ وینس میں آلڈس[2] نے پیرس میں اینٹیان[3] نے اینٹورپ میں پلانٹن[4] نے اور باسل میں فروبن نے اساتذہ کی تصنیفات کو چھاپ چھاپ کر دنیا بھر میں ان کی نشر و اشاعت کی۔ کہیں گوٹنبرگ کی انجیل کی تقلید میں گوتھک حروف استعمال کئے۔ کہیں اطالوی کہیں یونانی رسم الخط اور کہیں عبرانی ابجد کو کام میں لائے +

چنانچہ جن لوگوں کے پاس کہنے کو کچھ تھا۔ ان کی آواز پر سب دنیا کان لگائے بیٹھی تھی۔ وہ زمانہ گزر گیا۔ جب علم و فضل معدودے چند ہی کی ملکیت تھا۔ پھر جب الزویئر ہارلم[5] نے سستی سستی ایڈیشنیں چھاپنی شروع کیں۔ تو جہالت کے آخری آثار بھی مٹ گئے۔ پھر تو ارسطو اور افلاطوں۔ ورجل اور ہوریس اور پلائنی اور زمانہ قدیم کے تمام مصنف اور فلاسفر اور سائنس دان ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ اور چند پیسوں کے عوض ہر انسان کے وفادار رفیق بننے کو تیار تھے۔ انسانیات کا یہ اثر ہؤا۔ کہ چھاپے کی ایجاد نے سب انسانوں کو آزاد اور ہم رتبہ بنا دیا +

---

[1] Johann Gutenberg [2] Aldus [3] Etienne

[4] Plantn [5] Elzevier of Haarlem

عظیم الشان دریافتیں

جب لوگوں نے زمانۂ وسطیٰ کے طرزِ زندگی کی تنگ حدود کو توڑ دیا۔ تو انہیں اپنی جولانیوں کے لئے زیادہ وسعت کی ضرورت ہوئی۔ کیونکہ یورپ کی سرزمین ان کے حوصلوں کے مقابلے میں بہت تنگ تھی۔ چنانچہ وہ زمانہ آیا۔ جبکہ نئے نئے ممالک دریافت ہوئے

صلیبی جنگوں کی وجہ سے لوگوں کو سفر کا چسکا تو پڑ گیا۔ اور اس سے ان کے خیالات میں وسعت بھی پیدا ہوئی۔ لیکن لوگ بیشتر محض اسی رستے پر آتے جاتے رہے جو وینس اور جافے[1] کے درمیان واقع تھا۔ تیرھویں صدی میں خاندان پولو[2] کے دو بھائیوں نے جو وینس کے سوداگر تھے۔ صحرائے منگولیا کی خاک چھانی تھی۔ اور اونچے اونچے پہاڑوں کو عبور کر کے بالآخر والئی خطا یعنی شاہنشاہِ چین کے دربار میں پہنچ گئے تھے۔ ان دو بھائیوں میں سے ایک کا لڑکا مارکو تھا جس نے اپنے باپ اور چچا کی بیست سالہ صحرا نوردیوں کا حال ایک کتاب کی شکل میں لکھا۔ لوگوں نے جب جزیرۂ زیپانگو[3] (اطالوی زبان میں جاپان کو مارکو نے یونہی لکھا تھا) کے طلائی میناروں کے عجیب و غریب قصے پڑھے۔ تو حیران ہوئے۔ کئی لوگ امیر بننے کے لالچ سے مشرق کا سفر اختیار کرنے کو بیقرار تھے لیکن رستہ دور کا تھا۔ اس لئے کسی کی ہمت نہ پڑی +

سمندر کا رستہ تو ہر وقت کھلا تھا۔ لیکن زمانہ وسطیٰ میں سمندری سفر لوگوں کو چنداں مرغوب نہ تھا۔ اس کی کئی معقول وجوہ تھیں۔ اول تو جہاز بہت چھوٹے

---

[1] Jaffe [2] Polo [3] Zipangu

چھوٹے تھے۔ مثلاً جس جہاز پر میگیلن[1] نے دنیا کا چکر لگایا جس میں اسے کئی سال لگ گئے۔ اس کا حجم آج کل کی دریائی کشتی سے زیادہ نہ تھا۔ ایسے جہازوں پر بیس سے لے کر پچاس تک آدمی سوار ہو سکتے تھے۔ رہائشی کمرے تنگ و تاریک تھے۔ اور ان کی چھتیں اتنی نیچی کہ سیدھے کھڑے ہونا محال تھا۔ کھانے پکانے کا انتظام بہت بُرا تھا۔ موسم ذرا بھی خراب ہوتا۔ تو آگ نہ جل سکتی۔ چنانچہ ملاحوں کو خاطر خواہ کھانا بھی نصیب نہ ہوتا۔



مارکو پولو

اُس زمانے کے لوگ مچھلی سکھانا جانتے تھے۔ لیکن جس طرح آج کل خوراک کے بند ڈبے مل جاتے ہیں۔ اُس زمانے میں نہ ملتے تھے۔ جب خشکی سے دور نکل جاتے۔ تو تازہ ترکاری کے لئے ترستے رہتے۔ پانی چھوٹے چھوٹے پیپوں میں بند کر کے لے جاتے۔ جو بہت جلد باسی ہو جاتا۔ اور اس میں سے سڑی ہوئی لکڑی کی بو آنے لگتی۔ اور کیڑے پڑ جاتے۔ جراثیم کا علم اس زمانے میں نہ تھا۔ اتیرھویں صدی کے راہب راجر بیکن کو ان کے

---

[1] Magellan

وجود کا خیال تو آیا تھا۔ لیکن اس نے یہ راز کسی کو نہ بتایا) لوگ یہی گندہ پانی پی لیتے اور بعض اوقات جہاز کا تمام عملہ تپ محرقہ سے مر جاتا۔ ان اولین جہاز رانوں میں اموات کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ جب ۱۵۱۹ء میں میلگن سفر پر سیوٹل[1] سے روانہ ہوا۔ تو دوسو ملاح اپنے ساتھ لے گیا۔ دنیا کا چکر کاٹ کر واپس آیا۔ تو صرف اٹھارہ آدمی باقی رہ گئے تھے۔ سترھویں صدی میں بھی جب کہ مغربی یورپ اور جزائر ہند کے درمیان تجارتی آمد و رفت بہت بڑھ چکی تھی۔ امسٹروم سے باٹیویا[2] تک آنے جانے میں چالیس فیصدی ملاحوں کا مر جانا معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ ان میں کے بیشتر لوگ خارش کے مرض کا شکار ہو جاتے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے۔ جو تازہ ترکاری نہ ملنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مسوڑے خراب ہو جاتے ہیں۔ خون میں زہر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور مریض نقاہت کی وجہ سے مر جاتا ہے۔

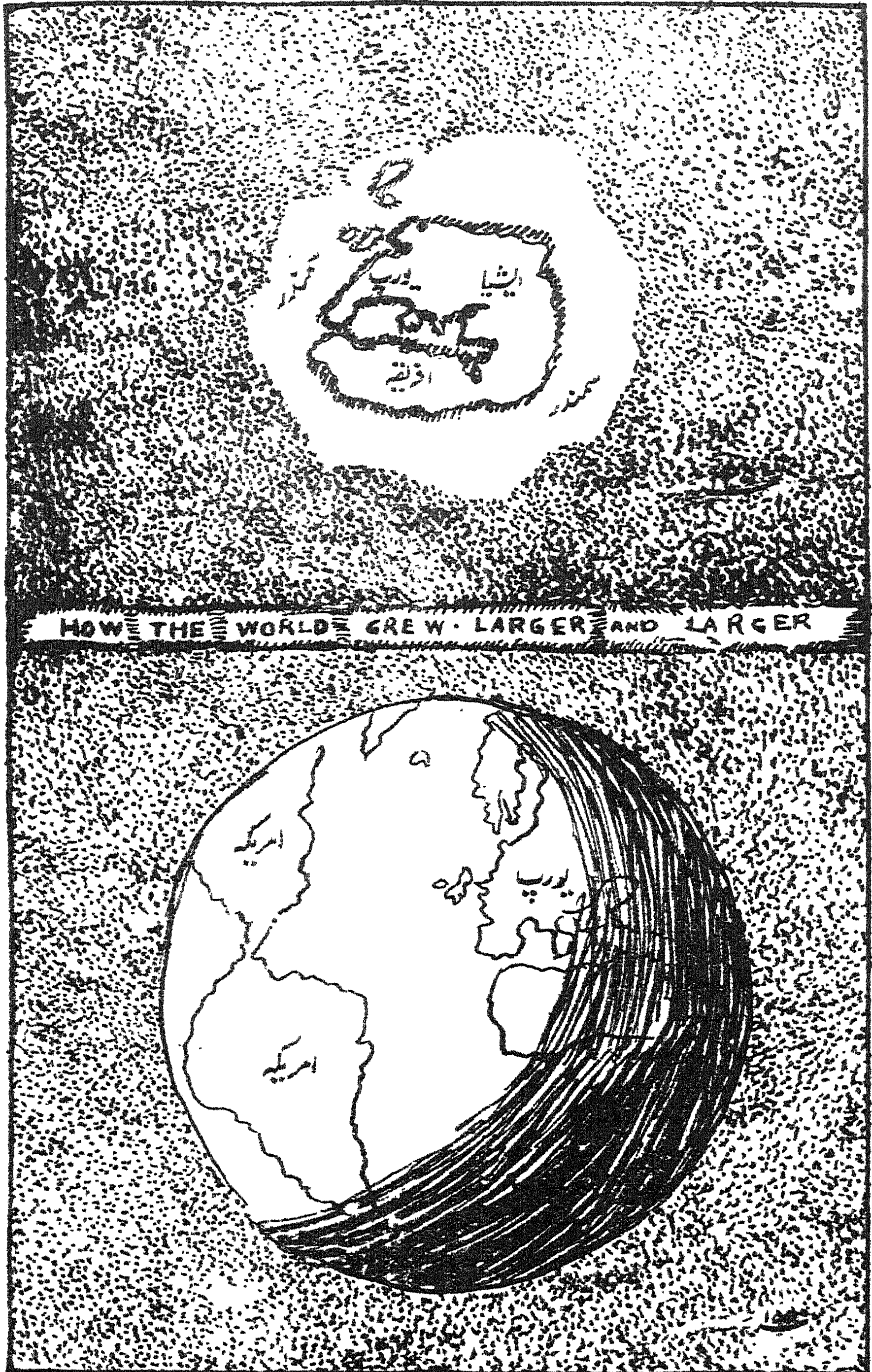
ان حالات کے ہوتے ہوئے آسودہ حال لوگ سمندر کے سفر پر مشکل سے آمادہ ہوتے۔ میگلن اور کولمبس اور واسکوڈے گاما ایسے سیاح جب سفر کو نکلے۔ تو ان کے تقریباً سب کے سب ہمراہی سزا یافتہ مجرم۔ جیب کترے اور بدمعاش لوگ تھے۔

ان سیاحوں کی جس قدر بھی تعریف و تحسین کی جائے۔ کم ہے۔ یہ بڑے بہادر اور ہمت والے لوگ تھے۔ اس آسائش کے زمانے میں ان کی تکلیفات کا تصور مشکل ہے۔ جہازوں میں جا بجا سوراخ تھے۔ جہاز کا ساز و سامان از حد ناقص تھا۔ تیرھویں صدی کے وسط تک جہاز ران قطب نما سے تو آشنا ہو چکے تھے۔ (جو چین سے عرب اور پھر صلیبی جنگوں کی وساطت سے یورپ پہنچا تھا) لیکن نقشے غلط سلط تھے۔ اپنی اٹکل سے اور خدا کے بھروسے پر جہاز کو چھوڑ دیتے۔ قسمت یاور ہوتی۔ تو دو تین سال کے بعد واپس پہنچ جاتے۔ ورنہ ان کے پنجر کسی دور دراز ساحل پر آسمان کے نیچے پڑے پڑے سفید ہو جاتے۔ لیکن ان میں پیش روؤں کی حقیقی روح موجود تھی وہ قسمت سے بازی لگاتے۔ اور زندگی کو ایک شاندار اور پُر خطر کھیل سمجھتے تھے۔ جب ان کی آنکھوں کو نئے ساحل کی دھندلی سی لکیر یا کسی نئے سمندر کا پُر سکون

---

[1] Seville

[2] Batavia



دنیا کیونکر پھیلی

پانی جو ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک نظروں سے اوجھل رہا تھا۔ دکھائی دے جاتا۔ تو بھوک اور پیاس اور دکھ اور تکلیف سب کچھ بھول جاتے +

ان دریافتوں کا حال اس قدر دلچسپ ہے کہ میرا دل چاہتا ہے۔ اس کتاب کو ہزار صفحے تک پہنچا دوں۔ لیکن زمانۂ ماضی کا صحیح تصور پیش کرنے کے لئے تاریخ کو ریمبرانٹ[1] کی تصاویر کی مانند ہونا چاہیئے۔ یعنی جو بہترین اور سب سے بڑی اور سب سے اہم باتیں ہیں۔ ان پر بہت تیز روشنی ڈالنی چاہیئے۔ اور باقی چیزوں کو سائے میں رکھنا چاہیئے۔ یا انہیں محض چند لکیروں سے ظاہر کرنا چاہیئے۔ اس باب میں میں صرف اُن دریافتوں کی مختصر سی فہرست ہی پیش کر سکتا ہوں۔ جو سب سے زیادہ اہم ہیں +

یہ یاد رکھو۔ کہ چودھویں اور پندرھویں صدی میں جہاز ران صرف ایک بات کے درپے تھے۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا۔ کہ کوئی ایسا محفوظ رستہ دریافت کریں۔ جو انہیں آرام کے ساتھ سلطنت خطا (چین) جزیرۂ زیپانگو (جاپان) اور اُن پر اسرار جزیروں تک پہنچا دے۔ جہاں مصالحوں کی پیداوار ہوتی تھی + صلیبی جنگوں کے بعد زمانۂ وسطیٰ کے اہل یورپ کو مصالحوں کا چسکا پڑ گیا تھا۔ علاوہ بر آں خوراک کو محفوظ رکھنے کا طریقہ کسی کو آتا نہ تھا۔ چنانچہ گوشت بہت جلد خراب اور بدذائقہ ہو جاتا۔ اور جب تک اس پر بہت سی مرچیں یا جائفل نہ چھڑکی جاتی۔ اس کا کھانا ناممکن ہوتا +

بحیرۂ روم کے بڑے بڑے جہاز ران اہل وینس اور اہل جنوا تھے لیکن ساحل اوقیانوس کے سفر کا سہرا پرتگیزوں کے سر ہے + مُوری حملہ آوروں کے ساتھ جو سالہا سال تک کشمکش جاری رہی تھی۔ اس کی وجہ سے ہسپانیہ اور پرتگال کے باشندوں میں حبّ وطن کا جذبہ بہت ترقی کر چکا تھا۔ جب ایک دفعہ کسی قوم میں جوش پیدا ہو جائے۔ تو اس کو کسی نئے رستے پر لگانا کچھ مشکل نہیں + تیرھویں صدی میں شاہ الفانسو سوم نے ہسپانوی جزیرہ نما کے جنوب مغربی کونے میں سلطنت الگاروے[2] کو فتح کر کے اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا تھا۔ چودھویں صدی میں پرتگیزوں نے مسلمانوں پر غلبہ

---

[2] Algarve   [1] Rembrandt

پاکر آبنائے جبل الطارق کو عبور کر لیا تھا۔ اور کیوٹا[1] کے شہر پر جو عربوں کے شہر تعرفہ[2] کے بالمقابل واقع تھا۔ نیز تنجیر کے شہر پر جو بعد میں الگاروے کے افریقی علاقوں کا دارالحکومت قرار پایا۔ قابض ہو گئے تھے۔ (تعرفہ کے معنی عربی زبان میں فہرست کے ہیں۔ یہی وہ لفظ ہے۔ جو ہسپانوی زبان کے رستے انگریزوں تک لفظ "ٹیرف[3]" کی شکل میں پہنچا ہے) +
ان کامیابیوں کے بعد سیاحت میں نام پیدا کرنے کے لئے ان میں کافی جوش عمل پیدا ہو چکا تھا +

۱۴۱۵ء میں شاہزادہ ہنری نے (جو ہنری سیاح کے نام سے مشہور ہوا) جس کا باپ پرتگال کا بادشاہ جان اوّل اور جس کی ماں جان آف گانٹ کی بیٹی فلپا[4] تھی (جان آف گانٹ کا ذکر شکسپیئر کے ناٹک رچرڈ دوم نامی میں بھی آیا ہے) شمال مغربی افریقہ کی سیاحت کے لیئے باقاعدہ تیاری شروع کی + اس سے پیشتر اس ریتلے ساحل پر فنیقیوں اور فنیقیوں کے علاوہ اہل شمال کے قدم بھی پڑ چکے تھے۔ جو اس علاقے کو بالوں والے "وحشی انسان" یعنی بن مانس کا وطن سمجھتے تھے + شاہزادہ ہنری اور اس کے جہاز رانوں نے جزائر کنیری[5] کو ایک ایک کر کے دریافت کیا۔ جزیرہ مدیرا[6] کو جہاں ایک مرتبہ پہلے جنوا کا ایک جہاز جا پہنچا تھا۔ دوبارہ دنیا سے روشناس کرایا۔ جزائر ازورز[7] کا جن سے پرتگیز اور ہسپانوی محض سرسری طور پر واقف تھے۔ باقاعدہ نقشہ مرتب کیا۔ اور افریقہ کے مغربی ساحل پر دریائے سینیگال[8] کا دہانہ بھی دیکھ لیا۔ جسے وہ دریائے نیل کا دہانہ سمجھے + بالآخر پندرھویں صدی کے وسط تک راس ورڈ[9] یا راس اخضر اور جزائر اخضر تک جا پہنچے۔ جو افریقہ اور برازیل[10] کے بیچ میں واقع ہیں +

ہنری نے محض سمندری سیاحت اور دریافتوں ہی پر اکتفا نہ کی + وہ سلسلۂ یسوع کا آقائے اعظم[11] تھا۔ جب ۱۳۱۲ء میں فرانس کے بادشاہ فلپ خوشرو کی درخواست

---

[1] Ceuta
[2] Ta'rifa
[3] Tariff
[4] Philippa
[5] Canary
[6] Madiera
[7] Azores
[8] Senegal
[9] Verde
[10] Brazil
[11] Grand Master of the Order of Christ

پر پاپائے کلیمنٹ پنجم نے صلیبیوں کے سلسلۂ ٹمپلر[1] کو منسوخ کر دیا۔ نواہل پرتگال نے اسے اس شکل میں اپنے ہاں جاری رکھا (برسبیل تذکرہ جب فلپ نے سلسلہ ٹمپلر منسوخ کرایا تھا۔ تو اپنے ہاں کے جتنے ٹمپلر تھے۔ ان کو زندہ جلا کر ان کی جائداد اور مال و اسباب پر خود قابض ہو گیا تھا۔ شاہزادہ ہنری نے سلسلہ یسوع کے مقبوضات کے محصولات سے یہ فائدہ اٹھایا۔ کہ اس روپے سے کئی مہموں کے لئے ساز و سامان مہیا کیا اور اندرون صحرائے اعظم اور ساحل گنی[2] کو چھان ڈالا +

لیکن اس پر زمانہ وسطی کا رنگ بہت غالب تھا۔ بہت سا وقت اور بے شمار روپیہ پُر اسرار "پریسٹر جان[3]" کی تلاش میں ضائع کیا۔ پریسٹر جان کے متعلق یہ افسانہ مشہور تھا کہ یہ کوئی مسیحی پادری ہے جو مشرق میں کہیں "ایک وسیع مملکت کا شہنشاہ ہے" + یہ افسانہ یورپ میں سب سے پہلے بارھویں صدی کے وسط میں مشہور ہوا + تین سو سال تک لوگ پریسٹر جان اور اسکے جانشینوں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ آخر یہ معما ہنری کی موت کے تیس سال بعد حل ہوا +

۱۴۸۶ء میں بارتھولومیو ڈیاز[4] پریسٹر جان کی مملکت کی تلاش میں سمندر کے رستے افریقہ کے سب سے جنوبی مقام تک جا پہنچا تھا۔ پہلے اس نے اس مقام کا نام راس طوفان رکھا۔ کیونکہ ہوائیں بہت زور سے چلتی تھیں جن کی وجہ سے مشرق کی سمت سفر کا جاری رکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ لیکن لزبن[5] کے جہازرانوں نے جو ہندوستان کے سمندری رستے کی تلاش میں تھے۔ اور جو اس دریافت کی اہمیت کو سمجھ گئے تھے۔ اس کی بجائے اس کا نام راس امید رکھا +

ایک سال بعد پیڈرو دی کووِل ہم[6] خاندان میڈیچی کے نام کی ہنڈیاں ساتھ لے کر پریسٹر جان کی تلاش میں خشکی کے رستے چل پڑا۔ پہلے بحیرہ روم۔ پھر مصر کو عبور کیا اور جنوب کی سمت روانہ ہوا۔ عدن پہنچ کر خلیج فارس کو عبور کیا۔ جہاں سکندر اعظم کے بعد شاذ و نادر ہی کسی یورپ کے باشندے کا گزر ہوا تھا۔ یہاں سے ہندوستان کے ساحل پر گوآ اور کالی کٹ کا سفر کیا۔ جہاں سے جزیرہ قمر (مڈغاسکر[7]) کے بہت سے حالات معلوم ہوئے۔ لوگوں کا خیال تھا۔ کہ یہ جزیرہ ہندوستان اور افریقہ کے عین

---

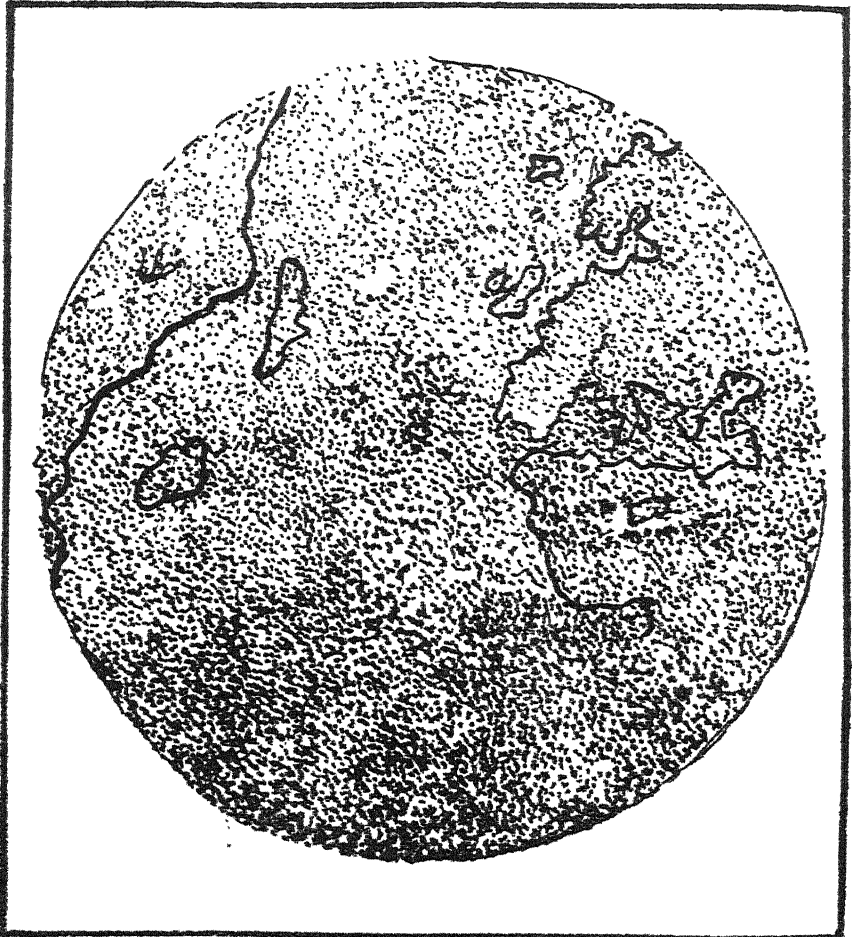
[1] Templar [2] Guinea [3] Prester John

[4] Bartholomew Diaz [5] Lisbon [6] Pedro de Covilham

[7] Madagascar

بیچوں بیچ واقع ہے) وہاں سے پیٹ تو چوری چھپے گئے اور مدینے کی سیر کی۔ اور پھر ایکبار بحیرہ احمر کو عبور کیا۔ بالآخر ۱۴۹۰ء میں پریسٹر جان کی مملکت دریافت کر لی۔ یہ "پریسٹر جان" حبشستان کا کالا بادشاہ نکلا۔ جس کے آباؤ اجداد نے چوتھی صدی میں (یعنی عیسائی مبلغوں کے سویڈن ناروے تک پہنچنے سے سات سو سال پیشتر) عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا ۔

ان سیاحتوں سے پرتگیز جغرافیہ دانوں اور نقشہ کشوں کو یقین ہوگیا۔ کہ سمندر کے مشرقی رستے سے جزائر ہند تک پہنچ جانا ممکن تو ہے۔ لیکن آسان نہیں ۔ اس کے بعد مباحثہ ہؤا۔ بعض چاہتے تھے۔ کہ راس امید سے مشرق کی سمت سیاحت جاری



کولمبس کی دنیا

رکھی جائے بعض کہتے تھے نہیں۔ اوقیانوس کو عبور کرنا چاہیئے۔ سلطنت خطا تک پہنچنے کا رستہ یہی ہے +

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے۔ کہ اس زمانے میں سمجھدار لوگ اس بات پر کامل یقین رکھتے تھے۔ کہ دنیا چپٹی نہیں۔ بلکہ گول ہے۔ نظام فلکی کا وہ تصور جسے دوسری صدی میں مصر کے نامور جغرافیہ دان بطلیموس نے اختراع کیا تھا۔ اور جو زمانۂ وسطیٰ کے معتقدات میں شامل تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے علما کے نزدیک غلط قرار پایا۔ انھوں نے اس کی بجائے پولینڈ کے ریاضی دان کوپر نی کس کا نظام تسلیم کیا۔ جس کا عقیدہ تھا۔ کہ زمین اور زمین کی طرح اور کئی مدور سیارے سورج کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس عقیدے کو کوپر نی کس نے محکمہ احتساب کے ڈر سے چھتیس سال تک چھپائے رکھا۔ (کتابی صورت میں یہ اس کی وفات کے ایک سال بعد ۱۵۴۳ء میں طبع ہؤا) محکمۂ احتساب پاپا کے حکم سے تیرھویں صدی میں قائم ہؤا تھا۔ کیونکہ فرانس اور اطالیہ کے بعض لوگوں کے نئے نئے خیالات سے اسقفِ روما کی مطلق العنانی کو ضعف پہنچنے کا احتمال تھا۔ (یہ لوگ بہت نیک اور پارسا لوگ تھے۔ اور ان کی "بدعتی" اس سے بڑھ کر اور کچھ نہ تھی۔ کہ یہ کسی چیز کو کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہ سمجھتے تھے۔ اور یسوع مسیح کی طرح ناداری اور افلاس کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے) لیکن جو لوگ جہازرانی کے ماہر تھے۔ ان میں یہ عقیدہ عام تھا۔ کہ زمین گول ہے۔ بحث صرف اس بات پر تھی۔ کہ مشرقی رستہ اختیار کیا جائے یا مغربی +

مغربی رستہ تجویز کرنے والوں میں جنوا کا ایک جہازران کرسٹوفورڈ کولمبو بھی تھا۔ اس کا باپ پشم کا سوداگر تھا۔ قرائن سے پایا جاتا ہے کہ بیٹے نے پاویہ[1] کی یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔ جہاں ریاضی اور اقلیدس میں خاص مہارت حاصل کی۔ بعد ازاں باپ کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد مشرقی بحیرۂ روم میں مقام کیوس[2] تک تجارتی اغراض کے لئے سفر کیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ انگلستان بھی متعدد مرتبہ آیا۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ اُون خریدنے آیا تھا۔ یا ایک

---

[1] Pavia   [2] Chios

جہاز کا کپتان بن کر وہاں تک پہنچا تھا + کولمبو کا اپنا بیان یہ ہے۔ کہ فروری ۱۴۷۷ء میں میں نے آئس لینڈ کا سفر کیا۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ وہ جزائر فیرو[۱] سے آگے بڑھنے نہ پایا۔ اور چونکہ یہاں فروری کے مہینے میں سردی بہت پڑتی ہے۔ اس لئے انہیں آئس لینڈ سمجھا۔ یہاں کولمبو کا ان بہادر اہل شمال کی نسل کے لوگوں سے ملنا ہؤا۔ جو دسویں صدی میں گرین لینڈ میں آباد ہو گئے تھے۔ اور گیارھویں صدی میں جب لیف[۲] کا جہاز طوفان کے تھپیڑوں سے وائن لینڈ[۳] یا لیبراڈور[۴] کے ساحل سے جا لگا تھا۔ امریکہ تک پہنچ گئے تھے +

کسی کو معلوم نہیں۔ کہ مغرب بعید کی ان نوآبادیات کا کیا حشر ہؤا۔ لیف کے بھائی تھورسٹائن[۵] کی بیوہ کے دوسرے شوہر تھورفن کارلسیفن[۶] کی امریکن نوآبادی قوم اسکیمو کی مزاحمت کی وجہ سے تین سال سے زیادہ قائم نہ رہی لیکن گرین لینڈ کے متعلق سنہ ۱۴۱۰ء کے بعد پھر کبھی کچھ سننے میں نہ آیا + اغلباً گرین لینڈ کے باشندے سب کالے طاعون کا شکار ہو گئے تھے۔ کیونکہ اسی مرض نے ناروے کی نصف آبادی کا بھی صفایا کر دیا تھا + بہرحال جزائر فیرو اور جزیرہ آئس لینڈ کے باشندوں میں ابھی تک یہ مشہور تھا۔ کہ "مغرب بعید میں ایک وسیع سرزمین موجود ہے"۔ اور یہ بات کولمبو کے کان میں ضرور پڑی ہو گی۔ کولمبو کو سکاٹ لینڈ کے شمالی جزیروں کے ماہی گیروں سے مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ بعد میں وہ پرتگال پہنچا۔ جہاں اس نے جہازران شاہزادہ ہنری کے ایک کپتان کی بیٹی سے شادی کر لی +

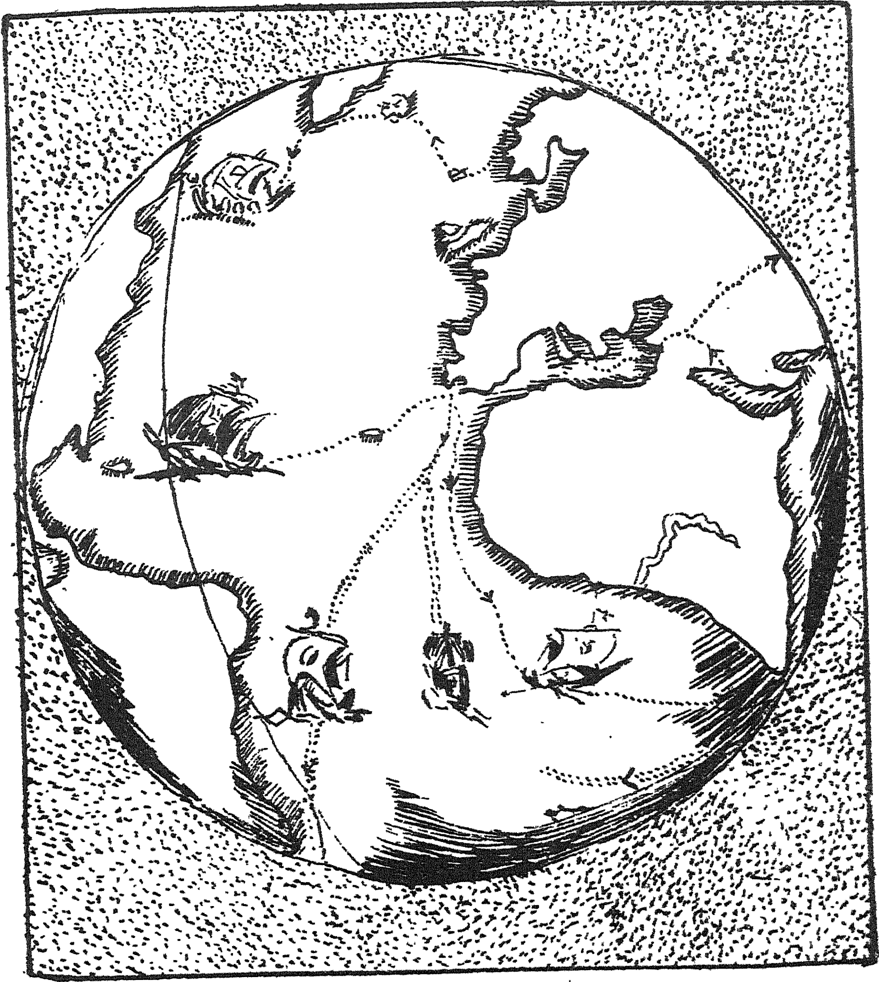
۱۴۷۸ء کے بعد اس نے اپنی زندگی تمامتر جزائر ہند کے مغربی رستے کی تلاش کیلئے وقف کر دی۔ اپنی تجاویز پرتگال اور ہسپانیہ کے حکمرانوں کے پاس بھیجیں پرتگیزوں کو چونکہ مشرقی رستے کی اجارہ داری کا یقین تھا۔ اس لئے وہ ملتفت نہ ہوئے۔ ہسپانیہ میں شہنشاہ فرڈی نینڈ آف آراگون[۷] اور ملکہ ازبیلا[۸] آف کاسٹیل جن کی باہمی

---

[۱] Faroe　[۲] Leif　[۳] Viveland

[۴] Labrador　[۵] Thorstein　[۶] Thorfinn Karlsefne

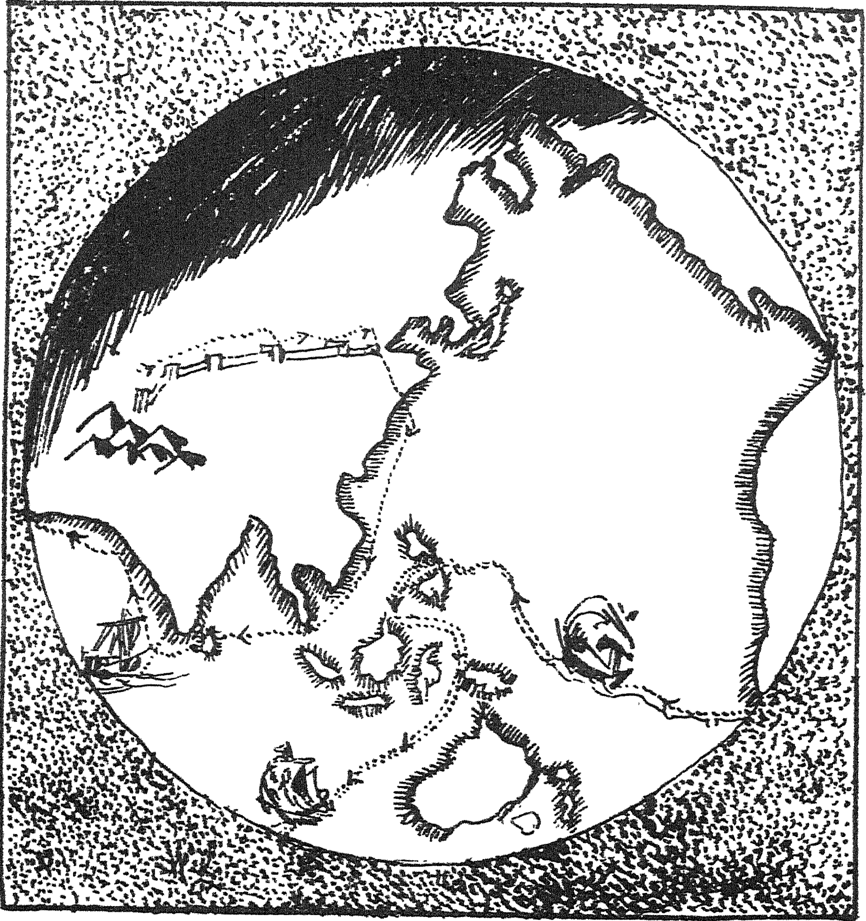
[۷] Ferdinand of Aragon　[۸] Isabella of Castille



عظیم الشان دریافتیں - مغربی نصف کرہ

شادی کی وجہ سے ۱۴۶۹ئہ میں ہسپانیہ ایک متحدہ مملکت بن گیا تھا۔ مُوروں کو ان کی آخری جائے پناہ یعنی غرناطہ سے بیدخل کرنے میں مصروف تھے۔ فالتو روپیہ ان کے پاس نہ تھا۔ کہ ایک پرخطر مہم کے لئے پیش کرتے۔ کیونکہ ان کی اپنی فوج کو روپے کی اشد ضرورت تھی +

چنانچہ اس دلیر اطاوی کو اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے بہت سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ کولمبس کی داستان اب اس قدر مشہور ہوچکی ہے۔ کہ اس کا بیان



عظیم الشان دریافتیں ۔ مشرقی نصف کرہ

دہرانا بیسود ہوگا۔ جنوری ۱۴۹۲ء میں مُوروں نے غرناطہ دشمن کے حوالے کردیا۔ اسی سال اپریل کے مہینے میں کولمبس اور فرمانروایان ہسپانیہ کے مابین اقرارنامے پر دستخط ہوگئے۔ ۳۰ اگست کو جمعہ کے دن کولمبس تین چھوٹے چھوٹے جہازوں میں ۸۸ ملاحوں کو ساتھ لے کر (جن میں کے بیشتر لوگ سزا یافتہ مجرم تھے اور مہم میں شامل ہونے کے وعدے پر رہا کئے گئے تھے) مقام پالوسؔ[1] سے روانہ ہوُا۔ جنوری

---

[1] Palos

۱۴۹۳ء میں کولمبس نے لاناویڈاد[1] کے چھوٹے سے قلعے میں ۴۴ آدمیوں کو (جنہیں بعد میں پھر کبھی کسی نے زندہ نہ دیکھا) خیرباد کہا اور گھر کو روانہ ہؤا۔ وسط فروری میں وہ جزائر ازورز تک پہنچا۔ جہاں پرتگیزوں نے اسے قید کی دھمکی دی۔ ۱۵ ر مارچ ۱۴۹۳ء کو پالوس پہنچا۔ ساتھ امریکہ کے اصلی باشندے تھے۔ (چونکہ کولمبس کا یہ خیال تھا۔ کہ جو جزیرے اس نے دریافت کئے ہیں۔ وہ ہندوستان کے ساحل کے قریب ہیں۔ اس لئے وہاں کے باشندوں کو انڈین یعنی ہندوستانی سمجھا۔ اس لئے ان کا نام یہی پڑ گیا) وہاں سے بعجلت تمام بارسیلونا پہنچا۔ اور اپنے مربیوں اور محسنوں کو یہ خوشخبری سنائی کہ مجھے خدا نے کامیابی عطا کی ہے۔ اور ملک خطا اور زیپانگو کے سیم و زر تک پہنچنے کا رستہ فخر مسیحیت شاہنشاہ ہسپانیہ اور اس کی ملکہ عالی مرتبت کے قدموں کا منتظر ہے۔

لیکن افسوس کہ کولمبس کا اندازہ غلط تھا۔ ممکن ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنے چوتھے سفر کے دوران میں جب اس نے مغربی امریکہ کی سرزمین کو چھؤا تو اسے شبہ سا ہؤا ہو۔ کہ میں غلطی پر ہوں۔ لیکن مرتے دم تک اسے اس بات کا پختہ یقین تھا۔ کہ یورپ اور ایشیا کے درمیان اور کوئی براعظم واقع نہیں اور کہ اس نے چین کا رستہ دریافت کر لیا ہے۔

اس اثنا میں پرتگیزوں کو مشرقی رستے نے کامیابی کی راہ دکھائی۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈاگاما مالابار کے ساحل تک جا پہنچا۔ اور وہاں سے مصالحے لاد کر بخیر و عافیت لزبن[2] لایا۔ ۱۵۰۲ء میں دوبارہ یہی سفر کیا۔ لیکن مغربی رستہ دریافت و تحقیق کے لئے مفید ثابت نہ ہؤا۔ ۱۴۹۷ء اور ۱۴۹۸ء میں جان[3] اور سبستیان کیبٹ[4] نے جاپان کا رستہ دریافت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انہیں نیوفونڈلینڈ کی ان چٹانوں اور برف پوش ساحلوں کے سوائے کچھ نظر نہ آیا۔ جو اس سے پانچسو سال پہلے اہل شمال کو دکھائی دئے تھے۔ فلورنس کے ایک شخص امریگو وسپوچی[5] نے (جو ہسپانیہ کا جہازران

---

[1] La Navidad [2] Lisbon [3] John

[4] Sebastian Cabot [5] Amerigo Vespucci

اعظم مقرر ہوا اور جس کی وجہ سے نئے براعظم کا نام امریکہ قرار پایا) ساحل برازیل کی سیاحت کی تھی۔ لیکن اسے جزائر ہند کا کہیں نشان نہ ملا۔

۱۵۱۳ء میں یعنی کولمبس کی وفات کے سات سال بعد یورپ کے جغرافیہ دانوں کو حقیقت کا پتہ چلا۔ واسکو نونیر اٹے بلبوآ[۱] نے خاکنائے پانامہ کو عبور کیا۔ اور جب ڈارئین[۲] کی مشہور چوٹی پر چڑھا۔ تو پانی کا ایک وسیع قطعہ دکھائی دیا جس سے یہ شبہ ہوا کہ اس سمت ایک اور سمندر واقع ہے۔

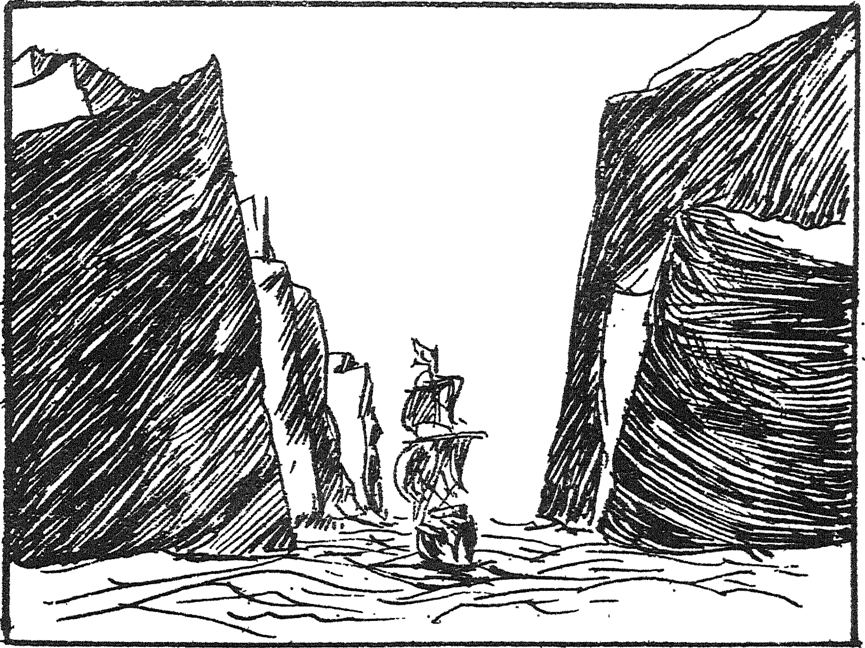
سب سے آخر ۱۵۱۹ء میں پرتگیزی جہاز ران میگلن کے زیر کمان پانچ چھوٹے چھوٹے ہسپانوی جہازوں کا ایک بیڑا جزائر سپائس[۳] کی تلاش میں چل پڑا۔ یہ بیڑا مغرب کی سمت روانہ ہوا۔ کیونکہ مشرق کا رستہ تو بالکل پرتگیزوں کے قبضے میں تھا۔ جنہیں کسی غیر کا دخل گوارا نہ تھا۔ میگلن نے افریقہ اور برازیل کے درمیان اوقیانوس کو عبور کیا۔ اور جنوب کا رخ کیا۔ اور ایک تنگ رودبار میں پہنچا جس کے ایک طرف پٹیا گونیا (بڑے پاؤں والے لوگوں کی زمین) کا سب سے جنوبی حصہ تھا۔ اور دوسری طرف جزائر فائر[۴] واقع تھے۔ ان جزیروں کی وجہ تسمیہ یہ ہے۔ کہ جب یورپ کے ملاحوں نے انہیں دور سے دیکھا۔ تو وہاں کے باشندوں کی موجودگی کے آثار بجز آگ کے اور کچھ نظر نہ آئے۔ تقریباً پانچ ہفتوں تک میگلن کے جہاز خوفناک طوفان اور آندھی کے رحم پر بہتے پھرے۔ ملاحوں میں غدر ہو گیا۔ جسے میگلن نے نہایت سخت گیری سے فرو کیا۔ دو باغیوں کو غیر ملک کے ساحل پر اتار دیا۔ کہ وہاں بیٹھ کر فراغت اور یکسوئی سے اپنے گناہوں پر پچھتایا کریں۔ آخر کار طوفان تھما۔ رود بار کچھ فراخ ہوا۔ اور میگلن ایک نئے سمندر میں داخل ہوا۔ جس کی موجیں لطیف اور جس کا پانی پرسکون تھا۔ اسی لئے اس کا نام بحرالکاہل رکھا۔ پھر مغرب کو روانہ ہوا۔ لیکن اٹھانوے دن کے سفر میں بھی زمین کہیں نظر نہ آئی۔ اس کے ساتھی بھوک اور پیاس کے مارے فنا ہو گئے۔ جب کچھ کھانے کو نہ رہا۔ تو جہاز کے چوہوں کی باری آئی۔ یہ بھی ختم ہو گئے۔ تو ملاح بھوک مٹانے کو

---

[۱] Vasco Nuner ke Balboa [۲] Darien [۳] Spice
[۴] Fire

بادبانوں کی دھجیاں چبانے لگے۔

مارچ ۱۵۲۱ء میں زمین دکھائی دی میگلن نے اس کا نام رہزنوں کا ملک رکھا۔ کیونکہ یہاں کے باشندے جو ہاتھ آیا۔ چُرا کرلے گئے۔ اس کے بعد پھر مغرب کی سمت جزائر سپائس کو چل پڑے:

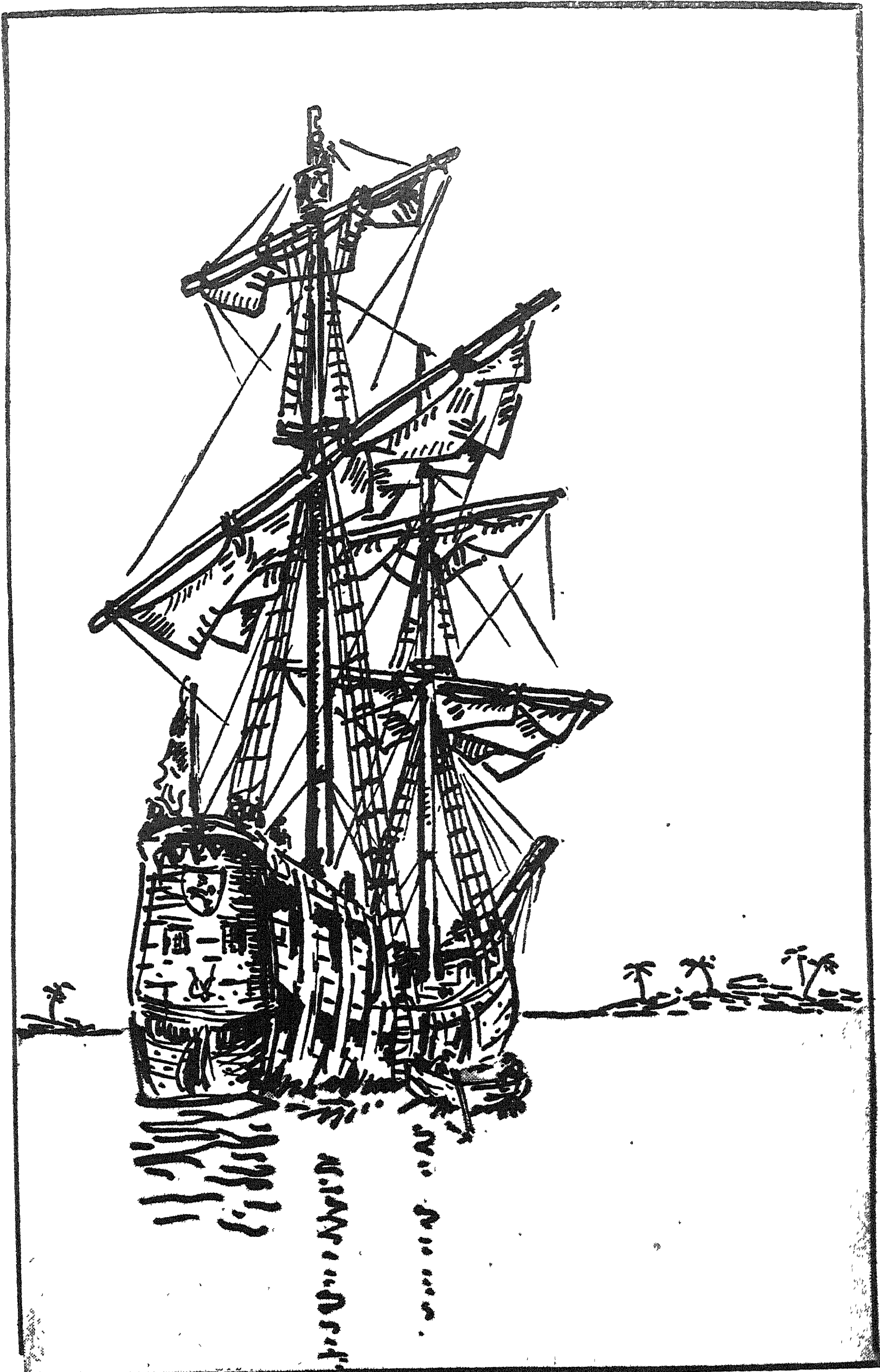


میگلن

پھر زمین دکھائی دی - ویران جزیروں کا ایک جُھنڈ۔ جس کا نام میگلن نے نے اپنے آقا چارلس پنجم کے بیٹے فلپ کے نام پر (یہ وہی فلپ دوم ہے۔ جس کی سیہ کاری سے تاریخ کے صفحے تاریک ہوئے) جزائر فلپائن[1] رکھا۔ شروع شروع میں تو میگلن کی بڑی آؤ بھگت ہوئی لیکن بعد میں جب اس نے اپنے جہازوں کی توپوں کے بل پر لوگوں کو مسیحیت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ تو وہاں کے باشندوں نے اُسے اور اُس کے ساتھ اس کے کئی کپتانوں اور ملاحوں کو مار ڈالا۔ جو بچ گئے۔

---

[1] Phlippines



ایک نئی دنیا

انھوں نے تینوں میں سے ایک جہاز کو جلا دیا۔ اور پھر چل پڑے۔ پھر جزائر مولکا[۱] کو دریافت کیا۔ پھر بورنیو نظر آیا۔ اور بالآخر ٹائیڈور[۲] پہنچے۔ وہاں ایک جہاز مع اپنے ملاحوں کے ٹھہر گیا۔ کیونکہ اس کے پیندے میں بہت سے سوراخ ہو گئے تھے دوسرے جہاز نے جس کا نام وتوریہ[۳] تھا۔ سباسٹیاں ڈل کانو[۴] کے زیر کمان بحر ہند کو عبور کیا۔ شمالی آسٹریلیا کے پاس سے گزرا۔ لیکن یہ براعظم دکھائی نہ دیا۔ (اس ہموار اور دشوار گزار سرزمین کو پہلے پہل سترھویں صدی کے پہلے نصف حصے میں ہالینڈ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے دریافت کیا)۔ اور آخر کار بڑی مصیبتیں جھیلنے کے بعد ہسپانیہ پہنچا۔

یہ سفر سب سیاحتوں سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں تین سال لگ گئے۔ بہت سا روپیہ صرف ہوا۔ اور کئی جانیں تلف ہوئیں۔ لیکن اس سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو گئی۔ کہ زمین گول ہے۔ اور جو ملک کولمبس نے دریافت کئے تھے۔ وہ جزائر ہند نہ تھے۔ بلکہ ایک اور ہی براعظم کا جزو تھے۔ اس دریافت کے بعد ہسپانیہ اور پرتگال دونو اپنی ہندوستانی اور امریکن تجارت کو فروغ دینے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ان دو حریفوں میں صلح قائم رکھنے کی خاطر پاپا سکندر ششم نے (مسیحیت کے منکرین میں سے صرف یہی ایک شخص تھا۔ جو اس عالی مرتبے پر فائز ہوا) پچاس درجے پر مغربی طول البلد کا جو خط تھا۔ اسے حد فاصل قرار دیا۔ اور دنیا کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا۔ اس تقسیم کو ۱۴۹۴ء کی توردی سیلاس[۵] کی تقسیم کہتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا۔ کہ امریکہ کا براعظم ماسوائے ملک برازیل کے ہسپانوی ملکیت قرار پایا۔ اور جزائر ہند اور افریقہ کا بیشتر حصہ پرتگیزی مقبوضات میں شمار ہوا۔ تا آنکہ انگلینڈ اور ہالینڈ کے آباد کاروں نے جو پاپائی احکام کو درخور اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں پرتگیزوں کو بے دخل کر دیا۔

جب کولمبس کی دریافت کی خبر وینس کے تجارتی حلقوں میں پہنچی۔ جو زمانہ

---

[۱] Moluccas [۲] Tidor [۳] Vittoria

[۴] Sebastian del Cano [۵] Tordesillas

وسطیٰ کی تمام تر تجارت کا مرکز تھا - تو ہلچل مچ گئی - حصوں کی قیمت چالیس اور پچاس فیصدی تک گر گئی - تھوڑے عرصے کے بعد جب یہ معلوم ہوا - کہ کولمبس مملکت خطا کا رستہ دریافت کرنے میں ناکام رہا ہے - تو وینس کے تاجر کچھ سنبھلے لیکن واسکوڈاگاما اور میگلن کی سیاحتوں نے یہ ثابت کر دیا - کہ مغرب کی سمت سمندر کے رستے جزائر ہند تک پہنچنا بہت مشکل نہیں - جنوا اور وینس کے فرمانرواؤں کو افسوس ہوا - کہ ہم نے پہلے کولمبس کی تجویز کو کیوں قبول نہ کیا - لیکن اب کیا ہو سکتا تھا - بحیرہ روم کی اہمیت اب ایک جھیل سے زیادہ نہ رہی خشکی کے رستے جزائر ہند اور چین سے جو تجارت ہوتی تھی - وہ بالکل ہی گھٹ گئی - اطالیہ کا اقتدار جاتا رہا - اب تجارت اور تجارت کی وجہ سے تہذیب کا نیا مرکز اوقیانوس قرار پایا - اور اس شاہراہ کو جو اہمیت اور جو فروغ نصیب ہوا - آج تک ویسے کا ویسا قائم ہے +

تہذیب کے فروغ کی داستان بھی کیا حیرت انگیز داستان ہے - آج سے پچاس صدیاں پہلے وادئ نیل کے باشندوں نے اپنے کارناموں کی یاد کو تحریر کے ذریعے محفوظ کیا - نیل سے تہذیب نے نقل مکان کیا - تو عراق میں ڈیرا جمایا - پھر کریٹ اور یونان اور روما کی باری آئی - اندرون ملک کا ایک سمندر تجارت کا مرکز بن گیا - اور بحیرہ روم کے ساحل پر جو شہر آباد تھے - وہاں فنون لطیفہ اور سائنس اور فلسفہ اور دیگر علوم پروان چڑھے - سولھویں صدی میں تہذیب نے پھر سفر کیا - اور جو ممالک اوقیانوس کے ساحل پر واقع تھے - وہ روئے زمین کے مالک بن گئے +

بعض لوگوں کا خیال ہے - کہ جنگ عظیم کا اقوام یورپ پر ایک اثر یہ بھی ہوا ہے کہ اوقیانوس کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے - ان کا قیاس ہے - کہ تہذیب براعظم امریکہ کو عبور کر کے بحرالکاہل کو سفر کر جائیگی - لیکن مجھے اس میں شک ہے +

تہذیب نے مغرب کو سفر کیا - تو ساتھ ساتھ جہازوں کے حجم بھی بڑھتے گئے - اور فن جہاز رانی نے بھی بہت کچھ ترقی کر لی - وہ چپٹے پیندے والے جہاز جو نیل اور فرات میں استعمال ہوتے تھے - ان کو چھوڑ کر فنیقیوں اور اہل ایجئین ا یونانیوں اور اہل کارتھیج نے بادبانی جہاز استعمال کئے - پرتگیزوں اور ہسپانیوں نے انہیں

بھی ترک کیا۔ اور اس کی جگہ چپو شکل کے جہاز بنائے لیکن انگریزوں اور اہل ہالینڈ کے جہازوں کے مقابل میں یہ بھی ناکارہ ثابت ہوئے۔

لیکن آج کل زمانے میں تہذیب بحری جہازوں کی محتاج ہیں۔ ان کی جگہ اب ہوائی جہازوں نے لے لی ہے۔ اب آئندہ تہذیب کا مرکز کس جگہ قائم ہوگا۔ یہ بہت کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ ہوائی طاقت دنیا کے کس حصے میں فروغ پاتی ہے۔ اب سمندر کو پھر وہ سکون و قرار نصیب ہوگا جس کی موجودگی میں ننھی ننھی مچھلیاں نسل انسانی کے اولین آباو اجداد کے ساتھ سمندر کی گہرائیوں میں چین اور اطمینان کی زندگی بسر کرتی تھیں۔

بدھ اور کنفیوشس

پرتگیزوں اور ہسپانویوں کی دریافتوں کی وجہ سے مغربی یورپ کے عیسائیوں کا ہندوستان اور چین کے رہنے والوں سے میل جول بہت بڑھ گیا۔ اہل یورپ یہ جانتے تھے۔ کہ دنیا میں مذہب صرف عیسائیت ہی نہیں۔ وہ مسلمانوں سے اور مسلمانوں کے علاوہ شمالی افریقہ کے اُن بیدین قبیلوں سے واقف تھے۔ جو درختوں اور پتھروں کی پوجا کرتے تھے لیکن عیسائی فاتحین ہندوستان اور چین میں پہنچے۔ تو دیکھا کہ یہاں کروڑوں لوگ ایسے آباد ہیں۔ جنھوں نے نہ کبھی یسوع مسیح کا نام سنا نہ سننا چاہتے ہیں وہ اپنے مذہب کو جو کئی ہزار سال پرانا تھا۔ مغرب کے دین سے بدرجہا اونے سمجھتے ہیں چونکہ میں بنی نوع انسان کی داستان تم کو سنا رہا ہوں۔ صرف اہل یورپ یا مغربی نصف دنیا کے حالات بیان نہیں کر رہا۔ اس لئے میں دو ایسی ہستیوں کا ذکر تمہیں سنانا چاہتا ہوں جن کی زندگی اور جن کی تعلیم سے آج بھی دنیا کی نصف سے زیادہ آبادی اپنے خیالات اور اپنے اعمال میں ہدایت پاتی ہے +

ہندوستان میں بدھ کو ایک بہت بڑا مذہبی پیشوا مانا جاتا تھا۔ بدھ کی زندگی کے حالات بہت دلچسپ ہیں۔ بدھ کی پیدائش چھٹی صدی قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اس کا وطن اسی سر بفلک کوہ ہمالیہ کے دامن میں تھا جس کے سائے میں اس سے چار سو سال بیشتر زرتشت نے جو آرین قوم کے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں میں پہلا پیشوا تھا۔ اپنی قوم کو یہ تعلیم دی تھی۔ کہ زندگی ایک جنگ ہے جو بدی کے دیوتا اہرمن اور نیکی کے دیوتا ارمزد کے درمیان جاری ہے۔ بدھ کے والد کا نام سدھودھن تھا۔ اور وہ قبیلہ ساکیہ کا ایک طاقتور سردار تھا۔ ان کی والدہ مہامایہ پڑوس کے ایک راجا کی بیٹی تھیں۔ دور دراز کی پہاڑیوں نے کئی ماہتاب غروب ہوتے دیکھے لیکن مہامایہ کی گود خالی رہی۔ اور راجہ بغیر کسی ولیعہد کے حکومت کرتا رہا۔ آخرکار پچاس کی عمر میں ان کے دل کی مراد بر آئی۔ اور وہ اپنے میکے کو روانہ ہوئی

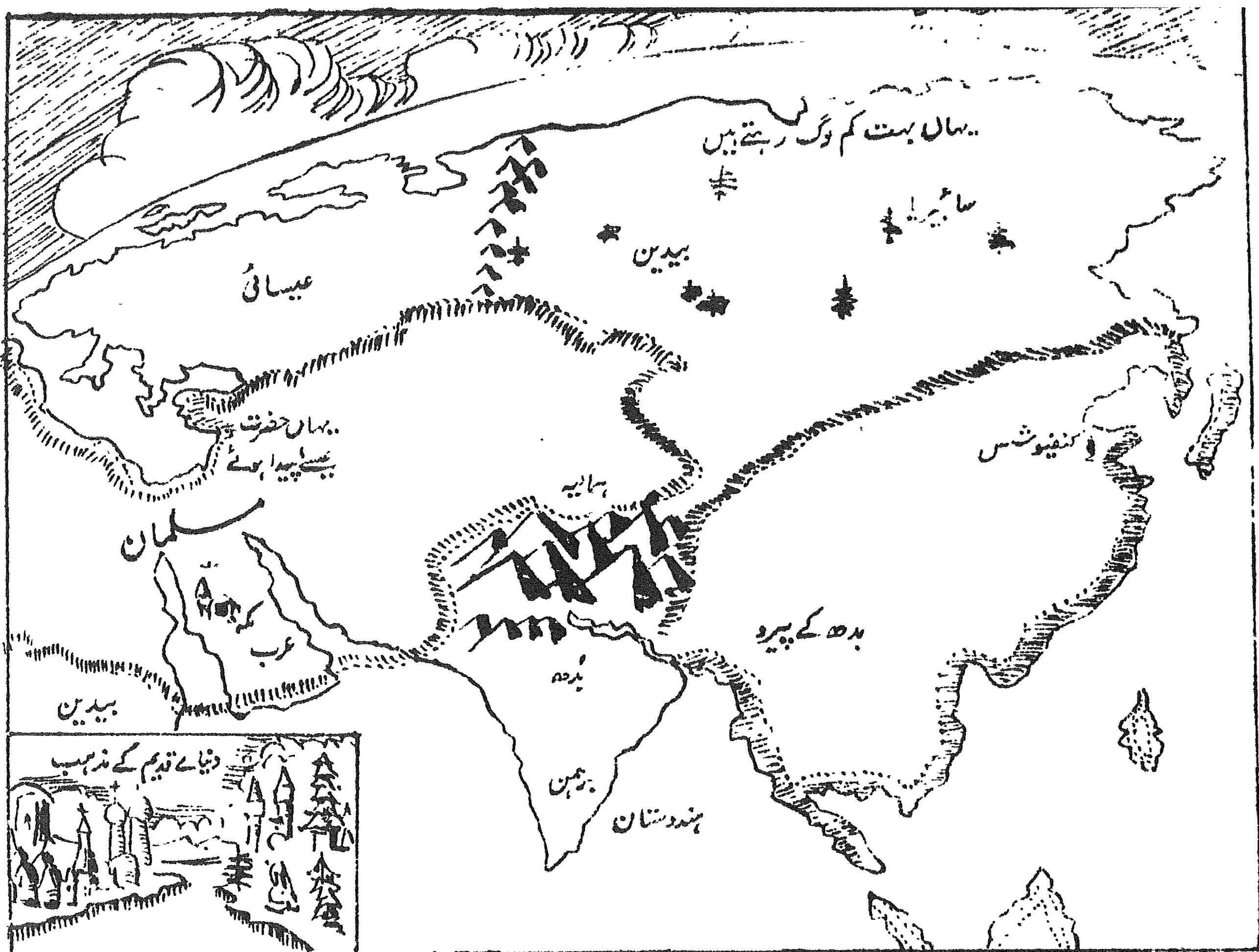
تاکہ جب خدا اسے اولاد کی نعمت سے مالا مال کرے۔ تو اس کے ارد گرد اس کے خویش اقارب موجود ہوں +

مہاما یہ کا میکہ کلیان کے دور دراز دیس میں تھا۔ راہ تو لمبنی کے باغیچے میں ٹھنڈے ٹھنڈے درختوں کے پاس آرام کر رہی تھی کہ لڑکا تولد ہُوا۔ اس کا نام سدھارتھ رکھا گیا لیکن مشہور وہ بدھ کے نام سے ہُوا۔ جس کے معنے ہیں ایسا شخص جس کا سینہ نور معرفت سے منور ہو +

راجکمار سدھارتھ جب سن بلوغ کو پہنچا۔ تو حسن نے جوانی کو اور بھی رونق بخشی۔ انیس برس کا تھا۔ کہ یشودھرا سے شادی ہوئی۔ اس کے بعد عمر کے دس سال رنج و غم سے مامون راج بھون کی چار دیواری میں ہنسی خوشی گزارے۔ اور دل میں یہی سمجھتا رہا۔ کہ ایک نہ ایک دن مجھے ساکیہ قوم کا راجا بننا ہے +

لیکن جب تنیس برس کی عمر کو پہنچا۔ تو ایک دن رتھ پر سوار ہو کر محل سے باہر نکلا۔ ایک بوڑھے آدمی پر نظر پڑی جس کے اعضا عمر بھر کی مشقت سے مضمحل ہو چکے تھے۔ اس قدر کہ اب زندگی کا بوجھ بھی مشکل سے اُٹھا سکتا تھا۔ اپنے رتھ بان چنا سے پوچھا۔ کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ چنا نے جواب دیا۔ راجکمار دنیا ایسے ضعیف لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ راجکمار کا دل اُداس ہو گیا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ محل کو لوٹ آیا۔ اور اس بوڑھے کے خیال کو دل سے بھلانے کی کوشش کی۔ ایک دن پھر باہر نکلا۔ ابکی بار ایک ایسے شخص پر نظر پڑی۔ جو ایک مہلک مرض کا شکار تھا۔ رتھ بان سے پوچھا۔ یہ کس پاپ کی سزا بھگت رہا ہے۔ چنا نے جواب دیا۔ راجکمار دنیا ایسے مریضوں سے بھری پڑی ہے۔ دنیا ایسے دکھوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔ نوجوان راجکمار یہ سن کر پھر اداس ہو گیا۔ لیکن پھر محل کو لوٹ آیا +

چند ہفتے گزر گئے۔ ایک دن سدھارتھ اشنان کی غرض سے رتھ میں سوار ہو کر دریا کو روانہ ہُوا۔ سڑک کے کنارے ایک کھائی میں ایک انسان کی نعش پڑی سڑ رہی تھی۔ گھوڑے اسے دیکھ کر بدکے۔ راجکمار نے ایسا گھناؤنا منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ڈر گیا۔ لیکن چنا نے کہا راجکمار ایسی باتوں کی پرواہ کرنی چاہیئے۔ دنیا میں کئی لوگ اسی طرح مرتے رہتے ہیں۔ زندگی کا قاعدہ یہی ہے۔



دنیا کے تین بڑے بڑے مذہب

کہ ہر چیز کا ایک نہ ایک دن خاتمہ ہو جانا ہے سب چیزیں فانی ہیں۔ موت ہر شخص کی منتظر کھڑی ہے۔ اور اس سے بچنا ناممکن ہے +

جب شام کو سدھارتھ محل میں داخل ہوا۔ تو سازوں کے بجنے کی آواز سنائی دی۔ یا دھ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تھا۔ اور لوگ خوشی کے شادیانے بجا رہے تھے۔ لیکن سدھارتھ کا دل ملول تھا۔ اُس نے زندگی کو بے نقاب دیکھ لیا تھا۔ اور وہ جانتا تھا۔ کہ منش جیون دکھ اور پاپ سے بھرا ہے موت اور دکھ کا تصور ایک بھیانک خواب کی طرح اُس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا +

اُس رات غضب کی چاندنی تھی + سدھارتھ کو نیند نہ آئی۔ اُس کا دل قسم قسم کے خیالات کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ جانتا تھا۔ کہ جب تک اس معمائے حیات کو سلجھا نہ لے اُسے چین نصیب ہو سکتا + دل نے کہا جب تک تم اپنے خویش و اقارب کو چھوڑ کر کہیں دُور نہ چلے جاؤ گے۔ یہ الجھن یونہی رہیگی + دبے پاؤں وہ اُس کمرے میں گیا جہاں یشودھرا بچے کو ساتھ لئے سو رہی تھی + پھر اپنے وفادار ملازم چنّا کو بلایا۔ اور اُسے ساتھ چلنے کو کہا۔ دونو رات کی تاریکی میں باہر نکل گئے۔ ایک تسکینِ قلب کی تلاش میں اور دوسرا اپنے محبوب آقا کا حق نمک ادا کرنے +

سدھارتھ کئی برس تک حقیقت کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں پھرتا رہا + اُس زمانے میں ہندوستان کے اندر کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اہلِ ہند کے آبا و اجدا دیعنی ہندوستان کے اصلی باشندوں کو جنگجو آریاؤں نے مغلوب کر لیا تھا۔ اس لئے آریہ قوم کے لوگ ہندوستان کے کروڑوں صلح پسند مسکین طبیعت لوگوں کے آقا و مالک بنے ہوئے تھے۔ اپنے حقوق کو قائم رکھنے کیلئے آریاؤں نے کل آبادی کو مختلف ذاتوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ انڈیورپین فاتحین کے جانشین یعنی سپاہی پیشہ لوگ اور امرا اونچی ذات میں شمار ہوتے تھے۔ جو برہمنوں کی رکھشا کرنا اپنا دھرم سمجھتے تھے۔ اور ان سے نیچے کاشتکار اور سوداگر +

قدیم باشندے شودر کہلاتے تھے۔ اور ان کی حالت بہت پست تھی۔ مذہب بھی ذاتوں کے نظام کا ایک جزو تھا۔ قدیم انڈیورپین قوم کو ہزارہا سال کی صحرا نوردیوں کے دوران میں جو عجیب و غریب واقعات پیش آئے تھے۔ اُن کے

حالات سب کے سب ایک کتاب میں جس کا نام وید تھا جمع کر دیئے گئے تھے۔ اس کتاب کی زبان سنسکرت تھی۔ جو برِ اعظم یورپ کی مختلف زبانوں یونانی۔ لاطینی۔ روسی۔ جرمن اور کئی اور زبانوں سے ملتی جلتی تھی + صرف تین اونچی ذاتوں کو اس مقدس صحیفوں کے پڑھنے کی اجازت تھی۔ شودر اس سے محروم رکھے گئے تھے +

اندریں حالات ہندوستان کے بیشتر لوگ ذلت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ چونکہ اس دنیا میں وہ مسرت سے یکسر محروم تھے۔ اس لئے دکھ سے نجات حاصل کرنے کے لئے اُنہیں کسی اور دنیا کی تلاش تھی + کسی آئندہ زندگی کی مسرت کے تصوّر سے اُنہیں تھوڑی بہت تسکین حاصل ہوتی تھی +

دنیا کا خالق برہم تھا۔ جسے اہل ہند زندگی اور موت کا مالک مانتے تھے۔ اور اُسے تکمل ترین ہستی سمجھ کر اُس کی پوجا کرتے تھے۔ زندگی کا اعلےٰ ترین مقصد یہ سمجھا جاتا تھا۔ کہ انسان دولت اور حکومت کی تمام خواہشات سے آزاد ہو کر برہم روپ ہو جائے پاکیزہ خیالات کا رتبہ اعمال سے بلند تر سمجھا جاتا تھا + کئی لوگ گھر بار چھوڑ کر جنگل کو چلے جاتے تھے۔ درختوں کے پتوں پر زندگی بسر کرتے تھے۔ اور جسم کو مارتے تھے۔ تاکہ دانا و بینا پاکیزگی اور بخشش کے مالک برہم کا دھیان لگا کر اپنی روح کو تقویت پہنچائیں +

سدھارتھ ان بن باسیوں سے واقف تھا۔ جو شہروں اور قصبوں کے شور سے دور حق کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اُس نے بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کا تہیہ کر لیا۔ اپنے بال کٹوا دئے۔ وفا دار چنّا کے ہاتھ ایک الوداعی پیغام کے ساتھ اپنے تمام جواہرات گھر بھیج دئے۔ اور تنِ تنہا جنگل کو نکل گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اُس کی نیکی اور تقدس کا شہرہ دُور دُور پھیل گیا + پانچ نوجوان اُس کی تعلیم سے مستفیض ہونے کیلئے آئے۔ بدھ نے اُن کو اپنا چیلہ بنا لیا۔ اس شرط پر کہ جہاں جائے وہ اُس کے ساتھ ساتھ رہیں + انہوں نے یہ شرط منظور کر لی۔ چھ سال تک کوہِ بندھیاچل کی سنسان چوٹیوں پر وہ بدھ سے کسب فیض کرتے رہے۔ لیکن بدھ کو یہی محسوس ہوا۔ کہ میں ابھی منزل سے بہت دور ہوں۔ دنیا کو چھوڑ چکا تھا۔ لیکن ہوس دنیا نے ابھی اس کا دامن نہ چھوڑا تھا۔ اپنے چیلوں کو بھیج دیا۔ خود ایک

پُرانے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اور اُنچاس دن کا برت رکھا۔ آخر کار اُسے اپنی مراد حاصل ہوئی۔ پچاسویں دن شام کے جھٹپٹے میں برہم نے اپنے عقیدت مند بھگت کو اپنا جلوہ دکھایا۔ اس کے بعد سدھارتھ کا نام بدھ پڑ گیا + جہاں جاتا لوگ عزت وتوقیر کرتے۔ کیونکہ اُس نے فانی مصیبت زدہ انسان کو دکھ سے نجات دلانے کا طریقہ دریافت کر لیا تھا +

بدھ نے زندگی کے آخری پینتالیس سال دریائے گنگا کی وادی میں گزارے جہاں وہ لوگوں کو تسلیم و رضا کی تعلیم دیتا رہا + چار سو اٹھاسی قبل مسیح میں اُس نے اس دنیا سے سفر کیا۔ لیکن اس سے پہلے کروڑوں لوگ اس کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ اُس کا مذہب کسی ایک ذات کے لئے نہ تھا۔ نیچ سے نیچ شودر بھی اُس کے حلقے میں داخل ہو سکتا تھا +

بدھ مذہب سب جانداروں کی مساوات کا قائل تھا۔ اور انسانوں کو ایک نئے جنم کی خوشخبری سُنا کر موجودہ زندگی سے بہتر زندگی کا یقین دلاتا تھا + اونچی ذاتوں نے اس بات کی سر توڑ کوشش کی۔ کہ لوگوں کو قدیم عقائد کی طرف پھر راغب کریں۔ لیکن بدھ مذہب کا مٹنا اب ناممکن ہوگیا تھا۔ بدھ کے پیرو ہمالیہ کی وادیوں میں سے ہوتے ہوئے چین تک جا پہنچے۔ بحیرہ زرد کو عبور کیا۔ اور اپنے گرو کا پیغام اہل جاپان کے کانوں تک پہنچایا۔ خود بھی اپنے آقا کے احکام پر جس نے طاقت اور قوت کے استعمال کو گناہ قرار دیا تھا۔ ہمیشہ کاربند رہے + آج کل بدھ مذہب کا زور پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ اور اس کے پیرووں کی تعداد مسلمانوں اور عیسائیوں کی مجموعی تعداد سے بڑھ کر ہے +

دانائے چین یعنی کنفیوشس کی داستان مختصر اور سیدھی سادی ہے۔ ۵۵۱ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ جبکہ چین کی مرکزی حکومت کمزور تھی۔ اور چین کے لوگ قزاقوں اور رہزن امرا کے رحم پر زندگی بسر کرتے تھے۔ لوٹ مار اور قتل وخون کا بازار گرم تھا۔ شہر ویران تھے۔ اور شمالی اور وسطی چین کے زرخیز میدان ایک بیابان بن کر رہ گئے تھے۔ جہاں لوگ بھوکوں مر رہے تھے۔ لیکن کنفیوشس کی زندگی ایک باوقار خاموش طبع شخص کی زندگی تھی۔

جس میں یہ ہنگامہ آرائیاں اور یہ شور و شغب کبھی دخل انداز نہ ہونے پایا +

کنفیوشس کو اپنی قوم سے بہت محبت تھی۔ اُس کا دل اُن کے لئے بہت کڑھتا تھا۔ لیکن طاقت اور قوت کے استعمال کو وہ بے سود سمجھتا تھا۔ خود صلح پسند شخص تھا جانتا تھا کہ محض قوانین کے بدل ڈالنے سے لوگوں کی زندگی منقلب نہیں ہو سکتی۔ اُسے یقین تھا۔ کہ جب تک نیتیں نہ بدلیں۔ نجات کی توقع فضول ہے۔ چنانچہ اُس نے بظاہر ایک ناممکن کام پر ہاتھ ڈالا۔ یعنی اُن کروڑوں انسانوں کی سیرت کو بدل ڈالنے کا تہیہ کر لیا۔ جو مشرقی ایشیا کے وسیع میدانوں میں آباد تھے + جس چیز کو ہم مذہب سمجھتے ہیں۔ اہل چین کو کبھی اُس سے چنداں دلچسپی نہ ہوئی تھی + اکثر وحشی انسانوں کی طرح وہ بھی جنات کو مانتے تھے لیکن کسی پیغمبر یا کسی الہامی کتاب پر ایمان نہ رکھتے تھے + دنیا میں جو بڑے بڑے اخلاقی رہنما گزرے ہیں۔ اُن میں سے صرف کنفیوشس ہی ایک ایسا رہنما تھا جس نے نہ پیغمبری کا دعوےٰ کیا نہ ملہم ہونے کا۔ جسے نہ کبھی خدا کا جلوہ نظر آیا نہ خدا کی آواز سنائی دی +

وہ صرف ایک معقول اور رحم دل انسان تھا۔ جو اکیلا پھرتا رہتا تھا۔ اور اپنی بانسری پر دردناک راگ بجایا کرتا تھا + نہ کسی کو اپنا پیرو بنانے کی کوشش کی۔ اور نہ بڑائی یا رہنمائی کا دعوےٰ کیا + کنفیوشس کو دیکھ کر وہ قدیم یونانی فیلسوف خصوصاً جبر یہ عقیدے کے پیرو یاد آتے ہیں۔ جو کسی صلے یا انعام کے لئے نہیں بلکہ محض اپنی روح کی تسکین کے لئے نیک خیالات اور نیک اعمال کے قائل تھے +

کنفیوشس میں رواداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں چین کے اندر ایک اور رہنما کا بھی بہت شہرہ تھا۔ اس کا نام لاؤتسے[1] تھا۔ یہ ایک نئے فلسفے کا جسے تاؤازم کہتے ہیں۔ بانی تھا (اسی فلسفے نے بعد میں "سنہری قاعدے" کی شکل اختیار کی) باوجود اختلاف عقائد کے کنفیوشس خود چل کر لاؤتسے کے پاس ملاقات کی غرض سے گیا +

کنفیوشس کو کسی سے نفرت نہ تھی۔ اُس کا عقیدہ تھا۔ کہ ضبطِ نفس سب سے

---

[1] Lao-Tse.

بڑی نیکی ہے۔ اور قابلِ قدر انسان وہی ہے۔ جو کبھی برہم نہ ہو۔ اور جو کچھ تقدیر اُسے دکھائے۔ اُسے اِس یقین کے ساتھ برداشت کرے۔ کہ دنیا کے ہر واقعے اور ہر حادثے میں کوئی نہ کوئی مصلحت پائی جاتی ہے۔ شروع شروع میں بہت کم لوگ اُس کے پاس تعلیم حاصل کرنے کی غرض آئے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ اُس کی وفات سے پہلے (جو ۴۷۸ ق م کا واقعہ ہے) چین کے کئی بادشاہ اور شہزادے اُس کے زمرے میں شامل ہو گئے + جب یسوع مسیح بیت اللحم میں پیدا ہوئے۔ تو کنفیوشس کا فلسفہ بیشتر اہل چین کی ذہنیت کا جزو بن چکا تھا + چین میں کنفیوشس کا اقتدار اب تک قائم ہے۔ لیکن اُس کے فلسفے کی اصلی وضع بہت کچھ بدل چکی ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ امتدادِ زمانہ سے اکثر مذہب بدلتے رہتے ہیں۔ مسیح نے لوگوں کو انکسار اور تسلیم اور ہوسِ دنیا سے پاک رہنے کا سبق سکھایا تھا۔ لیکن مسیح کی وفات کے پندرہ سو سال بعد کلیسائے مسیح کا نائب کروڑوں روپے ایک ایسی عمارت پر صرف کر رہا تھا۔ جس کو بیت اللحم کے طویلے یعنی مسیح کے مولد سے دور کی نسبت بھی نہ تھی +

لاؤتسے نے لوگوں کو "سنہری قاعدہ" سکھایا تھا۔ لیکن تین صدیوں کے اندر اندر جہلا نے اُسے بے رحم خدا بنا دیا۔ اور اُس کے احکام اور ارشادات کو اُن توہمات کے ڈھیر کے نیچے دفن کر دیا۔ جن کی وجہ سے عام چینیوں کی زندگی طرح طرح کے خدشوں اور وسوسوں میں الجھی رہتی ہے +

کنفیوشس نے اپنے پیروؤں کو والدین کی عزت کرنا سکھایا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہُوا کہ لوگ مرحوم والدین کی یاد کو اولاد کی پرورش سے بھی افضل سمجھنے لگے۔ اُنھوں نے مستقبل سے منہ موڑ لیا اور ماضی کی وسیع تاریکی پر اپنی متجسس نظریں گاڑ دیں۔ آباؤ اجداد کی پرستش نے ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی + اگر کسی پہاڑی کی روشن اور زرخیز ڈھلوان پر کوئی قبرستان ہوتا۔ تو اُسے بالکل نہ چھیڑتے۔ اور کاشتکاری کے لئے اُسے چھوڑ کر دوسری ڈھلوان کو جو سنگلاخ اور بنجر ہوتی۔ منتخب کر لیتے۔ قحط اور افلاس انہیں گوارا تھا۔ لیکن قبروں کا انہدام انہیں گوارا نہ تھا +

تاہم مشرقی ایشیا کی بڑھتی ہوئی آبادی پر کنفیوشس کی تعلیم کا اثر بالکل ہی زائل کبھی نہ ہؤا۔ اس دانائے چین کے بتائے ہوئے رموز و نکات اس قدر دل نشین ہوئے کہ اُن سے ہر چینی کے دل پر (خواہ وہ کوئی غریب دھوبی تھا جو کسی تہ خانے میں محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ یا کسی وسیع مملکت کا فرمانروا جو عالیشان محل کی بلند چار دیواری کے اندر رہتا تھا) معقولیت اور فلسفے کا ایک رنگ چڑھ گیا۔ اور ان کی تمام زندگی اس سے اثرپذیر ہوئی +

سولھویں صدی میں مغرب کے پُر جوش مگر غیر مہذب عیسائیوں کا مشرق کے قدیم مذاہب سے آمنا سامنا ہؤا + اولین ہسپانیوں اور پرتگیزوں نے بدھ کے پُرسکون مجسموں کو دیکھا۔ کنفیوشس کی باوقار تصاویر پر غور کیا۔ لیکن اُن کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ یہ مقدس ہستیاں جن کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کسی دور دراز دنیا کا پتہ دیتی ہے کیا کہہ رہی ہیں۔ اُن کی سمجھ میں یہی آیا۔ کہ یہ عجیب و غریب دیوتا محض شیطان ہیں۔ بے دینوں اور بُت پرستوں کے معبود ہیں۔ اور اس قابل نہیں کہ کلیسا کے سچے فرزند ان کی تکریم کریں + جہاں کہیں بدھ یا کنفیوشس کی روح مصالحے یا ریشم کی تجارت کے رستے میں حائل ہوتی۔ اہلِ یورپ اس "شیطنت" پر بندوقوں اور تلواروں سے حملہ آور ہوتے + اس طریق کار سے بعض خرابیاں بھی پیدا ہوئیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں ایسی نفرت اور بیگانگی کا سامنا ہو رہا ہے جس سے مستقبل میں بھلائی کی کوئی امید نظر نہیں آتی +

ریفارمیشن (اصلاح مذہبی)

نسل انسانی کی ترقی کی مثال ایک بہت بڑے پنڈولم کی ہے۔ جو ہمیشہ ادھر سے ادھر ہلتا رہتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں لوگ مذہب سے بے پروا اور علوم وفنون میں منہمک تھے۔ اس کے بعد ریفارمیشن کا زمانہ آیا۔ اور لوگ علوم وفنون کو چھوڑ کر پھر مذہب کی طرف متوجہ ہوئے +

تم "ریفارمیشن" کے لفظ سے ضرور واقف ہو گے۔ اس نام کو سن کر ان بہادر مہاجرین کی مختصر سی جماعت کا خیال آتا ہے۔ جنہوں نے "آزادئی عبادت" کی خاطر سمندر کو عبور کیا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ لوگ اس تحریک کی وجوہ و نتائج کو بھولتے گئے۔ اور اب تو اہل یورپ (بالخصوص پراٹسٹینٹ ممالک کے باشندے) اس تحریک کو "آزادئی خیالات" کا مرادف اور مارٹن لوتھر[1] کو اس اصلاح کا رہنما سمجھتے ہیں۔ لیکن تاریخ نویسی کا یہ مطلب نہیں۔ کہ اپنے آبا و اجداد کے گُن گا گا کر صفحوں کو سیاہ کیا جائے اور بس۔ بقول جرمن مؤرخ رانکے[2] کے ہمیں یہ پتہ لگانا چاہئے۔ کہ "فی الواقع کیا ہؤا؟" اس تجسس کے بعد ماضی کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے +

دنیا میں بہت کم چیزیں ایسی ہیں۔ جو سراسر اچھی یا سراسر بُری ہوں۔ جس طرح بہت کم اشیا ایسی ہیں۔ جو بالکل سیاہ یا بالکل سفید ہوں + ایک راستگو مؤرخ کا فرض ہے۔ کہ وہ ہر تاریخی واقعے کے اچھے بُرے دونو پہلو بے نقاب کرے + یہ کام آسان نہیں۔ کیونکہ ہم اپنے ذاتی تعصبات سے دل کو پاک وصاف

---

[1] Martin Luther [2] Rank

نہیں کر سکتے۔ تاہم ہمیں کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔ کہ ہم واقعات کے جانچنے اور پرکھنے میں انصاف اور حق پسندی سے کام لیں ⁂

میری اپنی مثال لو۔ میری پرورش نہ صرف ایسے ملک میں ہوئی جو پراٹسٹنٹ تھا۔ بلکہ ایسے شہر میں ہوئی۔ جسے اس ملک میں پراٹسٹنٹ عقیدے کا مرکز کہنا چاہیئے۔ بارہ برس کی عمر تک کسی کیتھولک سے میری ملاقات نہ ہوئی۔ اس کے بعد جب ان سے دوچار ہونے کا موقع پیش آیا۔ تو میں ان سے ڈرتا تھا۔ بچپن سے سنتا آیا تھا۔ کہ ڈیوک آف[1] ایلبا نے اہل ہالینڈ کی "بیدینی" کو (جو لوتھر اور کالون[2] کی تعلیم کا نتیجہ تھی) مٹانے کی کوشش کی تھی۔ اور ہسپانیہ کے محکمہ احتساب نے لاکھوں انسانوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ اور پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ اور ان کے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ یہ واقعہ ایسا ذہن نشین تھا۔ گویا کل کی بات ہو۔ اور یہی ڈر رہتا تھا۔ کہ مبادا یہی واقعہ پھر پیش آئے۔ سینٹ بارتھولومیو[3] کی رات کے سانحے پھر دہرائے جائیں۔ اور مجھ غریب کو بہادر امیر البحر دی کولونی[4] کی طرح رات کے لباس میں قتل کر دیا جائے۔ اور میری لاش کھڑکی سے باہر پھینک دی جائے ⁂

بہت عرصہ بعد مجھے کئی سال ایک کیتھولک ملک میں رہنے کا اتفاق ہؤا۔ میں نے دیکھا۔ کہ کیتھولک لوگ میرے ہموطنوں کی طرح ذہین اور عقلمند ہیں۔ اور خوش اخلاقی اور روا داری میں تو ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔ یہ معلوم کر کے اور بھی تعجب ہؤا۔ کہ ریفارمیشن کے متعلق کیتھولک لوگوں کا نقطۂ نظر پراٹسٹنٹ لوگوں سے مختلف ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو پراٹسٹنٹ لوگوں سے زیادہ حق بجانب سمجھتے ہیں ⁂

سولھویں اور سترھویں صدی کے لوگ جو خود ریفارمیشن کے دور میں سے گزر رہے تھے۔ اس تحریک کے دونو پہلوؤں کو یوں نہ پرکھتے تھے۔ ان کا تو یہ ایمان تھا کہ ہم راستی پر ہیں۔ اور ہمارے دشمن گمراہ ہیں۔ حالات ہی ایسے تھے۔ کہ یا دشمن

---

[1] Duke of Alba [2] Calvin [3] St. Bartholomew
[4] do Coligny

کو پھانسی پر لٹکاتے یا خود پھانسی پر لٹکنا پڑتا۔ اور انہیں بہتر یہی معلوم ہوتا۔ کہ دشمن کو پھانسی پر لٹکایا جائے۔ اس میں ان کا کیا گناہ؟ فطرت انسانی کا تقاضا یہی ہے +

۱۵۰۰ء کی دنیا (اس سن کا یاد رکھنا مشکل نہیں۔ شاہنشاہ چارلس پنجم کی پیدائش بھی اسی سال ہوئی تھی) کس قسم کی دنیا تھی؟ غور سے دیکھو تو نظر آتا ہے کہ جہاں زمانہ وسطیٰ میں بدنظمی کا دور دورہ تھا وہاں اب بے شمار منظم مملکتیں قائم ہیں۔ اور ہر مملکت کی مرکزی حکومت طاقتور اور مستحکم ہے۔ سب سے طاقتور شہنشاہ چارلس اعظم ہے۔ جو ابھی شیرخوار بچہ ہے۔ لیکن یہ فرڈی ننڈ اور ازبیلا کا پوتا اور زمانہ وسطیٰ کے شہسواروں کے آخری سردار میکسی ملن آف ہیپس برگ[ل] اور اس کی بیوی چارلس جری کی بیٹی کا (یعنی اس برگنڈی کے ڈیوک کی دختر نیک اختر کا جس جس فرانس کو شکست دی تھی۔ لیکن خود سوئٹزرلینڈ کے آزاد دہقانوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا) نواسا تھا + شیرخوار چارلس بیشتر روئے زمین کا مالک تھا۔ اور اپنے والدین دادا نانا چچا ماموں کے املاک کا نیز اُن تمام اقربا کے مقبوضات کا جو جرمنی۔ آسٹریا۔ ہالینڈ۔ بلجیم اطالیہ اور ہسپانیہ میں زمینوں کے مالک تھے۔ اور جن کی نوآبادیاں ایشیا۔ افریقہ اور امریکہ میں واقع تھیں۔ واحد وارث تھا + چارلس شہر گھنٹ کے قلعے میں پیدا ہوا ہے۔ جو فلانڈرز کے امرا کی ملکیت ہے۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے۔ کہ ۱۹۱۴ء کے جنگِ عظیم میں جرمنوں نے اسی قلعے کو بطور قید خانے کے استعمال کیا اور اہل فلانڈرز کو وہاں محبوس کیا + چارلس گو ہسپانوی بادشاہ اور جرمن شہنشاہ ہے لیکن تعلیم اُسے ایک فلیمنگ کی سی دی گئی ہے +

اُس کا باپ مرچکا ہے (بعض لوگ کہتے ہیں اسے زہر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ قیاس پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا)۔ اُس کی ماں پاگل ہو چکی ہے۔ اور اپنے مرحوم شوہر کی نعش کو تابوت میں اٹھائے ملک ملک پھر رہی ہے + بچہ اپنی خالہ مارگیرٹ کی سرپرستی میں پرورش پا رہا ہے + اس شیرخوار شہنشاہ کے زیرسایہ جرمن اور اطالوی

[ل] Maximillan of Habsburg

اور ہسپانوی اور بے شمار بھانت بھانت کی قومیں رہتی ہیں جن پر بڑے ہو کر اُسے حکومت کرنا ہے۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے وہ فلیمنگ ہے۔ اس لئے کلیسائے کیتھولک کا سچا فرزند ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا دل مذہبی تعصب سے نفور ہے۔ بچپن سے کاہل اور سست ہے۔ لیکن مقسوم میں دنیا کی بادشاہی لکھی ہے اور دنیا بھی ایسی کہ جوشِ مذہبی کی وجہ سے اُس میں جا بجا شورشیں بپا ہو رہی ہیں۔ اُسے لمحہ بھر کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ میڈرڈ سے اِنڈبروک تک اور بروجز سے وائنا تک مارا مارا پھرتا ہے۔ طبیعت صلح جُو اور سکون پسند ہے لیکن جنگ سے فرصت نہیں ملتی۔ پچپن برس کی عمر میں اہلِ دنیا کی حماقتوں اور سیاہ کاریوں سے متنفر ہو کر دنیا سے منہ موڑ لیتا ہے۔ اور تین سال بعد مایوسی اور تھکن سے چُور ہو کر فرشتۂ اجل کو لبیّک کہتا ہے۔

یہ تو شہنشاہ چارلس کا حال ہوا۔ اب دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت یعنی کلیسا کا حال سنو۔ کلیسا کی حالت اب اوائل زمانۂ وسطی کی سی نہیں رہی۔ جب اس نے کفّار پر تلوار اٹھائی تھی۔ اور نیکی اور تقدّس کا علَم بلند کیا تھا۔ اوّل تو کلیسا کے پاس اب دولت کی ریل پیل ہے۔ پاپائے روما مسکین مسیحیوں کے گلے کا گڈریا نہیں رہا۔ وہ ایک عالیشان محل میں جلوہ افروز ہے۔ اور اس کے اِرد گرد اہلِ فن اور ادیبوں اور ماہرین موسیقی کا جھمگٹا لگا رہتا ہے۔ گرجوں میں اولیاء اللہ کی نئی نئی تصاویر آویزاں ہیں۔ لیکن ان تصویروں میں مصوّروں نے یونانی دیوتاؤں کا سا ارضی حسن ضرورت سے زیادہ بھر دیا ہے۔ پاپا اپنے اوقات کا صرف دسواں حصہ معاملاتِ سلطنت کو دیتا ہے اور باقی تمام وقت رومن مجسموں یا نئے نئے یونانی مرتبانوں یا اپنے تابستانی محل کے نقشوں یا کسی نئے کھیل کی ریہرسل میں منہمک رہتا ہے۔ پاپا کا ہر مشیر اور ہر اُسقفِ اعظم پاپا کی نقل کرتا ہے اور ہر اُسقف اُسقفِ اعظم کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ البتہ گاؤں کے پادری اپنے فرائض کی بجا آوری میں بدستور کوشاں ہیں۔ اور دُنیا کی سیاہ کاریوں اور حسن و عیش کی کافرانہ ہوس رانیوں سے اپنا دامن تر نہیں ہونے دیتے۔ وہ خانقاہوں سے دور رہتے ہیں۔ کیونکہ خانقاہوں کے راہب افلاس اور ناداری کے عہد کو

پس پشت ڈال کر اور لوگوں سے نظر بچا کر عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں +
عوام کی زندگی پہلے سے بہت بہتر ہے - وہ اب زیادہ خوشحال ہیں - زیادہ آرام دہ مکانوں میں رہتے ہیں - مکتب اب پہلے سے بہتر اور شہر اب پہلے سے زیادہ خوبصورت ہیں - اسلحہ بارود کی وجہ سے لوگ اب اپنے پرانے دشمنوں یعنی قزاق اُمرا سے جو تاجروں سے محصول کی بڑی بڑی رقمیں وصول کیا کرتے تھے - اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں +
یہ تو اُن لوگوں کا حال تھا - جنہوں نے ریفارمیشن میں بہت نمایاں حصہ لیا +

اب ذرا اس بات پر غور کریں کہ نشاۃ ثانیہ نے یورپ پر کیا اثر ڈالا تھا - تاکہ یہ سمجھ میں آجائے - کہ علم و فن کے نئے جنم کے بعد جوشِ مذہبی کا دوبارہ ظہور میں آنا لابد کیوں ہوا + نشاۃ ثانیہ کا آغاز اطالیہ میں ہوا - اور وہاں سے یہ تحریک فرانس میں پہنچی + ہسپانیہ کے لوگ تو پانچ سو سال تک مُوروں سے برسرپیکار رہ چکے تھے - اور جنونِ مذہبی اور تنگ خیالی اُن کی طبیعت میں سما گئی تھی - اِس لئے نئی روشنی کا اُن پر چنداں اثر نہ ہؤا + تاہم نشاۃ ثانیہ کا حلقہ اثر روز بروز وسیع تر ہوتا گیا + لیکن جب اس تحریک نے کوہ ایلپس کو عبور کیا - تو اس کی شکل بدل گئی +
آب و ہوا کے اختلاف کی وجہ سے شمالی یورپ کے باشندوں کا مطمحِ نظر اپنے جنوبی پڑوسیوں سے بہت مختلف بلکہ اُس کے برعکس تھا + اطالوی لوگ نیلے آسمان کے نیچے کھلی ہوائیں زندگی بسر کرتے تھے - اُن کے لئے گانا اور ہنسنا اور خوش رہنا آسان تھا + جرمنی ہالینڈ انگلستان اور سویڈن کے لوگ اپنا بیشتر وقت گھر کے اندر گزارتے تھے - اور اپنے آرام دہ چھوٹے چھوٹے مکانات کی بند کھڑکیوں پر بارش کی پڑا پڑ سنتے رہتے تھے + اس طرح کی زندگی سے اُن کی طبیعت میں خوش دلی کی بجائے متانت اور سنجیدگی پیدا ہوگئی تھی + انسان کی غیر فانی روح کا خیال اُن کے دل سے کبھی محو نہ ہوتا تھا - اور جن چیزوں کو وہ مقدس اور قابلِ تعظیم سمجھتے تھے - اُن کا ٹھٹھا اُڑا سکتے تھے + نشاۃ ثانیہ کا علمی پہلو یعنی قدیم

مصنفین اور قواعدِ زبان اور دیگر علوم کا مطالعہ۔ اس سے تو انہیں بہت دلچسپی تھی لیکن نشاۃ ثانیہ کی بدولت جس طرح اطالیہ قدیم روما اور یونان کی غیر مسیحی تہذیب کی طرف رجوع کر رہا تھا۔ ویسے شمالی ممالک میں ناممکن تھا + شمال کے لوگ اس تہذیب کے شوق کو بددینی کے مرادف سمجھتے تھے۔ اور اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے +

لیکن پاپا اور اُس کے مشیر تمام تر اطالوی تھے + اُنھوں نے کلیسا کو ایک خوشگوار سا کلب بنا رکھا تھا۔ جہاں فن اور موسیقی اور ناٹک کے تو اکثر تذکرے رہتے تھے۔ لیکن مذہب کا نام شاذ ہی زبان پر آتا تھا + چنانچہ متین طبیعت اہلِ شمال اور زیادہ مہذّب مگر خوش دل اور بے پروا اہل جنوب کے درمیان تفرقہ بڑھتا گیا۔ اور کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ کلیسا معرضِ خطر میں پڑ رہا ہے +

ریفارمیشن کی تحریک جرمنی میں کیوں پیدا ہوئی اور سویڈن یا انگلستان میں کیوں پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی بھی وجوہ ہیں۔ گو وہ چنداں اہم نہیں + جرمن قوم کو روما سے پرانی دشمنی تھی + شہنشاہ اور پاپا کے مابین لڑائیوں کے لامتناہی سلسلے نے دونو کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا رکھا تھا + یورپ کے دیگر ممالک میں سلطنت کی باگیں طاقتور بادشاہوں کے ہاتھ میں تھیں۔ اس لئے فرمانروائے ملک اپنی رعایا کو پادریوں کی حرص و آز سے بچا سکتا تھا لیکن جرمنی میں جہاں ایک نام نہاد بادشاہ بے شمار شورش پسند چھوٹے چھوٹے رئیسوں پر حکمران تھا۔ بیچارے شہری اُسقفوں اور پادریوں کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے + نشاۃ ثانیہ کے زمانے کے پاپاؤں کو عالیشان گرجے بنانے کا بہت شوق تھا۔ اور اس شوق کو پورا کرنے کے لئے پادریوں کے ذریعے شہریوں سے روپیہ وصول کرتے تھے + اہلِ جرمنی کو یہ گوارا نہ تھا کہ ایک تو پاپا اُنہیں نفرت اور حقارت سے دیکھے اور پھر اپنا شوق پورا کرنے کے لئے ان کی جیبوں پر ہاتھ ڈالے +

اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی۔ جسے مورخین اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں + چھاپے کی مشین جرمنی میں ایجاد ہوئی تھی + شمالی یورپ میں کتابیں سستی تھیں +

انجیل پہلے کی طرح اب ایک پُراسرار کتاب نہ رہی تھی - کہ صرف پادریوں ہی کے پاس موجود ہو اور وہی اُسے سمجھ سکیں + جس گھر میں باپ اور بچے لاطینی زبان سمجھتے تھے - وہاں انجیل کا ایک نسخہ موجود تھا + رفتہ رفتہ کلیسا کی مرضی کے خلاف گھر کے سب لوگ اُسے پڑھنے لگے + جب اُس کا مطالعہ کیا تو معلوم ہُوا کہ پادری کئی باتیں ایسی بیان کرتے ہیں - جو کتابِ مقدس میں نہیں پائی جاتیں + اس سے طرح طرح کے شبہات پیدا ہوئے - لوگوں کے دلوں میں قسم قسم کے سوالات اُٹھے + جب سوالات کے جواب نہ ملیں - تو بڑی خرابی پیدا ہوتی ہے +

کشمکش کا آغاز یوں ہُوا کہ شمال کے ماہرین انسانیات نے راہبوں کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا + پاپا کی عزت و حرمت ابھی دلوں میں باقی تھی - اس لئے براہ راست اُس کی مقدس ذات پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی + لیکن کاہل اور جاہل راہبوں کو جو اپنے ہوس خانوں یعنی خانقاہوں کی چار دیواری کے اندر عیش کرتے تھے - مزے لے لے کے تنگ کیا +

تم یہ سُن کر حیران ہو گے - کہ اس تحریک میں جو شخص سب سے پیش پیش تھا - وہ کلیسا کا ایک سچا فرزند تھا + اس کا نام جیرارڈ جیرارڈ زون[1] تھا - لیکن اسے عام طور پر ایراسمس[2] کہتے ہیں + ملکِ ہالینڈ کے شہر راسٹرڈیم کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہُوا - اور ڈیونیٹر کے اُسی لاطینی سکول میں تعلیم پائی - جہاں سے برادر طامس فارغ التحصیل ہو کر نکلا تھا + بڑا ہو کر پادری بنا اور کچھ عرصہ ایک خانقاہ میں زندگی گذاری + سفر بہت کیا تھا اس لئے جو کچھ لکھتا اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر لکھتا + اُس نے بہت سے پمفلٹ شائع کئے - (وہ آج کل زندہ ہوتا تو اُسے اخبار نویس کہا جاتا) جن میں "غیر معروف اشخاص کے خطوط" کے عنوان سے گمنام چٹھیوں کا ایک سلسلہ شائع کیا + لوگ انہیں پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے + یہ چٹھیاں منظوم تھیں - اور ظریفانہ رنگ میں لکھی گئی تھیں - اِن کی زبان لاطینی تھی - مگر وہ لاطینی جو جرمنی میں مستعمل تھی + اِن

---

[1] Gerard Gerardzoon. [2] Erasmus.

چٹھیوں کے ذریعے ایراسمس نے آواخر زمانۂ وسطیٰ کے راہبوں کی نخوت۔ تعصب اور حماقت کا خوب مضحکہ اڑایا ہے + ایراسمس عالم و فاضل شخص تھا۔ اور لاطینی اور یونانی دونو زبانوں کا ماہر + عہد جدید کا پہلا مستند لاطینی ترجمہ اسی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اور انجیل کے اصلی یونانی نسخے کو بھی اسی نے اغلاط سے پاک کر کے شائع کیا۔ لیکن رومن شاعر سیلسٹ[۱] کی طرح اس کا عقیدہ تھا کہ حقیقت کو مسکراہٹ اور خندہ پیشانی کے ساتھ آشکارا کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی +

سنہ ۱۴۹۹ء میں سر طامس مور[۲] کو ملنے انگلستان گیا + وہاں فراغت کے زمانے میں چند ہفتوں کے اندر اُس نے ایک چھوٹی سی مزاحیہ کتاب لکھی جس کا نام اُس نے "حماقت کی خوبیاں" رکھا۔ اس کتاب میں اُس نے راہبوں اور اُن کے ضعیف الاعتقاد پیروؤں کی خوب خبر لی۔ اور اُن کی تذلیل کے لئے فن انشا کے مہلک ترین حربے یعنی ظرافت کو استعمال کیا + سولھویں صدی میں یہ کتاب سب کتابوں سے زیادہ بکی۔ اور قریباً ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہوا + اسے پڑھ کر لوگ ایراسمس کی دیگر تصانیف کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ جن میں اُس نے کلیسا کی اصلاح کی ضرورت کو ثابت کیا تھا۔ اور انسانیت کے دیگر ماہرین سے التجا کی تھی۔ کہ وہ دینِ مسیحی کو از سرِ نو زندہ کرنے میں اُس کے ممد و معاون ہوں +

لیکن اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ ایراسمس معقولیت پسند اور روادار اس قدر تھا۔ کہ جو لوگ کلیسا کے مخالفین تھے۔ وہ بھی اس سے خوش نہ ہوئے۔ انہیں کسی زیادہ سخت گیر رہنما کی تلاش تھی +



لوتھر بائیبل کا ترجمہ کرتا ہے

آخر کار قدرت نے ان کی مرضی کا ایک رہنما پیدا کر دیا۔ اس کا نام مارٹن لوتھر تھا + لوتھر شمالی جرمنی کا ایک کسان تھا۔ لیکن

---

[۲] Sir thomas More   [۱] Sallust.

دماغ اعلےٰ درجے کا پایا تھا۔ اور دلیر بے انتہا تھا۔ ایرفرٹ[۱] کی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرچکا۔ تو ایک ڈومنیکنی[۲] خانقاہ میں داخل ہوگیا۔ وہاں سے فارغ ہوکر وٹن برگ[۳] کے مدرسہ دینیات میں پروفیسر بن گیا۔ اور اپنے ہموطن کسانوں کے بیٹوں کو کتاب مقدس کا درس دیتا رہا۔ فرصت بہت ملتی تھی۔ اُدھر درس دینا ادھر عہد عتیق اور عہد جدید کے اصلی نسخوں کا مطالعہ کرتا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس پر یہ روشن ہو گیا۔ کہ یسوع مسیح کے اقوال اور پاپاؤں اور اسقفوں کے احکام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۱۵۱۱ء میں سرکاری کام کے لئے روما آیا۔ خاندان بورجیا[۴] کا سکندر ششم جس کا اندوختہ اس کے لڑکے اور لڑکی کے کام آرہا تھا۔ مرچکا تھا۔ اس کا جانشین جولیس[۵] دوم خود بہت نیک تھا۔ لیکن اپنا بیشتر وقت جنگ اور تعمیرات میں صرف کردیتا تھا۔ چنانچہ لوتھر اس کی نیکی سے چنداں متاثر نہ ہوا۔ اور مایوس ہوکر وٹن برگ واپس چلا آیا۔ لیکن آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

پاپائے جولیس نے اپنے جانشینوں کو وصیت کی تھی۔ کہ سینٹ پطرس کا ایک شاندار گرجا تعمیر کیا جائے۔ تعمیر کا کام ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا۔ کہ مرمت کی نوبت آن پہنچی۔ سکندر ششم نے خزانہ پاپائی کی ایک ایک کوڑی صرف کردی تھی۔ لیو[۶] دہم نے جو ۱۵۱۳ء میں جولیس کے بعد پاپا بنا۔ پیسے پیسے کو محتاج ہورہا تھا۔ اس نے روپیہ جمع کرنے کا پرانا طریقہ اختیار کیا۔ اور "عفونامے" فروخت کرنے لگا۔ "عفونامہ" موٹے کاغذ کے ایک ورق کو کہتے تھے۔ جو روپے کے بدلے خریدا جاتا تھا۔ اور جس کے رو سے پاپا یہ اقرار کرتا تھا۔ کہ یہ جس کو دیا جاتا ہے۔ وہ مقررہ وقت سے اتنا عرصہ پہلے اعراف سے نکال کر جنت میں ڈالا جائیگا۔ اواخر زمانۂ وسطیٰ کے اعتقادات کے مطابق یہ بات بالکل صحیح تھی۔ کلیسا کو جہاں یہ قدرت حاصل تھی۔ کہ وہ تائب انسانوں کے گناہ معاف کردے۔ وہاں اسے یہ اختیار کیوں نہ تھا کہ وہ اولیاء اللہ کو شفیع بنا کر

---

[۱] Erfurt. [۲] Dominican. [۳] Wittenberg.
[۴] Borgia. [۵] Julius. [۶] Leo.

خدا سے یہ بھی منوا لے۔ کہ فلاں شخص کے لئے اعراف کی دنیا میں صرف اتنا عرصہ قیام کرنا کافی ہے۔ اسی میں اس کی تطہیر ہو جائیگی +

یہ البتہ قابلِ افسوس تھا۔ کہ عفو ناموں کو روپے کے بدلے بیچنا پڑتا تھا لیکن اس میں کیا قباحت تھی + جو نادار تھے۔ اُن سے کچھ نہ لیا جاتا۔ اور جو صاحب مقدور تھے اُن کے روپے سے بغیر کسی دقت کے خزانہ پاپائی میں اضافہ ہوتا رہتا +

۱۵۱۷ء میں سیکسنی کے علاقے میں عفو ناموں کی فروخت کا اجارہ ایک ڈومی نیکی راہب کے حوالے کر دیا گیا جس کا نام جوہان ٹیٹسل تھا + برادر جوہان نے تاجرانہ طبیعت پائی تھی۔ اس نے عفو ناموں کی تجارت کو فروغ دینے میں دن رات ایک کر دیا + علاقے کے دیندار لوگ اس کے طور طریقوں کو دیکھ کر بہت برافروختہ ہوئے اور لوتھر کو تو اس قدر غصہ آیا۔ کہ وہ آپے سے باہر ہو گیا + اکتیس اکتوبر ۱۵۱۷ء کو لوتھر نے ایک کاغذ پر عفو ناموں کی فروخت کے خلاف پچانوے دلائل لکھ کر اس کی نقلیں گرجا کے دروازوں پر چسپاں کر دیں + یہ دلائل لاطینی زبان میں تھے۔ کیونکہ لوتھر کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ عوام میں کوئی شورش بپا ہو + اُس کی طبیعت ہی شورش پسند نہ تھی + وہ عفو ناموں کی فروخت کو ناجائز سمجھتا تھا۔ اور اُس کا مقصد صرف یہ تھا۔ کہ جو پروفیسر میرے ساتھ کے کام کرنے والے ہیں۔ وہ ان اعتراضات سے آگاہ ہو جائیں + اُس کا یہ فعل محض علما کی دنیا تک محدود تھا ــــ عوام کو اکسانا اس کا مقصد نہ تھا +

لیکن شومئ قسمت سے اُس زمانے میں ہر کہ و مہ مذہبی معاملات میں دلچسپی لیتا تھا۔ اور جب کبھی کوئی مذہبی معاملہ معرضِ بحث میں آتا۔ لوگوں ایک ہلچل سی مچ جاتی + دو مہینے کے اندر اندر اس سیکسن راہب کے پچانوے[۹۵] دلائل پر یورپ بھر میں بحثیں ہونے لگیں۔ ہر شخص یا اُن کی حمایت میں یا اُن کے خلاف بولنے لگا ــــ ہر چھوٹے سے چھوٹے پادری اور گمنام سے گمنام عالم نے اپنا اپنا فتوے شائع کیا + پاپائی حکام کا ماتھا ٹھنکا۔ اُنہوں نے وٹن برگ کے پروفیسر کو حکم دیا کہ تم روما جا کر

Johan Tetzel

اپنی اس حرکت کی جواب دہی کرو+ لیکن لوتھر کو ہُس کا انجام یاد تھا۔ اُس نے جرمنی سے باہر قدم نہ رکھا+ پاپا نے اُسے کلیسا سے خارج کر دیا+ لوتھر نے پاپا کے فرمان کو برسر عام آگ کی نذر کر دیا اور لوگوں نے تعریف و تحسین کے نعرے بلند کئے+ اس کے بعد لوتھر اور پاپا کے درمیان ہمیشہ کے لئے ٹھن گئی+

واقعات و حالات کے اقتضا نے لوتھر کو غیر مطمئن عیسائیوں کی ایک بہت بڑی فوج کا سردار بنا دیا+ جرمن محبانِ وطن مثلاً فان ہٹن[1] اُس کی مدد کو دوڑے۔ وٹن برگ اور ایرفرٹ اور لائپزگ کے طلبا نے عہد کر لیا کہ لوتھر کو گرفتار نہ ہونے دینگے لیکن سیکسنی کے حاکم نے ان نوجوانوں کو یقین دلایا کہ جب تک لوتھر سیکسنی کی حدود کے اندر ہے اُس کا بال تک بیکا نہ ہوگا+

یہ سب واقعات ۱۵۲۰ء میں رونما ہوئے+ چارلس پنجم بیس سال کا تھا اور چونکہ نصف دنیا پر حکمران تھا۔ اِس لئے پاپا سے بگاڑ نہ سکتا تھا+ اُس نے دریائے رائن پر ورمز[2] کے شہر میں ایک انجمن منعقد کی اور لوتھر کو جواب دہی کے لئے حاضر ہونے کا حکم دیا+ لوتھر نے جواب جرمن قوم کی آنکھ کا تارا بن چکا تھا حاضر ہوکر صاف صاف کہ دیا کہ جو کچھ میں کہ چکا ہوں یا لکھ چکا ہوں۔ اُس میں سے میں ایک حرف بھی واپس لینے کے لئے تیار نہیں —— میرا ضمیر خدا کے سوا کسی کا تابع فرمان نہیں اور میں ضمیر کی خاطر جان تک قربان کرنے پر آمادہ ہوں+

ورمز کی انجمن نے بڑے غور و فکر کے بعد لوتھر کو خدا اور انسان کا باغی قرار دیا۔ اور اہل جرمنی کو حکم دیا کہ کوئی شخص نہ اسے پناہ دے۔ نہ اسے کھانے پینے کو کچھ دے اور نہ اس بے دین کی تصنیفات کو پڑھے+ لیکن لوتھر کو کوئی خطرہ نہ تھا+ شمالی جرمنوں کی بہت بڑی اکثریت نے اس حکم کو غیر منصفانہ اور ہتک آمیز قرار دے کر اُسے نظر انداز کر دیا۔ اور لوتھر کو وارٹ برگ کے قلعے میں جو حاکم سیکسنی کی ملکیت تھا چھپا دیا+ وہاں بیٹھ کر اس نے ساری کی ساری انجیل جرمن زبان میں ترجمہ کر ڈالی تاکہ ہر شخص خدا کے کلام کو بغیر کسی پادری کی وساطت کے پڑھ

---

[1] Von Hutten. [2] Worms.

سکے اور اُس کے معنی سے پوری طرح آگاہ ہو جائے +

ریفارمیشن اب محض ایک روحانی اور مذہبی تحریک نہ رہی تھی + وہ لوگ جنہیں گرجاؤں کی جدید خوبصورت عمارتوں سے نفرت تھی - اس لئے کہ اُن کا حُسن ان کی سمجھ سے بالاتر تھا - اُنہوں نے اس شورش سے فائدہ اُٹھا کر انہیں منہدم کر دیا + قلاش اُمرا خانقاہوں کی زمینوں پر قابض ہو کر پھر متمول ہو گئے + غیر مطمئن والیانِ ملک نے شہنشاہ کی غیر حاضری میں پہلے سے زیادہ طاقت پکڑ لی + مفلس کسانوں نے نیم مجنوں شورش پسندوں کے کہے میں آ کر اپنے آقاؤں کے قلعوں پر دھاوا بول دیا - اور پرانے صلیبیوں کے سے جوش کے ساتھ لوٹ مار اور قتل و خون کا بازار گرم رکھا - اور جو یوں غارت نہ ہو سکا - اُسے جلا کر راکھ کر دیا +

مملکت کے گوشے گوشے میں بدنظمی و ابتری پھیل گئی + بعض والیانِ ملک نے پروٹسٹنٹ (یعنی لوتھر کے حمایتی) بنکر اپنی کیتھولک رعایا کو طرح طرح کی سزائیں دیں + بعض اپنے پرانے دین پر قائم رہے - انہوں نے پراٹسٹنٹ رعایا کو پھانسیوں پر لٹکا دیا - ۱۵۲۶ء میں سپائر کی انجمن نے اس اختلاف کو مٹانے کے لئے حکم دیا - کہ رعایا کا مذہب وہی ہونا چاہیئے - جو والئے ملک کا ہے + اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ جرمنی میں ہزارہا چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن بن کر بگڑیں - اور ہمیشہ آپس میں دست و گریبان رہیں - اور اِن کے باہمی تنازعات نے کئی سو سال تک سیاسی ترقی کا راستہ بند کر دیا +

فروری ۱۵۴۶ء میں لوتھر نے وفات پائی اور اُسی گرجا میں دفن ہؤا - جہاں اُنتیس سال پہلے عفو ناموں کی فروخت کے خلاف اپنے اعتراضات کا اعلان کیا تھا + ریفارمیشن نے تیس سال سے بھی کم عرصے کے اندر اندر نشاۃ ثانیہ کے زمانے کی بے پروا و بے فکر ــــ خنداں و شاداں دنیا کو جھگڑالو - پُرشور - بدزبان چٹل خور لوگوں کا ایک دنگل بنا دیا + پاپاؤں کی عالمگیر پیشوائی کا خاتمہ ہو گیا - اور تمام مغربی یورپ ایک میدانِ کارزار بن گیا - جہاں ایسے ایسے عقائد مذہبی اور مسائل دینی کی عظمت و حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے جو آج کل کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آتے ــــ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے +

Speyer سپائر

مذہبی جنگ و جدال

بڑے بڑے مذہبی تنازعات کا زمانہ

سولھویں اور سترھویں صدی کا زمانہ مذہبی تنازعات کا زمانہ تھا +

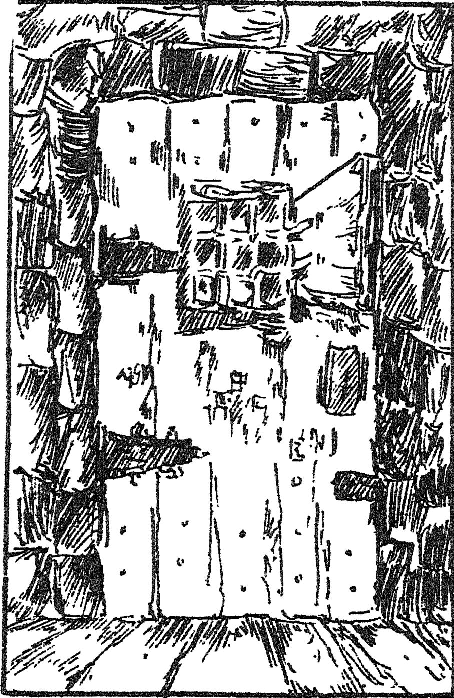
اگر تم غور کرو۔ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ آج کل ہر جگہ اقتصادیات کے تذکرے رہتے ہیں اور جا بجا اُجرت اور مزدوری کے اوقات اور ہڑتال اور اسی قسم کی باتوں کے متعلق بحث ہوتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے زمانے کے سب سے اہم مسائل اقتصادی مسائل ہیں +

لیکن ۱۶۰۰ئہ یا ۱۶۵۰ئہ میں سوائے مذہبی تذکروں کے اور کوئی بات بچوں کے سننے میں نہ آتی تھی + بڑے بڑے ثقیل الفاظ مثلاً جبر و قدر وغیرہ وغیرہ جو کیتھولک یا پراٹسٹنٹ کے دین کے دقیق اور باریک مسائل سے متعلق تھے۔ اُن کے کان میں ٹھونسے جاتے تھے + والدین کی مرضی کے مطابق انہیں کیتھولک یا لوتھری یا کالوینی یا ذونگلی یا اناب‌پٹسٹی فرقے کا بپتسمہ دیا جاتا دینیات سکھانے کے لئے انہیں لوتھر کا تصنیف کردہ سوال جواب نامہ یا کالون کے لکھے ہوئے قواعدِ عیسائیت پڑھائے جاتے۔ وہ کتابِ دعا میں سے انتالیس ارکانِ دین رٹ لیتے اور انہیں بتایا جاتا کہ دینِ حقیقی کی بِنا انہیں ارکان پر ہے +

ہولناک خبروں کے سوا کچھ سننے میں نہ آتا۔ مثلاً یہ کہ انگلستان کا حد سے زیادہ شادی شدہ بادشاہ ہنری ہشتم کلیسائے انگلستان کا پیشوا بن بیٹھا ہے۔ اور اس نے اُسقفوں اور پادریوں کا تقرر جو پاپا کے اختیار میں تھا۔ اب اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور کلیسا کی کُل مال و دولت پر قابض ہو گیا ہے + کہیں محکمہ احتساب

Anabaptist. ۵۲ Zwinglian ۵۱

اور اس کی شدید سزاؤں اور تاریک قید خانوں کا ذکر ہوتا۔ جسے سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ کہیں یہ سننے میں آتا کہ ہالینڈ میں پراٹسٹنٹ لوگوں کے ہجوم نے بارہ نہتے ضعیف العمر پادریوں کو محض اس لئے پھانسی پر لٹکا دیا ہے کہ غیر عقیدے کے لوگوں کو مارنے میں انہیں لطف حاصل ہوتا ہے + بدقسمتی سے یہ دو مخالف فریق ایک دوسرے کے ہم پلہ و ہم وزن تھے + ان میں سے ایک ذرا بھی زیادہ طاقتور ہوتا۔ تو دوسرے کا قلع و قمع کر دیتا۔ اور اس کشمکش کا خاتمہ ہو جاتا + لیکن یہ جنگ آٹھ نسلوں تک جاری رہی اور اس میں اس قدر پیچیدگیاں پیدا ہوئیں کہ میں انہیں تفصیل سے بیان نہیں کر سکتا + موٹی موٹی باتیں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ مفصل حال پڑھنا ہو۔ تو ریفارمیشن کی کوئی تاریخ پڑھ لو +



محکمۂ احتساب

پراٹسٹنٹ لوگوں کی عظیم الشان تحریک کے بعد خود کلیسا کے اندر اچھی خاصی اصلاح ہوئی + اُن پاپاؤں کا خاتمہ ہو گیا جو محض علم و فن سے دلچسپی رکھتے تھے اور رومن اور یونانی آثار صنادید کے شیدا تھے + اُن کی جگہ متین اور سنجیدہ شخص بر روئے کار آئے جو دن رات کے بیس گھنٹے اپنے مقدس فرائض کی بجا آوری میں صرف کرتے تھے +

خانقاہوں کی بے حیائی اور عیش پسندی کا طویل زمانہ بھی اب ختم ہو گیا + سب راہب خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں علی الصبح اٹھتے۔ آبائے کلیسا کی کتابوں کا مطالعہ کرتے۔ مریضوں کی تیمارداری کرتے۔ اور جو جاں بلب ہوں۔ انہیں تسکین دیتے + محکمۂ احتساب دن رات اس بات کا خیال رکھتا کہ چھاپے کے ذریعے

خطرناک عقائد کی اشاعت نہ ہونے پائے + اس سلسلے میں اکثر مؤرخین گیلیلیو[1] کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ اس شخص کو اس گناہ کی پاداش میں سزائے قید بھگتنی پڑی کہ اس نے اپنی دُوربین کی مدد سے آسمان اور ستاروں کی گردش کے متعلق نہ صرف ایسے ایسے نظریے قائم کئے تھے جو کلیسا کے عقائد کے خلاف تھے۔ بلکہ ان نظریوں کی تشہیر بھی کر دی تھی + لیکن ایسے معاملات میں صرف پاپا اور اس کے پادری اور محکمہ احتساب ہی موردِ الزام نہیں + کیتھلک لوگوں کی طرح پروٹسٹنٹ بھی سائنس اور حکمت کے دشمن تھے + جو لوگ اپنے تجربہ اور فہم سے اور تجسس و تحقیق سے کام لیتے تھے۔ انہیں پروٹسٹنٹ بھی اپنے تعصب اور جہالت کی وجہ سے بنی نوع انسان کے لئے مضر سمجھتے تھے +

مثال کے طور پر مائیکل سروٹیس[2] کا حال پڑھئے۔ یہ شخص ہسپانیہ کا طبیب اور ماہر دینیات تھا۔ اور علم تشریح کے سب سے پہلے نامور ماہر یعنی ویسلیس[3] کا شاگرد رہ کر بہت نام پیدا کر چکا تھا + جب فرانیسی حکام نے اسے پھانسی پر لٹکانے کا فیصلہ کیا۔ تو مشہور فرانیسی مصلح اور جینوا کا سیاسی اور روحانی مطلق العنان فرمانروا یعنی کالون نہ صرف حکام کا ممدو معاون ہُوا۔ بلکہ جب سروٹیس فرانس کے قید خانے سے بھاگ کر جینوا میں پناہ گزیں ہُوا تو کالون نے خود اسے قید کر دیا۔ اور پھر اس پر مقدمہ چلایا جس میں بہت سا عرصہ گزر گیا۔ اور آخر کار اس کی علمی شہرت کو نظر انداز کر کے بے دینی کا الزام لگا کر اُسے زندہ جلا دیا +

غرضیکہ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا + معتبر اعداد و شمار دستیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ پروٹسٹنٹ لوگ اہل کیتھولک سے بہت پہلے اس شغل سے اُکتا گئے + عقائد مذہبی کی خاطر جن لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ یا پھانسی پر لٹکایا گیا یا جن کے سر قلم ہوئے۔ اُن کے خون سے کلیسائے روما کے مضبوط اور سخت گیر ہاتھ اہل پروٹسٹنٹ کی نسبت زیادہ رنگین نظر آتے ہیں +

---

[1] Galileo [2] Michael Servatus. [3] Vesalius.

رواداری کا سبق (بڑے ہو کے اس بات کو یاد رکھنا) بنی نوعِ انسان نے حال ہی میں سیکھا ہے۔ اور جدید زمانے کے لوگ بھی صرف اُنہیں معاملات میں رواداری سے کام لیتے ہیں جن سے انہیں چنداں دلچسپی نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر افریقہ کا باشندہ بدھ مذہب یا اسلام کا مذہب اختیار کر لے تو اُس سے تعرض نہیں کرتے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ بدھ مذہب یا اسلام کا اُن کے مقاصد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن جب اُنہیں معلوم ہو جائے کہ ان کا پڑوسی جو پہلے آزاد تجارت کا حامی تھا۔ اور درآمد پر بڑے بڑے محصولات عائد کرنے کے خلاف تھا۔ اپنے عقائد کو چھوڑ کر مصلحین محصولات کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے اور اب درآمد پر محصول لگانے کی حمایت کرتا ہے۔ تو اُن کی رواداری سب دھری رہ جاتی ہے۔ اور وہ بعینہٖ سترھویں صدی کے اُن لوگوں کی طرح برافروختہ ہو کر طعن و تشنیع پر اتر آتے ہیں۔ جو اپنے دوستوں کے تبدیلِ مذہب پر غصے میں آجاتے تھے۔

اس بات کو بہت عرصہ نہیں گزرا کہ بے دینی کو لوگ مرض سمجھتے تھے۔ آج کل اگر کوئی شخص صفائی کا خیال نہ رکھے۔ اُس کا گھر غلیظ ہو۔ اور اس بات کا خطرہ ہو کہ اُس کی مجرمانہ غفلت کی وجہ سے اُس کے یا اُس کے بچوں کو تپ محرقہ یا کوئی اور بیماری لاحق ہو جائیگی۔ تو ہم محکمہ حفظانِ صحت کو اطلاع دے دیتے ہیں۔ اور وہاں کے افسر اس شخص کو جو گویا شہر بھر کے لئے خطرے کا موجب ہے۔ پولیس کی مدد سے باقی لوگوں سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں ایک بے دین شخص کو یعنی اُس عورت یا مرد کو جو پروٹسٹنٹ یا کیتھولک مذہب کے بنیادی اصولوں پر کھلے بندوں اعتراض کرتا پھرتا۔ کسی مہلک مرض کے مریض سے بھی زیادہ خطرناک سمجھا جاتا۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا۔ کہ جسمانی مرض کی اتنی کیا فکر۔ وہ تو صرف جسم کے لئے مہلک ہے۔ سب سے بڑا مرض بے دینی ہے۔ کیونکہ اس میں غیر فانی روح کی ہلاکت مضمر ہے جس طرح آج کل اگر پڑوس میں کہیں ہیضے یا چیچک کے آثار نمودار ہوں۔ تو ہم اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہ اسے افسروں کے علم میں لائیں۔ اسی طرح اُس زمانے میں ہر نیک اور معقول شہری اس بات کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کہ اگر کوئی شخص دین سے منہ موڑے۔ تو اُس کی اطلاع پولیس میں

کرائے ٭

بڑے ہو کر تمہیں معلوم ہو گا کہ امراض سے مقابلہ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دوران مرض میں مناسب دوائیں استعمال کی جائیں۔ دوسرے یہ کہ تندرستی ہی کی حالت میں خاص خاص احتیاطیں برتی جائیں تاکہ بیماری قریب ہی نہ آنے پائے۔ یہ دوسرا کام بھی ڈاکٹروں ہی کے زیر ہدایت عمل میں آتا ہے۔ وہ لوگوں کی طرز بود و باش کا مطالعہ کرتے ہیں۔ گھروں اور بازاروں سے ہر قسم کی غلاظت اٹھوا دیتے ہیں۔ بعض بعض چیزوں سے پرہیز کرنے کو کہتے ہیں۔ اور صحت و صفائی کے موٹے موٹے اصولوں سے لوگوں کو آگاہ کر دیتے ہیں۔ بعض وقت سکولوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور وہاں چھوٹے بچوں کو دانت صاف کرنا، ٹیکہ لگوانا وغیرہ وغیرہ مفید باتیں سکھاتے ہیں۔ غرضیکہ ہر طرح سے بیماری کی روک تھام کرتے رہتے ہیں ٭

سولھویں صدی کے لوگوں نے جو جسمانی بیماری کو روحانی بیماری سے کمتر سمجھتے تھے۔ روحانی امراض کی روک تھام کے لئے بھی بہت کچھ انتظام کر رکھا تھا۔ اور بچوں کو تو ابجد خوانی ہی کے زمانے میں ارکانِ مذہب سکھا دیتے تھے۔ یہ طریقہ اہل یورپ کی عام ترقی میں بہت ممد ہوا۔ اور پروٹسٹنٹ ممالک میں جا بجا مکتب کھل گئے۔ ان مکتبوں میں بیشتر وقت تو دینیات پر صرف ہوتا۔ لیکن دینیات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ پڑھایا جاتا ٭ ان کی وجہ سے لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور چھاپے کی صنعت کو بہت فروغ ملا ٭

اہل کیتھولک بھی پیچھے نہ رہے۔ انھوں نے بھی تعلیم پر بہت توجہ کی۔ اور اس پر بہت سا وقت صرف کیا ٭ ان دنوں میں انجمن یسوع[1] نئی نئی قائم ہوئی تھی جس نے اشاعت تعلیم میں کلیسا کی بے انتہا مدد کی ٭ اس ممتاز انجمن کا بانی ہسپانیہ کا ایک سپاہی تھا جس نے اپنی سیاہ کاری اور عیاشی کی زندگی سے تائب ہو کر کلیسا کی خدمت کا عہد کر لیا تھا جس طرح آج کل کئی لوگ مکتی فوج کی طفیل گناہوں سے تائب ہو کر

---

[1] Society of Jesus.

اپنی زندگی محتاجوں کی دستگیری کے لئے وقف کر دیتے ہیں +

اِس ہسپانوی نام لویولا[1] تھا + امریکہ کے دریافت سے ایک سال پہلے پیدا ہُوا بڑا ہو کر ایک دفعہ ایسا زخمی ہُوا کہ عمر بھر کو لنگڑا ہو گیا + ہسپتال میں لیٹا تھا کہ دوشیزۂ مقدس اور اُس کے فرزند نے اپنا جلوہ دکھایا اور تائب ہونے کو کہا + لویولا نے عہد کر لیا کہ شفا پا کر ارضِ مقدس کو جاؤں گا - اور جس کام کو صلیبی ادھورا چھوڑ آئے تھے اُسے تکمیل تک پہنچاؤں گا - لیکن جب بیت المقدس پہنچا - تو معلوم ہُوا کہ اس عہد کا پورا کرنا ناممکن ہے - چنانچہ مغرب کو لوٹ آیا اور لوتھریوں کی بے دینی کے خلاف جو جنگ بپا تھی - اُس میں شامل ہو گیا +

۱۵۳۴ء میں جب وہ پیرس کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا - اُس نے سات اور طلبا کو اپنے ساتھ ملا کر ایک انجمن قائم کی + آٹھوں نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ ہم نیکی کی زندگی بسر کرینگے - مال و دولت کی ہوس کو پاس نہ آنے دینگے - اور اپنے جسم اور اپنی روح کو ہمیشہ کلیسا کی خدمت کے لئے وقف سمجھیں گے + تھوڑے ہی سالوں کے اندر اندر اس مختصر سی انجمن نے بڑھتے بڑھتے ایک منظم جماعت کی شکل اختیار کر لی جس کا نام انجمن یسوع رکھا گیا - اور پاپائے پال سوم نے اسے تسلیم کر لیا +

لویولا فوج میں کام کر چکا تھا - وہ انضباط اور تنظیم اور اطاعت کے اصولوں سے اچھی طرح واقف تھا - ان صفات کی بدولت یسوعیوں کی انجمن کو بہت کامیابی نصیب ہوئی + ان لوگوں نے نشر و اشاعتِ تعلیم کو اپنا مقصدِ اولین قرار دیا - کوئی اُستاد جب تک کہ وہ خود بہت اچھی تعلیم حاصل نہ کرلے کسی شاگرد سے بات تک کرنے کا مجاز نہ ہوتا + اساتذہ طلبا کے ساتھ رہتے اور اُن کے کھیل کود میں بھی اُن کے شریک ہوتے تھے - وہ اپنے شاگردوں کی پوری پوری نگہداشت کرتے تھے - اور اُن کے ساتھ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے + یسوعیوں کی مساعی سے اہل کیتھولک کی ایک ایسی نسل پیدا ہوئی جس نے اوائل زمانہ وسطیٰ کے لوگوں کی

---

[1] Loyola.

طرح فرائض مذہبی کی بجاآوری کو اپنا نصب العین قرار دے لیا +

یسوعی ہشیار لوگ تھے محض ناداروں ہی کی تعلیم میں مصروف نہ رہے - بلکہ ذی جاہ لوگوں کے محلات میں دخل پاکر ہونے والے فرمانرواؤں اور شہنشاہوں کے بھی اتالیق بن گئے + اس بات کی اہمیت تمہیں اُس وقت معلوم ہوگی جب کہ میں تمہیں سی سالہ جنگ کا حال سناؤں گا + لیکن مذہبی جنون کے اس آخری اور ہولناک مظاہرے یعنی سی سالہ جنگ سے پہلے کئی اور قابل ذکر واقعات ظہور میں آئے +

چارلس پنجم مرچکا تھا + جرمنی اور آسٹریا پر اُس کا بھائی فرڈی ننڈ حکمران تھا - اور اُس کے دیگر مقبوضات یعنی ہسپانیہ اور ہالینڈ اور جزائر ہند اور امریکہ اُس کے بیٹے فلپ کے حصے میں آئے تھے + فلپ کی ماں پرتگال کی شہزادی اور اپنے شوہر کی رشتے کی بہن تھی + ایسی شادی سے جو بچے پیدا ہوں - اُن کی خلقت کچھ عجیب ہوتی ہے + فلپ کا بیٹا بدقسمت دان کارلوس[۱] جو بعد میں اپنے باپ کی مرضی سے مارا گیا - دیوانہ تھا + فلپ خود دیوانہ تو نہ تھا - لیکن اُس کا جوش مذہبی جنون کی حد تک پہنچا ہُوا تھا + اس کا دعوے تھا کہ میں نوعِ انسان کی نجات کے لئے مامور ہوں - اس لئے جس شخص کو مجھ سے ذرا بھی اختلاف ہوگا - وہ گویا نسل انسانی کا دشمن ہے اور اس کا قتل واجب ہے - تاکہ نیک بندوں کو اُس کی تقلید کرنے کی ترغیب نہ ہو +

ہسپانیہ بے حد متمول ملک تھا + کاسٹیل اور آراگون کے خزانے نئی دنیا کے زرو سیم سے معمور ہو رہے تھے لیکن ہسپانیہ ایک عجیب اقتصادی مرض میں مبتلا تھا + کاشتکار لوگ تو رات دن کام کرتے رہتے - اور ان کی عورتیں مردوں سے بھی زیادہ محنت کرتیں - لیکن اونچے طبقے کے لوگوں کو مشقت سے اس قدر نفرت تھی - کہ وہ سرکاری محکموں یا فوج کی نوکری کے علاوہ کوئی اور کام کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے + مُور بہت محنتی لوگ تھے - لیکن اُنہیں ہسپانیہ سے نکلے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا + نتیجہ یہ ہوا

---

۱ Don Carlos.

کہ ہسپانیہ باوجود اپنے خزانوں کے مفلس کا مفلس رہا۔ ہسپانوی خود تو ہاتھ پاؤں نہ ہلاتے۔ اس لئے ضروریاتِ زندگی مثلاً گندم وغیرہ باہر سے منگوانی پڑتیں۔ اور ہسپانیہ کا روپیہ غیر ممالک کے کام آتا +



بارتھولومیو کی رات

فلپ یعنی سولھویں صدی کی سب سے طاقتور قوم کا فرمانروا اپنی آمدنی کے لئے اُن محصولات کا محتاج تھا۔ جو ہالینڈ اور ڈنمارک کے بڑے بڑے تجارتی مرکزوں سے وصول ہوتے تھے + لیکن یہاں کے لوگ لوتھر اور کالون کے راسخ العقیدہ پیرو تھے۔ اُنہوں نے اپنے گرجاؤں کو بتوں اور تصویروں سے پاک وصاف کر دیا تھا۔ اور پاپا سے کہہ دیا تھا کہ ہم آپ کی اطاعت کو اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ بلکہ اُن احکام کی بجا آوری کو واجب سمجھتے ہیں۔ جو ہمارا ضمیر صادر کرے۔ یا جو انجیل کے نئے ترجمے میں پائے جائیں +

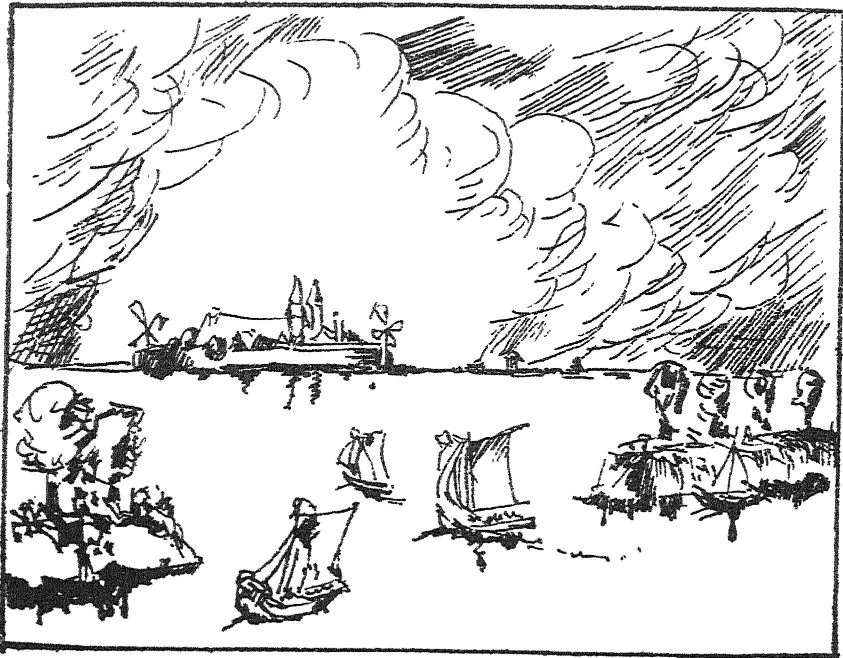
اندریں حالات شاہ فلپ عجب مخمصے میں تھا + اہلِ ہالینڈ کی بے دینی کو معاف بھی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اُن کا دستِ نگر بھی تھا + اُنہیں پروٹسٹنٹ بن جانے دیتا۔ اور اُن کی روح کو بچانے کیلئے کوئی تدبیر عمل میں نہ لاتا تو خدا کا مجرم ٹھیرتا + انہیں محکمۂ احتساب کے حوالے کر دیتا۔ اور اپنی رعایا کو خود زندہ جلوا دیتا۔ تو گویا اپنی آمدنی کے بہت بڑے حصے سے ہاتھ دھو بیٹھتا +

طبیعت کا کمزور تھا۔ اس لئے مدت تک ڈانواڈول رہا + کبھی مُلاطفت سے پیش آتا کبھی آنکھیں دکھاتا۔ لیکن اہل ہالینڈ اپنی ہٹ کے پکے تھے۔ انہوں نے مذہبی گیت گانا اور لوتھری اور کالونی مبلغین کے وعظوں میں جانا نہ چھوڑا + مایوس ہو کر فلپ نے "مردِ آہنی" یعنی ڈیوک آف[1] ایلبا کو ان مرتدین کی تادیب کے لئے

---

[1] Duke of Alba

بھیجا۔ اسپانیہ نے پہلا کام یہ کیا کہ جو رہنما ابھی ترکِ وطن نہ کر چکے تھے۔ اُن کے سر قلم کر دیئے۔ ۱۵۷۲ء میں (سینٹ بارتھولومیو کی رات کو فرانس کے پراٹسٹنٹ رہنماؤں کا قتلِ عام اسی سال کا واقعہ ہے)۔ اس نے ہالینڈ کے بہت سے شہروں پر دھاوا بول دیا۔ اور وہاں کے باشندوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اور اس سے اگلے سال ہالینڈ کے صنعتی مرکز یعنی شہر لیڈن کا محاصرہ کر لیا۔



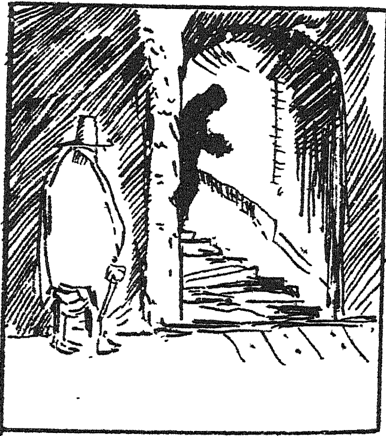
ولیم نے شہر لیڈن کو سمندر کے بند کاٹ کر کیونکر بچایا

اس دوران میں شمالی ہالینڈ کے سات چھوٹے چھوٹے صوبوں نے ایک دوسرے کی حفاظت کی غرض سے آپس میں اتحاد قائم کر لیا تھا۔ (جو اتحادِ اُٹرکٹ[1] کے نام سے مشہور ہے) اور ولیم آف اورینج[2] کو اپنی فوجوں کا سپہ سالار اور اپنے رہزن جہاز رانوں کا (جو گدایانِ بحری کے نام سے مشہور تھے) کمانڈر مقرر کر لیا تھا۔ ولیم جرمن نسل کا شہزادہ تھا۔ اور چارلس پنجم کی زندگی میں اُس کا مشیرِ خاص رہ چکا تھا۔ اُس نے

ے۱ Utrecht ے۲ William of Orange

شہر لیڈن کو بچانے کے لئے سمندر کے کنارے جو بڑے بڑے بند لگے ہوئے تھے۔ ان کو کاٹ ڈالا۔ پانی اندر گھس آیا۔ اندرون ملک میں ایک بہت بڑی پایاب جھیل بن گئی۔ اور ولیم چپٹے پیندے کی کشتیوں پر اپنی فوج سمیت سوار ہو کر انہیں کیچڑ میں سے کھینچتا اور دھکیلتا اور کھیتا ہؤا فصیلِ شہر تک جا پہنچا +

یہ پہلا موقع تھا کہ افواجِ قاہرۂ شاہِ ہسپانیہ کو ایسی شکست فاش ملی + جس طرح جنگ روس اور جاپان میں جاپانیوں نے ہمکڈن کو فتح کر لیا تھا۔ تو لوگ بہت حیران ہوئے تھے۔ اسی طرح ہسپانیوں کی شکست پر اُس زمانے کی دنیا انگشت بدنداں رہ گئی + پروٹسٹنٹ طاقتوں کا حوصلہ بہت بڑھ گیا۔ لیکن فلپ نے باغیوں کی سرکوبی کا خیال نہ چھوڑا + ایک فاترالعقل مذہبی دیوانے کو روپے کا لالچ دیکر ولیم آف اورینج کو اُس کے ہاتھ سے قتل کرا دیا۔ لیکن اپنے سردار کے قتل ہو جانے پر بھی لوگوں نے حوصلہ نہ ہارا۔ بلکہ اس سے تو وہ اور بھی برافروختہ ہوئے + ۱۵۸۱ء میں ہیگ[ا] کے مقام پر ان سات صوبوں کے نمائندوں کی مجلس منعقد ہوئی۔ جس میں ان سب نے مل کر ظالم بادشاہ فلپ کی اطاعت کا جُوا اتار پھینکا۔ اور حکمرانی کا بوجھ جواب تک "شہنشاہ۔ مامور من اللہ" کے سپرد تھا اپنے کندھوں پر اٹھا لیا +



ولیم خاموش کا قتل

سیاسی آزادی کی تاریخ میں یہ واقعہ بہت اہم ہے۔ یہ اُمرا کی اُس بغاوت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جس نے شاہِ انگلستان سے میگنا کارٹا پر دستخط کرائے تھے + ہالینڈ کے شہری اس اصول کے قائل تھے۔ کہ حکومت بادشاہ اور رعایا کے درمیان ایک معاہدے کا نام ہے۔ ہر فریق پر بعض فرائض کی بجاآوری واجب ہے۔ اگر ایک فریق اس معاہدے کی خلاف ورزی کرے۔ تو دوسرے فریق

ا۔ Hague

کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ وہ اس عہد کو منسوخ سمجھے۔ ۱۷۷۶ء میں شاہ جارج سوم کی رعایا نے بھی یہی بات کا اعلان کیا۔ لیکن اُن کے اور اُن کے بادشاہ کے مابین تین ہزار میل چوڑا سمندر حائل تھا۔ برخلاف اس کے جب ہالینڈ کے نمائندوں نے خود مختاری کا علم بلند کیا تو ہسپانیہ کی فوجیں سامنے منہ کھولے کھڑی تھیں۔ اور سرزنش کو ہسپانوی بیڑا ہر وقت موجود تھا۔

جب کیتھولک "بلڈی میری"[1] کے بعد پروٹسٹنٹ ملکہ الزبتھ تخت پر بیٹھی۔ تو نہ صرف اُس وقت بلکہ بہت عرصہ پہلے سے بھی لوگوں میں یہ مشہور ہو رہا تھا۔ کہ ہسپانیوں کا ایک پراسرار جنگی بیڑا ہالینڈ اور انگلستان کو فتح کرنے کی غرض سے آنے والا ہے۔ ملاحوں میں اکثر اس کے تذکرے رہتے تھے۔ اور اس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں اُڑتی رہتی تھیں۔ سولھویں صدی کے اواخر میں یہ افواہیں زیادہ معتبر معلوم ہونے لگیں۔ جو جہازران لزبن سے ہو آئے تھے۔ اُن کا بیان تھا۔ کہ ہسپانیہ اور پرتگال کی سب بندرگاہوں میں جہاز تعمیر کئے جا رہے ہیں۔



آرماڈا آ رہا ہے

یہ بھی معلوم ہوا کہ بلجیم میں ڈیوک آف پارما[2] ایک بہت بڑا لشکر جمع کر رہا ہے۔ تاکہ جب جنگی بیڑا آن پہنچے۔ تو وہ اوسٹنڈ[3] سے چل کر لندن اور ایمسٹرڈم پر دھاوا بول دے۔

۱۵۸۸ء میں گریٹ آرماڈا[4] نے لنگر اٹھا کر شمال کا رخ کیا۔ لیکن ہالینڈ کی بندرگاہوں کے راستے ہالینڈ کے بیڑے نے روک رکھے تھے۔ اور رود بار کی حفاظت انگریز کر رہے تھے۔ علاوہ براں ہسپانوی جو جنوب کے پرسکون سمندر

---

[1] Bloody Mary [2] Duke of Parma [3] Ostend

[4] Great Armada

کے عادی تھے۔ شمال کے طوفانی سمندر میں اپنی سب جہاز رانی بھول گئے + میں تمہیں کیا بتاؤں کہ جب سمندر کی لہریں اور دشمن کے جہاز دونو نے اپنا اپنا زور دکھایا تو آرماڈا کا کیا حشر ہؤا + صرف چند جہاز جو آئرلینڈ کی اوٹ میں ہو گئے تھے سلامت بچے + باقی سب کا سب بیڑہ بحیرۂ شمال میں غرق ہو گیا +

اہل انگلستان اور اہل ہالینڈ نے بھی اس حملے کا بدلہ لیا۔ اور جس طرح ہسپانوی یہاں آئے تھے یہ اُن کے مقبوضہ علاقے میں جا دھمکے + ایک ہالینڈ نژاد شخص نے جو کبھی پرتگیزوں کی ملازمت کر چکا تھا۔ جہاز رانی کے متعلق ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی + اس صدی کے اختتام سے پہلے پہلے ہاوٹ مین[1] نے اس کتاب کو پڑھ کر جزائر ہند کا راستہ دریافت کر لیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ اہل ہالینڈ کی ایک کمپنی ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے قائم ہوئی جس نے پرتگال اور ہسپانیہ کی ایشیائی اور افریقی نو آبادیات پر دست درازی کی۔ اور باقاعدہ جنگ چھڑ گئی +

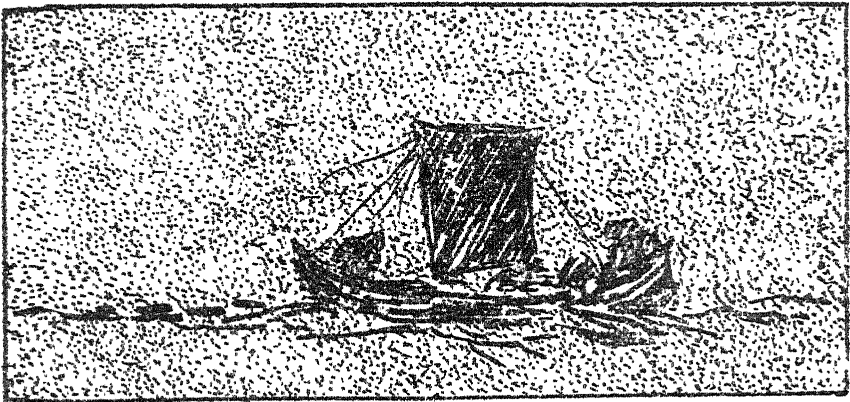
بیرونی فتوحات کے اس پہلے دور میں ہالینڈ کی عدالت میں ایک عجیب وغریب مقدمہ دائر ہؤا + سترھویں صدی کے اوائل میں ہالینڈ کے ایک کپتان ہیم سکرک[2] نامی نے آبنائے ملاکا میں ایک پرتگیزی جہاز پر قبضہ کر لیا تھا + (ہیم سکرک بہت مشہور جہاز ران تھا۔ جزائر ہند کا شمال مشرقی رستہ دریافت کرنے کے لئے ایک مہم لے کر روانہ ہؤا تھا۔ اور موسم سرما جزیرۂ نووا زیمبلا[3] کے برفانی ساحل پر گذار چکا تھا +) تمہیں یاد ہو گا کہ پاپا نے دنیا کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ پرتگیزوں اور ایک حصہ ہسپانیوں کے حوالے کر دیا تھا + اس تقسیم کی بنا پر پرتگیز یہ کہتے تھے کہ ہمارے ہندی جزیروں کے ارد گرد جو سمندر واقع ہے۔ وہ ہماری ملکیت ہے۔ اور چونکہ اس وقت ہمارے اور ہالینڈ کے متحدہ صوبوں کے مابین کوئی لڑائی نہیں۔ اس لئے ہالینڈ کی ایک تجارتی کمپنی کے کپتان کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ کہ وہ ہمارے علاقے میں

---

[1] Houtman [2] Heemskerk [3] Nova Zembla

داخل ہو کر ہمارے جہاز ہم سے چھین نہ جائے۔ اس بنا پر اُنہوں نے دعوے دائر کر دیا۔ کمپنی کی طرف سے ایک ذہین نوجوان ڈیگروٹ نامی وکیل مقرر ہوا۔ اس نے دورانِ بحث میں یہ حیرت انگیز دلیل پیش کی کہ سمندر کسی کی ملکیت نہیں یعنی اس پر سب کا برابر حق ہے۔ سمندر کا جو علاقہ تری توپوں کی زد سے باہر ہے۔ وہ ہر قوم کے ہر جہاز کے لئے کھلا یا کم از کم کھلا ہونا چاہیئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اس اصول کی یوں کھلی عدالت میں حمایت کی ہو۔ باقی تمام جہاز ران قوموں نے اس کی مخالفت کی۔ ڈیگروٹ کے دعوے کی تردید میں جان سیلڈن نامی ایک انگریز نے ایک کتاب لکھی جس میں اُس نے یہ ثابت کیا۔ کہ جو سمندر کسی مملکت کے ارد گرد واقع ہو وہ قدرتی طور پر اُسی کے مقبوضات میں شمار ہونا چاہیئے۔ میں نے اس مباحثے کا ذکر یہاں اس لئے کیا ہے کہ یہ مسئلہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔ اور گذشتہ جنگ کے دوران میں اس کی وجہ سے بڑی بڑی مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔

بیس سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ جزائرِ ہند۔ راسِ اُمید۔ لنکا اور ساحلِ چین و جاپان کی زرخیز نوآبادیات پر اہلِ پروٹسٹنٹ کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۶۲۱ء میں



ہڈسن کی موت

لے De Grout.   ٹلے John Selden

ویسٹ انڈین نامی تجارتی کمپنی کی بنیاد رکھی گئی + اس کمپنی نے برازیل کو فتح کر لیا اور شمالی امریکہ کے اُس دریا کے دہانے پر جسے ہنری ہڈسن نے ۱۶۰۹ء میں دریافت کیا تھا + ایک قلعہ تعمیر کیا۔ جس کا نام امسٹرڈم جدید رکھا +

ان فتوحات کی بدولت انگلستان اور جمہوریت ہالینڈ کو اس قدر مال و دولت ہاتھ آیا۔ کہ اُنھوں نے بڑی لڑائیوں کے لئے تو غیر ممالک کے سپاہیوں کو نوکر رکھ لیا اور خود فراغت اور اطمینان کے ساتھ کلّیتہً تجارت کی طرف متوجہ ہوئے + اہل پروٹسٹنٹ کی بغاوت سے اِن دو ممالک کو تو آزادی اور خوشحالی نصیب ہوئی لیکن یورپ کے کئی دوسرے علاقوں میں قتل و خون کے وہ معرکے گرم ہوئے۔ کہ گزشتہ جنگ یورپ ان کے مقابلے میں بچوں کا ایک کھیل معلوم ہوتی ہے +

تیس سالہ جنگ ۱۶۱۸ء میں شروع ہوئی۔ اور ۱۶۴۸ء میں عہد نامہ ویسٹ فیلیا[۱] پر ختم ہوئی + ایک سو سال سے یورپ مذہبی منافرت کا شکار ہو رہا تھا۔ اس لئے جنگ کا بپا ہونا لابدُ تھا + جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ یہ جنگ ایک ہولناک جنگ تھی جس میں یورپ کی سب قومیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی تھیں + لڑائی سے ہاتھ اُس وقت اٹھایا۔ جب تھک کر چُور ہو گئیں۔ اور لڑنے کی ہمت ذرا بھی باقی نہ رہی +

تیس سال کے اندر اندر وسطی یورپ کے اکثر علاقے ایک بیابان بن کر رہ گئے جہاں قحط زدہ کسان موت سے بچنے کے لئے مرے ہوئے گھوڑوں کا گوشت بھوکے بھیڑیوں کے پنجوں سے چھین چھین کر کھا رہے تھے + جرمنی کا یہ حال تھا کہ جہاں ایک شہر یا گاؤں سلامت بچا۔ وہاں پانچ شہر پیوست زمین ہو گئے + مغربی جرمنی میں پیلاٹین[۲] کا علاقہ اٹھائیس بار لُٹا۔ اور ایک کروڑ اٹھارہ لاکھ کی آبادی میں سے صرف چالیس لاکھ انسان زندہ بچے +

خاندان ہیبس[۳] برگ کے جانشین فرڈی ننڈ دوم کے شہنشاہ منتخب ہونے کے ساتھ ہی لڑائی شروع ہو گئی + فرڈی ننڈ یسوعیوں کا محبوب شاگرد اور کلیسا

---

[۱] Westphalia   [۲] Palatinate   [۳] Habsburg

کا عقیدت مند اور فرمانبردار فرزند تھا + جوانی کے زمانے میں اپنی مملکت کو سب مذہبی فرقوں اور ہر قسم کی بے دینی سے پاک کرنے کا جو عہد کیا تھا اس کو بڑی جانفشانی سے نبھایا + فرڈی نند کے شہنشاہ منتخب ہونے سے دو دن پہلے اس کا سب سے بڑا حریف فریڈرک (جو پلاٹین علاقے کا حاکم اور شاہ انگلستان جیمز اوّل کا داماد تھا) بوہیمیا[1] کا بادشاہ بن گیا۔ چونکہ فرڈی نند کھلم کھلا اپنی رائے فریڈرک کے خلاف دے چکا تھا۔ اس لئے اس انتخاب کی خبر سن کر بہت چراغ پا ہوا +

افواج ہیبس برگ نے بوہیمیا پر چڑھائی کر دی۔ نوعمر فرمانروا اس جرّی لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے مدد کا طلبگار ہوا۔ لیکن کسی نے دستگیری نہ کی + جمہوریت ہالینڈ مدد دینے کو تیار تھی۔ لیکن وہ خود ہسپانیہ کے خاندان ہیبس برگ سے برسرپیکار تھی۔ اپنے مخصوں سے ہی نجات نہ ملتی تھی۔ دوسروں کی خبر گیری بھلا کیونکر کرتی + انگلستان میں خاندان سٹوارٹ[2] اپنے استحکام میں مصروف تھا۔ اُسے کیا پڑی تھی کہ اپنا روپیہ اور فوج بوہیمیا کے دور دراز ملک میں بھیج کر خود اپنی طاقت کو ضعف پہنچائے + چند مہینوں کی کشمکش کے بعد شاہِ بوہیمیا کو ملک چھوڑنا پڑا۔ اور سلطنت بویریا کے کیتھولک خاندان کے حوالے کر دی گئی + یہیں سے سی سالہ جنگ کا آغاز ہوا +

ہیبس برگ کی فوجیں ٹلی[3] اور والن سٹائن[4] کے زیر کمان جرمنی کے پراٹسٹنٹ علاقے میں سے بزورِ شمشیر رستہ نکال کر بالٹک کے ساحل تک جا پہنچیں + ڈنمارک کا بادشاہ پراٹسٹنٹ تھا۔ اب کیتھولک کے قرب سے خائف ہوا۔ اور بیشتر اس کے کہ دشمن بہت زور پکڑ لیں وہ خود ہی اُن پر حملہ آور ہو گیا + اُس کی فوجیں جرمنی میں تو آن گھسیں لیکن یہاں پہنچ کر انہوں نے شکست کھائی + والن سٹائن نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ غنیم کو اس قدر لتاڑا کہ ڈنمارک

---

[1] Bohemia
[2] Stuart
[3] Tilly
[4] Wallanstein

انگلستان
لندن
اسٹرڈم
کیتھولک
ویسٹ فالیا ۱۶۴۸
سویڈن
سٹرال سنڈ
پولینڈ
برلن
میگڈی برگ
کیتھولک
پیرس
وٹن برگ
(لوتھر کا وطن)
بوہیمیا
فرانس
کیتھولک
کیتھولک
پراگ
میونخ
کیتھولک
جنیوا
کالون کا وطن
وی آنا
آسٹریا
اطالیہ
ہسپانیہ
سی سالہ جنگ

سی سالہ جنگ

صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اب پروٹسٹنٹ کے قبضے میں بالٹک کا صرف ایک شہر یعنی سٹرال سُنڈ[1] باقی رہ گیا۔

۱۶۳۰ء کے اوائل موسم گرما میں سویڈن کے بادشاہ اور خاندان واسا[2] کے جانشین شاہ گستاوس ایڈولفس[3] نے اس شہر کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہ بادشاہ اپنے ملک کو روسیوں سے بچانے میں بہت ناموری پیدا کر چکا تھا۔ عقیدے کا پراٹسٹنٹ تھا۔ اور طبیعت میں اُمنگ بھری تھی۔ رات دن سویڈن کو ایک عظیم الشان مملکت شمالی کا مرکز بنانے کے خواب دیکھتا رہتا۔ یورپ کے جملہ پراٹسٹنٹ فرمانرواؤں نے مذہب لوتھری کی پشت پناہ سمجھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ ایڈولفس نے ٹلی کی فوجیں کے ہاتھ میگڈی برگ[4] کے پراٹسٹنٹ باشندوں کے خون سے ابھی رنگین تھے شکست دی۔ اس کے بعد اُس کی فوجوں نے ہیبس برگ کے اطالوی مقبوضات تک پہنچنے کے لئے اندرون ملک کا رُخ کیا۔ اہلِ کیتھولک نے پیچھا کیا۔ اور جب حالات نے خطرناک صورت اختیار کی۔ تو ایڈولفس دفعتاً پلٹا اور ہیبس برگ کے بڑے لشکر کو لوٹسن[5] کی لڑائی میں نیچا دکھایا۔ شومئے قسمت سے خود راستہ بھول کر اپنی فوجوں سے کہیں دور نکل گیا۔ اور مارا گیا۔ لیکن اس آویزش سے ہیبس برگ کا زور بہت کچھ زائل ہو گیا۔

فرڈی ننڈ طبیعت کا شکی تھا۔ اس ہزیمت کے بعد اپنے سپہ سالاروں پر سے اس کا اعتماد اُٹھ گیا۔ چنانچہ اُس نے والن سٹائن کو قتل کرا دیا۔ جب کیتھولک شاہان بوربون[6] نے جو فرانس کے حکمران تھے۔ اور خاندان ہیبس برگ سے رقابت رکھتے تھے۔ یہ سنا تو وہ سویڈن کے پراٹسٹنٹوں سے جا ملے۔ ٹوفی سیٹر وہم کی فوجیں جرمنی کے مشرقی حصے پر حملہ آور ہوئیں۔ اور فرانسیسی کمانداروں کی مدد سے سویڈن کے سپہ سالاروں نے ہیبس برگ کے علاقے

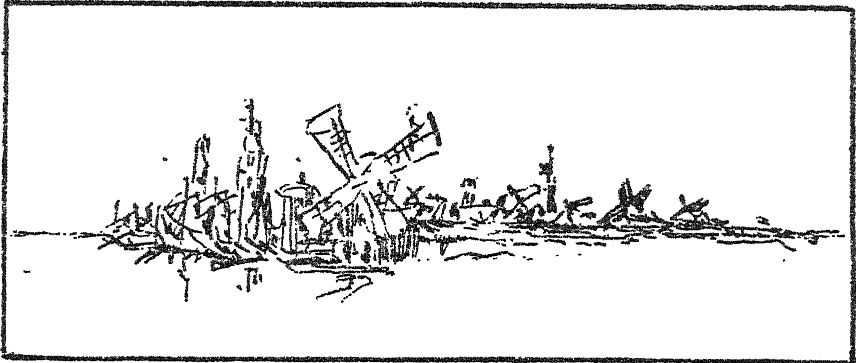
---

[1] Stralsund — [2] Vasa — [3] Gustavus Adolphus

[4] Magdeburg — [5] Lutzen — [6] Bourbon

ہیں قتل و خون اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا + جب ڈنمارک کے لوگوں نے دیکھا۔ کہ اہلِ سویڈن شہرت اور دولت دونوں سے مالا مال ہو رہے ہیں تو اُن کے دل میں حسد پیدا ہوا + انہوں نے اہلِ سویڈن کے خلاف جو انہیں کے ہم مذہب تھے۔ جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس لئے کہ سویڈن کے پراٹسٹنٹ کیتھولک فرانسیسیوں کے حلیف تھے اور کیتھولک فرانسیسیوں کے رہنما ڈی رشلیو نے پراٹسٹنٹ فرانسیسیوں کو اُن مذہبی حقوق سے محروم کر دیا تھا جو ۱۵۹۸ء میں فرمانِ نینٹس کے رُو سے اُنہیں عطا ہوئے تھے +

ایسی جنگوں سے کسی بات کا فیصلہ نہیں ہوا کرتا + چنانچہ جب ۱۶۴۸ء میں ویسٹ فیلیا کے عہد نامے پر دستخط ہوئے۔ اور اس جنگ کا خاتمہ ہوا تو جو قومیں شروع میں کیتھولک تھیں۔ وہ اب بھی کیتھولک رہیں۔ اور جو شروع میں پراٹسٹنٹ تھیں اُنہوں نے لوتھر اور کالون اور زونگلی کا مذہب نہ چھوڑا + سوئٹزرلینڈ اور ہالینڈ میں اہلِ پراٹسٹنٹ کی آزاد جمہوری سلطنتیں تسلیم کر لی گئیں + میٹس اور ٹول اور ویردون کے شہر اور ایلساس کا کچھ علاقہ فرانسیسیوں کے ہاتھ آیا۔ یورپ کے پاس اب نہ فوجیں تھیں نہ روپیہ ہمتیں ٹوٹ چکی تھیں



امسٹرڈم ۱۶۴۸ء میں

Metr.	۳	Nantes.	۲	Ricnelieu.	۱
Alsace	۶	Verdun.	۵	Toul	۴

اور اُمیدوں پر پانی پھر چکا تھا + مملکتِ مقدسہ روما کا ایک ڈھانچہ سا باقی رہ گیا اور بس +

اس تیس سالہ جنگ کا اگر کچھ فائدہ ہُوا تو یہ کہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونو کو آئندہ کے سبق کان ہو گئے۔ اور پھر وہ ایک دوسرے سے کبھی نہ اُلجھے + لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی منافرت بالکل جاتی رہی + کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے باہمی تنازعات تو ختم ہو گئے۔ لیکن اہلِ پروٹسٹنٹ خود کئی فرقوں میں منقسم ہو گئے۔ اور طعن و تشنیع کا سلسلہ جوں کا توں جاری رہا + ہالینڈ میں جبر و قدر کے مسئلے پر اختلاف پیدا ہُوا - اور یہاں تک بڑھا کہ ہالینڈ کے ایک سیاست دان کا سر قلم کر دیا گیا (اس سیاست دان نے جمہوری سلطنت کو پہلے بیس سال نہایت کامیابی سے چلایا تھا - اور ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کی غرض سے جو کمپنی قائم ہوئی تھی - اُسے بہت اعلےٰ پیمانے پر منظم کیا تھا) انگلستان میں بھی ایسے ہی تنازعات کی وجہ سے خانہ جنگی کی نوبت آن پہنچی +

انگلستان کی جنگ میں پہلی دفعہ یورپ کے ایک بادشاہ کو از روئے قانون سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ لیکن اس کا حال بیان کرنے سے پیشتر میں چاہتا ہوں کہ تاریخ انگلستان کے بعض پہلے واقعات تمہیں بتا دوں + اس کتاب میں میں صرف اُن واقعات کا حال لکھتا ہوں - جن سے موجودہ حالات پر کچھ روشنی پڑ سکتی ہے + اگر میں کسی ملک کا ذکر نہ کروں - تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اُس مُلک سے نفرت ہے + مثلاً میرا دل چاہتا ہے - کہ میں ناروے اور سوئٹزرلینڈ اور سربیا اور چین کی باتیں بھی تمہیں سنا دوں - لیکن سولھویں اور سترھویں صدی میں یورپ نے جو ترقی کی اُس کا ان ممالک سے کوئی تعلق نہیں - اس لئے میں بصد ادب و احترام معافی کا خواستگار ہوں - اور نادم ہوں کہ ان کا ذکر نہیں کر سکتا + انگلستان کی بات جُدا ہے + اس چھوٹے سے جزیرے کے باشندوں نے پچھلے پانچ سو سال کے عرصے میں ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیئے ہیں + جن سے دنیا کا کونہ کونہ متاثر ہو رہا ہے - اور کئی ملکوں کی تاریخ نے ان کو دیکھ کر اپنا رُخ بدل

لیا ہے ۔ تاریخ انگلستان کے مطالعے کے بغیر تو آج کل کے اخبارات میں جو کچھ لکھا ہے ۔ وہ کبھی سمجھ میں نہیں آسکتا ۔ اس لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ایسی کیا بات ہوئی ۔ جس سے انگلستان نے تو پارلیمنٹی طرزِ حکومت اختیار کر لی ۔ اور باقی ماندہ یورپ مطلق العنان شہنشاہوں کے زیرِ فرمان رہا ۔

انقلابِ انگلستان

بادشاہوں کے "خداوندی" حقوق اور پارلیمنٹ کے انسانی حقوق کے درمیان کشمکش جس کا انجام شہنشاہ چارلس کے لئے بہت حسرتناک ثابت ہوا

شمال مشرقی یورپ کے اوّلین سیاح سیزر نے رود بارِ انگلستان کو ۵۵ قبل مسیح میں عبور کرکے انگلستان کو فتح کرلیا تھا۔ چار صدیوں تک یہ ملک رومن مقبوضات میں شامل رہا۔ لیکن جب بربریوں نے روما کو معرضِ خطر میں ڈال دیا تو مملکت کے دور دراز علاقوں میں جس قدر افواج مقیم تھیں۔ انہیں دارالسلطنت کو لوٹ آنے کا حکم پہنچا۔ رومن لشکر نے انگلستان چھوڑ کر روما کا رُخ کیا۔ اور انگلستان کا کوئی والی وارث نہ رہا۔

جب شمالی جرمنی کے بھوکے سیکسنوں کو پتہ چلا کہ برطانیہ میں اب کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں رہا۔ تو وہ بحیرۂ شمال کو عبور کرکے اس خوشحال جزیرے میں آن بسے۔ یہاں پہنچ کر اُنہوں نے بہت سی خودمختار اینگلوسیکسن سلطنتیں قائم کیں۔ لیکن یہ سلطنتیں ہر وقت ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی رہتیں۔ کسی بادشاہ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ سارے ملک پر حکومت کرسکتا۔ پانچسو سال سے بھی زیادہ عرصے تک مرسیہ اور نارتھمبریا اور ویسکس اور سیکس اور کینٹ اور ایسٹ اینگلیا غرضیکہ یہ سب سلطنتیں سویڈن اور ناروے کے بحری قزاقوں کا تختۂ مشق بنی رہیں۔ بالآخر گیارھویں صدی میں ناروے اور شمالی جرمنی کی مانند انگلستان بھی کینوٹ[1] اعظم کی مملکت کا حصہ بن گیا۔ اور انگلستان کی خودمختاری کا خاتمہ ہوگیا۔

---

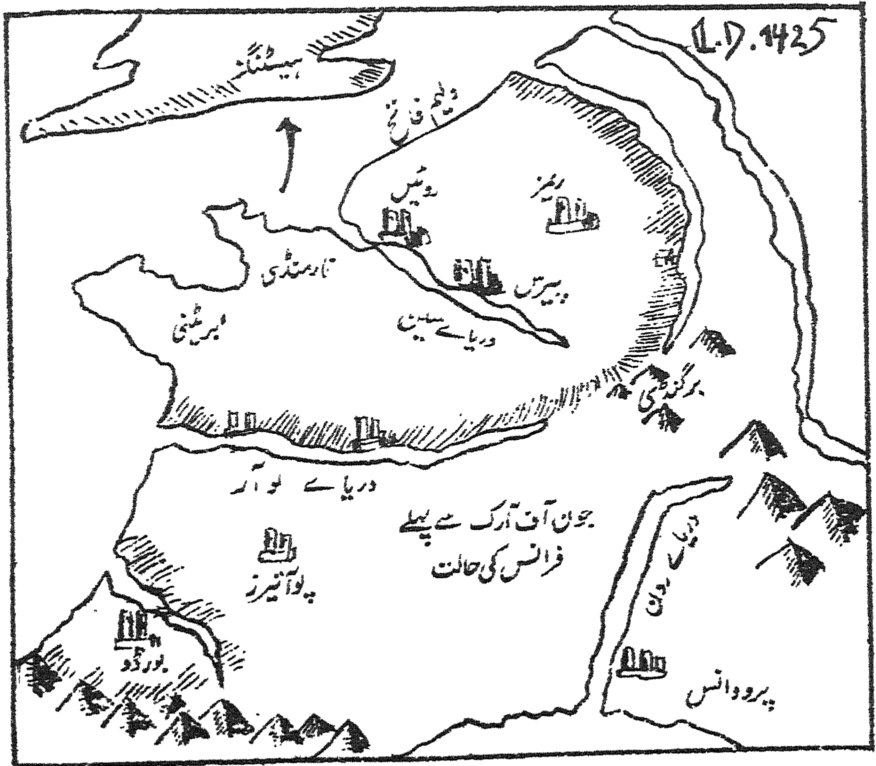
[1] Canute

پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ کینوٹ کے ہم وطن یعنی اہلِ ڈنمارک کو بھی دست بردار ہونا پڑا۔ لیکن جونہی انگلستان ان کے پنجے سے آزاد ہُوا۔ ایک اور قوم نے اسے پھر فتح کرلیا + یہ نئے فاتحین اہلِ شمال ہی ایک اور قبیلے کے لوگ تھے۔ جنہوں نے دسویں

قومِ انگلیس

صدی کے شروع میں فرانس پر حملہ آور ہو کر وہاں ریاستِ نارمنڈی کی بنیاد ڈالی تھی + ولیم والئے نارمنڈی کی نظر جب سمندر کے پار اس جزیرے پر پڑتی مُنہ میں پانی بھر آتا۔ مدت تک اپنی ہوس کو سینے میں دبائے رکھا۔ لیکن آخر نہ رہا گیا۔ اکتوبر ۱۰۶۶ء رودبارِ انگلستان کو عبور کیا۔ چودہ اکتوبر کو ہیسٹنگز کی لڑائی میں قومِ اینگلو سیکسن کے آخری بادشاہ یعنی ہیرلڈ ولئے ویسکس کو شکست دے کر کمزور فوجوں کا صفایا کر دیا۔ اور خود انگلستان کے تخت پر متمکن ہُوا + لیکن ولیم اور ولیم کے جانشین یعنی خاندان آنژو کے بادشاہ انگلستان کو اپنا وطن نہ سمجھتے تھے + اُن کے نزدیک یہ جزیرہ محض اُن کی عظیم الشان مملکت کا ایک جزو تھا۔ گویا ایک نوآبادی تھی جہاں کے لوگ چونکہ غیر ترقی یافتہ اور جاہل تھے۔ اس لئے فاتحین انہیں اپنی

زبان اور اپنی تہذیب زبردستی سکھا رہے تھے + لیکن قسمت کی نیرنگی دیکھئے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا انگلستان خود نارمنڈی کے سینے پر چڑھ بیٹھا + اسی اثنا میں شاہانِ فرانس اپنے طاقتور نارمن انگلیسی پڑوسیوں کو (جو کہنے کو تو سلطنت فرانس کی رعایا تھی لیکن فی الحقیقت فرانس سے سرکش ہو رہے تھے) ملک سے نکالنے کے لئے سر توڑ کوشش کر رہے تھے + ایک سو سال کی کشمکش کے بعد بالآخر اہل فرانس نے جون آف آرک نامی ایک نوجوان لڑکی کی رہنمائی کی بدولت اِن اجنبیوں کو اپنے ملک سے بے دخل کر دیا + جون ۱۴۳۰ء میں کومپین کی لڑائی میں اہلِ برگنڈی کے ہاتھ آئی - اہلِ برگنڈی نے اُسے قیدی



صد سالہ جنگ

بنا کر انگریزی فوجوں کے ہاتھ بیچ ڈالا - اور انگریزوں نے اُسے جادوگرنی سمجھ کر زندہ جلا دیا + انگریزوں کو اپنے فرانسیسی مقبوضات کی ہمیشہ فکر لگی رہتی تھی - لیکن اس

جنگ کے بعد اُن کے دل کو اطمینان نصیب ہوا۔ اور وہ کلیتہً اپنے برطانوی مقبوضات کی طرف متوجہ ہوئے + برطانیہ کا یہ حال تھا کہ اُمرا آپس میں دست و گریبان ہو رہے تھے (ایسی خانہ جنگیاں زمانہ وسطیٰ میں وباؤں کی طرح عام تھیں) اکثر بڑے بڑے زمیندار اُن جنگوں میں مارے گئے تھے جو تاریخ میں گلاب کے پھولوں کی لڑائیوں کے نام سے مشہور ہیں۔ چنانچہ اس قحط الرجال میں بادشاہوں نے بلا روک ٹوک اپنے اقتدار کی بنیادیں مُستحکم کر لیں + پندرھویں صدی کے خاتمے تک انگلستان کی مرکزی حکومت بہت طاقتور ہو گئی۔ تخت پر خاندان ٹیوڈر کا جانشین ہنری ہفتم متمکن تھا اس نے ایک محکمۂ عدالت قائم کیا جو "سٹار چیمبر" کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کے ساتھ بڑے بڑے خوفناک مظالم کی یاد وابستہ ہے + جن اُمرا میں ابھی کچھ سکت باقی تھی اُنہوں نے دوبارہ حکومت میں دخل پانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن محکمۂ عدالت نے اس قسم کی تمام مساعی کو بڑی سختی اور بیدردی سے دبا دیا +

۱۵۰۵ء میں ہنری ہفتم کے بعد اُس کا بیٹا ہنری ہشتم تخت نشین ہوا۔ انگلستان کی ماہیت بدل گئی اور زمانۂ وسطیٰ کا یہ جزیرہ زمانۂ جدید کی ایک سلطنت بن گیا +

ہنری کو مذہب سے چنداں دلچسپی نہ تھی + پہلی بیوی کو طلاق دینے لگا تو پاپا نے اس میں مین میخ نکالی اِس پر ہنری نے پاپا کی اطاعت کا جُوا اتار پھینکا اور کلیسائے روما سے الگ ایک کلیسائے انگلستان کی بنیاد رکھی + کلیسائے انگلستان سب سے پہلا قومی کلیسا تھا۔ یعنی یہیں پر سب سے پہلے والئے مُلک اپنی رعایا کے دین اور دنیا دونو کا پیشوا قرار پایا + یہ مذہبی انقلاب جو بغیر قتل و خون کے عمل میں آیا ۱۵۳۴ء کا واقع ہے + اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو انگریز پادری جو عرصۂ دراز سے لُوتھری واعظین کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنے ہوئے تھے خاندانِ شاہی کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہو کر مامُون ہو گئے اور بادشاہ کی خیر خواہی کا دم بھرنے لگے۔ دوسرے خانقاہوں کے اِملاک و اراضی پر حکومت نے اپنا قبضہ جما لیا جس سے اقتدارِ شاہی کو تقویت پہنچی + تاجر پیشہ لوگ اپنے وطن اور وطن کی خوشحالی پر نازاں تھے اور چونکہ انگلستان اور براعظم یورپ کے درمیان ایک گہرے اور چوڑے رودبار نے حائل ہو کر اہلِ انگلستان اور دیگر قوموں کے درمیان مغائرت پیدا کر دی تھی اس لئے ہر غیر ملکی چیز سے نفرت کرتے تھے۔ برطانوی ہو کر

ایک اطالوی اُسقُف کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا انہیں بہر حال پسند نہ تھا۔ اس لئے جب ہنری نے پاپا سے سرکشی کی تو تاجر پیشہ لوگوں نے اُس کے فعل کو بہت سراہا +

۱۵۴۷ء میں ہنری نے وفات پائی + ولیعہدِ سلطنت کی عمر اُس وقت دس سال کی تھی + اس کم سِن بچے کے سرپرست لوتھری عقائد کے پیرو تھے۔ اُنہوں نے پراٹسٹنٹ مذہب کو پھیلانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا + بادشاہ سولہ برس کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ دنیا سے کوچ کر گیا + اُس کے بعد اُس کی بہن فلپ دوم شاہ ہسپانیہ کی بیوی ملکہ میری تخت نشین ہوئی + میری نے نئے قومی کلیسا کے اُسقفوں کو زندہ جلا دیا اور دیگر معاملات میں بھی اپنے ہسپانوی شوہر کا تتبع کیا +

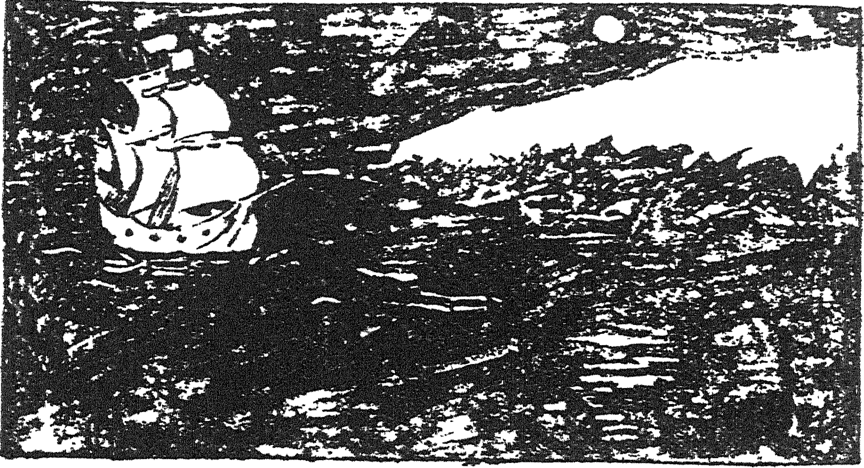
خوش قسمتی سے وہ بہت عرصہ زندہ نہ رہی + اس کے بعد ۱۵۵۸ء میں ہنری ہشتم کی بیٹی الزبتھ تخت پر بیٹھی + (الزبتھ این بولین کے بطن سے پیدا ہوئی تھی جو ہنری کی چھ بیلیوں میں سے دوسری تھی۔ جب ہنری کی طبیعت این بولین سے بھر گئی تو اُس کا سرِ قلم کرا دیا +) الزبتھ قید میں رہ چکی تھی۔ اور قید سے بھی نجات جب ملی جب مقدس رومن شہنشاہ نے خود اُس کی رہائی کی درخواست کی + اہلِ کیتھولک اور اہلِ ہسپانیہ کا ذکر تک سُننا اُسے گوارا نہ تھا + اپنے مرحوم باپ کی طرح مذہب سے غافل تھی۔ لیکن مردم شناسی بھی اُسی سے ورثے میں پائی تھی + پینتالیس سال تک حکومت کرتی رہی۔ اور اس عرصے میں اپنے خاندان کے اقتدار کو خوب مستحکم بنایا اور اپنے خوش باش وطن کے محصولات و مقبوضات کو وسعت دی + بڑے بڑے اولوالعزم اور دانا شخص اس کے دربار کی زینت تھے۔ انہوں نے معاملاتِ سلطنت میں ملکہ کا ہاتھ بٹایا۔ اور ان کی سیاست دانی کی بدولت عہدِ الزبتھ کو وہ فروغ نصیب ہوا کہ تاریخ کے صفحات آج تک اس کی یاد سے روشن ہیں + یہ دور ایسا اہم ہے کہ اس کا تمہیں تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیئے + اس کے متعلق کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن کی ایک مختصر سی فہرست اس کتاب کے آخر میں بھی دی گئی ہے +

لیکن الزبتھ کو ہر وقت ایک خطرناک حریف کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ اس کا نام میری تھا۔ میری خاندانِ سٹوارٹ میں سے تھی۔ اس کا باپ سکاٹ لینڈ نژاد

اور ماں فرانس کی دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ فرانسس دوم مرحوم شاہ فرانس کی بیوہ اور کیتھرین آف میڈیچی کی بہو تھی + (یہ وہی کیتھرین ہے جس کے ایما سے سینٹ بارتھولومیو کی رات قتلِ عام ہوا تھا) میری کا بیٹا جو بعد میں انگلستان کا پہلا سٹوارٹ بادشاہ بنا ابھی کمسن تھا + میری راسخ العقیدہ کیتھولک اور الزبتھ کے دشمنوں کی بڑی دوست تھی + لیکن سیاسی مصلحتوں سے پوری طرح آشنا نہ تھی۔ اپنی کالوینی رعایا پر وہ ظلم ڈھائے کہ سکاٹ لینڈ میں بغاوت ہو گئی۔ اور میری کو انگریزی علاقہ میں پناہ لینی پڑی + یہاں اٹھارہ سال مقیم رہی لیکن بجائے اس کے کہ وہ ملکہ الزبتھ کی شکر گزار ہوتی جس کی طفیل اُس کی زندگی چین سے گزر رہی تھی۔ رات دن اُسی کے خلاف سازشیں کرتی رہی + جب اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی۔ تو الزبتھ نے مشیرانِ سلطنت کی تجویز کو قبول کر لیا۔ اور میری کا سر کٹوا دیا +

۱۵۸۷ء میں میری کے قتل سے ہسپانیہ کو انگلستان سے وجۂ عناد پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ جنگ کی نوبت آن پہنچی + لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ انگلستان اور ہالینڈ کے جنگی بیڑوں نے متحد ہو کر فلپ کے آرماڈا کو تتر بتر کر دیا + یہ جنگ اس غرض سے بپا ہوئی تھی۔ کہ کیتھولک مذہب کی مخالف دو بڑی بڑی طاقتوں کی سرزنش کی جائے۔ لیکن نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان دو طاقتوں پر تجارت کی نئی نئی راہیں کھل گئیں۔ جن سے انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا +

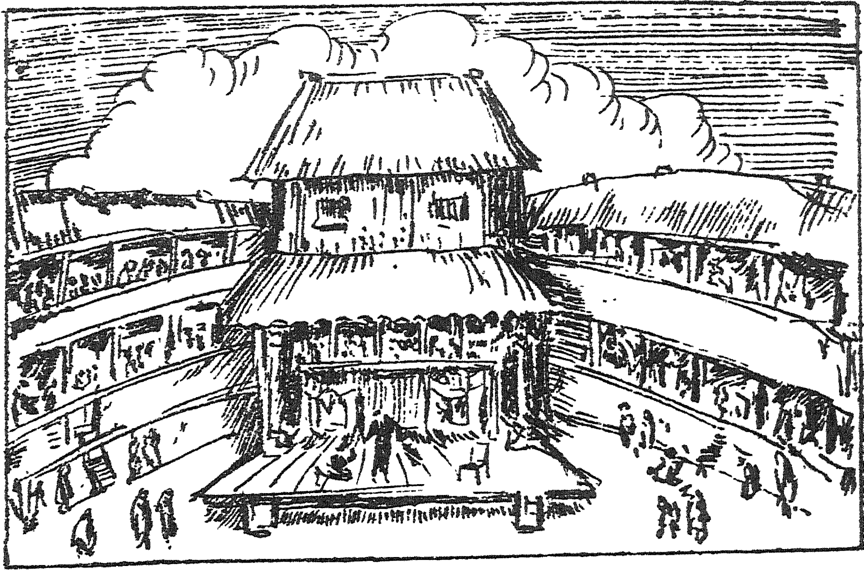
برسوں کے تامل و توقف کے بعد اہلِ انگلستان اور ہالینڈ میں آخر اس بات کا حوصلہ پیدا ہوا۔ کہ جزائر ہند اور امریکہ پر دھاوا بولیں۔ اور اہلِ ہسپانیہ نے اُن کے پراٹسٹنٹ بھائیوں پر جو ظلم ڈھائے تھے۔ اُن کا انتقام لیں + انگریز اُن لوگوں میں سے تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے کولمبس کی تقلید کی تھی۔ سب سے پہلے انگریزی جہازوں ہی نے وینس کے جہازران کابوتو (یا کابوت) کے زیرِ کمان ۱۴۹۷ء میں شمالی امریکہ کے براعظم کو دریافت کیا تھا + لیبراڈور اور نیو فونڈلینڈ بذاتِ خود تو اس قابل نہ نکلے۔ کہ وہاں نوآبادیاں قائم کی جائیں لیکن نیو فونڈلینڈ کا ساحل انگریزی ماہی گیروں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا + ۱۴۹۸ء میں اسی کابوت نے فلوریڈا کے ساحل کی بھی سیاحت کی +



جان اور سبسٹیان کابوت کو نیو فونڈ لینڈ کا کنارہ نظر آرہا ہے

اس کے بعد ہنری ہفتم اور ہنری ہشتم کا زمانہ آیا۔ جب کہ اور مصارف اس قدر زیادہ تھے کہ سیاحتوں کا خیال آنا بھی مشکل تھا۔ الزبتھ کے زمانے میں صورت حالات بدل گئی۔ ملک کو چین نصیب تھا۔ میری سٹوارٹ قید میں تھی۔ ملاحوں کو یہ کھٹکا نہ تھا کہ سفر کو جائینگے تو بیوی بچوں پر خدا جانے کیا مصیبتیں نازل ہونگی۔ الزبتھ ابھی بچہ ہی تھی کہ ولوبیؔ جہاز میں سوار ہو کر راس شمال سے بھی آگے نکل گیا۔ اور اس کا ایک کپتان جزائر ہند کے رستے کی تلاش میں روس کے ایک شہر آرکینجل پر جا پہنچا۔ جہاں اُس نے ماسکو کی دور دراز مملکت کے ساتھ سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم کر لئے۔ اس سفر کے بعد عہد الزبتھ کے اوائل میں کئی اور لوگوں نے دور دراز ممالک کے چکر کاٹے۔ تاجر پیشہ قسمت آزما سپاہیوں نے غیر ممالک میں تجارتی کمپنیاں قائم کیں۔ جو بعد میں انگلستان کی نو آبادیاں بن گئیں۔ الزبتھ کے جہازران قزاق بھی تھے۔ اور سیاست دان بھی۔ سمندر کی بساط پر قسمت سے بازی لگاتے۔ رہزنوں اور لٹیروں کی طرح آئین اور قانون سے بے نیاز ہو کر جو ہاتھ لگتا جہازوں پر لاد لاتے۔ اور اپنے فائدے کے لئے انسانوں تک کی تجارت

لہ Willoughby.



ملکہ الزبتھ کے زمانے کی اسٹیج

سے دریغ نہ کرتے + انہوں نے سلطنتِ انگلستان کا جھنڈا دنیا کے گوشے گوشے میں گاڑ دیا اور اپنی کنواری ملکہ کے نام سے روئے زمین کو آشنا کر دیا +

اس اثنا میں ولیم شیکسپیئر ملکہ کی ضیافت طبع کا سامان بہم پہنچاتا رہا - اور ملک کے بہترین سیاست دانوں نے الزبتھ کے دست و بازو بن کر ہنری ہشتم کی وراثت کو ایک جدید اور ترقی یافتہ سلطنت بنا دیا +

۱۶۰۳ء میں ملکۂ الزبتھ نے ستتر سال کی عمر میں وفات پائی اور اُس کے بعد اس کے حریف سٹوارٹ کا بیٹا اور اُس کے اپنے دادا ہنری ہفتم کا پڑپوتا جیمز اوّل کے لقب سے تخت پر بیٹھا + خدا کے فضل سے ورثے میں اُسے سلطنت ایسی ملی - جو دیگر ممالک یورپ کے برعکس مذہبی تنازعات کے مہلک اثرات سے مامون رہی تھی! یورپ میں پراٹسٹنٹ اور اہل کیتھولک لوگ اپنے اپنے دین کی خاطر ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے - لیکن انگلستان میں صلح و امن کا دور دورہ تھا - اور یہاں کا مذہبی انقلاب بغیر کسی خونریزی کے اور بغیر لوتھر یا ڈیولا کی انتہا پسندی کے عمل میں آیا تھا + چنانچہ بعد میں جب نو آبادیات میں زور آزمائی کا موقع آیا - تو انگلستان کا پلہ بہت بھاری رہا اور بین الاقوامی معاملات

ہیں انگلستان کی حیثیت سب سے اونچی رہی۔ اور آج تک سب سے اونچی ہے +
خاندان سٹوارٹ کے عہدِ حکومت میں جو سانحات پیش آئے۔ وہ بھی ملک کی ترقی
کے رستے میں حائل نہ ہوئے +

خاندان ٹیوڈر کے جانشین خاندانِ سٹوارٹ کے لوگ انگلستان میں پردیسی سمجھے
جاتے تھے۔ لیکن خود اُن کے دل میں اس بات کا احساس پیدا نہ ہوا۔ اور انہوں
نے اس کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس نہ کیا + لوگ ایک ٹیوڈر فرمانروا کی ذلیل ترین
حرکتوں سے چشم پوشی کر سکتے تھے۔ لیکن ایک سٹوارٹ فرمانروا کی ذراسی بے عنوانی پر
چیخ اٹھتے تھے + ملکہ الزبتھ کا جو دل چاہا اُس نے کیا اور کسی نے اُس پر حرف گیری
نہ کی + لیکن عام طور پر وہ ہمیشہ ایسی حکمت عملی پر کاربند رہی جس سے انگریزی
تجارت کو فروغ اور انگریزی تاجروں کو خوشحالی نصیب ہوئی۔ اس لئے رعایا ہمیشہ
وفادار رہی + اگر الزبتھ کبھی کبھی پارلیمنٹ کے حقوق غصب کر لیتی تھی۔ تو بھی لوگ
اُن فوائد کی خاطر جو ملکہ معظمہ کی دانشمندانہ حکمتِ عملی کی بدولت غیر ممالک سے پہنچ
رہے تھے۔ اُس سے تعرض نہ کرتے تھے +

بظاہر شاہ جیمز نے ملکۂ الزبتھ کی حکمتِ عملی سے انحراف نہ کیا۔ لیکن اُس کی
طبیعت میں وہ جوش نہ تھا + یوں تو غیر ملکی تجارت کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی رہی۔
اور اہل کیتھولک کو بھی سر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ لیکن جب ہسپانیہ دوبارہ تعلقات
قائم کرنے کی غرض سے انگلستان کی چاپلوسی کرنے لگا۔ تو جیمز پر اُس کا جادو چل
گیا + رعایا کو یہ بات ناگوار گزری۔ لیکن بادشاہ کے سامنے دم مارنے کی مجال
نہ ہوئی +

تھوڑے ہی عرصے کے اندر اندر کئی اور وجوہ سے یہ رنجش اور بڑھ گئی + شاہ
جیمز اور اُس کے بیٹے اور جانشین چارلس اوّل دونوں کا یہ عقیدہ تھا کہ بادشاہ مامور
من اللہ ہے۔ اس لئے اپنی مرضی کا پورا پورا مالک ہے + اس کے لئے ضروری نہیں
کہ وہ اپنی رعایا کے کہے پر چلے + یہ اصول دنیا میں پہلے بھی رائج تھا + پاپا جو کئی
پہلوؤں سے رومن شہنشاہوں کے جانشین تھے (یا یوں کہئے کہ رومنوں کے
سامنے جو عالمگیر سلطنت کا نصب العین تھا۔ اُس کے علم بردار تھے) اپنے

آپ کو دنیا میں خلفائے یسوع سمجھتے تھے - اور اسی حیثیت سے مانے جاتے تھے - جب احکم الحاکمین کی حکمتوں میں چوں و چرا کا یارا نہ تھا - تو اُس کے خلفا پر نکتہ چینی کرنے کی کس کو جرأت ہوتی - جسے جہاں بانی خدا نے سونپی ہو - وہ تو اپنے اعمال و افعال کے لئے صرف خدا ہی کے سامنے جواب دہ ہوگا ❊

لوتھر کی تحریک کے بعد جو بادشاہ پروٹسٹنٹ ہوگئے - اور پاپا کے زیرِ فرمان نہ رہے - وہ خود خدا کے خلیفے بن بیٹھے ❊ لوگ ان پر معترض نہ ہوئے ❊ جس طرح آج کل ہمیں جمہوری حکومت سب سے معقول طرزِ حکومت معلوم ہوتی ہے - اسی طرح اُن کے نزدیک خلافت کا یہ تصور نہایت معقول معلوم ہوتا تھا ❊ اس لئے یہ کہنا کہ شاہ جیمز کی مطلق العنانی پر لوگ معترض اس لئے ہوئے کہ لوتھری یا کالوینی عقائد نے اُن کی ذہنیت کو بدل ڈالا تھا - صحیح نہیں ❊ انگریزوں کی قوم جو خلافت سے مُنکر ہوئی تو اِس کی وجوہ اور تھیں ❊

یہ انحراف ہالینڈ سے شروع ہُوا - جہاں ۱۵۸۱ء میں سات سلطنتوں کے نمائندوں نے فلپ دوم شاہِ ہسپانیہ کی اطاعت سے انکار کر دیا - اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ چونکہ بادشاہ نے اپنا عہد توڑ دیا ہے - اس لئے جس طرح کسی اور بد عہد ملازم کو برخواست کر دیا جاتا ہے اُسی طرح بادشاہ کو بھی برطرف کر دینا چاہیئے ❊ اس واقعے کے بعد جو قومیں بحیرۂ شمال کے ساحل پر آباد تھیں اُن میں سے بیشتر کو رفتہ رفتہ اس بات کا یقین ہوتا گیا - کہ بادشاہ کو اپنی رعایا کے سامنے جواب دہ ہونا چاہیئے - ان ممالک کی رعایا متمول اور ذی اقتدار تھی - وسطی یورپ کے غریب باشندوں کی طرح اُنہیں یہ خطرہ نہ تھا - کہ ایسی بات منہ سے نکالیں گے - تو شاہی فوج کے سپاہی پکڑ کر پاس ہی کسی قلعہ کی تاریک کوٹھڑی میں بند کر دینگے ❊ ہالینڈ اور انگلستان کے تاجروں کی مدد کے بغیر کوئی بادشاہ بّری یا بحری فوج رکھنے کے قابل نہ تھا - سب سے بہترین اسلحہ یعنی روپیہ ان کے پاس موجود تھا - اس لئے وہ کسی سے نہ ڈرتے تھے ❊ اگر خاندان ہیپس برگ یا خاندانِ بوربون یا خاندانِ سٹوارٹ کے کسی فرمانروا کو حقِ فرمانروائی خدا کی طرف سے عطا ہُوا تھا - تو تاجروں کی مال و دولت بھی خدا ہی کی دی ہوئی تھی -

اور یہ طاقت خلافت کے زبانی دعووں سے کہیں زیادہ تھی۔ اور اس کے سامنے تخت ہی فوجوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس سے جہاں اور ممالک کے لوگ پھانسی اور قید کے ڈر سے زبان تک ہلانے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ وہاں ہالینڈ اور انگلستان کے باشندے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بھی نہ ڈرتے تھے۔

چنانچہ جب خاندانِ سٹوارٹ کے بادشاہ اپنی مطلق العنانی کے بلند آہنگ دعووں سے رعایا کو تنگ کرنے لگے۔ تو متوسط طبقے کے لوگوں نے سب سے پہلے ایوانِ عام میں اُن کو ٹوکا۔ بادشاہ نے اُن کی پروا نہ کی۔ بلکہ پارلیمنٹ ہی کو منسوخ کر دیا۔ گیارہ برس تک چارلس اول اکیلا حکومت کرتا رہا۔ نت نئے محصولات اس بیدردی سے عائد کئے گویا مملکتِ برطانیہ اُس کی ذاتی ملکیت ہے۔ اُس کے مشیر بڑے ہوشیار لوگ تھے۔ اور وہ خود بھی اپنے عقیدے کا پکا اور ہٹ کا پورا تھا۔

خرابی یہ ہوئی کہ سکاٹ لینڈ کی وفادار رعایا کی تالیفِ قلوب کرنے کی بجائے چارلس اُلٹا اُن سے اُلجھ پڑا۔ روپے کی ضرورت محسوس ہوئی تو طوعاً و کرہاً پھر پارلیمنٹ کو جمع کیا۔ اپریل ۱۶۴۰ء میں اجلاس منعقد ہوا۔ لیکن اراکین نے بادشاہ کی ایک نہ چلنے دی۔ چنانچہ چند ہفتوں کے بعد پارلیمنٹ پھر منسوخ ہو گئی۔ نومبر میں ایک نئی پارلیمنٹ منعقد کی گئی تھی لیکن یہ پہلے سے بھی زیادہ سرکش ثابت ہوئی۔ اراکین یہ سمجھ چکے تھے کہ بادشاہ اور رعایا کے درمیان جو اختلاف پیدا ہو چکا ہے۔ اُس کا فیصلہ یوں آسانی سے نہ ہوگا۔ انہوں نے بادشاہ کے چھ بڑے مشیروں کو قتل کر دیا۔ اور جب اقتدارِ شاہی کو یہ کاری زخم لگا چکے۔ تو اعلان کر دیا۔ کہ پارلیمنٹ کو خود پارلیمنٹ کی مرضی کے بغیر کوئی منسوخ نہیں کر سکتا۔ بالآخر یکم دسمبر ۱۶۴۱ء کو انہوں نے بادشاہ کے سامنے ایک شکایت نامہ اعظم پیدا کیا جس میں رعایا کی تمام شکایات بالتفصیل درج تھیں۔

جنوری ۱۶۴۲ء میں چارلس حمایتیوں کی تلاش میں لندن سے باہر نکلا۔ اِدھر بادشاہ کے حریفوں اور اُدھر پارلیمنٹ کے حامیوں نے صفیں آراستہ کیں۔ اور جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں انگلستان کا سب سے طاقتور فرقہ

یعنی فرقۂ اہلِ صفا بہت جلد بروئے کار آیا۔ ان خدا پرستوں کی پلٹنوں نے آلیورا
کرام ویل کے زیر کمان اپنی تنظیم اور اپنے غیر متزلزل ایمان کی وجہ سے باقی فوجوں
کے لیے نہایت اعلےٰ مثال قائم کی + چارلس نے دو دفعہ شکست کھائی اور ۱۶۴۵ء
میں نیزبی کی لڑائی کے بعد سکاٹ لینڈ کو بھاگ گیا + اہلِ سکاٹ لینڈ نے اُسے
انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا +

اِس کے بعد طرح طرح کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا دور شروع ہوا۔ اور
اہلِ سکاٹ لینڈ کے ایک عیسائی فرقے نے انگریز اہلِ صفا کے خلاف بغاوت کا جھنڈا
بلند کر دیا + اگست ۱۶۴۸ء میں پریسٹن پینس کی سہ روزہ لڑائی کے بعد کرام ویل نے
اس دوسری جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایڈنبرا فتح کر لیا + اس دوران میں اُس کے
سپاہیوں نے طول طویل مذہبی مباحثوں اور زبانی جمع خرچ سے تنگ آ کر من مانی
کارروائی کا تہیہ کر لیا + اُنھوں نے پارلیمنٹ کو اُن تمام لوگوں سے پاک کر دیا جن کے
عقائد ان سے مختلف تھے + جو اراکین باقی رہ گئے۔ اُنھوں نے بادشاہ پر غداری
کا الزام عائد کیا۔ اور جب ایوانِ اُمرا نے اس الزام کی تحقیقات کی۔ اور اس پر کوئی
حکم صادر کرنے سے انکار کر دیا۔ تو ایک خاص عدالت مقرر کی گئی جس نے بادشاہ
کو سزائے موت کا حکم سنایا۔ تیس جنوری ۱۶۵۰ء کو شاہ چارلس وائٹ ہال کے ایک
دریچے میں سے نکل کر چپ چاپ تختۂ دار تک پہنچا۔ یہی اس کی زندگی کا آخری سفر
تھا + اس واقعے کا در اصل مفہوم یہ ہے کہ حکومت اب گویا عوام کے ہاتھ میں تھی۔
جن کے نمائندوں نے پہلی مرتبہ ایک فرمانروا کو موت کا حکم سنایا۔ اس لئے کہ وہ
فرمانروا اس جدید طرز کی حکومت میں اپنی حیثیت صحیح طور پر نہ پہچان سکتا تھا اور
اُس سے تجاوز کرنا چاہتا تھا +

چارلس کی وفات کے بعد کا دور آلیور کرام ویل کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے +
شروع شروع میں تو وہ غیر رسمی طور پر انگلستان کا مطلق العنان رہنما تھا لیکن ۱۶۵۳ء
میں اُسے دستور و آئین کے مطابق لارڈ پروٹیکٹر کا عہدہ تفویض کیا گیا + وہ پانچ

لے Oliver Cromwell

سال تک برسرِ اقتدار رہا۔ اور اس دوران میں ملکہ الزبتھ کی حکمت عملی پر کاربند رہا۔ ہسپانیہ پھر ایک بار انگلستان کا جانی دشمن بن گیا۔ اور اہلِ ہسپانیہ کے خلاف جنگ کرنا کل قومِ انگریز کا نصب العین قرار پایا۔

انگلستان کی تجارت اور تاجروں کے مفاد کو سب سے مقدم سمجھا گیا۔ اور حکومت نے کسی معاملے میں کٹر اہل پروٹسٹنٹ کے عقائد سے سرِمُو انحراف نہ کیا۔ کرام ویل نے دیگر دولِ یورپ کے مقابلے میں تو انگلستان کے اقتدار کو ذرہ بھر ضعف نہ پہنچنے دیا۔ لیکن معاشرت ملک کی اصلاح میں اُسے سخت ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ دنیا میں مختلف خیالات اور مختلف عقائد کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اُن سب کو ایک دوسرے کا ہم خیال بنانا اور اُن سے یہ توقع رکھنا کہ ان میں کبھی اختلاف پیدا نہ ہوگا ناممکن ہے۔ غور سے دیکھئے تو اس میں بھی قدرت کی ایک بہت بڑی مصلحت مضمر ہے۔ اگر کوئی حکومت صرف ایک ہی فرقے کے ہاتھ میں ہو۔ کل اختیارات اُسی فرقے کے قبضے میں ہوں۔ اور ہر بات میں اِسی فرقے کے خیالات و آرا سے استصواب کیا جائے تو ایسی حکومت کا بہت دیر تک قائم رہنا ممکن نہیں۔ جب اہل صفا نے اقتدارِ شاہی کو ضعف پہنچانا چاہا۔ اور بادشاہ کی مطلق العنانی سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں تھیں اُن کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو گویا بہت نیکی کا کام کیا۔ لیکن جب عنانِ حکومت اُن کے ہاتھ میں آئی۔ اور اُنھوں نے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش کی۔ تو لوگ اُس سے تنگ آ گئے۔

جب کرام ویل نے ۱۶۹۸ء میں وفات پائی۔ تو خاندانِ سٹوارٹ دوبارہ سلطنت پر قابض ہو گیا۔ کسی نے اُن کی مزاحمت نہ کی۔ بلکہ برعکس لوگوں نے اُنھیں اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اُن کا خیر مقدم کیا۔ کیونکہ مطلق العنان جابر شاہ چارلس کے بعد مسکین طبع اہلِ صفا کی حکومت کچھ کم جابر ثابت نہ ہوئی تھی۔ لوگوں نے خاندان سٹوارٹ پر یہ بات واضح کر دی۔ کہ اگر شاہانِ ملک مامور من اللہ ہونے کا دعوے چھوڑ دیں۔ اور اپنے مرحوم باپ کی طرح اپنی ضد پر نہ اڑے رہیں۔ اور اپنے آپ کو پارلیمنٹ کے تابع فرمان سمجھیں۔ تو ہم ... بادشاہ کی

وفاداری اور ہوا خواہی کا دم بھرتے رہیں گے +

وولپشتنوں نے یکے بعد دیگرے اس مفاہمت پر عمل کرنے کی کوشش کی - لیکن خاندان سٹوارٹ نے چارلس کے حسرتناک انجام سے عبرت نہ پکڑی - اور اپنی بری عادتوں کو نہ چھوڑا + چارلس دوم جو ۱۶۶۰ء میں انگلستان واپس آیا خوش اخلاق مگر نالائق شخص تھا + لیکن چونکہ حد درجے کا کاہل اور تساہل پسند تھا اور بلاتکلف جھوٹ بول لیتا تھا۔ اس لئے کھلم کھلا بغاوت کا موقع پیش نہ آیا ۱۶۶۲ء میں اُس نے نیا قانون نافذ کیا جس کے رو سے سب رافضی پادریوں کو اپنے اپنے حلقوں سے بے دخل کر دیا - اور فرقہ اہلِ صفا کے پادریوں کی قوت کو زائل کر دیا + ۱۶۶۴ء میں ایک اور قانون اس مطلب کا نافذ کیا - کہ اگر کوئی رافضی کسی مذہبی جلسے میں شامل ہوگا - تو اُسے جلاوطن کر کے جزائر غرب الہند کو بھیج دیا جائیگا + لوگوں نے جب یہ احکام سُنے - تو اُن کا ماتھا ٹھنکا - اُن پر روشن ہو گیا کہ بادشاہ کے دماغ میں مامور من اللہ ہونے کا خبط ابھی باقی ہے - انھوں نے بدستور سابق بے اطمینانی کا اظہار کیا - اور پارلیمنٹ کی تنگ دستی کا بہانہ تلاش کر کے بادشاہ کو روپیہ دینا بند کر دیا +

جب پارلیمنٹ سے روپیہ نہ ملا - تو چارلس نے خُفیہ طور پر اپنے ٹروسی اور عزیز لوئی شاہ فرانس سے روپیہ قرض لیا + اپنے پراٹسٹنٹ حلیفوں کو بیس لاکھ سالانہ پونڈ کے عوض بیچ کر چارلس دل میں پارلیمنٹ کی سادہ لوحی پر خوب ہنسا +

روپے کی طرف سے بے فکر ہو کر بادشاہ کے حوصلے بڑھ گئے + جلاوطنی کے کئی سال اپنے کیتھولک رشتہ داروں کے ہاں گزارے تھے - دل ان کے عقائد کی طرف مائل تھا - انگلستان کو پھر کلیسائے روما کے زمرۂ حلقہ بگوشاں میں واپس لانے کے خواب دیکھنے لگا - ایک اعلانِ عفو نافذ کیا جس کے رو سے وہ تمام قوانین جو اہل کیتھولک اور رافضیوں کے خلاف پڑتے تھے - منسوخ کر دیئے + اِدھر یہ اعلان شائع ہوا - ادھر لوگوں میں یہ خبر مشہور ہوئی - کہ چارلس کے چھوٹے بھائی جیمز نے کیتھولک مذہب اختیار کر لیا ہے + عوام کے

کان کھڑے ہوئے اور اُن کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوُا کہ یہ سب پاپایوں کی کوئی سازش ہے + لوگوں میں اضطراب کے آثار رونما ہوئے بیشتر لوگ خانہ جنگی کے خلاف تھے۔ اُنہیں بادشاہ کے مظالم اُس کا تبدیلِ مذہب اُس کی مطلق العنانی یہ سب کچھ گوارا تھا لیکن یہ گوارا نہ تھا۔کہ لوگ اپنے ہی بھائی بندوں کا خون بہائیں بعض ایسے بھی تھے۔ جو اس قدر روا داری کے قائل نہ تھے۔ یہ وہی رافضی تھے۔جن سے بادشاہ اس قدر خائف رہتا تھا۔لیکن یہ لوگ اپنی ہٹ کے پورے اور دھن کے پکے تھے۔اور ان کے رہنما کئی جلیل القدر اُمرا تھے۔جنہیں مطلق العنان بادشاہ کی حکومت کسی طرح گوارا نہ تھی۔اور جب ایک مرتبہ اُس سے نجات حاصل کر لی تھی۔تو اب دوبارہ اُسے قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے +

ملک میں دو جماعتیں پیدا ہوئیں + ایک جماعت میں تو متوسط طبقے کے لوگ تھے۔جو بادشاہ کے خلاف تھے + (چونکہ ۱۶۴۸ء میں سکاٹ لینڈ کے وگا مور یعنی سوداگران اسپ نے اپنے پادریوں کے زیر سرکردگی کوچ کر کے ایڈن برا کے مقام پر بادشاہ کی مخالفت کی تھی۔اس لئے اس جماعت کے افراد کو لوگ وِگ[1] کہتے تھے +) دوسری جماعت بادشاہ کے حمایتیوں کی تھی۔جنہیں ٹوری[2] کہتے تھے۔(شروع شروع میں اس لفظ سے مراد صرف آئرلینڈ کے شاہ پرست تھے) + یہ دو جماعتیں ایک دوسرے کے مقابلے پر ڈٹ گئیں لیکن کسی نے زور آزمائی کو انتہا تک پہنچانے کی کوشش نہ کی + چارلس نے اپنی زندگی کے دن پورے کر لئے۔اور اس کے بعد ۱۶۸۵ء میں اُس کا بھائی جیمز دوم (جو کیتھولک عقیدے کا پیرو تھا) تخت پر بیٹھ گیا۔لیکن کسی نے مزاحمت نہ کی + جیمز نے پہلے تو ملک کو یہ خبر سنائی کہ بدولت بعض دیگر دول یورپ کی مانند ایسی فوج بھرتی کرنا چاہتے ہیں۔جو صلح کے زمانے میں ہر وقت تیار کھڑی رہیگی۔اور جس کے سپہ سالار فرانسیسی کیتھولک ہونگے۔ لوگ اسے بدعت قبیحہ سمجھ کر بہت ناراض ہوئے۔اس کے بعد ۱۶۸۸ء میں ایک اور اعلان عفو شائع کیا۔اور حکم دیا کہ یہ اعلان سب انگلیسی گرجوں

---

[1] Whig.　[2] Tory.

میں بڑھ جائے۔ اگر جیمز کی جگہ کوئی بہت ہی ہر دلعزیز بادشاہ ہوتا اور حالات بھی غیر معمولی ہوتے تو لوگ شاید ایسی حرکتوں کو برداشت کر لیتے۔ لیکن جیمز کی یہ جسارت اس کے حق میں بہت مضر ثابت ہوئی۔ سات اُسقفوں نے فرمانِ شاہی کے ماننے سے انکار کر دیا۔ انہیں عدالت میں پیش کیا گیا۔ جیوری نے انہیں بے گناہ قرار دیا اور عوام نے اُن کے فیصلے سے پورا پورا اتفاق کیا۔

جیمز نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں کی تھیں۔ اُس کی پہلی بیوی سے جو پروٹسٹنٹ تھی۔ میری اور این دو لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں۔ اُس کے بعد جیمز نے موڈینا ایسٹ کے کیتھولک گھرانے کی ایک عورت ماریا نامی سے شادی کر لی۔ بدقسمتی سے انہیں دنوں ماریا کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ظاہر تھا کہ بادشاہ کا جانشین یہی لڑکا ہوگا۔ اور اس کی پراٹسٹنٹ سوتیلی بہنیں تخت سے محروم رہ جائینگی۔ لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہوئے۔ اور یہ افواہ مشہور ہوئی۔ کہ یہ لڑکا ماریا کا بیٹا نہیں۔ لوگوں نے کہا۔ اس عمر میں ماریا کے اولاد نہیں ہو سکتی۔ یہ سب ایک سازش ہے۔ کوئی یسوعی پادری محل میں کسی بچے کو لے آیا ہے۔ تاکہ انگلستان پر ایک کیتھولک بادشاہ حکمران ہو۔ شورش اس قدر بڑھی کہ خانہ جنگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ سات بڑے بڑے آدمیوں نے (جن میں وگ اور ٹوری دو نو جماعتوں کے لوگ شامل تھے۔) جیمز کی بڑی لڑکی میری کے شوہر ولیم دوم کو (جو جمہوریہ ہالینڈ کا صدر تھا) خط بھیجا اور اُس سے التجا کی۔ کہ آپ انگلستان آکر اس بادشاہ سے جو از روئے قانون ہمارا حکمران ہے۔ لیکن جس کی حرکتوں سے ہم تنگ آ گئے ہیں۔ نجات دلوائیے۔

پانچ نومبر ۱۶۸۸ء کو ولیم ٹوربے کے مقام پر جہاز سے اُترا۔ ولیم یہ نہ چاہتا تھا۔ کہ اُس کے خسر کو کوئی ایسی تکلیف پہنچے جس سے لوگوں کو اس سے ہمدردی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے جیمز کو صحیح سلامت بھاگ جانے کا موقع دیا۔ جیمز وطن چھوڑ کر فرانس جا بیٹھا۔ ولیم نے ۲۲ جنوری ۱۶۸۹ء کو پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد کیا۔ تیرہ فروری کو وہ اور اُس کی بیوی انگلستان کے فرمانروا قرار پائے لوگوں نے اُن کی اطاعت قبول کی۔ اور اہل پراٹسٹنٹ کو کیتھولک لوگوں کی

دست درازیوں سے چھٹکارا ملا +

پارلیمنٹ نے جواب اپنے آپ کو مشیر شاہی سے بڑھ کر سمجھنے لگی تھی - اور جس نے کئی فرائضِ ملکی اپنے ذمے لے لئے تھے - موقع سے پورا فائدہ اٹھایا + ۱۶۲۸ء میں عطائے حقوق کے لئے جو عرضی پیش کی گئی تھی - اُسے ٹال جانے کے کسی کونے سے پھر باہر نکالا - اور پھر حقوقِ رعایا کے متعلق ایک دوسرا بل پیش کیا جو پہلے سے بھی سخت تھا + اس بل کے رو سے بادشاہ کے لئے یہ ضروری ہو گیا - کہ وہ کلیسائے انگلیسی کا پیرو ہو - اُسے یہ حق نہ رہا کہ وہ جس قانون کو چاہے منسوخ کر دے یا جس شخص کو چاہے بعض قوانین سے مستثنےٰ قرار دیدے + علاوہ برآں اس بل میں یہ بھی درج تھا - کہ پارلیمنٹ کی رضامندی کے بغیر کوئی محصولات عائد نہیں کئے جا سکتے نہ کوئی فوج رکھی جا سکتی ہے + الغرض ۱۶۸۹ء میں انگلستان کو وہ آزادی نصیب ہوئی جس سے یورپ کے دیگر ممالک ابھی محروم تھے +

لیکن ولیم کا عہد حکومت صرف قانونِ آزادی ہی کے لئے مشہور نہیں - ایک ذمہ دار وزارت کی تشکیل بھی ولیم ہی کے عہد میں ہوئی + ظاہر ہے کہ کوئی بادشاہ تنِ تنہا حکومت نہیں کر سکتا - اُسے ہمیشہ چند معتمد مشیروں کی ضرورت رہتی ہے + خاندانِ ٹیوڈر کے بادشاہوں نے اُمرا اور پادریوں کی ایک مجلس بنا رکھی تھی لیکن یہ مجلس اتنی بڑی تھی - کہ اس کا سنبھالنا مشکل تھا - چنانچہ اسے کاٹ چھانٹ کر ایک مختصر مجلس منعقد کی گئی جس کا نام پریوی کونسل رکھا گیا + یہ دستور ہو گیا - کہ اس کونسل کے اراکین محلِ شاہی کے ایک کبنیٹ[1] یعنی ایک کمرے میں جمع ہوتے تھے اس کا نام کیبنیٹ یا کابینہ پڑ گیا +

انگلستان کے فرمانرواؤں کا یہ قاعدہ چلا آتا تھا - کہ وہ اپنے مشیر سب سیاسی جماعتوں میں سے منتخب کرتے تھے - ولیم بھی اسی قاعدے پر کاربند رہا لیکن جب پارلیمنٹ نے زور پکڑا - اور وِگ جماعت کو دارالعوام میں اکثریت حاصل ہوئی تو ٹوریوں کو مشیرانِ سلطنت میں شامل کرنا ناممکن ہو گیا - اس لئے ٹوری امرا کو

---

[1] Cabinet.

برخاست کر دیا گیا۔ اور کابینے میں صرف وگ وزرا رکھے گئے + چند سال بعد دارالعوام میں وگ جماعت کا وہ پہلا سا زور نہ رہا۔ تو بادشاہ سرکردہ ٹوریوں کی حمایت حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا + ولیم مرتے دم تک لوئی شاہ فرانس سے مصروف پیکار رہا۔ اسلئے انتظام ملکی کی فرصت ہی نہ ملی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تمام اہم ملکی معاملات کابینے کے ہی زیر ہدایت انجام پاتے رہے + جب ولیم کی سالی این اُس کی وفات کے بعد ۱۷۰۲ء میں تخت پر بیٹھی۔ تو یہی صورتِ حالات قائم رہی + این کے سترہ بچے تھے۔ لیکن اُن میں سے ایک بھی زندہ نہ رہا۔ اور جب اُس نے ۱۷۱۴ء میں وفات پائی۔ تو خاندان ہنوور کا جارج اول (یعنی جیمز اوّل کی پوتی صوفی کا بیٹا) تخت انگلستان پر متمکن ہُوا +

جارج اوّل گنوار شخص تھا۔ اور زبان انگریزی سے محض نابلد۔ انگلستان کی پیچیدہ سیاسیات پر نظر ڈالی۔ تو خاک بھی اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ چنانچہ سب کچھ کابینے پر چھوڑ دیا۔ اور خود کبھی اُن کے اجلاس میں شامل نہ ہوا + انگریزی کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے اجلاس میں شامل ہوتا۔ تو بیٹھا جمایاں لیتا رہتا + رفتہ رفتہ حکومت انگلستان وسکاٹ لینڈ کے کُل اختیارات کابینے کے قبضے میں آ گئے۔ (سکاٹ لینڈ کی پارلیمنٹ بھی ۱۷۰۷ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ سے ملحق ہو گئی تھی) بادشاہ کو اب حکومت کے کام سے کوئی سروکار نہ رہا۔ چنانچہ وہ بیشتر وقت براعظم یورپ کی سیاحت میں مصروف رہتا +

جارج اوّل اور جارج دوم کے عہدِ حکومت میں کابینے کی ترکیب میں بڑے بڑے ممتاز وگ شامل رہے (ان میں سے سر رابرٹ وال پول اکیس سال تک اپنے عہدے پر فائز رہے) + بالاخر ان کا رہنما نہ صرف کابینے کا صدر بلکہ خود پارلیمنٹ میں جس جماعت کی اکثریت تھی۔ اس کا صدر تسلیم کیا گیا + جارج سوم نے ہرچند کوشش کی کہ حکومت کے اختیارات کابینے سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لے۔ لیکن اُس کی کوششوں کے نتائج اس قدر مضر ثابت ہوئے۔ کہ شاہان انگلستان نے پھر اُن کا کبھی اعادہ نہ کیا + گویا اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگلستان میں ذمہ وار حکومت قائم ہو گئی۔ اور ملک کی حکومت کے تمام اختیارات ذمہ وار

وزارت کے سپرد کر دئے گئے ۔ اُس دن سے لے کر آج تک انگلستان میں یہی قاعدہ چلا آتا ہے ۔

غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے ۔ کہ یہ حکومت فی الحقیقت تمام جماعتوں کی نمائندہ نہ تھی ۔ حق رائے دہندگی بمشکل بارہ آدمیوں میں سے ایک کو حاصل تھا ۔ لیکن جدید نمائندہ حکومت اسی سے قائم ہوئی ۔ اور اسی کی بدولت تمام اختیارات بادشاہ سے چھین کر بغیر کسی شورش یا فساد کے عوام کے نمائندوں کے سپرد کر دئے گئے ۔ اور ان حقوق میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا ۔ اس سے انگلستان کو ستُ جنگ تو نصیب نہ ہوا ۔ لیکن اُن بغاوتوں اور شورشوں سے نجات ضرور حاصل ہوئی ۔ جنہوں نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ کے دیگر ممالک کا ستیاناس کر دیا ۔

توازنِ قوت

لیکن فرانس کے فرمانرواؤں کو آسمانی حقوق کے بل پر بیش از پیش جاہ وحشمت نصیب ہوئی۔ اور اِن کی ہوس کو محض "توازنِ قوت" ہی کے جدید اصول نے تجاوز سے باز رکھا۔

جس زمانے میں انگلستان کے لوگ آزادی کی خاطر لڑ رہے تھے۔ اُس زمانے میں فرانس کی حالت بالکل اس کے برعکس تھی۔ مُلک کے حالات اور زمانے کے اقتضا کے مطابق جس قسم کا شخص حکومت کے لئے سب سے موزوں ہوتا ہے۔ اُس کا غیب سے ظہور میں آنا اور عنانِ سلطنت کو سنبھال لینا تو ادیرِ روزگار میں سے ہے۔ جہاں تک فرانس کا تعلق ہے۔ لوئی چہاردہم اس قسم کے مشاہیر زمانہ میں سے تھا لیکن باقی ماندہ یورپ کے لئے اس کا وجود نزولِ برکات کا موجب نہ بنا۔

اس نوجوان بادشاہ کو جس ملک کی فرمانروائی نصیب ہوئی۔ وہ یورپ کا سب سے زیادہ آباد ملک تھا۔ اور وہاں کے لوگ دیگر تمام اقوام سے زیادہ روشن طبع تھے۔ جب لوئی تخت پر بیٹھا۔ تو فرانس کے دو نامور کارڈی نل یعنی مازارین[1] اور رشلو[2] اپنا کام کر چکے تھے۔ اور اُن کے حسنِ تدبیر کی بدولت قدیم مملکتِ فرانس کو یہ رتبہ نصیب ہُوا تھا۔ کہ ستارھویں صدی میں کوئی ایسا ملک نہ تھا۔ جس کی مرکزی حکومت اتنی مستحکم اور طاقتور ہو۔ لوئی خود کا بھی حیرت انگیز قابلیت کا مالک تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے زرین عہدِ حکومت کے اثرات اس بیسویں صدی میں بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ وہ اوضاع و اطوار کی نفاست اور وہ شائستہ گفتاری جنہیں آجکل

---

[1] Mazarin, [2] Richelieu.

ہم اپنی معاشرتی زندگی میں تہذیب کا بہترین معیار سمجھتے ہیں شہنشاہ لوئی ہی کے دربارِ شاہی کی اختراع ہے۔ آج سے دو سو سال پہلے فرانسیسی زبان اپنی پاکیزگی اور نفاست کی بدولت باقی سب زبانوں سے سبقت لے گئی تھی۔ یہاں تک کہ آج بھی تمام بین الاقوامی معاملات میں فرانسیسی زبان ہی استعمال ہوتی ہے۔ اُس زمانے کے تھیئٹر سے آج کل بھی اس فن کے ماہر کئی نکات اخذ کر سکتے ہیں۔ فرانس کی اکادمی کو جس کی بنیاد رشلو نے رکھی تھی۔ دنیائے علم و ادب میں وہ رتبہ نصیب ہُوا کہ دیگر ممالک اُس پر رشک کرنے لگے۔ لوئی کے عہدِ حکومت کی برکات لاتعداد ہیں۔ آج کل یورپ کے سب ممالک میں میز پر کھانوں کی جو فہرست رکھی جاتی ہے۔ اس کا فرانسیسی زبان میں لکھا جانا محض اتفاقی امر نہیں۔ طباخی کا شگفتہ فن جو کمالِ تہذیب کا نشان ہے لوُئی ہی کے ذوق کی بدولت کمال کو پہنچا۔ اِس کا زمانہ ایسی جاہ و حشمت کا آئینہ دار تھا۔ کہ آج بھی ہماری آنکھیں اُس سے خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔

لیکن اس درخشاں تصویر کا دوسرا رُخ اتنا روشن نہیں۔ جب کسی ملک کی ظاہری شان و شوکت اور دبدبہ و جلال کا یہ عالم ہو۔ کہ بیرونِ ملک میں ہر جگہ پر اس کا لوہا مانا جائے۔ تو اندرونِ ملک کی حالت ابتر ہوتی ہے۔ لوئی چہاردہم اپنے باپ کی وفات کے بعد ۱۶۴۳ء میں تخت پر بیٹھا۔ اور ۱۷۱۵ء تک حکمران رہا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ فرانس کی حکومت بہتّر سال یعنی قریباً دو پشتوں تک ایک ہی شخص کے ہاتھ میں رہی۔

یہ بات واضح طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیئے۔ کہ کسی واحد شخص کا حکمران ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ دنیا میں کئی ایسے بادشاہ ہوئے ہیں۔ جن کی حکومت گو شخصی تھی۔ لیکن وہ خود بیدار مغز تھے۔ اور اپنے فرائض نہایت دانائی اور تن دہی سے سرانجام دیتے تھے۔ لوئی اس ڈھنگ کا پہلا فرمانروا تھا۔ اُسے یہ بالکل پسند نہ تھا۔ کہ وہ ا‌ز‌لئے ملک محض نام کا بادشاہ ہو۔ اور معاملاتِ ملکی محض ایک خوشگوار مشغلہ اور سامانِ تفریح بن کر رہ جائیں۔ اُس زمانے کے بیدار مغز فرمانروا اپنی رعایا سے بھی زیادہ کام کرتے تھے۔ سب سے پہلے اُٹھتے

تھے - اور سب سے بعد میں سوتے تھے + فرمانروائی کو عطائے خداوندی سمجھتے تھے - اور رعایا میں سے کسی شخص کا دخل انداز ہونا گوارا نہ کرتے تھے - لیکن اپنے فرائض کو بھی خدا کے مقرر کردہ فرمان سمجھتے تھے - اور اُن کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کرتے تھے +

یہ تو ناممکن تھا کہ بادشاہ سب کام اپنے ہی ہاتھ سے سرانجام دے - اُسے ہر وقت مشیروں کی ضرورت رہتی تھی - اور ایک دو سپہ سالار، خارجی سیاسیات کے چند ایک ماہرین اور اقتصادیات اور مالیات کے چند ایک واقف کار ہمیشہ مصروف رہتے تھے - لیکن یہ عمائدِ سلطنت بادشاہ کی اجازت کے بغیر تب تک نہ ہلا سکتے تھے - اور رعایا کے نزدیک بادشاہ کی مقدس ذات ہی بارِ جہاں بانی کی حامل تھی - اور مُلک بھر کی عظمت وسطوت شاہی خاندان کی عظمت وسطوت سے وابستہ تھی - گویا یہ طرزِ حکومت جمہوری اصولوں کے بالکل برعکس تھی - حکومتِ فرانس سے مراد صرف خاندان بوربوں[1] کی جاہ وحشمت تھی +

ایسے نظامِ سلطنت کے نقائص اظہر من الشمس ہیں + بادشاہ کے مقابلے میں باقی سب چیزیں ہیچ تھیں - کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی + امرا کے قدیم گھرانے جن سے لوگوں کو بہت کچھ فیض پہنچا تھا - صوبوں کی حکومتوں سے بے دخل کر دیئے گئے + اور جو فرائض سو سال پہلے کسی جاگیردار امیر کے سپرد تھے - وہ اب دور دراز پیرس کی سرکاری عمارت کے اندر کسی ملازمِ شاہی کے سپرد کر دئے گئے - جو سبز دریچوں والے کمرے میں بیٹھا اپنے احکام وہدایات سے مِسلوں کے صفحے سیاہ کرتا رہتا تھا - گویا شمشیر زن اُمرا کی جگہ اب قلم کش منشیوں نے لے لی - اور جب اُمرا نے دیکھا کہ اب کوئی کام کرنے کو نہیں رہا - تو اپنی زمین چھوڑ کر پیرس چلے آئے - اور دربار کی رنگ رلیوں میں شامل ہونے لگے - اور جب اپنی زمینداری سے غفلت برتی - تو جاگیریں

---

[1] Bourbon.

بھی تباہ و برباد ہوگئیں + اقتدار کے زمانے میں یہی اُمرا عرق ریزی اور تن دہی کے لئے مشہور تھے اور لوگوں کے لئے ان کی ذات برکت کا موجب تھی لیکن ایک پشت کے اندر اندر دربار و رسائی ان لوگوں کا مرجع بن گیا۔ تکلفات اور طرحداری تو دیکھی کہ شائستگی کا مرقع بن گئے لیکن مشاغل عیش و تفریح نے انہیں کسی کام کا نہ چھوڑا +

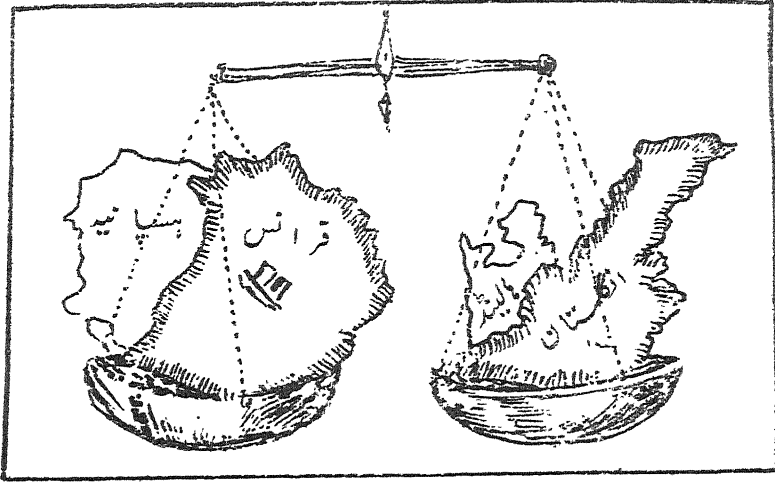
جب ویسٹ فیلیا کے صلح نامے پر دستخط ہوئے تو لوئی کی عمر دس سال کی تھی + سی سالہ جنگ نے خاندان ہیپس برگ کے اقتدار کو زائل کر دیا تھا لوئی جیسے اولوالعزم بادشاہ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ ہیپس برگ کے گم کردہ اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ۱۶۶۰ء میں لوئی نے شاہ ہسپانیہ کی بیٹی میریا تھریسا سے شادی کر لی تھی اور تھوڑے ہی عرصے بعد اُس کا خسر فلپ چہارم جو ہسپانیہ کے فاترالعقل ہیپس برگ خاندان کا جانشین تھا انتقال کر گیا + اُس کے مرنے پر لوئی نے فوراً اس بات کا دعوے کیا کہ ہسپانیہ کے جو مقبوضات بلجیم میں واقع ہیں وُہ ملکہ کے جہیز میں شامل تھے اس لئے وہ میری ملکیت ہیں + اگر لوئی اس علاقہ پر قابض ہو جاتا تو یورپ میں صلح و امن کا خاتمہ ہو جاتا اور پراٹسٹنٹ ممالک خطرے میں پڑ جاتے + ندرلینڈ کے سات متحدہ صوبوں کے خارجی وزیر جان ڈے وٹ[1] کے زیر کردگی ۱۶۶۴ء میں یورپ کا پہلا اہم بین القوامی اتحاد یعنی سویڈن ۔ انگلستان اور ہالینڈ کا اتحادِ ثلاثہ عمل میں آیا۔ لیکن یہ اتحاد پائیدار ثابت نہ ہوا + لوئی نے شاہ چارلس اور سویڈن دونو کو کچھ روپیہ دے دلا کر اور وعدے وعید کر کے اپنے ساتھ ملا لیا + چنانچہ ان اتحادیوں نے ہالینڈ کو اکیلا چھوڑ دیا اور ۱۶۷۲ء میں فرانیسی حملہ آور ہو کر اندرون ملک تک جا پہنچے + ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ جو بند لگے تھے اُنہیں ایک بار پھر توڑا گیا۔ لیکن آفتاب فرانس ہالینڈ کی دلدلوں میں ڈوب گیا۔ ۱۶۷۸ء میں نم ویگن[2] کے مقام پر صلح ہوئی مگر اس سے کسی بات کا تصفیہ نہ ہوا۔ برعکس اس کے اس صلح نامے کی شرائط میں ایک اور جنگ کے آثار نظر آنے لگے +

یہ دوسری جارحانہ جنگ ۱۶۸۹ء سے ۱۶۹۷ء تک جاری رہی ۔ اور بالآخر

---

[1] Jan de Witt.

[2] Nimwegen.



توازنِ قوت

رائزوک[1] کے مقام پر صلح ہوگئی۔ لیکن اس جنگ کے بعد بھی لوئی کو وہ اقتدار نصیب نہ ہوا جس کا کہ وہ متمنی تھا۔ اس کا پرانا دشمن جان ڈے وٹ ہالینڈ کے شورش پسندوں کے ہاتھوں قتل ہوگیا تھا۔ لیکن جان ڈے وٹ کے جانشین ولیم سوم نے (جس کا حال تم پچھلے باب میں پڑھ چکے ہو) بہت مزاحمت کی اور لوئی کی مراد بر نہ آنے دی۔

ہسپانیہ کے خاندان ہیبس برگ کے آخری فرمانروا چارلس دوم کی وفات پر ۱۷۰۰ء میں وراثت کے متعلق تنازعہ شروع ہوا جس نے جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۷۱۳ء میں اوٹرکٹ[2] کے مقام پر صلح ہوئی لیکن جانشینی کا سوال جوں کا توں رہا اور لوئی کا خزانہ خالی ہوگیا۔ خشکی پر تو شاہ فرانس کو فتح نصیب ہوئی تھی لیکن انگلستان اور ہالینڈ کے جنگی بیڑوں نے اس فتح کو بار آور نہ ہونے دیا۔ علاوہ بریں اس طویل کشمکش کی وجہ سے بین الاقوامی سیاسیات میں ایک نیا

---

[1] Ryswick.　[2] Utrecht.

قانون وضع کیا گیا جس کے رو سے یہ ناممکن ہوگیا کہ کوئی ایک قوم تمام یورپ یا تمام دنیا پر بہت عرصے تک حکومت کر سکے +

یہ اصول "توازنِ قوت" کا اصول کہلاتا ہے۔ یہ نسبۃً تحریر میں کبھی نہیں آیا۔ لیکن تین صدیوں تک دول یورپ اسے قوانین قدرت کی طرح اٹل سمجھ کر اس کی مطابعت کرتی رہیں۔ جن لوگوں نے یہ اصول وضع کیا۔ ان کی رائے یہ تھی۔ کہ اس وقت یورپ کی ہر قوم اپنی اپنی ترقی کے لئے کوشاں ہے۔ اور مختلف ممالک کے مقاصد ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔ اگر قوتوں کا توازن قائم کر کے اس کھینچا تانی کا سدِ باب نہ کیا جائے۔ تو یورپ تلف ہو جائیگا۔ اس لئے کسی ایک سلطنت یا کسی ایک خاندان کو اس بات کا موقع نہ دینا چاہیئے کہ وہ دوسروں کو دبا کر رکھے + سی سالہ جنگ کے دوران میں خاندان ہیپس برگ اسی اصول کا شکار ہوا تھا۔ گو اسے اس بات کا علم نہ تھا۔ اس کشمکش میں مذہبی جنگ و جدال نے فضا کو اس قدر گرد آلود کر دیا تھا۔ کہ فتح و شکست کے صحیح اسباب آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ لیکن آج کل تو یہ حالت ہے۔ کہ تمام اہم بین الاقوامی معاملات اقتصادی نقطۂ نظر سے اور بڑے ٹھنڈے دل کے ساتھ جانچے اور تولے جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے کی سیاست میں ذاتی جذبات کا کوئی دخل نہیں۔ اس قسم کی سیاست کا بانی جان ڈے وٹ تھا۔ ولیم سوم اس کا پہلا شاگرد تھا۔ اور لوئی چہاردہم باوجود اپنی شہرت اور عظمت کے سب سے پہلے اس اصول کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا۔ اس کے بعد کئی اور لوگ اسی اصول کا شکار ہوئے +

رُوس کا عروج

پُرانی ماسکووی سلطنت جو یورپ کی عظیم الشان بساطِ سیاست پر یک لخت آن دھمکی

تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہے۔ کہ کولمبس نے امریکہ ۱۴۹۲ء میں دریافت کیا تھا۔ اسی سال کے آغاز میں ٹائرول[1] کے ایک باشندے شنپس[2] نامی نے شہر ماسکو میں کبھی پہنچنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ماسکو کے متعلق افسانوں کی سی باتیں مشہور تھیں۔ ٹائرول کے اسقف اعظم نے مناسب سمجھا۔ کہ ایک مہم بھیج کر اصل حالات دریافت کئے جائیں۔ شنپس کو اس مہم کا سردار بنایا اور بہترین تعارفی خطوط اور اسناد دے کر روانہ کر دیا۔ لیکن شنپس کامیاب نہ ہو سکا۔ جس سرزمین میں ماسکو واقع تھا۔ اس کے متعلق گمان یہ تھا۔ کہ یورپ کے انتہائی مشرقی حصے میں پھیلی ہوئی ہے۔ جب سرحد پر پہنچا تو معلوم ہؤا۔ کہ غیر ملکیوں کو داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں۔ چنانچہ اپنا سا منہ لے کر لوٹ آیا۔ اور یہاں سے قسطنطنیہ چلا گیا کہ ترکوں ہی کے کچھ حالات معلوم کرلے۔ تاکہ سفر سے واپس جائے۔ تو کوئی تو ایسی نئی بات ہو جو اپنے آقا کو سُنا سکے۔

اکسٹھ سال بعد کا ذکر ہے کہ ایک شخص رچرڈ چانسلر[3] نامی اس کوشش میں مصروف تھا کہ ہو سکے تو جزائر ہند کا شمال مشرقی راستہ دریافت کرلے۔ اتفاق سے بادِ مخالف نے اسے بحیرۂ ابیض میں دھکیل کر ڈونیا[4] کے دہانے پر پہنچا دیا۔ جہاں اس نے ماسکووی گاؤں خولمگوری[5] دریافت کیا۔ یہ گاؤں اس

---

[3] Richard Chancellor [2] Schnups. [1] Tyrol.

[5] Kholmogory. [4] Dwina.

مقام سے چند ہی گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا۔ جہاں ۱۵۹۴ء میں شہر آرکینجل کی بنا رکھی گئی تھی۔ ابھی یار اجنبی نوواردوں سے درخواست کی گئی کہ چل کر گرینڈ ڈیوک کے حضور میں باریاب ہوں۔ ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر روس کے ساتھ ایک تجارتی عہدنامے پر دستخط کئے۔ اور واپس انگلستان آ گئے۔ گویا مغربی دنیا اور روس میں پہلی مرتبہ تجارتی تعلقات قائم ہوئے۔ ان کی دیکھا دیکھی تھوڑے ہی عرصہ میں دوسری اقوام نے بھی اس ملک کی سیر کی۔ اور اس پراسرار سرزمین کے متعلق کچھ حالات معلوم ہو گئے۔

طبعی اعتبار سے روس بہت وسیع میدان ہے۔ کوہ یورال[1] کی بلندی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ یہ پہاڑ حملہ آوروں کو روکنے کے لئے ناکافی ہیں۔ اور دریا فراخ زیادہ ہیں۔ لیکن ان کی گہرائی عام طور پر جہازرانی کے قابل نہیں۔

یہ سرزمین خانہ بدوشوں کے لئے ہر لحاظ سے بہت موزوں تھی۔ چنانچہ سلطنت روما کے عروج و زوال کے زمانے میں سلافی اقوام دریائے نیسٹر[2] اور نیپیر[3] کے درمیانی علاقے کے میدانوں اور جنگلوں میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ تیسری اور چوتھی صدی کے یونانی سیاحوں نے کہیں کہیں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ورنہ ان کے متعلق کسی کو بھی زیادہ کچھ معلوم نہ تھا۔

لیکن ان وحشی قوموں کی بدقسمتی کہ ان کا علاقہ ایک مشہور تجارتی شاہراہ کے اردگرد واقع تھا۔ یہ شاہراہ شمالی یورپ سے قسطنطنیہ کو آتی تھی۔ پھر بالٹک کے ساتھ ساتھ نیوا[4] اور وہاں جھیل لدوگا[5] کو عبور کرکے والخوو[6] کے ساتھ ساتھ جنوب میں پہنچتی تھی۔ پھر جھیل المن[7] کو عبور کرکے دریائے لوواٹ[8] کے ساتھ ساتھ نیپیر تک۔ اور نیپیر کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی بحرہ اسود کے کنارے تک آ پہنچی تھی۔ اہلِ شمال کو اس راستے کا علم بہت پہلے ہو گیا تھا جس زمانے میں وہ جرمنی

---

[1] Ural [2] Dniester. [3] Dnieper.
[4] Neva. [5] Ladoga. [6] Vol Kchv.
[7] Ilmen [8] Lovat

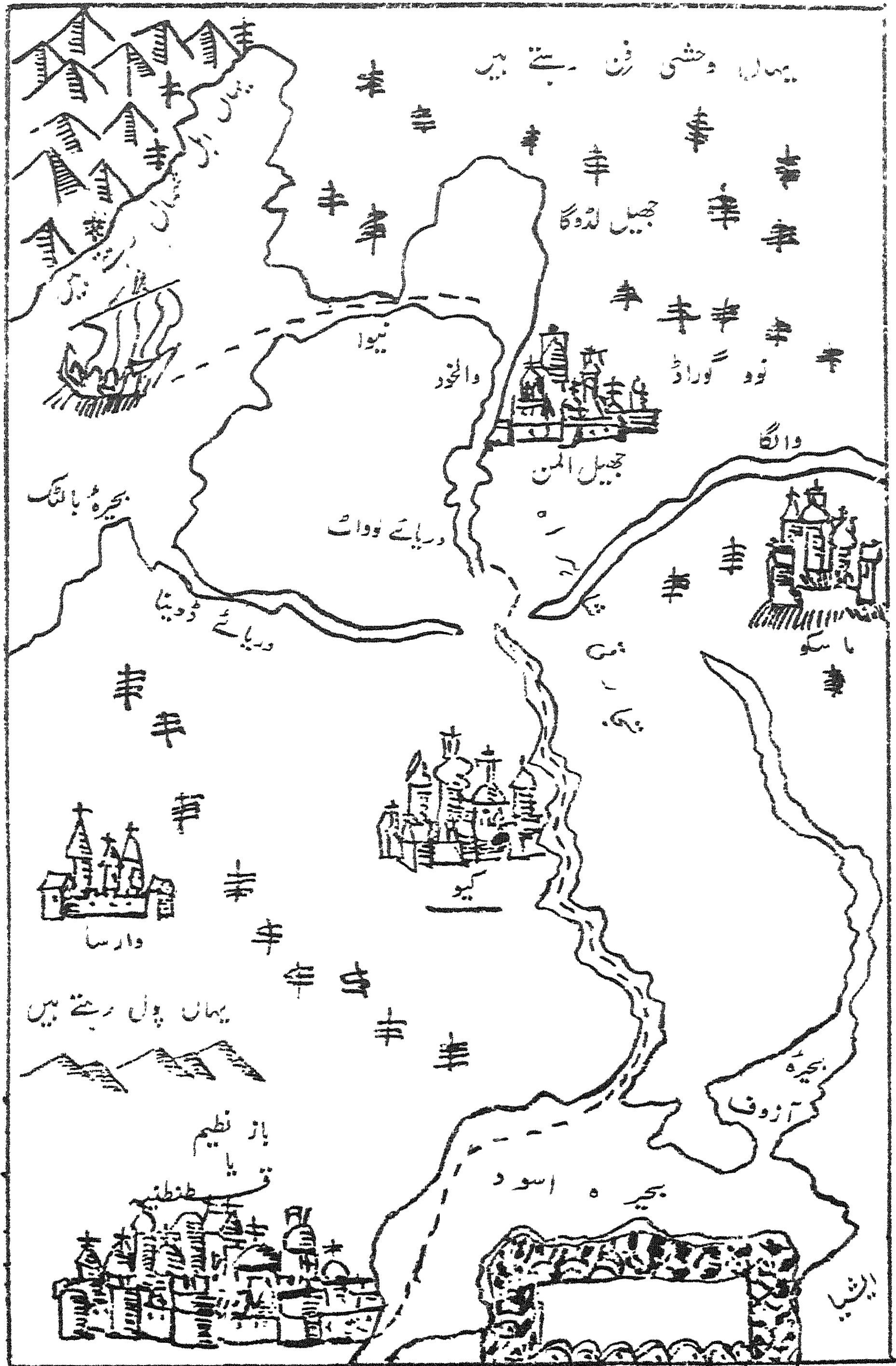
اور فرانس کی آزاد سلطنتوں کی بُنیاد رکھ رہے تھے۔ اسی زمانے میں شمالی روس میں بھی آ آ کر آباد ہونے لگے۔ ۸۶۲ء میں انہی میں سے تین شخص جو آپس میں بھائی بھائی تھے بالٹک کو عبور کر کے یہاں پہنچے جہاں اُنھوں نے تین خاندانوں کی بُنیاد رکھی۔ ان تینوں میں سے ایک بھائی جس کا نام رُورک[1] تھا عرصے تک زندہ رہا۔ اس نے اپنے بھائیوں کے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا اور بیس سال تک یہاں ایک سلافی سلطنت بھی قائم ہو گئی۔ جس کا دارالخلافہ کیو[2] تھا

کیو سے بحیرۂ اسود تک فاصلہ زیادہ نہیں۔ چنانچہ بہت عرصہ گذرنے نہ پایا کہ اس سلطنت کے قیام کی خبر قسطنطنیہ تک پہنچ گئی۔ پُرجوش عیسائی مبلغین کے لئے ایک نیا میدان کُھل گیا۔ بازنطینی راہب نیپر کے کنارے کنارے شمال کو روانہ ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں وسطِ مُلک میں جا پہنچے۔ یہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگ طرح طرح کے معبودوں کی پرستش کر رہے ہیں جن کا مسکن وہ جنگلوں اور دریاؤں اور پہاڑی غاروں میں سمجھتے ہیں۔ رومن مبلغین ادھر متوجہ نہ ہوئے وہ بے دین ٹیوٹنوں کی تعلیم میں اس قدر مُنہمک تھے کہ انہیں ان دُور افتادہ سلافیوں کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ بازنطینی پادریوں نے سلافیوں کو مذہب کا سبق پڑھایا ابجد سے روشناس کرایا اور فنون و تعمیر کے موٹے موٹے نکات سکھائے اور چونکہ بازنطینی سلطنت پر (جو روما کی مشرقی سلطنت کی باقیات ہی سے تھی) بہت کچھ مشرق کا رنگ چڑھ چُکا تھا۔ اور وہ اپنی اکثر مغربی خصوصیات کھو بیٹھی تھی۔ اس لئے روس گویا گھاٹے میں رہا۔

اس وسیع روسی سرزمین کی نئی سلطنتیں سیاسی اعتبار سے کامیاب نہ ہوئیں۔ اہل شمال کا دستور تھا کہ تمام موروثی جائیداد بیٹوں میں برابر تقسیم کر دیتے تھے۔ چنانچہ آج ایک چھوٹی سی سلطنت قائم ہوتی۔ کل وہی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آٹھ نو وارثوں میں تقسیم ہو جاتی۔ اور جوں جوں نسل بڑھتی

---

[1] Rurik.
[2] Kiev.


یہاں وحشی فن رہتے ہیں
جھیل لڈوگا
نیوا
نووگوراڈ
والخود
والگا
جھیل المن
بحیرۂ بالٹک
دریائے لووات
دریائے ڈوینا
ماسکو
کیو
وارسا
یہاں پول رہتے ہیں
بحیرۂ
آزوف
بحیرہ اسود
ایشیا

روس کی ابتدا

اور بھی حصے بخرے ہوتے جاتے ۔ یہ سلطنتیں لامحالہ ایک دوسرے سے اُلجھتی رہتیں اور آئے دن کوئی نہ کوئی مباحثہ کھڑا ہو جاتا ۔ چنانچہ جس وقت اُفقِ مشرق پر آگ کے شعلے بلند ہوئے ۔ اور ایشیا کی ایک وحشی قوم کے حملے کا خطرہ رونما ہوا تو یہ سب چھوٹی چھوٹی سلطنتیں اِس قدر کمزور اور ایسی منتشر حالت میں تھیں ۔ کہ کسی طرح اس ہیبت ناک دشمن سے تاب مقابلہ نہ لا سکتی تھیں ۔

۱۲۲۴ء میں تاتاری پہلی مرتبہ حملہ آور ہوئے ۔ اور چین بخارا ۔ تاشقند اور ترکستان کا فاتح یعنی چنگیز خاں اپنا ٹڈی دل لے کر مغرب میں نمودار ہوا ۔ سلافی افواج نے دریائے کالکا[1] کے قریب شکست کھائی اور روس منگولوں کے مقابلہ میں بالکل بے دست و پا ہو گیا ۔ جیسے اچانک یہ لوگ آئے تھے ۔ ویسے ہی اچانک رخصت بھی ہو گئے ۔ لیکن تیرہ سال بعد ۱۲۳۷ء میں پھر واپس آئے اور پانچ سال سے کم عرصے میں وسیع روس کا گوشہ گوشہ فتح کر لیا ۔ آخر ۱۳۸۰ء میں ماسکو کے گرینڈ ڈیوک ڈمیٹری ڈانسکوئی[2] نے کولی کووو[3] کے میدان میں فاتحین کو شکست دی ۔ اور منگولی اقتدار کا خاتمہ کر دیا ۔ لیکن ۱۳۸۰ء تک تاتاریوں نے اہل روس کو غلام بنائے رکھا ۔

اجنبی حکومت سے نجات حاصل کرنے میں روسیوں کو دو سو سال لگ گئے ۔ منگولیوں کی حکومت نہایت سخت گیر ۔ ہتک آمیز اور دل آزار تھی ۔ اس حکومت نے سلافی کسانوں کو غلام بنا ڈالا ۔ غلیظ اور ذلیل پست قد منگول بھی جنوبی روس کے کسی میدان میں خیمہ لگا کر اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگتا ۔ جو روسی سامنے آتا اس پر تھوک دیتا اور روسیوں کا یہ حال تھا کہ ان کے سامنے سجدے کرتے ۔ تب کہیں جان کی امان پاتے ۔ اس ظلم و تعدی سے لوگوں میں غیرت کا مادہ بالکل فنا ہو گیا فاقے کرنا دکھ سہنا ۔ گالیاں سننا یہ روسی کسانوں کا روز مرہ کا معمول بن گیا تھا ۔ اور کسانوں ہی پر کیا موقوف تھا ۔ شرفا تک ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔ گویا انسان نہیں کتے ہیں ۔ جنہیں اس قدر مار پڑی ہے کہ کوئی امنگ یا حوصلہ باقی

---

[1] Kalka.   [2] Dmitry Donskoi.   [3] Kulikovo.

نہیں رہا۔ اور جن کی مجال نہیں کہ اجازت کے بغیر قدم تک ہلا سکیں ✣

فرار کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ تاتاری خاں سے سوار بے رحم اور تیز گام تھے۔ سپاٹ میدان دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں سے گزر کر پہاڑوں کے دامن میں پناہ گزیں ہونے کی امید خیالِ خام تھی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ یا تو چپ چاپ بیٹھے اپنے زرد رو آقا کے تمام مظالم صبر و شکر سے سہتے رہیں۔ یا موت کے منہ میں جانے کو تیار ہو جائیں۔ تم کہو گے۔ اہل یورپ نے دستگیری کیوں نہ کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یورپ اس وقت اپنے جھگڑوں میں گرفتار تھا۔ کہیں پاپا اور شہنشاہ کی آویزش تھی۔ اور کہیں طرح طرح کے کفر و الحاد کی سرکوبی کی جا رہی تھی۔ چنانچہ یورپ نے سلافیوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ کہ جس طرح بن پڑے اپنی نجات کی صورت خود پیدا کریں ✣

جس سلطنت نے روس کو بالآخر اس بلا سے نجات دلائی۔ وہ انہیں چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں سے ایک تھی جن کی بنیاد اہل شمال کے ابتدائی حکمرانوں نے رکھی تھی ✣ یہ سلطنت روس کے درمیانی حصے میں واقع تھی۔ اس کا دارالخلافہ یعنی ماسکو دریائے مسکوا[1] کے کنارے ایک اونچی اور سیدھی پہاڑی پر واقع تھا ✣ یہ چھوٹی سی ریاست حکمت عملی سے کام لیتی رہی۔ تاتاریوں کی خوشامد ضروری ہوتی۔ تو چاپلوسی کرنے لگتی۔ خطرہ نہ ہوتا تو مخالفت پر تُل جاتی۔ اسی طرح رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے نصف تک روسیوں میں ایک نئی قومی زندگی کی روح پھونک دی ✣ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ تاتاری سیاسی اعتبار سے کسی تعمیری کام کی قابلیت نہ رکھتے تھے۔ وہ تو صرف تباہ کرنا جانتے تھے۔ نئی سرزمین فتح کرنے سے ان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا۔ کہ وہاں کے باشندوں سے خراج وصول کریں ✣ اس خراج کو ٹیکس کی صورت میں وصول کرنے کے لئے ضروری تھا۔ کہ پرانے سیاسی نظام کے بعض بچے کھچے آثار جوں کے توں رہنے دیتے ✣ چنانچہ خان اعظم کی نوازش سے چھوٹے چھوٹے کئی شہر سلامت بچ گئے۔ جن کا فرض یہ تھا کہ وہ

---

[1] Moskwa.

اپنے حریص آقاؤں کے لئے خراج جمع کریں۔اور تاتاری خزانوں کو معمور کرنے کے لئے اپنے ہمسایوں کو لوٹیں ٭

ماسکو کی ریاست اردگرد کی سرزمین سے روپیہ بٹور کر آخرش اتنی مضبوط بن گئی کہ اس نے اپنے تاتاری آقاؤں کے خلاف علانیہ بغاوت کر دی + یہ بغاوت کامیاب رہی اور لوگ ماسکو کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھنے لگے+ رفتہ رفتہ ماسکو ان تمام لوگوں کا مرکز بن گیا۔جن کے دل میں سلافی قوم کا درد تھا۔اور جن کا ایمان تھا۔کہ سلافیوں کی قسمت ایک نہ ایک دن ضرور پلٹا کھائے گی +۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا + دس سال بعد آئیون سوم کے زمانہ حکومت میں ماسکو نے مغربی دنیا کو مطلع کیا کہ گم شدہ بازنطینی سلطنت کی دنیوی اور روحانی وراثت ۔ نیز سلطنت روما کی جو روایات قسطنطنیہ میں باقی ہیں۔ان سب کی علمبرداری۔کا حق سلافی حکومت کو پہنچتا ہے۔ایک پشت کے بعد خوفناک آئیون کے زمانہ حکومت میں ماسکو کے گرینڈ ڈیوک اتنے قوی ہو گئے۔کہ انہوں نے قیصر یا زار کا لقب اختیار کر لیا۔اور مغربی دنیا سے اپنے حقوق تسلیم کرانے پر مصر ہوئے ٭

۱۵۹۸ء میں فیوڈر[1] اول کے ساتھ ہی شمال نژاد رورک کے ہاتھوں پرانے ماسکووی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔اس کے بعد سات سال تک ایک دوغلا تاتاری جس کا نام بورس گوڈونو[2] تھا حکمران رہا۔اس زمانے میں روسیوں کے مقسوم کا بھی فیصلہ ہو گیا + روس کی سلطنت وسیع تھی ۔لیکن متمول نہ تھی ۔ نہ تجارت تھی نہ صنعت۔شہر نہ تھے چند غلیظ گاؤں تھے ۔جو شہر کہلاتے تھے +مرکز میں ایک حکومت تھی جو بہت طاقتور تھی ۔ اور باقی سب ملک میں کسان ہی کسان تھے جو الف کے نام بے نہ جانتے تھے + یہ حکومت جو سلافی شمالی بازنطینی اور اور تاتاری اثرات کا مجموعہ تھی ۔کسی چیز کو اپنے مفاد سے مقدم نہ سمجھتی تھی اپنی حفاظت کے لئے اسے فوج کی ضرورت تھی ۔سپاہیوں کی تنخواہوں کے

---

[2] Boris Godunow. [1] Feodor.

لئے روپیہ ۔ روپیہ جمع کرنے کے لئے ٹیکس ٹیکس وصول کرنے کے لئے سول ملازم ۔ پھر ملازموں کو معاوضہ دینے کے لئے زمینیں ۔ جب زمین کی تلاش ہوئی تو معلوم ہؤا کہ مشرق اور مغرب میں زمین تو ہے ۔ لیکن ویران پڑی ہے ۔ جب تک ہل جوتنے کے لئے کاشتکار اور گلے چرانے کو گلے بان نہ ہوں ۔ زمین بیکار ہے چنانچہ پرانے خانہ بدوش کسان یکے بعد دیگرے اپنے حقوق سے محروم کئے جانے لگے ۔ یہاں تک کہ آخر کار سولھویں صدی کے پہلے سال میں باضابطہ طور پر یہ قرار پایا کہ جو کسان جس زمین پر آباد ہے ۔ وہ اُس زمین کے ساتھ ہی خرید و فروخت ہوگا ۔ گویا روسی کسان غلام بن گیا اور ۱۸۶۱ء تک غلام بنا رہا ۔ لیکن ۱۸۶۱ء تک اس کے مصائب اِس قدر بڑھ گئے تھے کہ اس کی نسل ہی رفتہ رفتہ معدوم ہو رہی تھی ۔

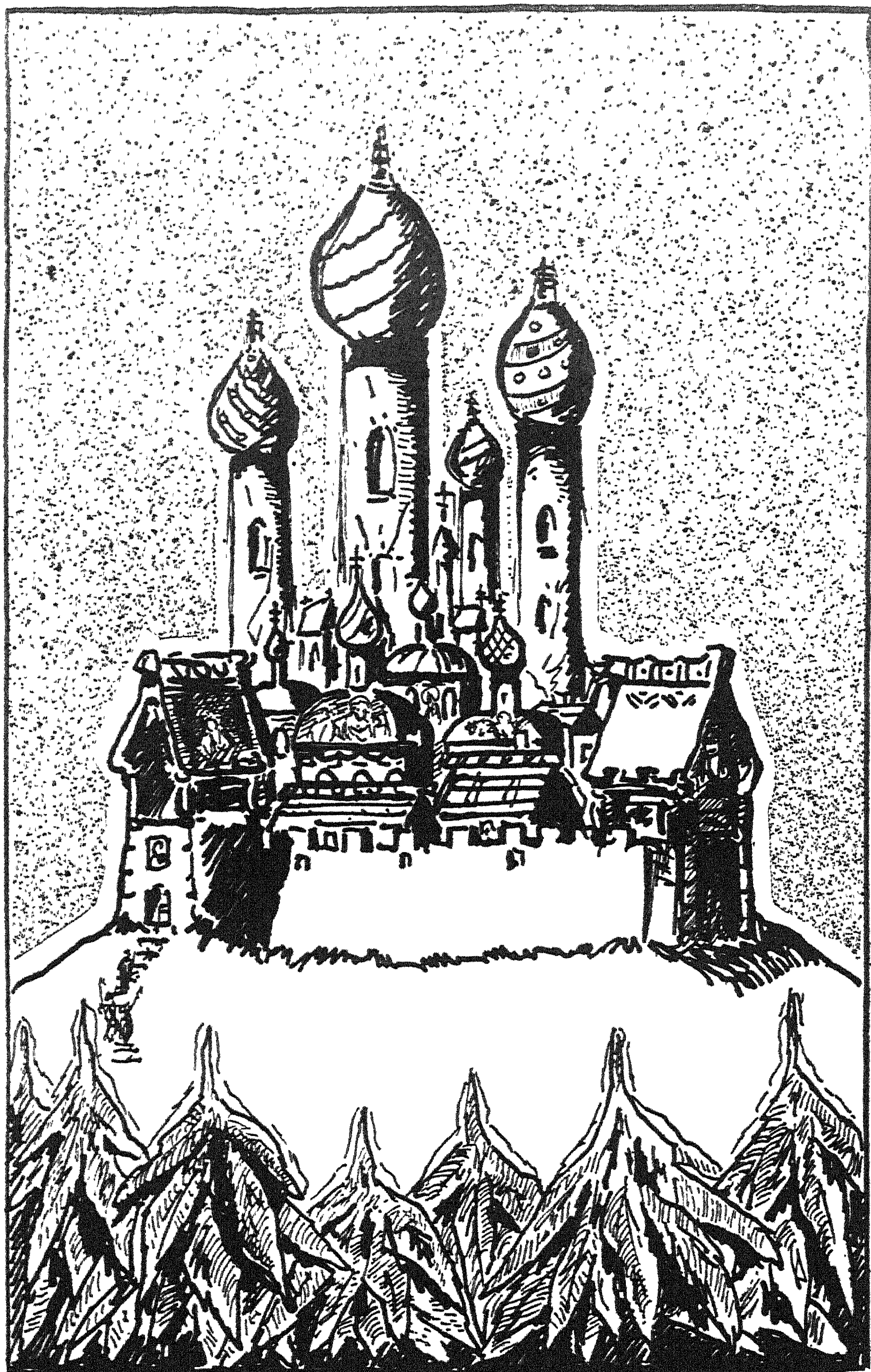
سترھویں صدی میں بہ نئی حکومت جس کی حدود سائبیریا میں بڑی سرعت سے پھیلتی چلی جا رہی تھیں ۔ اس قدر طاقتور ہوگئی ۔ کہ باقی تمام یورپ کیلئے اِسے تسلیم کر لینے کے سوا چارہ نہ رہا ۔ ۱۶۱۳ء میں جب بورس گوڈونو مرگیا تو روسی امرانے اپنے ہی میں سے ایک شخص کو زار منتخب کر لیا ۔ یہ شخص رومنوو[1] کے ماسکووی خاندان کے جانشین فیوڈور کا بیٹا مائیکل[2] تھا اور کریملن[3] کے نواح میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا ۔

۱۶۷۲ء میں اِس کا پڑپوتا اور ایک اور فیوڈور کا بیٹا پیٹر[4] پیدا ہؤا یہ بچہ ابھی دس سال کا تھا ۔ کہ اس کی سوتیلی بہن صوفیا[5] تخت روس پر قابض ہوگئی اور اس ننھے بچے نے دارالخلافے کے نواح میں جہاں غیر ملکی لوگ رہتے تھے پرورش پائی ۔ وہاں اسکاٹ لینڈ کے شراب فروشوں ۔ ڈنمارک کے تاجروں ۔ سوٹزرلینڈ کے طبیبوں ۔ اطالیہ کے حجاموں فرانس کے ماہرین رقص اور جرمنی کے معلمین سے اس کم عمر شہزادے کو اُس دُور دراز پر اسرار زمین کے متعلق طرح طرح کی باتیں معلوم ہوئیں ۔

---

[1] Romanow. [2] Michael. [3] Kremlin.
[4] Peter. [5] Sophia.

جو یورپ کے نام سے مشہور تھی - اور جہاں کا باوا آدم ہی نرالا تھا - سترہ سال کی عمر میں پیٹر نے جب تخت اپنی بہن صوفیا کو تخت سے الگ کر دیا اور خود روس کا بادشاہ بن گیا - مگر نیم وحشی اور نیم ایشیائی لوگوں کا زار بن جانے سے اس شخص کی تسکین نہ ہوئی - اس کی آرزو تھی کہ جس قوم کا بادشاہ کہلائے وہ متمدن اور مہذب ہو + لیکن بازنطینی اور تاتاری اثرات کو مٹا کر روس کو یورپ کی سلطنتوں کا ہم پلہ بنا دینا بچوں کا کھیل نہ تھا - اس کے لئے غور و فکر اور نظم و نسق کی ضرورت تھی - پیٹر کو یہ دونو قابلیتیں حاصل تھیں - چنانچہ ۱۶۹۸ء میں قدیم روس کی قطع و برید ہوئی اور اس میں یورپ کا پیوند لگایا گیا + اس سے یہ نخل بالکل خشک تو نہ ہوا - لیکن مرجھا ایسا گیا کہ پھر اس کا پنپنا مشکل ہو گیا + گذشتہ پانچ سال کے واقعات اس امر کے شاہد ہیں +



ماسکو

روس اور سویڈن کی باہمی کشمکش

شمال مشرق یورپ میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے روس اور سویڈن نے بارہا شمشیر آزمائی کی

۱۶۹۷ء میں زار پیٹر نے پہلی دفعہ یورپ کا سفر کیا اور برلن کے راستے ہالینڈ اور انگلستان کی سیر کی۔ اسے بچپن ہی سے پانی کا بہت شوق تھا۔ باپ کے دیہاتی مکان میں بطخوں کے لئے ایک تالاب بنا ہُوا تھا۔ بچپن میں ایک دفعہ وُہ ایک خانہ ساز کشتی میں سوار ہو کر اس تالاب کی سیر کر رہا تھا۔ کہ ڈوبتے ڈوبتے بچا پھر بھی پانی کا شوق اسے مرتے دم تک رہا اور جب تخت پر بیٹھا تو اس دُھن میں لگا رہا۔ کہ روس ایسے بند ملک کو سمندر تک رسائی کیونکر حاصل ہو۔



پیٹر اعظم ہالینڈ کے کارخانہ جہاز سازی میں

جب یہ خبر ہر دلعزیز سخت گیر نوجوان حکمران اپنے وطن سے دُور تھا تو ماسکو کے قدامت پسند روسیوں نے اس کی تمام اصلاحات کی بیخ کنی شروع کر دی۔ اور سٹریلسٹی[1] پلٹن نے جو خود زار کی محافظ تھی۔ بغاوت کا علم بلند کیا۔ پیٹر کو بہ سرعت تمام لوٹ آنا پڑا۔ سزا تجویز کرنے کا کام خود اپنے ذمے لیا۔ اور پلٹن کے ایک ایک سپاہی

---

[1] Streltsi.

کو یا پھانسی پر لٹکا دیا۔ یا اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے + صوفیا آپا جو اسی بغاوت کی روح رواں تھی ایک خانقاہ میں بند کر دی گئیں اور حکومت کا کام پھر باقاعدگی اور باضابطگی سے ہونے لگا + لیکن پیٹر ۱۷۱۶ء میں دوبارہ سفر کو گیا۔ تو روس میں پھر بھی صورت حالات پیدا ہوئی + اس مرتبہ مخالفین کا سرغنہ پیٹر کا نیم دیوانہ بیٹا ایلکسس[ل] تھا + زار پھر اُڑا ہُوا واپس آیا۔ اور ایلکسس کو قید خانے میں اتنا پٹوایا کہ وہ تمام ہوگیا + پرانے بازنطینی نظام کے طرف دار جن کو جلاوطن کرکے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ ویراں بیابانوں میں ہزارہا میل کی پیادہ مسافت کے بعد گرتے پڑتے آخر ان بیسے کی کانوں پر پہنچے۔ جہاں انہیں زندگی کے باقیماندہ دن گذارنے تھے + اس کے بعد پھر کسی نے سر نہ اُٹھایا اور پیٹر کو اصلاحات رائج کرنے کے لئے فراغت نصیب ہوئی +

ان اصلاحات کو ترتیب وار بیان کرنا بڑا مشکل ہے۔ زار بے حد عُجلت سے کام کرنے کا عادی تھا۔ کسی ضابطہ یا نظام پر نہ چلتا اور نابڑتوڑ احکام صادر کئے چلا جاتا۔ اِس کے دماغ میں یہ خبط سمایا ہُوا تھا کہ اب تک جو ہُوا ہے یکسر غلط ہے اِس کو منسوخ کرکے روس کو از سرِ نو تعمیر کرنا چاہیئے۔ اپنی زندگی میں دو لاکھ فوج جمع کر لی۔ اور پچاس جنگی جہاز تعمیر کرلئے۔ اور حکومت کا پرانا طریق تو چشمِ زدن ہی میں بدل ڈالا تھا + ڈوما یعنی امرا کی مجلس موقوف کرکے اس کی بجائے زار نے افسران حکومت کی ایک مشاورتی مجلس قائم کر دی تھی جو سینیٹ کہلاتی تھی +

روس آٹھ بڑے بڑے صوبوں میں مُنقسم کر دیا گیا۔ سڑکیں بنائی گئیں۔ شہر تعمیر ہوئے اور جہاں کہیں زار کا دل چاہا وہیں صنعتی کارخانے کھڑے کر دئے گئے۔ قطع نظر اس بات سے کہ وہاں خام پیداوار دستیاب بھی ہوسکتی یا نہیں + نہریں کھودی گئیں۔ مشرقی پہاڑوں میں کانیں نکالی گئیں۔ اس جاہلوں کی سرزمین میں مدارس اور اعلےٰ تعلیم کی درسگاہوں کی بُنیاد رکھی گئی۔ یونیورسٹیاں تعمیر ہوئیں۔ شفاخانے قائم ہوئے۔ ہالینڈ کے بحری انجنیروں اور دنیا بھر کے تاجروں اور کاریگروں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ کہ وہ روس میں آکر اس ملک کو اپنی صنعت و حرفت سے فروغ دیں۔ چھاپے خانے

ل Alexis.

بند ئے گئے۔ لیکن مطبوعہ کتابوں کو زیر احتساب رکھا + نیا آئین جاری ہوا جس کے رو
سے ہر طبقے کے فرائض کی تخصیص کر دی گئی + اور دیوانی و فوجداری کے تمام قوانین کو
کتابی صورت میں مرتب کیا گیا + پرانا روسی لباس متروک قرار پایا۔ آپ ہی قینچیاں ہاتھ
میں لئے دیہات کی سڑکوں کی نگرانی کرتے تھے اور جہاں کسی دراز ریش روسی دہقان
کو دیکھ پاتے فوراً اُس کی ڈاڑھی کو مغربی رواج کے مطابق تراش دیتے ٭
زار کو یہ گوارا نہ تھا کہ مذہبی معاملات میں کوئی بھی اُس کا مدمقابل ہو + یورپ
میں تو پاپا شہنشاہ کا رقیب بن گیا تھا۔ لیکن روس میں زار نے اس کشمکش کا موقع
ہی نہ آنے دیا۔ ۱۷۲۱ء میں پیٹر کلیسائے روس کا پیشوا بن بیٹھا۔ ماسکو کا قدیم مذہبی



پیٹر اعظم نیا دار الخلافہ تعمیر کرتا ہے

نظام منسوخ کر دیا گیا اور زار کی مجلسِ مقدس تمام مذہبی معاملات میں مختار کل تسلیم کی
گئی + چونکہ ماسکو کا شہر قدامت پسندوں کا مرکز تھا۔ اسلئے اسی شہر میں رہ کر ان
اصلاحات کا کامیاب بنانا مشکل معلوم ہوا۔ چنانچہ پیٹر نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ پایۂ تخت
ہی کسی اور شہر کو منتقل کر دیا جائے + بحیرۂ بالٹک کے مضرِ صحت دلدلی علاقے میں زار
نے نیا پایۂ تخت تعمیر کیا۔ زمین کو خشک کرنے کا کام ۱۷۰۳ء میں شروع ہوا۔ اور
چالیس ہزار کسان اس شاہی شہر کی تعمیر میں مصروف رہے۔ سویڈن والوں نے پیٹر پر
فوج کشی کی اور چاہا کہ اس کے نئے شہر کو منہدم کر دیں۔ بیماری اور مشقت نے

ہزاروں کسانوں کا کام تمام کر ڈالا۔ لیکن تعمیر کا کام گرمی سردی میں برابر جاری رکھا۔ اور ۱۷۱۲ء میں اسی کے دارالسلطنت ہونے کا اعلان کیا گیا + بارہ سال میں اس شہر کی آبادی ۷۵۰۰۰ تک پہنچ گئی + سال میں دو مرتبہ دریائے نیوا میں سیلاب آتا اور شہر زیر آب ہو جاتا۔ لیکن زار کا عزم اس سے بھی متزلزل نہ ہوا۔ اس نے بند بنوا کر اور نہریں کھدوا کر سیلاب کا سدِ باب کیا + ۱۷۲۵ء میں جب زار کا انتقال ہوا تو یہ شہر شمالی یورپ کا سب سے بڑا شہر بن چکا تھا +

ایک خطرناک رقیب کی یہ ترقی تمام ہمسایہ سلطنتوں کے لئے بے حد پریشانی کا موجب تھی۔ پیٹر سویڈن کی سلطنت کے حالات بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ۱۶۵۴ء میں سی سالہ جنگ کے مردِ میدان گستاوس ایڈولفس کی اکلوتی بیٹی کرسٹینا تخت سے دست بردار ہو کر روما چلی گئی تھی۔ تا کہ ایک سچے کیتھولک کی طرح اپنی زندگی کے دن وہیں گذار دے۔ یہ خاندان واسا کی آخری ملکہ تھی۔ اس کے بعد گستاوس ایڈولفس کا ایک بھتیجا جو پراٹسٹنٹ تھا تخت پر بیٹھا۔ چارلس دہم اور چارلس یازدہم کے زیرِ فرمان سویڈن نے بہت ترقی کی۔ لیکن ۱۶۹۷ء میں چارلس یازدہم یک لخت مرگیا + اس وقت اس کے جانشین چارلس دوازدہم کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ شمالی سلطنتیں عرصے سے ایسے موقعہ کی تاک میں تھیں + بادشاہ کی کمسنی کو نیک فال سمجھا۔ سترھویں صدی کی بڑی بڑی مذہبی جنگوں میں سویڈن اپنے ہمسایوں کو دبا دبا کر خود طاقتور بن گیا تھا۔ اب ان ہمسایوں کو موقعہ ہاتھ آیا۔ یک لخت ایک جنگ پھوٹ پڑی۔ جس میں روس۔ پولینڈ۔ ڈنمارک اور سیکسنی ایک طرف تھے۔ اور سویڈن دوسری طرف لیکن چارلس نے نومبر ۱۷۰۰ء کو ناروا[۱] کی مشہور جنگ میں پیٹر کی اکھڑ اور غیر تربیت یافتہ فوجوں کو بہت بری طرح شکست دی۔ چارلس اس صدی کے ماہرینِ جنگ میں عدیم النظیر تھا۔ اس جنگ میں فتحیاب ہو کر وہ اپنے دوسرے دشمنوں پر پل پڑا۔ اور نو سال کے اندر پولینڈ۔ سیکسنی۔ ڈنمارک اور بالٹک کے شہروں کو ایک ایک کر کے برباد کر ڈالا یا آگ کی نذر کر دیا + پیٹر ان دنوں روس کے ایک دور دراز حصے میں

Narva. ۱ [۱]

بیٹھا اپنے سپاہیوں کو قواعدِ جنگ کی تعلیم دینے میں منہمک تھا ۔

اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ۱۷۰۹ء میں جب پولٹاوا[1] کی جنگ ہوئی۔ تو ماسکوویوں نے سویڈن کی خستہ و ماندہ فوجوں کو تہس نہس کر دیا + چارلس کی شخصیت پھر بھی ویسی ہی دلفریب رہی۔ اس میں اب بھی وہی دلکشی تھی۔ جو کسی افسانے کے سچے جانباز ہیرو میں پائی جاتی ہے لیکن انتقام کی بے سود کوشش میں اس نے اپنے ملک کو برباد کر لیا تھا۔ ۱۷۱۸ء میں وہ مر گیا (کسی حادثے سے مرا یا قتل کر ڈالا گیا۔ یہ ٹھیک طور پر معلوم نہیں) اور ۱۷۲۱ء میں جب بمقام نائی سٹاٹ[2] صلح ہوئی تو فن لینڈ کے سوا بالٹک کے تمام مقبوضات سویڈن کے ہاتھ سے نکل گئے + روس کی نئی سلطنت جسے پیٹر نے پیدا کیا تھا۔ اب شمالی روس کی سب سے بڑی قوت بن گئی۔ لیکن ادھر اس نے سر بلند کیا ادھر ایک نیا رقیب پیدا ہو گیا جو رفتہ رفتہ منظم ہو کر زور پکڑنے لگا اور خم ٹھونک کر سامنے آیا۔ یہ پرشیا کی سلطنت تھی ۔

۱؎ Poltowa.

۲؎ Nystadt.

پرشیا کا عروج

شمال جرمنی کے ویران حصے میں ایک ننھی سی حکومت یعنی پرشیا کا غیر معمولی عروج

پرشیا کا علاقہ سرحد پر واقع ہے۔ چنانچہ اس کی تاریخ میں بھی وہی خصوصیات ہیں۔ جو سرحدی علاقوں کی تاریخ میں اکثر پائی جاتی ہیں + نویں صدی میں شارلمان نے تہذیب کے پرانے مرکز کو بحیرۂ روم سے شمال مغربی یورپ کے وحشی علاقوں میں منتقل کر دیا تھا۔ اس کے فرنگی سپاہی یورپ کی حدود کو مشرق میں بڑھانے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے سلافی اور لتھوینی بے دینوں سے جو بحیرہ بالٹک اور کوہ کارپتھین کے درمیان آباد تھے۔ بہت سا ملک چھین لیا تھا۔ جس طرح ریاست ہائے متحدہ ایک منظم سلطنت بن جانے سے پہلے اپنے سرحدی مقبوضات کا بندوبست کرتی تھیں۔ اسی طرح فرنگی بھی ان دور افتادہ علاقوں کا انتظام کرتے +

برینڈن[1] برگ کی سرحدی ریاست کی بنیاد شروع میں شارلمان نے رکھی تھی۔ تاکہ جنگی سیکسن قبیلوں سے اپنے مشرقی مقبوضات کی حفاظت کر سکے۔ وینڈ[2] نامی ایک سلافی قوم اس علاقہ میں آباد تھی۔ دسویں صدی میں اسے فتح کر لیا۔ ان کی تجارتی منڈی جس کا نام برینا[3] بور تھا۔ اس ریاست کا مرکز قرار پائی۔ اور اس کی وجہ سے یہ نئی ریاست برینڈن برگ کہلانے لگی +

گیارھویں۔ بارھویں۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں اس سرحدی ریاست کی حکومت کے فرائض امرا کے خاندان سرانجام دیتے رہے۔ آخر پندرھویں صدی میں خاندان ہوہنزولرن[4] کی باری آئی + اس خاندان کے افراد نے برینڈن برگ کے حاکم

---

[1] Brandenburg. [2] Wend. [3] Brennabor. [4] Hohenzollern.

بن کر کے اس ریتیلے اور اجاڑ سرحدی علاقے کو دنیائے جدید کے معیار کے مطابق ایک منظم سلطنت بنا دیا +

یہ ہوہنزولرن خاندان جسے یورپ اور امریکہ کی متحدہ قوتوں نے حال ہی میں جولانگاہ سیاست سے باہر نکال دیا ہے۔ اصل میں جنوبی جرمنی سے آیا تھا + ان کے آباو اجداد اونے حیثیت کے لوگ تھے۔ بارھویں صدی میں ایک شخص فریڈرک ہوہنزولرن کی شادی اتفاق سے ایک اونچے گھرانے میں ہوگئی۔ اور وہ نورنمبرگ[۱] کے قلعے کا محافظ مقرر ہوگیا + اس کی اولاد نے اپنی قوت و طاقت بڑھانے کے لئے ہر موقع سے فائدہ اٹھایا۔ کئی صدیوں تک ان کا وطیرہ یہ رہا۔ کہ ہمیشہ موقع کی تاک میں رہتے۔ اور جو ہاتھ آتا اسے جانے نہ دیتے + آخر کار الیکٹر کے عہدے پر سرفراز ہوئے (یہ خطاب ان حکمران شہزادوں کو دیا جاتا تھا۔ جو قدیم مملکت جرمن کے شہنشاہ منتخب کیا کرتے تھے) ریفارمیشن کے زمانے میں انہوں نے پراٹسٹنٹوں کا ساتھ دیا۔ اور ستارھویں صدی کے آغاز میں ان کا شمار شمالی جرمنی کے سب سے طاقتور شہزادوں میں ہونے لگا +

سی سالہ جنگ میں پراٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں برینڈن برگ اور پرشیا کو دل کھول کر لوٹتے رہے۔ لیکن الیکٹر اعظم فریڈرک ولیم کے زمانے میں تھوڑے ہی عرصے کے اندر اس نقصان کی تلافی ہوگئی۔ اور ملک کی تمام اقتصادی اور ذہنی قوتوں کو سمجھ اور احتیاط سے کام میں لاکر ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کا نظم و نسق دُور بینی اور جُز رسی کا ایک مرقع تھا +

جدید پرشیا ایک ایسی ریاست ہے جس میں انفرادی خواہشات اور اُمنگیں جماعتی مفاد کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس پرشیا کا آغاز فریڈرک اعظم کے باپ کے زمانہ سے ہوتا ہے + فریڈرک ولیم اول سپاہی منش شخص تھا۔ جفاکش اور کفایت شعار۔ سپاہیوں کی طرح قدرے غیر شائستہ۔ ہالینڈ کے تیز تمباکو کا شوقین۔ امرا کے چاؤ چونچلوں سے کوسوں دُور۔ فرانسیسی وضع کی طرحداری سے متنفر۔ احساسِ فرض جنوں کی حد

---

[۱] Nuremberg.

تک پہنچا ہوا تھا جس نے دل و دماغ کو باقی خیالات سے یکسر خالی کر دیا تھا۔ نہ خود کبھی چین سے بیٹھتا۔ نہ اپنے ماتحتوں کو چین سے بیٹھنے دیتا + جرنیل ہو یا معمولی سپاہی کسی سے رو رعایت نہ تھی۔ اپنے بیٹے فریڈرک سے بھی تعلقات ایسے تھے۔ کہ انہیں کسی لحاظ سے بھی خوشگوار نہیں کہا جا سکتا۔ بیٹا شائستگی کا دلدادہ۔ باپ طبیعت کا اکھڑ۔ بیٹے کو دلچسپی تھی فرانسیسی تہذیب سے۔ وہاں کے ادب۔ فلسفہ اور موسیقی سے۔ باپ کو اس شوقینی میں نسوانیت نظر آتی تھی۔ دونوں کی طبیعتیں انوکھی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آپس میں زدروں کی ٹھن گئی۔ بیٹے نے چاہا۔ کہ انگلستان فرار ہو جائے۔ لیکن گرفتار کر لیا گیا۔ کورٹ مارشل ہوا۔ جن عزیز ترین دوستوں نے اسے امداد پہنچائی تھی۔ ان کے سر اپنی آنکھوں سے قلم ہوتے دیکھے + اس کے بعد اسے ایک چھوٹے سے دور دراز قلعے میں بھیج دیا گیا۔ تاکہ وہاں بیٹھ کر حکمرانی کے اصول سیکھتا رہے + یہ مصیبت آگے چل کر شہزادے کے لئے رحمت ثابت ہوئی۔ ۱۷۴۰ء میں تخت پر بیٹھا۔ تو آئینی معاملات پر اس قدر حاوی تھا۔ کہ کسی غریب کی پیدائش کے سرٹیفکیٹ سے لے کر سالانہ میزانیہ کی تفصیلات تک کسی بات سے بے خبر نہ تھا +

اپنی کتاب "میکیاولی کا رد" میں فریڈرک نے اس قدیم فلورنس نژاد مورخ کے سیاسی عقیدے کو بہت برا بھلا کہا ہے + میکیاولی[1] نے اپنے شاگرد شہزادوں کو یہ ہدایت دی تھی۔ کہ اگر مفاد ملکی اسباب کا مقتضی ہو۔ کہ دروغ بافی اور عیاری سے کام لیا جائے۔ تو بے تکلف جھوٹ بولو اور فریب دینے میں تامل نہ کرو۔ لیکن فریڈرک کے نزدیک بادشاہی کا نصب العین یہ تھا۔ کہ فرمانروائے ملک رعایا کا سب سے بڑا خادم ہے۔ اور اُسے لوئی چہاردہم کی طرح مطلق العنان مگر روشن دماغ ہونا چاہیئے + خود اس کا اپنا حال یہ تھا۔ کہ گو دن رات کے بیس گھنٹے رعایا ہی کی خدمت میں صرف کر دیتا۔ مگر کسی مشیر کو پاس نہ پھٹکنے دیتا۔ اس کے وزرا کی حیثیت منشیوں سے زیادہ نہ تھی۔ پرشیا کو یوں اپنے زیر نگین رکھتا تھا۔ گویا اس کی ذاتی جائداد ہو۔ اس کے انتظام میں کسی کو شریک نہ ہونے دیتا تھا۔ اور حکومت کے مفاد کو سب سے برتر سمجھتا تھا +

---

[1] Macchiavelli.

۱۷۴۰ء میں آسٹریا کے شہنشاہ چارلس ششم کا انتقال ہوگیا۔ چارلس نے اس خیال سے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی اکلوتی بیٹی میریا تھریسیا[ا] کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ ایک لمبے چوڑے مومی کاغذ پر ایک وصیت لکھوا کر سب سے اس کی تصدیق کرا لی تھی۔ لیکن ادھر بڈھے شہنشاہ کی نعش ہیبسبرگ خاندان کے پشتینی تہ خانے میں رکھی گئی۔ اُدھر فریڈرک کی افواج نے سرحد آسٹریا کی سمت پیش قدمی شروع کر دی + یوں تو پرشیا وسطی یورپ کے ہر حصے پر کسی نہ کسی طرح اپنا حق ثابت کرتا تھا۔ لیکن ایک بہت قدیم اور مشکوک استحقاق کی بنا پر سائیلیسیا کے علاقے کو بالخصوص اپنی ملکیت سمجھتا تھا + چند لڑائیوں کے بعد فریڈرک نے تمام سائیلیسیا کو فتح کر ڈالا۔ کئی مرتبہ شکست کھاتے کھاتے بچا۔ لیکن مفتوحہ علاقے سے اس کے قدم نہ اکھڑے۔ اور اہلِ آسٹریا کے جوابی حملے اسے بیدخل نہ کر سکے +

یورپ اب اس نوزائیدہ مستحکم سلطنت کو نظر انداز نہ کر سکتا تھا + اٹھارھویں صدی میں جرمنوں کی حالت یہ تھی کہ بڑی بڑی مذہبی جنگوں نے انہیں تباہ کر ڈالا تھا۔ اور وہ دولِ یورپ کی نظروں سے گر چکے تھے۔ لیکن فریڈرک نے زارِ روس کی طرح دفعۃً وہ جوہر دکھائے کہ یورپ جرمنی کا لوہا مان گیا + اندرونی نظم و نسق میں اب وہ سلیقہ پایا جاتا تھا۔ کہ پرشیا کی رعایا یورپ بھر میں سب سے زیادہ مطمئن اور خوشحال نظر آنے لگی + خزانے معمور تھے۔ شدید سزائیں اور عقوبتیں منسوخ ہو چکی تھیں۔ محکمہ عدالت کی اصلاح ہوئی۔ سڑکیں بننے لگیں۔ مدرسے جابجا کھل گئے۔ یونیورسٹیاں تعمیر ہوئیں۔ دیانتدار اور انصاف پسند لوگ افسر مقرر ہوئے + اس لئے رعیت خدمت کرنے کو تیار تھی۔ انہیں یقین تھا۔ کہ ہمیں اپنی خدمات کا صلہ مل رہا ہے۔ اور ہم کسی طرح گھاٹے میں نہیں +

جرمنی کا ملک کئی سو سال تک اہلِ فرانس۔ اہلِ آسٹریا۔ اہلِ سویڈن۔ اہلِ ڈنمارک اور اہلِ پولینڈ کے لکدکوب کا تختۂ مشق بنا رہا۔ لیکن پرشیا کی جوانمردی نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اور اس میں پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

[ا] Maria Theresa.

یہ سب ترقی اس خطرناک والے بڈھے کی طفیل تھی جس کی پرانی وردی پر ہمیشہ نسوار کے داغ لگے رہتے تھے۔ جو اپنے ہمسایہ سلطنتوں کے متعلق ظریفانہ انداز میں بہت سخت باتیں کہ دیا کرتا۔ جو راستگوئی کے نام سے بیگانہ تھا۔ جو اپنے فائدے کے لئے سب کچھ کر گزرتا۔ اور اس عیاری اور فریب کاری کا ماہر تھا۔ جو اٹھارویں صدی میں سیاست کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ حالانکہ "میکیاولی کا رد" کا مصنف تھا۔ اور مکاری کو اپنے قلم سے مذموم لکھ چکا تھا۔

۱۷۸۶ء میں آخری وقت آگیا۔ دوست یکے بعد دیگرے اٹھ چکے تھے۔ اولاد کبھی ہوئی نہ تھی۔ تیماردار صرف ایک نوکر تھا۔ عیادت کرنے والے اس کے پالتو کتے تھے۔ جن کو وہ انسانوں سے زیادہ چاہتا تھا۔ کہتا۔ ان میں ناشکرا پن نہیں۔ یہ دوستوں کے دوست ہیں۔ اور مالک سے کبھی بے وفائی نہیں کرتے۔

نظامِ تجارت

یورپ کی نئی نئی خاندانی یا قومی حکومتوں نے دولت جمع کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے۔ اور نظامِ تجارت سے کیا مراد ہے؟

یہ ہم پڑھ چکے ہیں۔ کہ سولھویں اور ستارھویں صدی میں کئی جدید حکومتیں یکے بعد دیگرے ظہور میں آئیں + لیکن ہر نئی حکومت کے ظہور کے اسباب مختلف تھے بعض جگہ کسی ایک بادشاہ کی کوشش و تدبیر نے انہیں تشکیل دی کسی جگہ وہ محض حسن اتفاق ہی سے وجود میں آگئیں۔ اور کئی تو ایسی تھیں جن کی تنظیم میں محض ملک کی جغرافیائی حدود ہی معاون ہوئیں + تاہم جو حکومت ایک دفعہ قائم ہوگئی۔ اس نے اپنے اندرونی نظم و نسق کو مستحکم کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اور خارجی معاملات میں بھی جہاں تک ہوسکا۔ اپنا مرتبہ بلند کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کام میں بہت سا روپیہ صرف ہوا۔ زمانہ وسطیٰ کی سلطنتوں میں کوئی مرکزی حکومت تو ہوتی نہ تھی۔ سلطنت کے قیام کے لئے بھرپور خزانوں کی ضرورت نہ تھی۔ بادشاہ کو اپنا خراج املاکِ شاہی سے وصول ہو جاتا تھا۔ اور حکام اپنی تنخواہ خود وصول کر لیتے تھے لیکن جدید سلطنتوں کا انتظام جہاں تمام حکومت ایک مرکز کے ماتحت ہوتی۔ زیادہ پیچیدہ تھا + قدیم امراء مٹ چکے تھے۔ ان کی جگہ حکومت کے تنخواہ دار افسروں نے لے لی تھی۔ افواج بحری و بری اور اندرونی نظم و نسق کے لئے اب کروڑوں روپے کی ضرورت تھی۔ اس لئے اب ہر جگہ روپیہ جمع کرنے کا سوال درپیش تھا +

زمانۂ وسطیٰ میں سونا چاندی بہت کمیاب تھے۔ ایک اوسط درجے کے آدمی کو ساری عمر سونا دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔ صرف بڑے بڑے شہروں کے لوگ ہی چاندی کے سکّوں سے آشنا تھے + لیکن امریکہ کی دریافت اور ملک پیرو کی زر انگیز کانوں نے

کایا پلٹ دی ۔ تجارت کا مرکز بحیرۂ روم سے اُٹھ کر بحراوقیانوس کے ساحل پر قائم ہوا۔ اطالیہ کے پرانے تجارتی شہروں کی ساکھ بگڑ گئی ۔ ان کی جگہ نئی تجارتی اقوام نے لے لی۔ اور سونا اور چاندی اب انوکھی چیزیں نہ رہیں ٭

ہسپانیہ پرتگال ہالینڈ اور انگلستان کی وساطت سے قیمتی معدنیات یورپ میں پہنچیں۔ سولھویں صدی میں اقتصادیات سیاسی پر کتابیں لکھی گئیں ۔ ان کے مصنفین نے قومی تمول کے متعلق نئے نئے اصول پیش کئے ۔ اور یوں استدلال کیا کہ حقیقی دولت سونے چاندی کا نام ہے اس لیئے جس ملک کے پاس نقدی زیادہ ہے وہی سب سے زیادہ متمول ہے چونکہ نقد روپے سے فوجیں رکھی جاسکتی ہیں ۔ اسلئے جو ملک متمول ہے وہی سب سے زیادہ طاقتور ہے ۔ اور باقی دنیا پر حکومت کرسکتا ہے ٭

یہ نظام نظامِ تجارت کہلاتا ہے ٭ جس طرح اولیں مسیحی معجزوں پر ایمان لے آئے تھے اور آج کل کے کئی کاروباری لوگ امریکن نظام محصولات پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح یورپ کے لوگ بلاحیل وحجت اسی نظام تجارت پر ایمان لے آئے ٭ عملاً اس نظام نے مندرجہ ذیل شکل اختیار کرلی زرو سیم جمع کرنے کیلئے اپنے یہاں کا سامان تجارت دوسرے ممالک میں فروخت کرنا ضروری ہوگیا ۔ تمہارا ہمسایہ جتنا سامان تجارت تمہیں بھیجتا ہے اگر تم اس سے زیادہ اسے بھیجدو تو ظاہر ہے کہ وہ تمہارا مقروض ہوگا ۔ اور مجبور ہوجائیگا کہ اپنے ہاں کا کچھ سونا تمہیں دے ڈالے ۔ چنانچہ تمہیں نفع ہوگا اور اسے نقصان ٭ اس عقیدے کا نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ ستارھویں صدی میں ہر سلطنت کا اقتصادی لائحہ عمل یہ بن گیا :۔

(۱) قیمتی معدنیات جہاں تک ہوسکے ۔ حاصل کرو ٭

(۲) ملکی تجارت سے زیادہ بیرونی تجارت کی حوصلہ افزائی کرو ٭

(۳) ان مصنوعات کی حوصلہ افزائی کرو جو دیگر ممالک کو بھیجی جاتی ہیں ٭

(۴) آبادی بڑھاؤ کیونکہ تمہیں اپنے کارخانوں کے لئے بہت سے مزدوروں کی ضرورت ہوگی اور زرعی ملک میں کافی مزدور نہیں ملتے ٭

(۵) سلطنت کو چاہئے کہ ان باتوں کی نگرانی کرتی رہے ۔ اور ان تجارتی مقاصد کی تکمیل کے لئے جب ضرورت ہو اپنے اقتدار کو کام میں لائے ٭

بجائے اس کے کہ بین الاقوامی تجارت کو بھی نظامِ قدرت کا ایک جزو سمجھا جاتا جو انسان کی مداخلت سے بے نیاز ہمیشہ قدرتی قانون کا پابند ہے۔ سولھویں اور سترھویں صدی کے لوگ سرکاری احکام اور فرامین شاہی اور حکومت کی مالی امداد کے وسیلے سے اس نظام پر خود قابو پانے کی کوشش کرتے رہے +

سولھویں صدی میں چارلس پنجم نے اس نظامِ تجارت کو جو اس وقت تک بالکل نئی چیز تھا اپنے مقبوضات میں رائج کر دیا۔ انگلستان کی ملکہ الزبتھ نے اس کی تقلید کی۔ خاندان بوربن خصوصاً شاہ لوئی چہاردہم نے تو اس اصول کو اپنا مذہب ہی بنا لیا + کولبرٹ[1] جو لوئی چہاردہم کے عہد میں وزیر مال تھا اس مذہب کا ہادی مانا جاتا تھا اور تمام یورپ اس کے اشارے پر چلتا تھا +

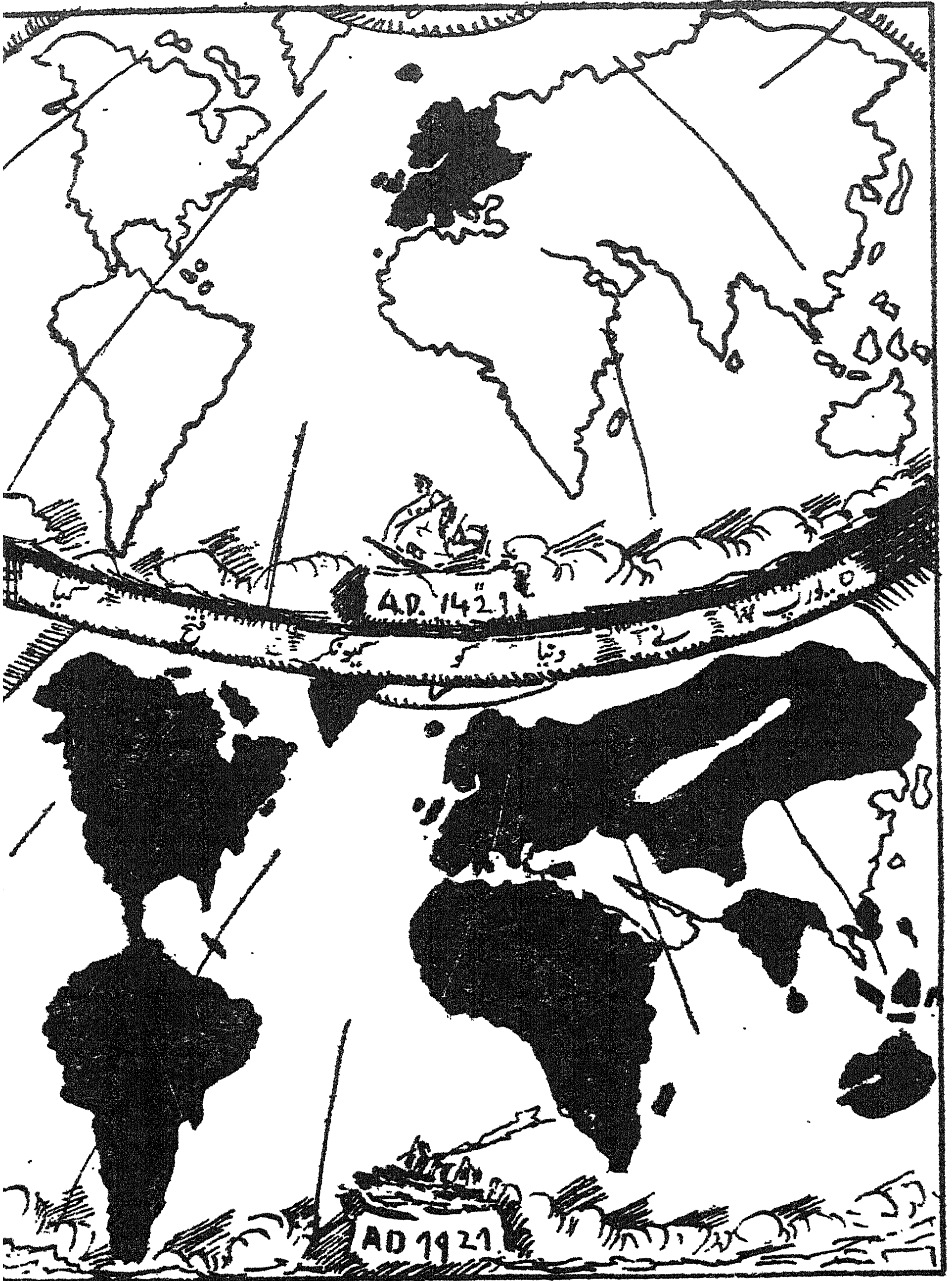
کرام ویل کی خارجی پالیسی اسی نظام تجارت کی ایک عملی صورت تھی۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا۔ کہ ہالینڈ جیسے متمول رقیب کو نیچا دکھایا جائے۔ اس زمانہ میں ہالینڈ کے جہاز یورپ کا مال تجارت باہر لے کر جاتے تھے۔ اور چونکہ یہ لوگ کسی قدر آزاد تجارت کی طرف مائل تھے اسلئے ان کا قلع قمع کرنا ضروری تھا +

تم خود ہی غور کرو کہ اس نظام کا نوآبادیات پر کیا اثر ہوا ہوگا + نوآبادیاں سونے اور چاندی اور مصالحوں کا ذخیرہ بن کر رہ گئیں + فاتحین کو جب ضرورت ہوتی وہاں سے اپنی جیبیں بھر لیتے + اس طرح اہلِ یورپ ایشیا امریکہ اور امریکہ کی معدنیات اور دیگر پیداوار کے اجارہ دار بن گئے۔ ہر سلطنت اپنی اپنی نوآبادیوں پر خزانے کا سانپ بن کر بیٹھ گئی اور کسی اجنبی کو اس کے قریب پھٹکنے نہ دیا + نوآبادیات کے باشندوں کو اتنی بھی اجازت نہ تھی۔ کہ وہ اپنے فاتحین کے علاوہ کسی دوسرے ملک سے تجارت کریں +

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ نظامِ تجارت نے ایسے ممالک میں جہاں پہلے کوئی کارخانہ نہ تھا۔ نئی نئی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی + وہاں سڑکیں بنیں۔ نہریں کھدیں اور سامان تجارت لانے لے جانے کے وسائل کی اصلاح ہوئی۔ کاریگری کا معیار اونچا ہو گیا۔

---

[1] Colbert



یورپ نے دنیا کو کیونکر فتح کیا

تجروں کی حیثیت بڑھ گئی اور زمیندار امرا کمزور پڑ گئے۔ لیکن اس سے طرح طرح کی مصیبتیں بھی پیدا ہوئیں۔ اس کی وجہ سے نوآبادیوں کے باشندے زرپرستوں کی ہوس زراندوزی کا شکار ہو گئے۔ اور یورپ کے شہروں کا حشر تو اس سے بھی بدتر ہوا۔ ہر ملک



بحری طاقت

نے ایک مسلح کیمپ کی صورت اختیار کر لی۔ روئے زمین چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور ہر ملک کے سر میں یہی خبط سمایا۔ کہ سب دولت خود سمیٹ لے اور دوسرے ملکوں کو تباہ کر ڈالے۔ تموّل کو اس قدر اہمیت دی گئی کہ لوگ دولت کو دنیا کی سب سے بڑی خوبی سمجھنے لگے + جس طرح فیشن آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اقتصادی نظام بھی اکثر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اُنیسویں صدی میں اس نظام تجارت کو ترک کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ کھلے مقابلے کا آزاد نظام رائج ہوا + کم از کم مجھے یہی بتایا گیا ہے +

انقلابِ امریکہ

اٹھارویں صدی کے خاتمے پر شمالی امریکہ کے بیابانوں میں جو کچھ پیش آیا۔ اُس کے متعلق عجیب و غریب خبریں یورپ والوں کے سُننے میں آئیں۔ جن لوگوں نے شاہ چارلس کو آسمانی حقوق کے دعوے پر اصرار کرنے کی پاداش میں سزا دی تھی۔ انہی لوگوں کی اولاد اب حکومتِ خود اختیاری کی پرانی جدوجہد میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہی تھی

آئیے۔ سہولت کی غرض سے چند سو سال پیچھے ہٹ جائیں۔ اور اُس عظیم الشان جدوجہد کی ابتدائی تاریخ پھر بیان کریں جو نو آبادیوں پر قبضہ حاصل کرنے کی خاطر یورپ کی بعض سلطنتوں میں شروع ہوگئی تھی ؞

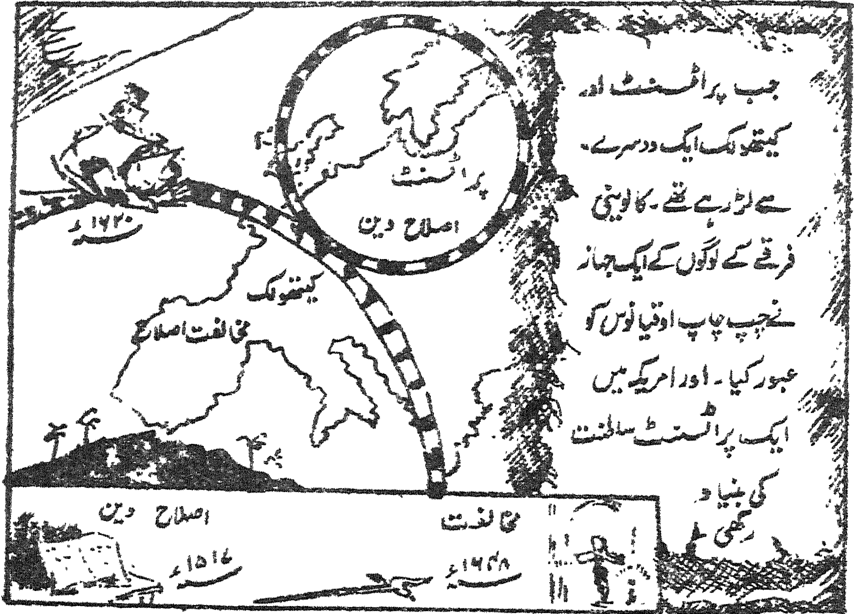


جنگ آزادی

یورپ کی سی سالہ جنگ کے دوران میں اور اس کے خاتمہ پر یورپ میں کئی نئی سلطنتیں پیدا ہوگئی تھیں جن میں سے کچھ تو قومی اور نسلی اصولوں پر قائم ہوئیں اور کچھ شاہی خاندانوں کے قبضے میں رہیں۔ ادھر یہ سلطنتیں بنیں ادھر ان کے فرمانرواؤں نے جن کی پشت پناہی تاجروں اور تجارتی کمپنیوں کی دولت کر رہی تھی۔ ایشیا۔ افریقہ اور امریکہ میں مزید مقبوضات حاصل کرنے کے لئے لڑنا شروع کر دیا ؞

ہسپانیہ اور پرتگال والے بحرالکاہل اور بحرِ ہند کو سو سال سے زیادہ عرصے تک

گمگھول چکے تھے + ان کے بعد انگریز اور ولندیز بروئے کار آئے۔ جن کے لئے ہسپانویوں اور پرتگیزوں کی بحری سرگرمیاں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ کیونکہ ابتدائی کام جو بہت کٹھن تھا وہ پہلے سے ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے پہلے پہل ان سمندروں میں جہازرانی کی۔ وہ ایشیا



مہاجرین

اور امریکہ کے باشندوں میں بدنام ہو چکے تھے + انگریز اور ولندیز آئے۔ تو لوگوں نے انہیں اپنا نجات دہندہ اور ہمدرد سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہم یہ تو نہیں کہتے۔ کہ یہ قومیں اپنے پیشروؤں سے بہتر اوصاف کی مالک تھیں۔ البتہ اتنا ضرور تھا۔ کہ ان لوگوں نے تجارت کے علاوہ اور کسی مقصد کو اپنے سامنے نہ رکھا اور عقل کو مذہبی اغراض کے تابع نہ ہونے دیا +

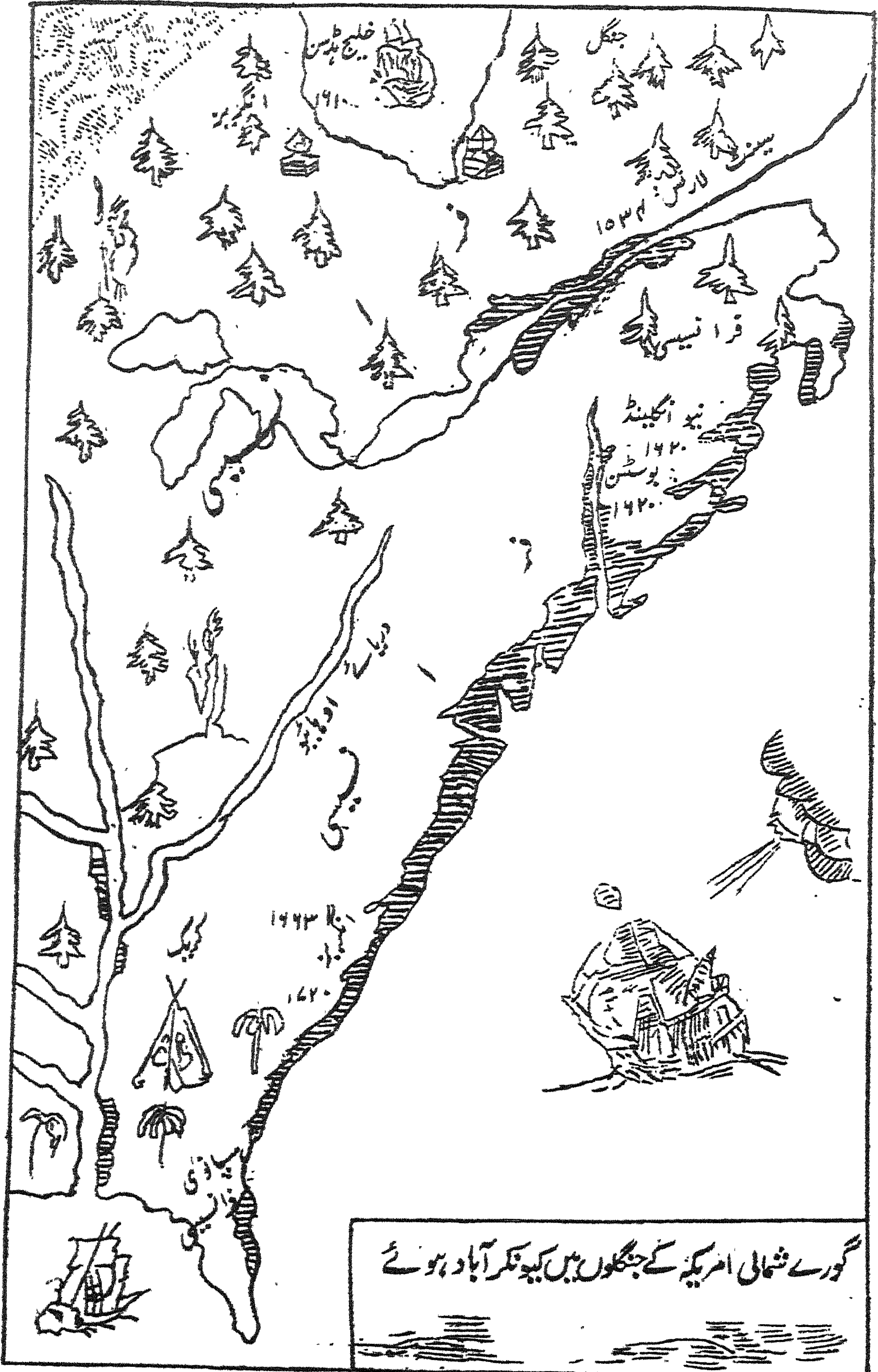
شروع شروع میں جب کبھی یورپ کی قوموں کو کمزور قوموں سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔ لیکن انگریز اور ولندیز زیرک لوگ تھے۔ حد سے بڑھنے نہ پائے۔ مصالحہ جات۔ سونا اور چاندی ملتے رہتے اور محصل وقت پر ادا ہوتے رہتے تو دیسیوں سے تعرض نہ کرتے + یہی وجہ ہے کہ انہیں دنیا کے زرخیز ترین حصوں پر قبضہ حاصل کرنے میں چنداں مشکل نہیں پیش آئی۔ لیکن ادھر یہ مرحلہ طے ہوا۔ ادھر

انھوں نے مزید مقبوضات حاصل کرنے کی غرض سے آپس میں لڑنا شروع کر دیا عجیب بات تو یہ ہے۔ کہ نو آبادیوں کی ان تمام لڑائیوں کا فیصلہ نو آبادیوں کے اندر نہیں ہوا۔ بلکہ یہ جھگڑا لڑنے والی سلطنتوں کی بحری فوجوں نے نو آبادیوں سے تین ہزار میل کے فاصلے پر چکایا۔ قدیم اور جدید زمانے کی جنگوں کا سب سے زیادہ دلچسپ اصول (جو تاریخ کے معدودے چند قابل اعتماد قوانین میں سے ہے) یہ ہے کہ جو قوم بحر کی مالک ہے وہی خشکی پر بھی حکومت کریگی + یہ اصول کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ یہ اَور بات ہے۔ کہ اس زمانے میں ہوائی جہازوں نے اسے بدل دیا ہو + لیکن اٹھارویں صدی میں تو ہوائی جہازوں کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ اس لئے برطانیہ نے اپنی بحری طاقت کے بل بوتے پر امریکہ۔ ہندوستان اور افریقہ میں وسیع نو آبادیاں قائم کر لیں +

سترھویں صدی میں ہالینڈ اور انگلستان کے درمیان جو بحری لڑائیاں ہوتی رہیں ان کا یہاں ذکر کرنا موزوں نہ ہوگا۔ ان لڑائیوں کا نتیجہ وہی ہوا۔ جو زبردست اور زبردست حریفوں کی جنگ آزمائی کا ہوا کرتا ہے + البتہ انگلستان اور اس کے حریف فرانس کے درمیان جو معرکے ہوئے۔ وہ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ انگریزی بیڑا گو فرانسیسی بیڑے سے طاقتور تھا۔ اور آخر کار انگریزوں نے فرانسیسیوں کو ہرا بھی دیا۔ تاہم اس جنگ کے اکثر ابتدائی معرکے چونکہ براعظم امریکہ میں ہوئے تھے۔ اس لئے وہ ہمارے موضوع سے دُور نہیں + اس وسیع سرزمین میں جو کچھ دریافت ہو چکا تھا۔ اس پر انگلستان اور فرانس دونوں اپنا اپنا حق جتاتے تھے۔ بلکہ اس کے علاوہ ان علاقوں کو بھی اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ جو ابھی تک بن بوجھے پڑے تھے۔ اور کسی گورے آدمی نے انہیں دیکھا تک نہیں تھا + ۱۴۹۷ء میں کیبٹ[1] امریکہ کے شمالی ساحل پر اُترا۔ اور بیس سال کے بعد جیوانی ویرا زانو[2]۔ ان ساحلی علاقوں میں پہنچا + لیکن کیبٹ یہاں انگریزی علم نصب کر چکا تھا۔ ویرا زانو فرانسیسی جھنڈا لہراتا آیا۔ اس لئے فرانس اور انگلستان دونوں نے اپنی اپنی جگہ اعلان کر دیا۔ کہ ہم سارے براعظم کے مالک ہیں +

---

[1] Cabot [2] Giovanni Verrazano



گورے شمالی امریکہ میں کیونکر آباد ہوئے

سترھویں صدی کے دوران میں انگریزوں نے مینؔ[1] اور کیرولیناسؔ[2] کے درمیان کوئی دس چھوٹی چھوٹی نوآبادیاں قائم کرلی تھیں + جہاں انگلستان میں کوئی نیا مذہبی فرقہ پیدا ہوتا اور دین مروجہ کے پیرو ان سے معاندت کرتے۔ لوگ اس علاقے کو دارالامان سمجھ کر ہجرت پر کمر باندھ لیتے اور یہاں آکر آباد ہو جاتے + "اہل صفا"[3] جو ۱۶۲۰ء میں نیو انگلینڈ پہنچے۔ یا "کویکر"[4] جو ۱۶۸۱ء میں بمقام پنسل وینیا آباد ہوئے۔ اسی قسم کے لوگ تھے + ان پناہ گزینوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ ساحل سمندر کے



جہاز "مے فلاور" کے کمرے میں

قریب سرحد پر ایک نیا وطن بنانے اور بہتر ماحول میں زندگی بسر کرنے کے لئے جمع ہوئے گویا بادشاہ کی نظر عتاب اور حکام کی مداخلت دونوں سے مامون ہو گئے +

برعکس اس کے فرانسیسی نوآبادیاں ہمیشہ شاہِ فرانس کے قبضے میں رہیں ۔ کوئی

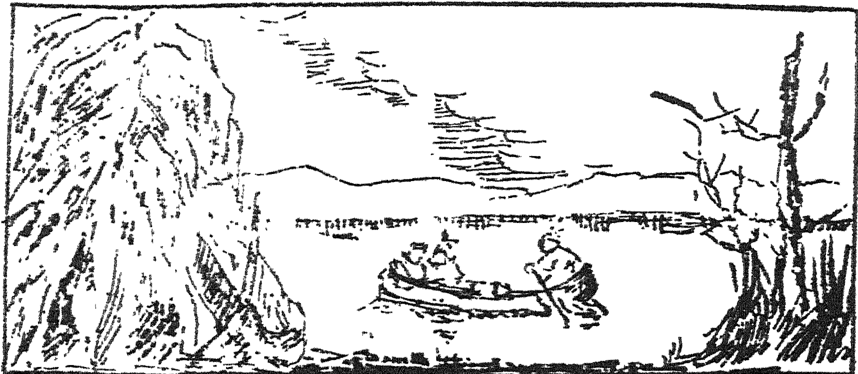
---

[1] Maine　　[2] Carolinas

[3] Puritans　　[4] Quaker

ہیوگونو[1] یا پراٹسٹنٹ ان نوآبادیوں میں قدم رکھنے کا مجاز نہ تھا۔ اہل فرانس کو اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ پراٹسٹنٹ مذہب کے خطرناک عقائد کی اشاعت کرکے امریکہ کے اصلی باشندوں کے خیالات کو نہ پلٹ نہ کر دیں اور یسوعیوں نے جو تبلیغ کا کام شروع کر رکھا ہے۔ اس میں روڑا نہ اٹکائیں۔ غرض یہ کہ انگریزوں نے اپنی نوآبادیوں کو اپنے حریف فرانس کے مقابلے میں بہتر طریق پر قائم کیا۔ ان کی نوآبادیاں متوسط درجے کے انگریزوں کی قوت اور تجارتی قابلیت کا مظہر تھیں۔ برعکس اس کے فرانسیسی نوآبادیوں میں جو لوگ بستے تھے۔ وہ ملازمین شاہی کی حیثیت سے سمندروں کو عبور کرکے پردیس میں آئے تھے انہیں ہمیشہ یہی دھن لگی رہتی تھی۔ کہ جب موقع ملے پیرس واپس چلے جائیں ؛

تاہم سیاسی حیثیت سے انگریزی نوآبادیوں کی حالت قابلِ اطمینان نہ تھی۔ فرانسیسیوں نے سینٹ لارنس کا دہانہ سترھویں صدی میں دریافت کر لیا تھا۔ بڑی بڑی جھیلوں کے علاقے سے وہ جنوب کی طرف بڑھے۔ اور مسسسپی کے کنارے جا اُترے۔ پھر انہوں نے خلیج میکسیکو کے کنارے کنارے بہت سے قلعے بنا لئے۔



فرانسیسی مغرب کی سیاحت کرتے ہیں

کوئی سو سال گذرے تو یہاں ساٹھ فرانسیسی قلعوں کی ایک قطار کھڑی ہو گئی۔ جنہوں

---

[1] Huguenot

نے ان انگریزی نوآبادیوں کو جو بحر اوقیانوس کے ساحل پر واقع تھیں اندرون ملک سے منقطع کر دیا ۔

انگریزوں نے نوآبادیات کی کمپنیوں کو زمین عطا کرتے وقت لکھ دیا تھا۔ کہ "ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک ساری زمین تمہیں بخش دی گئی" لیکن یہ محض کاغذی باتیں تھیں ۔ واقعہ یہ تھا۔ کہ جہاں سے فرانسیسی قلعوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ وہاں برطانی علاقے کی حد ختم ہو جاتی تھی ۔ اس حد کو توڑ کر آگے نکل جانا ناممکن نہ تھا لیکن اس پر روپیہ صرف ہوا۔ بہت سے آدمی کام آئے اور عرصے تک سرحد پر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اور دونوں فریق امریکن قبائل کی مدد سے اپنے گورے ہمسایوں کا خون بہاتے رہے ۔

جب تک انگلستان میں خاندان سٹوارٹ کا سکہ چلتا رہا۔ فرانس سے جنگ چھڑنے کا امکان نہ تھا۔ کیونکہ خاندان سٹوارٹ پارلیمنٹ کا زور توڑ کر مطلق العنان بننا چاہتا تھا۔ اور اس غرض کے لئے فرانس کے خاندان بوربون کی مدد کا محتاج تھا ۔ لیکن ۱۶۹۱ء میں خاندان سٹوارٹ کا آخری فرمانروا انگلستان سے بیدخل ہو گیا۔ اور ولیم والئی ہالینڈ جو لوئی چہاردہم کا سخت دشمن تھا تخت پر بیٹھا۔ اس وقت سے لے کر پیرس کے معاہدے تک (جو ۱۷۶۳ء میں ہوا) فرانس اور انگلستان۔ ہندوستان اور شمالی امریکہ پر قبضہ حاصل کرنے لئے آپس میں برابر لڑتے رہے ۔

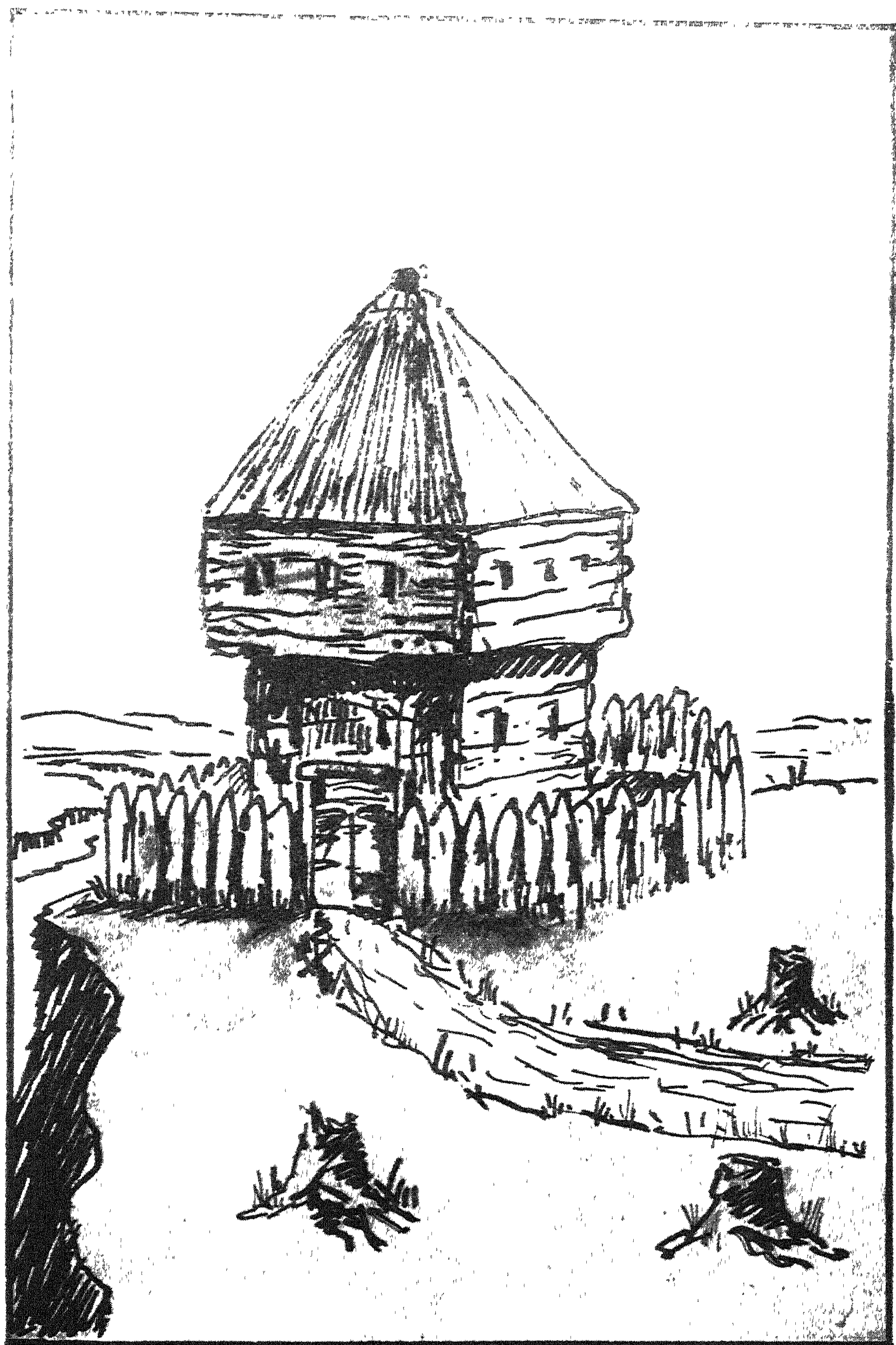
جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ان لڑائیوں کے دوران میں فرانس ہمیشہ انگلستان کی بحری فوجوں کے ہاتھوں شکست کھاتا رہا ۔ نوآبادیوں سے اس کا تعلق منقطع ہو گیا تو اکثر علاقے قبضے سے نکل گئے۔ اور جب صلح کا اعلان ہوا تو شمالی امریکہ کا پورا براعظم انگریزوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ اور کارٹیر[1]۔ شامپلین[2]۔ لاسال[3]۔ مارکٹ[4] اور دوسرے فرانسیسی سیاحوں نے جو علاقے دریافت کئے تھے۔ وہ فرانس سے چھن چکے تھے ۔

اس وسیع علاقے کا بہت تھوڑا حصہ آباد تھا یہ سرزمین شمال میں میساچوسٹس سے لے کر (جہاں "مہاجرین" یعنی اہل صفا کا ایک فرقہ جن پر اپنے تعصب کی وجہ سے

---

[1] Cortier — [2] Champlain

[3] La Salle — [4] Marquette



قصر صحرا

انگلستان اور ہالینڈ دونوں تنگ تھے ۔ ۱۶۲۰ء میں آکر اُترے تھے) کیرولنیاس اور وجینیا تک (جہاں تمباکو کی پیداوار ہوتی تھی اور جہاں کی نوآبادیاں محض جلب منفعت کی غرض سے قائم ہوئی تھیں) پھیلی ہوئی تھی ۔ آبادی تھوڑی تھی ۔ لیکن آسمان صاف تھا اور ہوا تازہ ۔ یہاں کے رہنے والوں اور آبائی وطن کے باشندوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا آبادکار لوگ بیابانوں میں آزادی اور خود اعتمادی کا سبق سیکھ کر پروان چڑھے تھے ۔ جفاکش تھے اور بہادر اسلاف کی یادگار ۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں تک آن پہنچے تھے ورنہ سست اور بزدل لوگوں کا کیا مقدور کہ سمندروں



نیو انگلینڈ میں پہلا موسم سرما

کو عبور کر کے پردیس میں زندگی بسر کرتے ۔ امریکہ کے آبادکاروں کو پابندی اور رکھ رکھاؤ کی زندگی اور ایسی گنجان آبادی سے نفرت تھی ۔ جہاں سانس لینے کے لئے بھی کافی جگہ نہ ہو ۔ باپ دادا کے وطن میں انہی نقائص کی وجہ سے زندگی اجیرن ہوگئی تھی + اب انہیں یہی لگن لگی تھی کہ جس طرح بن پڑے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور آپ اپنے آقا بن جائیں + اور معلوم ہوتا ہے انگلستان کی عنانِ حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ آبادکاروں کی اُمنگوں اور حوصلوں سے بیخبر تھے + حکومت نے آبادکاروں کو طرح طرح سے تنگ کیا ۔ نتیجہ یہ ہوا وہ حکومت سے تنگ آ گئے ۔ اور سرکشی پر آمادہ ہوگئے اور ایک دفعہ تعلقات بگڑے تو بگڑتے ہی چلے گئے + یہاں تفصیلی طور پر یہ بیان کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا ۔ کہ اس ضمن میں کیا کیا واقعات پیش آئے ۔ یا یہ کہ اگر جارج سوم شاہِ انگلستان عقلمند ہوتا ۔ یا اس کا وزیر لارڈ نارتھ اتنا مدہوش اور بے پروا نہ ہوتا تو کتنی بلائیں ٹل جاتیں + صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ جب برطانی آبادکاروں نے دیکھا ۔ کہ مصالحانہ گفت و شنید سے کام نہیں نکلتا ۔ تو قبضۂ شمشیر پر ہاتھ ڈالا ۔ پہلے بادشاہ کی وفادار رعایا تھے اب باغی بنے ۔ اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالا ۔ اُس

زمانے میں جرمن والیان ملک اپنی فوجوں کو کرائے پر چلاتے تھے - جو شخص زیادہ بولی دیتا بہی رجمنٹیں اُسی کے ہاتھ بیچ ڈالتے - جارج نے بھی اُس زمانے کے اس دلچسپ دستور کے مطابق جرمن سپاہی کرائے پر لے رکھے تھے - جب کوئی آبادکاران سپاہیوں کے ہاتھ پڑ جاتا - تو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا لیکن آبادکاروں نے اس خطرے میں بھی پڑنا گوارا کر لیا ۔

انگلستان اور اس کی نوآبادیوں میں کوئی سات سال تک جنگ رہی - بیشتر یہی ہوا کہ باغیوں کی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور بہت سے لوگ جن میں زیادہ تر شہروں کے باشندے تھے - بدستور انگلستان کی وفاداری کا دم بھرتے رہے - جنگ سے نفور تھے - اس لئے جھٹ صلح کے لئے نامہ و پیام کرنے پر آمادہ ہو جاتے - لیکن واشنگٹن کی جلیل القدر شخصیت آباد کاروں کی رہنمائی کر رہی تھی - اس لئے صلح نہ ہو سکی - واشنگٹن کو مٹھی بھر شجاع اور قابل رفیقوں کی اعانت کا سہارا تھا اس کی فوج سامان جنگ سے اچھی طرح آراستہ تو نہ تھی - لیکن اُس کے جان نثار سپاہی ارادے کے پکے اور ہمت کے دھنی تھے - انہی جیالے سورماؤں کی بدولت واشنگٹن شاہی فوجوں کو ضعف پہنچاتا رہا - اکثر اوقات یہ نوبت آن پہنچی کہ شکست کھانے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا - لیکن ایسے موقعوں پر اس کی دانائی آڑے آجاتی اور جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا - اس کے سپاہیوں کو اچھی خوراک نہ ملتی تھی - جاڑے کے دنوں میں اُن کے پاس جوتے اور کوٹ تک نہ ہوتے تھے اور وہ مضرِ صحت خندقوں میں رہتے تھے لیکن اپنے سردار پر انہیں پورا پورا بھروسہ تھا - اس لئے وہ فتح کی آخری ساعت تک برابر میدان میں ڈٹے رہے ۔

ادھر واشنگٹن لڑ رہا تھا - اُدھر بنجمن فرینکلن یورپ میں حکومتِ فرانس اور ایمسٹرڈم کے ساہوکاروں سے روپیہ حاصل کر رہا تھا لیکن واشنگٹن کی جنگ آزمائیوں اور فرینکلن کی سیاسی فتح مندیوں سے بھی بڑھ کر ایک اور واقعہ پیش آیا - یہ انقلاب کے ابتدائی زمانے کا ذکر ہے - مختلف نوآبادیوں کے نمائندے فلیڈلفیا میں جمع ہو کر ایسے مسائل پر بحث کر رہے تھے - جو تمام نوآبادیوں کے لئے برابر اہمیت رکھتے تھے - انقلاب کا پہلا سال تھا - ساحل سمندر کے بڑے

بڑے شہروں پر انگریزوں کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ انگلستان سے برابر کمک چلی آرہی تھی۔ ان ہنگاموں کے باوجود ۱۷۷۶ء کے جون اور جولائی میں ان لوگوں نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ اور ایسا فیصلہ کرنے کی جرأت انہیں لوگوں کو ہو سکتی ہے جنہیں اپنی سچائی کا پورا پورا یقین ہو ؛



جارج واشنگٹن

جون میں رچرڈ ہنری نے جو ورجینیا کی خاک سے اُٹھا تھا امریکہ کی کانگرس میں یہ تجویز پیش کی کہ یہ متحدہ نوآبادیاں آزاد اور مطلق العنان ہونی چاہئیں۔ اس لئے انہیں تاج برطانیہ کی وفاداری کے جُوئے سے آزاد کیا جاتا ہے۔ اور ان کے اور برطانیہ عظمےٰ کے تمام سیاسی تعلقات اصولاً کالعدم قرار دیئے جاتے ہیں !

جان ایڈمز نے جو میساچوسٹس کا باشندہ تھا۔ اس تجویز کی تائید کی۔ ۲ جولائی کو یہ تجویز منظور ہوئی اور ۴ جولائی کو سرکاری طور پر آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کا سہرا ٹامس جیفرسن کے سر ہے۔ جیفرسن نہایت ثقہ اور قابل شخص تھا۔ اُس نے آئینِ حکومت اور سیاسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ قسمت کو یہی منظور تھا کہ یہ شخص ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مشہور ترین پریذیڈنٹوں میں شمار ہو ؛

یہ خبر یورپ پہنچی۔ اور ساتھ ہی یہ اطلاع ملی کہ آبادکاروں کو کامل فتح ہوئی ہے اور ۱۷۸۷ء کا مشہور آئین منظور کر لیا گیا ہے۔ (یہ آئین دنیا کا پہلا تحریری آئین تھا)

اس پر بہت چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سترھویں صدی کی مذہبی لڑائیوں کے بعد جس نظام حکومت نے جنم لیا تھا۔ وہ اب پورے شباب پر پہنچ چکا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی۔ کہ سلطنت موروثی ہوتی تھی۔ اور مرکزی حکومت کو بڑے بڑے اختیارات حاصل تھے۔ اُدھر بادشاہوں کے محل وسیع ہوتے جاتے تھے۔ اِدھر شہروں کے گرد مفلس لوگوں کے گندے اور کثیف جھونپڑے نئی نئی ایکڑ زمین پر پھیلتے چلے جاتے تھے۔ ان جھونپڑوں میں جو لوگ رہتے تھے۔ ان میں بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ یہ بچارے تو بے بس تھے۔ لیکن اعلےٰ طبقوں کے لوگوں یعنی امراء اور اہل حرفت کو بھی ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات کے متعلق شبہات پیدا ہونے لگے۔ امریکہ کے آبادکاروں کی کامیابی نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ بہتیری باتیں جنہیں وہ اس کچھ عرصہ سے پہلے ناممکن سمجھتے تھے۔ ممکن نظر آنے لگیں۔

ایک شاعر کہتا ہے کہ لکسنگٹن[1] کی لڑائی میں جو پہلی گولی چلائی گئی "اس کی آواز سے ساری دنیا گونج اٹھی"۔ لیکن اس خیال میں کسی قدر مبالغہ ہے۔ چین۔ جاپان اور روس اور جزیرہ آسٹریلیا اور جزیرہ ہوائی (جنہیں کپتان کُک نے اِسی زمانے میں ازسرِنو دریافت کیا تھا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ اِن جزیروں کے باشندوں نے اُس بچارے کو اس خدمت کے عوض قتل کر ڈالا) تک اس گولی کی آواز نہ پہنچی لیکن اس گونج نے اوقیانوس کو یقینا عبور کر لیا۔ یورپ آگے ہی بے اطمینانی کا بارود خانہ بنا ہُوا تھا۔ یہ آواز وہاں پہنچی تو فرانس میں اتنا بڑا دھماکا ہُوا۔ کہ پٹروگریڈ سے میڈرڈ تک سارا برِاعظم کانپ اُٹھا۔ قدیم نظام حکومت کی عمارت زمین پر آ رہی۔ اور پرانے مدبر اور سیاست دان جمہوریت کی سینکڑوں من اینٹوں تلے دفن ہو گئے۔

---

[1] Lexington

انقلابِ فرانس

فرانس کا عظیم الشان انقلاب ساری دنیا کے سامنے آزادی - اخوت اور مساوات کا اعلان کرتا ہے +

انقلاب کا ذکر چھیڑنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے - کہ اس لفظ کے معنی بتا دیئے جائیں - ایک روسی مصنف کی اصطلاح میں (روسیوں سے بہتر اس لفظ کو کون جانتا ہے ؟) انقلاب کے معنی ہیں - کہ وہ قوانین جو سینکڑوں سالوں میں قدم جما چکے ہیں - اور امتداد زمانہ سے اتنے مستحکم ہو گئے ہیں - کہ بڑے بڑے جوشیلے ریفارمر بھی ان کے خلاف کچھ لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے - چند سالوں کے اندر تباہ کر دئے جائیں + یا یوں کہئے کہ انقلاب نام ہے اُن اجزا کی تباہی کا جن کا باہمی ربط ہی قوم کی معاشری - مذہبی سیاسی اور اقتصادی زندگی کا نچوڑ ہے +

اٹھارویں صدی میں جب فرانس کا پرانا نظام تمدن فرسودہ ہو چکا تھا - اسی قسم کے انقلاب کی آگ بھڑک اُٹھی - لوئی چہاردہم کے زمانے میں بادشاہ کا لفظ اختیارات کُلی کا مرادف تھا - اُمرا پہلے تو فیوڈل حکومت کے ملازم ہوا کرتے تھے - لیکن جب انہوں نے زمانے کا رنگ دگرگوں دیکھا - اور اپنے آپ کو بیکار پایا - تو وہ بھی دربار شاہی کی زیب و زینت کا سامان بن کر رہ گئے +

اُس زمانے میں حکومت پر بے شمار روپیہ خرچ ہوتا تھا - اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا - کہ یہ رقم لوگوں پر محصول لگا کر وصول کی جائے + بدقسمتی سے فرانس کے بادشاہوں میں اتنی قوت نہ تھی کہ امرا اور پادریوں کو بھی اپنے حصے کا محصول ادا کرنے پر مجبور کریں - اس لئے محاصل کا سارا بوجھ کسانوں پر جا پڑا - وہ بیچارے تنگ و تار جھونپڑیوں میں رہتے تھے - مالکان زمین سے وہ پہلا سا میل جول نہ رہا تھا - اب

وہ نالائق اور بے رحم کارندوں کے ظلم وستم کا شکار ہو رہے تھے۔ اور دن بدن گرتے چلے جا رہے تھے۔ زمین کی پیداوار زیادہ ہوتی۔ تو مالیہ بھی بڑھ جاتا۔ چنانچہ اس سے ان کی ذات کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا + ایسی حالت میں وہ بھلا کھیتی باڑی سے کیا دلچسپی لیتے۔ اب بادشاہ کی کیفیت سنو۔ وہ اپنے وسیع محلات کے ایوانوں میں شکوہ و تجمل کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ جہاں جاتا جاہ پرست لوگوں کا ایک گروہ ساتھ رہتا۔ یہ لوگ کسانوں کا خون چُوس چُوس کر موٹے ہو رہے تھے۔ اور کسان بیچارے ڈھور ڈنگروں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ اس عہد قدیم کی نہایت کریہہ مگر صحیح تصویر ہے۔ تاہم اس کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ جسے نظر انداز نہ کرنا چاہیئے +

ایک طبقہ متوسط درجے کے لوگوں کا تھا جن کے پاس روپیہ بھی تھا۔ اور اُمرا سے قرابت داریاں بھی تھیں۔ (شوہر کسی مالدار مہاجن کا بیٹا۔ بیوی کسی قلاش رئیس کی بیٹی۔ ایسے رشتے بہت عام تھے)۔ ایک دوسرا طبقہ مصاحبین شاہ کا تھا جن میں فرانس بھر کے زندہ دل لوگ شامل تھے۔ ان دونوں کی بدولت فرانس کی معاشرت۔ نفاست اور تکلفات کا ایک مرقع بنی ہوئی تھی۔ جو لوگ سب سے ذہین اور دانشمند تھے۔ انہیں سیاسیات کے قریب پھٹکنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ فرصت کے اوقات میں تخیل کے گھوڑے دوڑا کر اپنا جی بہلانے لگے +

لوگ لباس میں اختراعات کرنے لگتے ہیں۔ تو اکثر مبالغے کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح خیالات اور معاشرت میں جدتیں پیدا ہونے لگیں۔ تو ان کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی بات تھی۔ کہ اُس زمانے کے پُر تکلف لوگ سادہ زندگی میں بے حد دلچسپی لینے لگیں۔ چنانچہ بادشاہ اور ملکہ جو فرانس اور اس کے تمام ممالک مقبوضہ و محروسہ کے فرمانروائے مطلق تھے۔ اکثر اپنے درباریوں کو ساتھ لے کر دیہات کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں جا کر رہتے تھے۔ گوالنوں اور سائیسوں کا سا لباس پہن لیتے تھے۔ اور یہ سوانگ اس طرح رچایا جاتا۔ گویا سب کے سب چرواہے اور گڈریے ہیں۔ جو قدیم یونان کی پُر فضا وادی میں لطف کی زندگی بسر کر رہے ہیں + دربار ہر وقت سجا رہتا۔ گویّے نت نئے گیت اور رقص ایجاد کرتے اور شاہی حجام بیش قیمت مصنوعی بال تیار کر کے اپنی صنعت کا کمال دکھاتے + جب طبیعتیں ان مشغلوں سے بھی اُکتا گئیں۔ تو ورسائی (جہاں لوئی

لے Versailles

چہاردہم نے شہر کے شور وشغب اور ہنگاموں سے دور ایک عشرتگاہ تعمیر کی تھی) کی یہ ساری پُرتکلف دنیا ایسے ایسے مسائل کی طرف متوجہ ہوئی جنہیں ان کی زندگی سے دُور کا تعلق بھی نہ تھا۔ ان کی مثال فاقہ زدہ انسانوں کی تھی۔ جو کھانے کے سوا اور کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالتے یعنی جس چیز سے محروم ہیں۔ وہی ان کے لئے دلچسپی کا باعث ہے +

جب اُس بوڑھے فلسفی۔ ڈرامہ نویس۔ مورخ اور ناولسٹ یعنی والٹیر[1] نے جو تمام دینی اور سیاسی بندشوں اور جفا کاریوں کا دشمن تھا۔ اس نظام حکومت اور مروجہ تمدن کو اپنی نکتہ چینی کا ہدف بنا لیا۔ تو فرانس کے گوشے گوشے سے تحسین کا غلغلہ بلند ہُوا۔ اُس کے ڈرامے اس قدر مقبول عام ہوئے کہ تھیٹروں میں بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی تھی + ژین ژاک[2] روسو وحشی اور غیر متمدن انسان کی تعریف میں رطب اللسان ہُوا۔ اس کی پاک اور غیر ملوث فطرت کو قابل رشک بتایا۔ اور قدیم ترین وحشی انسانوں کی بے فکر اور پُرلطف زندگی کا وہ نقشہ کھینچا۔ کہ لوگوں کے منہ میں پانی بھر آیا (حالانکہ انسان قدیم کے متعلق اس کے معلومات بہت کم تھے + تعلیم اطفال کے معاملے میں اسے سند مانا جاتا ہے لیکن اس بارے میں بھی وہ بالکل کورا تھا +) اُس کے خیالات اس قدر دلپذیر ہوئے کہ فرانس بھر نے اس کی کتاب "معاہدہ[3] معاشرت" کو شوق سے پڑھا + سوسائٹی کا یہ حال تھا۔ کہ لوگ بادشاہ کو حکومت کا مرادف سمجھتے تھے۔ لیکن جب روسو نے کہا۔ کہ آؤ ہم پھر اسی مبارک زمانے کی طرف لوٹ جائیں۔ جبکہ حقیقی اختیار رعایا کے قبضے میں تھا۔ اور بادشاہ صرف رعایا کا خادم۔ تو لوگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ پھر مانٹسکیو[4] نے اپنی کتاب "مکتوبات[5] فارسی" شائع کی۔ اس کتاب میں دو معزز ایرانی سیاحوں کے فرضی خطوط جمع کئے گئے ہیں۔ جن میں فرانس کے تمدن پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ اور اُسے عیوب ونقائص سے پُر ثابت کیا گیا ہے + اس کتاب میں تمدن کا کوئی پہلو تضحیک وتمسخر سے محفوظ نہیں + بادشاہ سے لے کر اُس کے چھ سو باورچیوں میں سے کمترین باورچی تک سب کے سب تنقید کی تلوار

---

[1] Voltaire [2] Jean Jacques Rousseau [3] Social Contract

[4] Montesquieu [5] Persian letters

سے گھائل نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بکی اور دیکھتے دیکھتے اُس کے چار اڈیشن نکل گئے۔ اور جب مانٹسکیو نے "روحِ قوانین" کے نام سے ایک دوسری کتاب لکھی تو اُس کے ہزارہا خریدار پہلے ہی سے موجود تھے۔

اس کتاب میں مانٹسکیو نے فرانس کے فرسودہ نظام سے انگلستان کے اعلےٰ نظامِ حکومت کا مقابلہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ مطلق العنان بادشاہی کی بجائے ایک ایسا نظامِ حکومت رائج ہونا چاہیئے جس میں انتظام۔ قانون سازی اور عدالت کے شعبے الگ الگ قائم ہوں۔ ایک دوسرے کے ماتحت کام نہ کریں۔ پھر جب پیرس کے کتب فروش لیبریتان[1] نے اعلان کیا۔ کہ دیدرو[2]۔ والمبیرٹ[3] اور ترگو[4] اور کئی اور مصنفین مل کر ایک انسائیکلوپیڈیا شائع کرنا چاہتے ہیں جس میں تمام نئے خیالات۔ نئے علوم اور نئی معلومات جمع ہونگی۔ تو لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔

اس اہم کتاب نے لوگوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ بائیس سال کے بعد اس کی اٹھائیسویں جلد ختم ہوئی۔ فرانس کے لوگوں نے بیحد جوشِ عقیدت کے ساتھ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پولیس نے لوگوں کے جوش کو دبانا چاہا۔ لیکن یہ مشتے بعد از جنگ تھی۔ لوگ قابو سے نکل چکے تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے۔ جب تم انقلابِ فرانس کے ناول پڑھتے ہو یا کوئی ڈرامہ دیکھتے ہو۔ تو تم یہ سمجھ لیتے ہو کہ پیرس کے انقلاب کے حقیقی علمبردار کنجڑے قصاب تھے۔ جو جھونپڑیوں میں پیدا ہوئے۔ اور جنہوں نے گلیوں اور بازاروں میں پرورش پائی۔ یہ خیال حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ یہ سچ ہے کہ غربا نے انقلاب میں سب سے نمایاں حصہ لیا۔ لیکن یہ درحقیقت متوسط طبقے کے اہلِ حرفہ کی کارستانیوں کا نتیجہ تھا۔ جنہوں نے بادشاہ اور اس کے مصاحبین کی طاقت کو مٹا ڈالنے کی خاطر ان فاقہ زدوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ فی الحقیقت جن خیالات نے انقلاب کی آگ بھڑکائی۔ وہ چند طباع لوگوں کے ذہن کی پیداوار تھے۔ اوّل اوّل ان خیالات کا چرچا "عہدِ قدیم" کے دیوان خانوں میں ہوا۔ بادشاہ سلامت کے

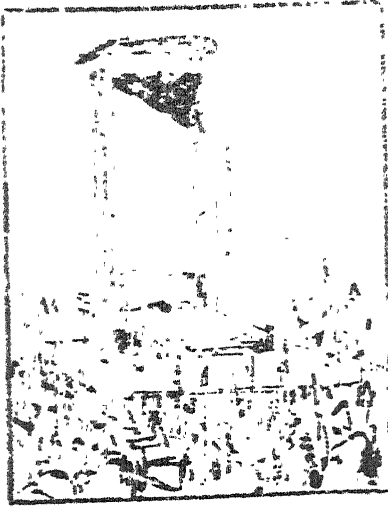
---

[1] Lebreton

[2] Diderot

[3] Alembert

[4] Turgo.



گلوٹین

[illegible] کی خواتین کی
[illegible] اتفاق [illegible] تھیں [illegible]
کی بدولت عزت و شوکت سے ان کا گذر ہوتا تھا۔
[illegible] مکان کی زیبائش سے [illegible]
دور تھے تہذیب کی [illegible] آتش زنی کی [illegible]
ایک مشغلہ سمجھ کر اس سے دل بہلاتے ہیں۔
لیکن ساخت کی عمارت خستہ ہو چکی تھی
فرش میں جا بجا دراڑیں آ گئی تھیں۔
کچھ چنگاریاں ان دراڑوں سے ہو کر
تہ خانے میں جا پہنچیں۔ جہاں مدتوں سے
کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا تھا۔ آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ اور شور و شغب کا ہنگامہ بپا ہو گیا۔ مکان کے مالک لوگوں کو دنیا جہان کے قصوں سے دلچسپی تھی۔ لیکن گھر کے انتظام سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انہیں کیا معلوم کہ آگ کیونکر بجھائی جاتی ہے شعلوں نے ساری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور جلا کر راکھ کر ڈالا۔ اس ہولناک آگ کا نام انقلاب فرانس ہے۔

اب سہولت کے خیال سے انقلاب فرانس کو دو حصوں میں تقسیم کرلو۔ پہلا دور ۱۷۸۹ء سے ۱۷۹۱ء تک ہے۔ اس زمانے میں آئینی بادشاہت قائم کرنے کی غرض سے کئی بار کم و بیش منظم کوششیں ہوئیں لیکن گوہر مراد ہاتھ نہ آیا۔ ناکامی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بادشاہ احمق تھا۔ اور اُسے کسی پر اعتماد نہ تھا۔ اور پھر بعض اتفاقات ایسے رونما ہوئے جن کے سامنے ہر شخص عاجز و درماندہ رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد ۱۷۹۲ء سے ۱۷۹۹ء تک جمہوریت قائم رہی (تاریخ عالم میں جمہوری نظام حکومت کی یہ پہلی سعی تھی) کئی سال تک بے اطمینانی کا دور دورہ رہا۔ اور اصلاح کی کئی مخلصانہ مساعی ناکام رہیں۔ اس کے بعد تشدد کا بازار گرم ہوا۔
ان دنوں فرانس پر چالیس ارب فرانک قرضہ تھا۔ خزانہ ہمیشہ خالی پڑا رہتا تھا۔ کوئی شے بھی باقی ایسی نہیں رہی تھی جس پر نئے محصول عائد کئے جاتے۔

اس زمانہ میں اور نو اور شاہ لوئی (بادشاہ سلامت کو قفل سازی میں بھی مہارت تھی - بڑے شکاری بھی تھے۔لیکن تدبیر و سیاست کے معاملے میں بالکل کورے)۔ کو بھی تھوڑا بہت احساس ہؤا۔ کہ اب ہاتھ پاؤں ہلانے چاہئیں۔ انہوں نے ترگو کو طلب فرمایا - اور وزیر مالیات کا عہدہ اُس کے سپرد کیا + این رابرٹ ژاک ترگو بیرن ڈی لولئے کی عمر کوئی ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی - وہ ان زبیندار رؤسا میں سے تھا۔جو انقلاب زمانہ سے بڑی سرعت کے ساتھ اب مٹتے چلے جا رہے تھے - ایک صوبے کا گورنر بھی رہ چکا تھا - اور تدبیر کے جوہر دکھا چکا تھا - اُسے علم سیاست مُدن کے مطالعے کا بے انتہا شوق تھا - اور اِس میں اُس نے بہت مہارت پیدا کر لی تھی - اُس بیچارے نے بھی بڑا زور مارا - لیکن ہتھیلی پر سرسوں کیسے جما لیتا۔ مُفلس کسانوں سے ٹیکس وصول کرنا تو ناممکن تھا - اب یہی ایک تدبیر رہ گئی تھی - کہ اُمرا اور پادریوں سے جن سے کبھی ایک کوڑی بھی وصول نہ ہوئی تھی روپیہ فراہم کیا جائے۔ لیکن جب ترگو نے یہ تدبیر آزمانی چاہی - تو دربار کے تمام اُمرا اِس کے درپے آزار ہوئے - اور میری آنتوانیٹ[1] بھی اسے قہر کی نظر سے دیکھنے لگی - کیونکہ اس ملکہ کے سامنے جو شخص کفایت شعاری کا نام لیتا تھا - اس پر عتاب نازل ہوتا - اب لوگ کہنے لگے کہ ترگو تو صرف خیالی پلاؤ پکاتا ہے - اُس کی باتیں عمل کے قابل نہیں - وہ سیاست دان نہیں وہ تو ایک پروفیسر ہے - جو دارالمطالعہ میں بیٹھ کر طرح طرح کے نظریے وضع کرتا رہتا ہے - چنانچہ ترگو نے تنگ آکر ۱۷۷۶ء میں استعفےٰ داخل کر دیا +

یہ "پروفیسر" مستعفی ہؤا تو ایک پختہ کار شخص اس عہدے پر متمکن ہؤا - اس کا نام نیکر[2] تھا - وہ سوئٹزرلینڈ کا باشندہ اور نہایت محنتی آدمی تھا - غلّے کی سٹہ بازی میں اُس نے خوب ہاتھ رنگے تھے - اور اب ایک بہت بڑے بنک کا حصہ دار تھا جس کی شاخیں کئی ملکوں میں پھیلی ہوئی تھیں + نیکر کی بیوی کو نام و نمود کی بہت خواہش تھی - اُس نے صرف اس خیال سے کہ میری بیٹی کسی اچھے گھرانے

---

[1] Marie Antoinetta [2] Necker

میں بیاہی جائے۔ شوہر کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ یہ لڑکی آخر
بیرن ڈی سٹیل[1] سے بیاہی گئی (جو پیرس میں سویڈن کا سفیر تھا) اور انیسویں صدی کے آغاز
میں اپنی ادبی قابلیت کی بدولت بہت نامور ہوئی +

جب نیکر نے یہ عہدہ سنبھالا۔ تو شروع
میں تزگو کی طرح بہت سرگرمی دکھائی ۱۷۸۱ء
میں بڑی چھان بین کے بعد فرانس کے
مالیات پر ایک تبصرہ شائع کیا لیکن یہ
علمی مقالہ بادشاہ سلامت کی سمجھ سے
بالاتر تھا + اُن دنوں انگریز فرانس اور
امریکہ دونو کے دشمن تھے + شاہ فرانس نے
انگریزوں سے لڑنے اور آبادکاروں کی
مدد کرنے کے لئے فوج بھیج رکھی تھی۔ اس
مہم میں خلاف توقع زرکثیر کی ضرورت پڑی
نیکر کو حکم ہُوا۔ کہ روپیہ لاؤ اُس نے روپیہ



لوئی شانزدھم

بہم پہنچانے کی بجائے مزید اعداد و شمار کے دفتر شائع کر دیئے اور کفایت شعاری
پر بیش از بیش زور دینے لگا۔ اس کے بعد وہ گنتی کے چند دن اپنے عہدے پر
قائم رہا۔ ۱۷۸۱ء میں اُسے بھی ناقابل سمجھ کر برطرف کر دیا گیا +

پروفیسر بھی گیا اور پختہ کار آدمی بھی چل دیا تو ایک نئی وضع کے ماہر مالیات
تشریف لائے جو ہر شخص سے وعدہ کر لیتے تھے کہ اگر مجھ پر بھروسہ کرو گے تو تمہارا
روپیہ ہر مہینے دگنا ہوتا رہے گا + اس شخص کا نام چارلس ایگزینڈر ڈی کالون[2] تھا۔
بڑا ہمت والا آدمی تھا۔ اور جفاکشی اور بے ایمانی دونو کی بدولت اس مرتبے کو
پہنچا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ملک پر قرض کا بڑا بھاری بوجھ ہے۔ آدمی چالاک تھا۔
ان مصیبتوں کے فوری علاج کی ترکیب یہ نکالی کہ اور کہیں سے قرضہ لے کر پرانے

---

[1] Baron de Stael. [2] deCalonne

قرضہ چکا دیے۔ یہ ترکیب جو دنیا میں اس سے پہلے بھی آزمائی جا چکی تھی۔ ہمیشہ نزول آفات کا موجب ہوتی ہے۔ اس دلچسپ وزیر مالیات نے تین سال کے اندر اندر فرانس کے قرض میں اسی کروڑ فرانک کا اضافہ کر دیا۔ لیکن ماتھے پر کبھی بل نہ آنے دیا۔ جب کبھی بادشاہ سلامت یا اُن کی حسین ملکہ (جسے عنفوانِ شباب ہی سے جب کہ وہ ابھی وی آنا میں تھی فضول خرچی کی عادت پڑ گئی تھی) روپیہ طلب کرتے وہ بلا حیل و حجت منظوری پر دستخط کر دیتا۔

آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پیرس کی پارلیمنٹ (یہ پارلیمنٹ کوئی قانون ساز مجلس نہیں بلکہ محض ایک عدالت عالیہ تھی) باوجود اپنی وفا شعاری کے اس نتیجے پر پہنچی۔ کہ اب پانی سر سے گذر چکا ہے کالون ابھی مزید آٹھ کروڑ قرضہ لینے کی فکر میں تھا۔ حالانکہ فصلیں اس سال بہت کم ہوئی تھیں۔ قحط اور افلاس کی وجہ لوگ جان بلب تھے اور یہ صاف نظر آ رہا تھا۔ کہ اگر عقل سے کام نہ لیا گیا۔ تو فرانس کا دیوالیہ نکل جائے گا۔ بادشاہ کی آنکھوں پر غفلت کی پٹی بندھی تھی۔ اُسے کیا خبر کہ حالات اب کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہُوا کہ عوام کے نمائندوں سے مشورہ کیا جائے۔ ۱۶۱۴ء سے اِن نمائندوں کی مجلس کا کوئی اجلاس نہیں ہُوا تھا۔ اب جو لوگوں نے دیکھا کہ چند دنوں میں قیامت برپا ہونے والی ہے تو انہوں نے مطالبہ کیا۔ کہ مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد کیا جائے۔ لوئی شانزدہم کسی نئے اقدام سے بہت گھبراتا تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ اس پر شورش بپا ہوئی۔ اور جب تحریک عوام میں پھیل گئی تو لوئی نے لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ۱۷۸۷ء میں فرانس کے معززین کو مشورے کے لئے طلب کیا۔ جس کا مطلب اس سے زیادہ اور کچھ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ فرانس کے سب خاندانی لوگ یکجا ہوں۔ حالات کی اصلاح کے لئے طرح طرح کی تجویزیں پیش کریں لیکن اُمرا یا پادریوں سے ٹیکس وصول کرنے کا ذکر بیچ میں نہ آئے۔ کیونکہ اس بات کی توقع فضول تھی۔ کہ ایک گروہ کسی دوسرے گروہ کے فائدے کی خاطر اپنے گلے میں اقتصادی اور سیاسی بندشوں کا پھندا ڈال لے۔ جلسے میں ۱۲۷ معززین شریک تھے۔ ان سب نے صاف کہہ دیا کہ ہم اپنے

کسی پرانے حق سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوا۔ اُدھر گرمی کو پیرس میں فاقہ زدہ لوگوں کا ہجوم شور مچا رہا تھا۔ کہ نیکر وزیر مال کے عہدے پر بحال کیا جائے۔ جب اس پر پورا اعتماد دے۔ لیکن معززین نے نہ مانا لوگ برافروختہ ہو کر کھڑکیاں توڑنے اور اسی قسم کی دوسری بیجا حرکات کرنے لگے۔ معززین بھاگ نکلے اور کالون کو برطرف کر دیا گیا۔ اب ایک اور شخص کارڈینل لومینی ڈی برییین کو وزیر مال مقرر کیا گیا۔ لیکن اس نے بھی کوئی کمال نہ دکھایا۔ بالآخر فاقہ زدہ رعایا کی دھمکیوں سے ڈر کر لوئی نے وعدہ کیا کہ جسقدر جلد قابل عمل ہوا عوام کے نمائندوں کا اجلاس کیا جائے گا۔ لیکن وعدہ مبہم تھا۔ اس لئے کسی کو تسلی نہ ہوئی ۔

اس سال ایسا کڑاکے کا جاڑا پڑا کہ تقریباً سو سال سے لوگوں نے سردی کا یہ زور شور نہ دیکھا تھا۔ فصلوں کو کچھ طوفان کچھ برف اور یخ سے بے انتہا نقصان پہنچا۔ پرووانس میں زیتون کے جتنے درخت تھے سب تباہ ہو گئے۔ بعض فیاض لوگوں نے دست کرم بڑھایا۔ لیکن ایک کروڑ اسی لاکھ فاقہ زدہ انسانوں کو کیونکر بچا سکتے تھے ہر جگہ روٹی کے لئے ہنگامے اور فساد ہوئے۔ اگلا زمانہ ہوتا تو فوجوں کی مدد سے لوگوں کو کچل ڈالتے لیکن نئے فلسفیانہ خیالات رنگ لا رہے تھے۔ لوگ یہ سمجھ چکے تھے کہ بھوک کا علاج بندوق سے نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں اب سپاہیوں پر سے بھی اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی آخر انہی فاقہ زدہ لوگوں کے بھائی بند تھے۔ ضروری تھا کہ بادشاہ کوئی نہ کوئی ایسا قدم اُٹھائے جس سے لوگ پھر اس پر اعتماد کرنے لگیں۔ لیکن بادشاہ کی یہ حالت تھی۔ کہ کسی بات کا فیصلہ ہی نہ کر سکتا تھا ۔

نئے نئے خیالات کے لوگوں نے مختلف صوبوں میں چھوٹی چھوٹی آزاد جمہوری ریاستیں قائم کر لیں۔ اور متوسط طبقے کے لوگوں میں یہ آواز سنائی دینے لگی۔ کہ جب تک ہمیں نمائندگی کا حق نہ دیا جائے ہم محصول ادا نہیں کریں گے۔ (اس واقع سے کوئی پچیس سال پہلے امریکہ کے باغیوں نے بھی یہی صدا بلند کی تھی) اور

ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ شورش فرانس بھر میں پھیل جائے گی۔ حکومت نے اس وقت تک کتابوں کی اشاعت پر سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں اب لوگوں کا جوش فرو کرنے اور بادشاہ کو اُن کی نظروں میں مقبول بنانے کے لئے یہ پابندیاں اٹھالیں۔ اُن کا اٹھنا تھا کہ ملک میں کتابوں کا طوفان امڈ آیا۔ ہر کہ ومہ نے تنقید کا قلم سنبھالا اور ہر کہ ومہ کو اس کے کچوکوں سے مجروح کیا + اس زمانے میں دو ہزار سے زیادہ پمفلٹ شائع ہوئے۔ غیظ و غضب کا طوفان لومینی ڈی بریین کو بھی بہالے گیا + نیکر کو واپس بلایا گیا تاکہ وہ اپنے مقدور کے مطابق اس ہمہ گیر اضطراب کو دور کرنے کے لئے کوئی تدبیر عمل میں لائے اُس کے آتے ہی اسٹاک کے نرخ میں تیس فیصدی کا اضافہ ہوگیا۔ آخر باہمی مشورے سے یہ طے پایا کہ لوگ کچھ دنوں صبر کریں۔ مئی ۱۷۸۹ء میں اسٹیٹس جنرل (یعنی عوام کے نمائندوں کی مجلس) کا اجلاس منعقد ہوگا ملک بھر کے دانا وہاں جمع ہونگے۔ مشکلیں سب دور ہو جائیں گی اور فرانس میں پھر امن و سکون اور عیش و مسرت کا دور دورہ ہوگا +

ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ جب ملک کے سارے عقلمند سر جوڑ کر مشورہ کرنے بیٹھیں گے تو مشکلات کی بدلیاں چھٹ جائیں گی اس خیال نے بہت نقصان پہنچایا اسٹیٹس جنرل کے اجلاس تک جتنے مہینے گذرے۔ وہ یونہی ضائع گئے۔ بعض افراد نے جو اپنے طور پر مشکلات کو رفع کرنے کے خواہاں تھے۔ ہاتھ روک لیا کیونکہ لوگوں کی نظریں اسٹیٹس جنرل کے اجلاس پر لگی ہوئی تھیں۔ اُدھر نیکر نے حکومت پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کی بجائے اُسے حالات کے مدوجزر کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ دوبارہ یہ تلخ بحث چھڑ گئی۔ کہ حکومت کی اصلاح کا کونسا طریقہ سب سے اچھا ہے۔ پولیس ہر جگہ کمزور ہو رہی تھی۔ مضافات پیرس کے باشندوں کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے لوگوں کو اشتعال دلانا اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ انہیں بھی آہستہ آہستہ اپنی قوت کا احساس ہونے لگا انہوں نے ایسا وطیرہ اختیار کیا۔ کہ اس بدنظمی کے سارے دور میں پھر اس سے قدم پیچھے نہ ہٹایا + انقلابِ فرانس کے وحشیانہ مظالم انہیں لوگوں کے کارنامے تھے + جو لوگ فی الحقیقت اس تحریک کے رہنما تھے وہ جب دیکھتے کہ ایک چیز جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوسکتی تو

مطلب برآری کے لئے انہی لوگوں کی بہیمیت سے فائدہ اٹھاتے ۔

نیکر نے کسانوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے فیصلہ کیا کہ انہیں اسٹیٹس جنرل میں دہری نمائندگی دی جائے۔ ایبے سییز[1] نے اس زمانے میں اس مسئلے پر "تھرڈ اسٹیٹ کی حقیقت" کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں اس نے ثابت کیا کہ کل اختیارات تھرڈ اسٹیٹ (متوسط طبقے کو تھرڈ اسٹیٹ کہتے تھے) کے قبضے میں ہونے چاہئیں۔ متوسط طبقے کو اس سے پہلے کوئی حیثیت



باستیل

حاصل نہیں۔ لیکن اب اس کی تلافی ہونی چاہئے ۔ گویا اس پمفلٹ نے اس گروہ کے خیالات کی ترجمانی کا حق ادا کیا جو تعداد میں دوسری جماعتوں سے زیادہ تھا۔ اور ملک کے سود و بہبود کا بہت خیال رکھتا تھا ۔

خدا خدا کرکے اسٹیٹس جنرل کا انتخاب ہوا لیکن اس میں بھی سخت مشکلیں پیش آئیں۔

---

[1] Abbe Sieyes

انتخاب ختم ہُوا تو ۳۰۸ پادریوں ۲۸۵ اُمرا اور تھرڈ اسٹیٹ کے ۶۲۱ نمائندوں نے بوریا بستر باندھ لیا اور ورسائی جانے کی تیاریاں کیں۔ متوسط طبقے کے نمائندوں نے بھی بڑی بڑی ضخیم روئدادیں تیار کر رکھی تھیں جن میں انہوں نے اپنے اپنے حلقے کے افسروں کے خلاف بہت سی شکائتیں قلمبند کر رکھی تھیں۔ اس طرح گویا وہ اسٹیج تیار ہو گیا جس پر نجاتِ فرانس کے ڈرامے کا آخری منظر بے حجاب ہونے والا تھا +

اسٹیٹس جنرل کا اجلاس ۵ رمئی ۱۷۸۹ء کو ہُوا۔ بادشاہ کا مزاج بہت برہم تھا۔ امرا اور پادریوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ کہ ہم اپنے کسی حق سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ نمائندوں کے تینوں گروہ الگ الگ کمروں میں جلسے کرکے اپنی شکائتوں کے متعلق بحث کریں + تھرڈ اسٹیٹ کے نمائندوں نے شاہی حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ٹینس کے ایک میدان میں جلد جلد جلسے کا انتظام کیا گیا + اور اسٹیٹ کے نمائندوں میں قول وقرار ہُوا کہ ہم اس معاملے میں بادشاہ کا حکم نہیں مانیں گے۔ وہ یہ چاہتے تھے۔ کہ اُمرا۔ پادری اور متوسط طبقے کے نمائندے تینوں ایک ہی اجلاس میں یکجا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ارادے کی اطلاع بادشاہ کو بھی دے دی۔ اور اس نے مجبور ہو کر اُن کی بات مان لی +

اب اسٹیٹس جنرل نے "انجمن قومی" کی شکل اختیار کرکے حکومت فرانس کے مسائل پر بحث شروع کی۔ بادشاہ پہلے تو جھنجھلایا۔ پھر کچھ ہچکچایا اور آخر صاف کہہ دیا کہ میں مطلق العنانی سے دست کش ہونے پر تیار نہیں۔ یہ کہہ کر وہ شکار کھیلنے کے لئے چلا گیا اور رنگ رلیوں میں پڑ کر ملک اور سلطنت کے سارے معاملات ذہن سے محو کر دئے۔ جب واپس آیا تو نمائندوں کے مطالبات تسلیم کر لئے۔ اس بادشاہ کی عادت میں یہ چیز داخل ہو چکی تھی کہ کوئی اچھا کام کرتا تو بے محل۔ بے موقع اور غلط طریقے پر + یوں جب لوگ "الف" مانگتے تھے۔ تو بادشاہ انہیں دھتکار دیتا اور خالی ہاتھ واپس بھیج دیتا۔ پھر جب مفلس قلاش لوگوں کا ہجوم شور مچاتا شاہی محل کو گھیر لیتا تھا۔ تو بادشاہ "الف" دینے کو تیار ہو جاتا۔ لیکن اس وقت تک معاملہ

اس حد تک بڑھ گیا ہوتا کہ لوگ "الف" کے ساتھ "ب" بھی طلب کرنے لگتے۔ وہی پہلا سوانگ ایک بار پھر رچایا جاتا اور جب بادشاہ شاہی فرمان پر دستخط کرتا اور اپنی پیاری رعایا کو "الف" اور "ب" دونو دے دیتا تو رعایا پھر پاؤں پھیلاتی۔ لوگ ایک اور مطالبہ کا اضافہ کر دیتے کہ اگر ہمیں "الف" "ب" اور "ج" تینوں نہ دیئے گئے تو ہم سارے شاہی خاندان کو تلوار کے گھاٹ اُتار دینگے۔ یہ سلسلہ اس طرح چلا اور پوری ابجد کی تختی میں سے گذرتا ہؤا بالآخر تختۂ دار پر ختم ہؤا ⁂

بادشاہ کی بدقسمتی کہ وہ ہمیشہ زمانے سے ایک قدم پیچھے رہ جاتا تھا اور پھر کبھی اسے اس غلطی کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ جب اس کا سر گلوٹین کے نیچے تھا۔ اس وقت بھی وہ یہی محسوس کر رہا تھا کہ مجھ سے بے انصافی ہوئی ہے اور رعایا نے (جس سے وہ اپنے زعم میں اپنی بساط کے مطابق بے حد محبت کرتا تھا) مجھ سے بہت بدسلوکی کی ہے ⁂

مورخ اکثر اوقات قیاس آرائیاں کیا کرتے ہیں کہ اگر یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟ لیکن میں تمہیں بار بار بتا چکا ہوں کہ تاریخ میں اس قسم کی "اگر مگر" چنداں کارآمد نہیں۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ اگر لوئی کی طبیعت اتنی نرم نہ ہوتی اور وہ محنتی زیادہ ہوتا تو اس پر آنچ نہ آنے پاتی۔ لیکن بادشاہی کی تباہی کا ذمہ وار صرف لوئی نہ تھا اگر اس میں نپولین کی سی قوت اور ہمت بھی ہوتی تو بھی زمانے کا رنگ ایسا تھا کہ اس کی زندگی اس کی بیوی کے ہاتھوں جو آسٹریا کی ملکہ میریا تھریسا کی لڑکی تھی۔ تباہ ہو جاتی ⁂ اس ملکہ نے آسٹریا کے دربار میں پرورش پائی تھی۔ اور وہاں جس قسم کی مطلق العنانی اور قدامت پسندی کا دور دورہ تھا کسی دربار میں اس کی نظیر نہیں ملتی اس لئے اُس میں وہ تمام خوبیاں اور برائیاں موجود تھیں جو قاعدے کی رو سے ایسی فضا میں پرورش پانے والی لڑکیوں میں ہونی چاہئیں ⁂

ملکہ نے تہیہ کر لیا کہ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہئے۔ اس نے انقلاب کے مقابلے میں ایک دوسرے انقلاب کا طوفان اُٹھانے کی تجویز سوچی۔ نیکر کو فوراً موقوف کر دیا گیا اور جتنی فوج اس ہنگامے میں بھی وفاداری کا دم بھرتی رہی تھی۔ اسے پیرس میں بلوا لیا گیا جب لوگوں کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے باسٹیل کے قلعے پر جس میں قیدی رکھے جاتے تھے۔ حملہ کیا اور ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو اس کی اینٹ سے اینٹ

بجا دی ۔ اس زنداں کو ہر شخص جانتا تھا ۔ اور لوگ اس سے بہت نفرت کرتے تھے ۔ پہلے اس میں صرف سیاسی قیدی رکھے جاتے تھے ۔ لیکن ان دنوں وہ پیرس کی حوالات کا کام دیتا تھا ۔ جہاں جیب کترے اور بدمعاش لوگ محبوس تھے ۔ اکثر اُمرا نے سمجھ لیا کہ اب خیر نہیں ۔ چنانچہ جونہی باستیل پر حملہ ہوًا ۔ وہ فرانس کو خیرباد کہہ کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے ۔ لیکن بادشاہ سلامت حسب عادت پھر بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے ۔ جس وقت باستیل تباہ ہوًا ۔ وہ شکار کھیل رہے تھے ۔ شکار میں انہوں نے کئی ہرن مارے تھے ۔ اس لئے بہت خوش ہوئے ۔

اب نیشنل اسمبلی نے کام شروع کیا ۔ لیکن اس طرح کہ ادھر اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا اور ادھر پیرس کے لوگوں نے شور و غل برپا کر رکھا تھا ۔ ۴ر اگست کو اسمبلی نے اُمرا اور پادریوں کی تمام مراعات چھین لیں ۔ ۲۷ر اگست کو "انسانی حقوق" کا اعلان ہوًا ۔ جو گویا فرانس کے اولین دستور کی تمہید تھا ۔ لیکن با اینہمہ حکومت کو ابھی تک کان نہ ہوئے تھے ۔ اکثر لوگوں کو شبہ تھا کہ بادشاہ اب بھی اصلاحات کے رستے میں روڑا اٹکانے کی کوشش کر رہا ہے ۔ ۵ر اکتوبر کو پھر پیرس میں فساد کی آگ بھڑکی ۔ لیکن اب کے اِس آگ کے شُعلے ورسائی تک جا پہنچے ۔ اور لوگوں نے بادشاہ کو مجبور کر دیا ۔ کہ وہ ورسائی چھوڑ کر پیرس آ رہے ۔ کیونکہ جب تک وہ ورسائی میں تھا لوگوں کو اس کی طرف سے خدشہ لگا رہتا تھا ۔ وہ تو اُسے اپنی زیر نگرانی رکھنا پسند کرتے تھے ۔ تاکہ جو خط اس کی طرف سے اس کے رشتہ داروں کے نام وی آنا ۔ میڈرڈ یا یورپ کے دوسرے درباروں میں بھیجے جائیں ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جا سکے ۔

ادھر اسمبلی میں میراؔبو[۱] جو امیر طبقے کا رکن ہونے کے باوجود تھرڈ اسٹیٹ کا رہنما بن گیا تھا ۔ بدنظمی کو فرو کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا ۔ لیکن ابھی وہ بادشاہ کی حفاظت کی تدبیریں ہی سوچ رہا تھا ۔ کہ ۲ر اپریل ۱۷۹۱ء کو اس کا انتقال ہو گیا ۔ بادشاہ کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے ۔ اِس نے ۲۱ر جون کو پیرس سے

ؔ۱ Mirabeau

بھاگ جانے کی کوشش کی۔ لیکن ویرنزہ[1] کے گاؤں کے قریب نیشنل گارڈ کے سپاہیوں نے ایک سکے پر اس کی تصویر دیکھ کر اُسے پہچان لیا۔ اور اُسے واپس پیرس پہنچا دیا ⁂

ستمبر ۱۷۹۱ئہ میں پہلا دستور منظور ہوا۔ جس کے بعد نیشنل اسمبلی کے ارکان اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ یکم اکتوبر ۱۷۹۱ئہ کو لیجسلیٹو اسمبلی کا اجلاس ہوا تا کہ نیشنل اسمبلی نے جو کام شروع کیا تھا۔ وہ جاری رہے۔ عوام کے نمائندوں کی اس مجلس میں بہتیرے انتہا پسند انقلابی بھی تھے۔ ان میں جو سب سے زیادہ بے باک تھے وہ جماعت جیکوبن سے تعلق رکھتے تھے (یہ لوگ اپنے سیاسی جلسے جیکوبن راہبوں کی خانقاہوں میں کیا کرتے تھے) ان نوجوانوں نے جن میں اکثر اہل حرفہ تھے بڑی پُرزور تقریریں کیں۔ جو اخباروں کی طفیل برلن اور ویآنا تک پہنچیں۔ شاہِ پرشیا اور شہنشاہ آسٹریا دونوں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اپنے بھائی اور بہن کو بچانے کے لئے کچھ کرنا چاہئیے۔ اُس زمانے میں وہ پولینڈ کے حصے بخرے کرنے میں بہت مصروف تھے۔ خانہ جنگی کی بدولت پولینڈ میں ایسی بدنظمی برپا ہوگئی تھی کہ جو سلطنت چاہتی اس کے ایک دو صوبے ہضم کر لیتی تھی۔ ان مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے جوں توں کر کے فرانس پر حملہ کرنے اور بادشاہ کو چھڑانے کے لئے فوج بھیج دی ⁂

اب سارے فرانس میں خوف اور سراسیمگی کی ہوا چلی۔ فاقے اور دکھ سہہ سہہ کر سالہا سال سے لوگوں کے دلوں میں نفرت کی جو آگ سُلگ رہی تھی وہ اب بھڑکی۔ پیرس کے ہجوم نے ٹیولریز کے قصر شاہی کا محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ کی وفادار باڈی گارڈ نے اپنے آقا کو بچانے کی کوشش کی۔ لیکن جب ہجوم پسپا ہونے لگا۔ تو لوئی نے جو کبھی کوئی فیصلہ نہ کر سکتا تھا۔ حکم دیا۔ کہ گولی چلانا بند کر دیا جائے۔ لوگ ادنےٰ قسم کی شراب کے نشے میں مدہوش تھے پھر شوروغُل اور خون نے انہیں بدمست کر رکھا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر پھر ان سپاہیوں پر حملہ کر دیا۔ اور ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ پھر وہ محل میں گھس آئے۔ لوئی بھاگ کر اس ایوان میں پہنچا۔ جہاں اسمبلی کے جلسے ہُوا کرتے تھے۔ لوگوں نے پیچھا کیا۔ وہیں کھڑے کھڑے اُسے معزول کر کے حراست میں لے لیا اور اسے ٹمپل کے پرانے قلعے

---

[1] Varennes

میں بھجوا دیا ۔

لیکن آسٹریا اور پرشیا کی فوجیں برابر بڑھی چلی آ رہی تھیں ۔ لوگوں کو سراسیمگی جنوں کی حد تک جا پہنچی ۔ اور عورتیں اور مرد سب کے سب وحشی درندے بن گئے ۔ ستمبر ۱۷۹۲ء کے پہلے ہفتے میں لوگوں نے جیلوں میں گھس کر سب قیدیوں کو قتل کر ڈالا ۔ حکومت چپ چاپ تماشا دیکھتی رہی ۔ جیکوبن جماعت جس کا سردار دانتوں؁ تھا ۔ جانتی تھی ۔ کہ انقلاب کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ اسی نازک مرحلے پر ہونے والا ہے ۔ اور بغاوت کو کامیاب بنانے کا صرف یہی طریقہ ہے ۔ کہ بے دریغ ظلم کیا جائے ۔ چنانچہ لیجسلیٹو اسمبلی کی بساط الٹ دی گئی اور ۲۱ ستمبر ۱۷۹۲ء کو ایک نئی نیشنل کنونشن قائم ہوئی ۔ اس جماعت کے تقریباً تمام ارکان انتہا درجے کے انقلاب پسند تھے ۔ انہوں نے بادشاہ پر باضابطہ غداری کا الزام لگا کر اُسے کنونشن کے سامنے پیش کیا ۔ جرم ثابت ہو گیا اور تین سو ساٹھ ووٹوں کے مقابلے میں تین سو اکسٹھ ووٹوں سے سزائے موت کا فتوےٰ دیدیا گیا ۔ (یہ ایک ووٹ جس کی بدولت موت کا فتوےٰ منظور ہوا ۔ لوئی کے عزیز ڈیوک آف آرلینز نے دیا تھا) ۲۱ جون ۱۷۹۳ء کو اُسے موت کی سزا دی گئی) اس موقع پر بھی وقار اور سکون کا دامن اُس کے ہاتھ سے نہ چھوٹا ۔ اس بیچارے کو معلوم ہی نہ تھا ۔ کہ یہ گولیاں کیوں چل رہی ہیں اور اتنا ہنگامہ کیونکر برپا ہوا ۔ شاہانہ وضعداری اجازت نہیں دیتی تھی ۔ کہ کسی سے اس کے متعلق سوال کرے ۔

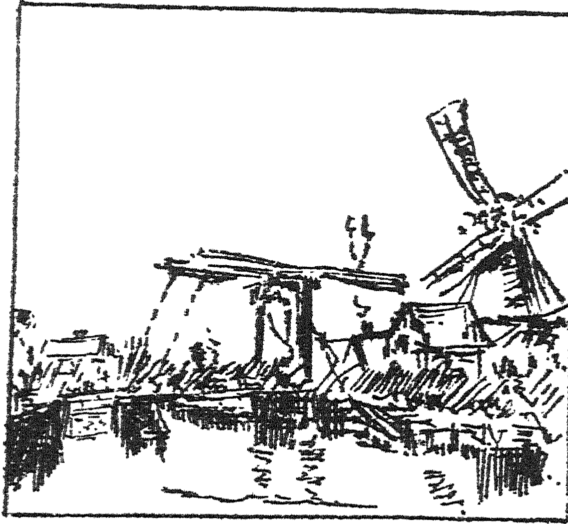
اب جیکوبن جماعت نے کنونشن کے اُن ممبروں کی طرف توجہ کی جو کسی قدر اعتدال پسند تھے ۔ یہ لوگ جیرونڈسٹ؂ کہلاتے تھے ۔ کیونکہ وہ جنوبی فرانس کے ایک علاقے جیرونڈ کے باشندے تھے ۔ ایک خاص انقلابی عدالت قائم ہوئی ۔ اور اس جماعت کے ۲۱ ارکان کے خلاف سزائے موت کا حکم سنایا گیا ۔ جو باقی بچے ۔ انہوں نے خودکشی کر لی ۔ یہ لوگ قابل اور دیانتدار تھے ۔ لیکن ان پر فلسفے کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا ۔ اور طبیعتوں میں اس قدر اعتدال تھا ۔ کہ اُس مار دھاڑ کے زمانے میں ان کا زندہ بچنا مشکل تھا ۔

اکتوبر ۱۷۹۳ء میں جیکوبن نے دستور و آئین کو بھی طاق پر رکھ دیا اور حکم دیا کہ جب تک

؂ Girondists   ؁ Danton

امن قائم نہیں ہوتا دستور کو معطل سمجھا جائے + سارے اختیارات ایک چھوٹی سی مجلس کے ہاتھ میں دیدیئے گئے جس کے رہنما دانتوں اور روبس پئیر[1] تھے + مذہب عیسوی اور پرانی تقویم کو بھی منسوخ کر دیا گیا ۔گویا معقولیت کا وہ زمانہ آیا جس کے متعلق طامس پین نے انقلاب امریکہ کے زمانہ میں فصاحت کے دریا بہائے تھے ۔لیکن وحشت زدگی بھی اسی دور کے ساتھ ساتھ آئی ۔سال بھر قتل کا بازار گرم رہا ۔ بُرے اور بھلے سب موت کے گھاٹ اُتر گئے ۔ اور روزانہ ستر اسّی آدمیوں کے سر قلم ہوئے +

مطلق العنانی کا وہ دور ختم ہو گیا جس میں سارے اختیارات ایک شخص یعنی بادشاہ کے قبضے میں تھے + تو اس کی جگہ ایک ایسی حکومت قائم ہوئی ۔جس میں ظلم کی تلوار معدودے چند آدمیوں کے ہاتھ میں تھی ۔جو جمہوریت کے محاسن پر اس قدر فریفتہ تھے کہ جو شخص ان کی رائے سے اختلاف رکھتا تھا ۔ اُسے بے دریغ قتل کر ڈالتے + ملک کا ملک ایک مقتل بن کر رہ گیا تھا ۔سب لوگ ایک دوسرے کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے ۔ اور کسی کو زندگی کا بھروسہ نہ تھا ۔پرانی کنونشن کے چند ارکین جو سمجھتے تھے کہ اب ان کی خیر نہیں جان کے خوف سے روبس پیر کے خلاف ہو گئے کیونکہ اس نے اپنے اکثر ساتھیوں کو بھی قتل کرا دیا تھا ۔جب کوئی مفر نظر نہ آیا تو روبس پیر نے جو اپنے سے بڑھ کر کسی کو جمہوریت کا حامی نہ سمجھتا تھا ۔خودکشی کا اقدام کیا ۔ جبڑے پر زخم آیا ۔لیکن جان تن سے نہ نکلی دشمنوں نے اس کے زخم پر پٹی



انقلاب فرانس ہالینڈ تک پہنچ گیا

---

[1] Robespierre

باندھی اور اُسے گھسیٹ کر گلوٹین کے تختے پر لے آئے جہاں اس کا سر قلم کر دیا گیا ۔

لیکن خطرہ ابھی باقی تھا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ جب تک یہ سرزمین دشمنانِ انقلاب کے وجود سے بالکل پاک نہ ہو جائے حکومت کی باگ ڈور چند اولوالعزم اور باہمت آدمیوں ہی کے ہاتھ میں رہے۔ انقلابی فوج جس کے تن پر کپڑا تھا۔ نہ پیٹ میں روٹی رائن اطالیہ۔ بلجیم اور مصر کے معرکوں میں بہت جی توڑ کر لڑی اور انقلاب کے تمام دشمنوں نے اس کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اس زمانہ میں پانچ ڈائرکٹر مقرر کئے گئے۔ جو چار سال تک فرانس پر حکومت کرتے رہے۔ پھر عنانِ اختیار ایک کامیاب جرنیل کے سپرد کی گئی جس کا نام نپولین بونا پارٹ تھا۔ یہ شخص ۱۷۹۹ء میں فرانس کا قونصل اعظم مقرر ہوا۔ اس کے بعد برابر پندرہ سال تک یورپ کی سرزمین ایسے ایسے سیاسی تجربات سے آشنا ہوئی۔ جو دنیا نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے ۔

نپولین

نپولین کی ولادت ۱۷۶۹ء میں ہوئی۔ جزیرہ کارسیکا میں ایک شہر اجاچیو[1] ہے نپولین کا باپ وہاں کا ایک ایماندار وکیل تھا۔ جس نے لیٹیزیا رامولینو[2] نامی ایک نیک عورت سے شادی کر لی تھی۔ اس لئے نپولین دراصل فرانسیسی نہیں بلکہ اطالوی تھا۔ اور اس کا وطن مالوف بحیرۂ روم کا ایک جزیرہ تھا۔ جہاں پرانے زمانے میں اہل یونان۔ اہل کارتھیج اور اہل روما باری باری آکر آباد ہو گئے تھے۔ کارسیکا سالہا سال سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ اور قریباً ۱۷۵۰ء کے بعد فرانسیسوں کے قبضے سے نکل جانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ فرانسیسی شروع شروع میں کارسیکا کو آزادی دلانے آئے تھے۔ یہاں پہنچے۔ تو منہ میں پانی بھر آیا۔ کارسیکا والوں کی حمایت کرتے کرتے خود ہی قابض بن بیٹھے۔

بیس سال کی عمر تک نپولین کارسیکا کی محبِ وطن جماعت میں شریک رہا۔ یہ جماعت آئرلینڈ کی شن فین جماعت کی مانند ایک سیاسی جماعت تھی۔ جسے فرانسیسوں سے بیحد نفرت تھی۔ اور ہمیشہ اس تاک میں لگی رہتی تھی کہ بن پڑے تو فرانس کی حکومت کا جوا اتار کر ملک کو آزاد کرائے۔ لیکن فرانس میں انقلاب ہوا۔ تو خلاف توقع اور یکایک اہل کارسیکا کی سب شکایات رفع کر دی گئیں۔ اور ان کے کل مطالبات تسلیم کر لئے گئے۔

نپولین نے بریئین[3] کے فوجی مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ فرانس کو ہی اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اور وہیں فوج میں ملازم ہو گیا۔ مادری زبان اطالوی تھی۔ اس لئے فرانسیسی زبان کا صحیح لہجہ عمر بھر نہ سیکھ سکا۔ تاہم فرانس میں آن بسا تھا۔ تو فرانسیسی ہی

---

[3] Brien [2] Letizia Ramolino [1] Ajaccio

کہلایا + آج کل قوم گال (یعنی فرانسیسی قوم) کی بہترین مثال پیش کرنی ہو۔ تو نپولین کا ہی نام لیا جاتا ہے +

نپولین کو نیز دست شخص کہنا چاہئے۔ قسمت نے صرف بیس سال کام کرنے کی مہلت دی۔ لیکن اس مختصر عرصے میں اس نے جتنی فتوحات کیں۔ جتنے میل سفر کیا۔ جتنے مربع کیلومیٹر فتح کئے۔ جتنے آدمی قتل کئے۔ جتنی اصلاحات رائج کیں اور یورپ میں جس قدر تہلکہ مچایا۔ اُس کی نظیر کسی دوسرے آدمی کی زندگی میں نہیں ملتی + حق تو یہ ہے کہ نپولین نے اسکندر اعظم اور چنگیز خاں کو بھی مات کر دیا تھا +

نپولین پستہ قد شخص تھا۔ اور بچپن میں اُس کی صحت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اُس کی ظاہری شکل وصورت سے کبھی کوئی متاثر نہیں ہوا۔ ساری عمر یہ کیفیت رہی۔ کہ جب مجبوراً کسی تقریب یا جلسے میں شامل ہوتا۔ تو ایک نہ ایک بھونڈے پن کی بات ضرور کرتا۔ وہ اُن تمام خوبیوں سے عاری تھا۔ جو خاندانی نجابت یا تمول کے طفیل حاصل ہوتی ہیں + جوانی کا بیشتر حصہ افلاس میں گزرا تھا۔ اکثر اوقات فاقہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اور چند پیسوں کی خاطر طرح طرح کے حیلے کرنے پڑے + تعلیم میں بھی اُس نے کوئی ایسے جوہر نہ دکھائے۔ پیوٹی کی اکادمی کے ایک انعامی مقابلے میں شامل ہوا۔ تو پندرھویں نمبر پر آیا۔ اور مقابلہ کرنے والوں کی کل تعداد سولہ تھی + لیکن اس نے مشکلات کی ساری زنجیریں ایک ایک کر کے توڑ ڈالیں۔ اُسے اپنی قسمت پر بھروسہ تھا۔ اور اچھی طرح جانتا تھا کہ مستقبل کے دامن نے میرے لئے اقبال اور عظمت کے موتی چھپا رکھے ہیں۔ اولوالعزمی اُس کی زندگی کا محور تھی۔ ذاتی وجاہت کا خیال اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ خطوں پر دستخط کرتا تھا۔ تو اپنے نام کے پہلے حرف "ن" کو جلی لکھتا تھا۔ وہ اس حرف کی پوجا کرتا تھا۔ اُس نے جو محل تعمیر کئے۔ وہ بہت عجلت میں تعمیر ہوئے تھے لیکن اُس کے نقش و نگار میں یہی حرف نمایاں تھا + اُس کی آرزو تھی کہ خدا کے نام کے بعد اُسی کا نام بلند ترین سمجھا جائے۔ اسی خواہش نے اُسے شہرت کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچا دیا۔ جہاں

اُس کے سوا کوئی دوسرا آدمی نہیں پہنچ سکے۔

نوجوان بونا پارٹ ابھی ملازمت کے ابتدائی مراحل ہی میں تھا۔ کہ اُسے یونان کے مشہور مورخ پلوٹارک کی کتاب "سوانح مشاہیر" پڑھنے کا شوق ہوا۔ لیکن اُس نے کبھی صدق کے اُس اونچے معیار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش نہیں کی جس کا تعین قدیم زمانے کے مشاہیر کر گئے تھے۔ وہ ان تمام خیالات اور جذبات سے عاری تھا۔ جو انسان کو دوسرے حیوانوں سے ممیز کرتے ہیں۔ وثوق سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اُس نے اپنے سوا کبھی کسی دوسرے سے محبت کی ہو۔ وہ اپنی ماں کے سامنے شائستگی سے گفتگو کرتا تھا۔ لیکن لیٹیزیا کے اوضاع واطوار بلند مرتبہ خواتین کے سے تھے۔ چنانچہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ کہ اولاد کو تابع فرمان کیونکر رکھنا چاہئے۔ اور اس سے اپنی عزت کیونکر کرانی چاہئے۔ اُسے چند سال تک اپنی حسین بیوی جوزفین سے بھی محبت رہی (جوزفین کا باپ مارٹینیک؎ کا ایک فرانسیسی افسر تھا۔ اور وہ وائیکونٹ دی بوآرنے؎ کی بیوہ تھی۔ جب اُس کے خاوند نے پرشیا والوں کے مقابلے میں شکست کھائی تھی۔ تو روبس پیر کے حکم سے اس کا سر قلم کر دیا گیا تھا) لیکن جب جوزفین کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ تو نپولین نے اُسے طلاق دے کر بعض مصلحتوں کے خیال سے شاہنشاہ آسٹریا کی لڑکی سے شادی کر لی۔

محاصرہ طولون کے زمانے میں نپولین جو ان دنوں توپخانے کا نامور افسر تھا۔ میکائیولی کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ فلورنس کے اس مدبر کا قول تھا۔ کہ اگر بدعہدی سے کوئی کام نکلتا ہو۔ تو اس میں تامل نہ کرو۔ نپولین نے ساری عمر اسی نصیحت پر عمل کیا۔ اُس کے لغت میں "شکر گزاری" کا لفظ نہ پایا جاتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُسے خود بھی کبھی دوسروں سے شکر گذاری کی اُمید نہیں ہوئی۔ دوسرے انسانوں کے دکھوں اور مصیبتوں کو دیکھ کر اُس کا دل کبھی نہ کڑھتا تھا۔ ایک دفعہ جنگی قیدیوں کے ساتھ پہلے جان بخشی کا وعدہ کیا۔ اور پھر اُنہیں قتل کر ڈالا۔ (یہ ۱۷۹۸ء کا واقعہ ہے نپولین ان دنوں مصر میں تھا)۔ شام میں اس کی فوج کے بہت سے سپاہی

؎ Martinique   ؎ deBeauharnais

زخمی ہو گئے تھے۔ جب انہیں جہاز پر نہ پہنچا سکا۔ تو انہیں وہیں چھوڑ کر خود چلا آیا۔ اور وہ بیچارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے + ڈیوک آف انگین[1] کو کورٹ مارشل کر کے سزائے موت کا حکم سنایا۔ لیکن کورٹ مارشل کے دوران میں قانون کو طاق پر رکھ دیا۔ اور من مانی کارروائیاں کیں۔ اور ڈیوک بیچارے کو محض اس لئے گولی سے مروا دیا۔ کہ خاندان بوربورن کو آئندہ کے لئے کان ہو جائیں + ایک دفعہ حکم دے دیا۔ کہ اُن جرمن افسروں کو جو اپنے ملک کی آزادی کے لئے لڑتے ہوئے گرفتار کئے جائیں۔ دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولی سے ہلاک کیا جائے۔ لیکن جب ٹائرول کا جوانمرد اینڈریس ہوفر[2] نہایت شجاعت سے لڑنے کے بعد گرفتار ہوا۔ تو اس سے معمولی غداروں کا سا سلوک کیا :

نپولین فوج کے ہر صیغے کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ لیکن طبی انتظام سے بالکل غافل رہتا تھا + اپنی وردی پر عطر کے قرابے انڈیل لیا کرتا تھا۔ تاکہ بیچارے محنت کش سپاہیوں کے پسینے کی بُو اس کی نازک طبیعت پر گراں نہ گزرے۔ غرضیکہ اس ظالم وجابر فرمانروا نے عجب شخصیت پائی تھی۔ برطانیہ کی عورتیں اپنے بچوں کو اس کا نام لے لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ اور بچے یہ دھمکی سُن کر دبک جاتے تھے۔ کہ بوناپارٹ شریر بچوں کو کھا لیتا ہے + میں اس شخصیت کے متعلق اتنی ناگوار باتیں کہہ چکا اور ابھی اَور کہنے کو تیار ہوں۔ لیکن پھر بھی مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے + کہ میں نپولین کو اتنا بُرا نہیں سمجھتا۔ جتنا کہ اُسے کہا جاتا ہے +

میری میز پر کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ میری ایک آنکھ ٹائپ رائٹر پر لگی ہے۔ اور دوسری اپنی پالتو بلّی پر جسے معلوم ہوتا ہے کاربن پیپر سے بہت محبت ہے۔ اس حالت میں میرا یہ حکم صادر کرنا کہ شہنشاہ نپولین نہایت قابل نفرت شخص تھا۔ بہت آسان ہے۔ لیکن اگر میں دریچے سے باہر سڑک پر نظر ڈالوں۔ اور گاڑیوں اور چھکڑوں کا غیر متناہی سلسلہ آ کر رُک جائے۔ طبل جنگ کی صدا سنائی دے۔ اور ایک پستہ قد انسان خستہ و شکستہ سبز وردی پہنے سپید گھوڑے پر سوار نظر آئے۔

---

[1] Engnien

[2] Andreas Hofer

اور مجھے کہا جائے کہ یہ نپولین ہے۔ تو خدا جانے میرا کیا حال ہو! مجھے یقین ہے کہ یہ منظر دیکھ کر میں اپنی کتابوں۔ اپنے گھر اور اپنی پیاری بچی اور دنیا جہان کے سارے قضیوں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو لوں۔ اور یہ نہ سوچوں کہ وہ مجھے کہاں لئے جاتا ہے۔ میرے دادا کے ساتھ یہی واقع پیش آیا۔ حالانکہ میرے دادا ایسے کوئی جوانمرد نہ تھے۔ اور ایک میرے دادا ہی پر کیا موقوف ہے۔ لاکھوں انسانوں کے آباؤ اجداد یہی حرکت کر چکے ہیں۔ اُن لوگوں کو اس کا کوئی معاوضہ نہیں ملا۔ لیکن انہیں معاوضے کی پرواہ کب تھی۔ انہوں نے خوشی خوشی اپنے بازوئے ہمت اور پائے طلب کو اس بدیسی کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اور اس کے بدلے میں یہ بدیسی اُنہیں وطن سے ہزاروں میل کے فاصلے پر لے گیا۔ جہاں وہ ادھر نزع کی حالت میں خون سے لت پت خاک پر تڑپتے تھے۔ اور نپولین اپنی سوچ میں مگن کھڑا انہیں تکتا رہتا تھا۔

اگر تم یہ پوچھو کہ اس شخص کے پاس کیا ایسا جادو تھا تو میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ صرف ایک وجہ کسی قدر سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ نپولین دنیا کا سب سے بڑا ایکٹر تھا۔ اور سرزمین یورپ اُس کی تماشا گاہ تھی۔ وہ موقع موقع کے مطابق جھٹ فیصلہ کر لیتا تھا۔ کہ تماشائیوں کو اب کونسی ادا پسند آئیگی۔ اب کون سے الفاظ مؤثر ثابت ہونگے۔ کبھی صحرائے مصر میں ابوالہول اور اہرام کی عظمت کے سائے تلے شمشیر زبان کے جوہر دکھاتا۔ کبھی اطالیہ کے مرطوب میدانوں میں اپنے ٹھٹھرتے ہوئے سپاہیوں سے خطاب کرتا۔ اور اس کے الفاظ ہمیشہ کارگر ثابت ہوتے۔ اور دل ہمیشہ اس کی مٹھی میں رہتے۔ جب زندگی کا آفتاب ڈھل چکا۔ یہ ہنگامے ختم ہو گئے۔ اور اُسے وطن سے دور وسط اوقیانوس کے ایک سنگلاخ جزیرے میں نظر بند کر دیا گیا۔ (جہاں بیماری کے عالم میں اُسے لے دے کے صرف وہاں کے انگریز گورنر کا سہارا تھا جس کی صحبت اُس کے لئے سوہان روح تھی) جب بھی تماشائیوں کی نظریں اُسی پر لگی تھیں۔

واٹرلو کی شکست کے بعد چند وفادار دوستوں کے سوا کسی شخص نے اِس جلیل القدر شہنشاہ کی صورت نہیں دیکھی۔ لیکن یورپ کے لوگ جانتے تھے۔

کہ وہ سینٹ ہلینا کے جزیرے میں زندگی کے آخری دن گزار رہا ہے۔ انہیں معلوم تھا۔ کہ انگریزی فوج شب و روز پہرہ دیتی ہے۔ اور اس سے بھی باخبر تھے۔ کہ لانگ وڈ کے فارم میں جو محافظ فوج اس کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے ایک انگریزی بیڑا اوقیانوس میں کھڑا رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا خیال دوست کے دل سے کبھی محو ہوا۔ نہ دشمن کے دل سے۔ اور جب آخرکار بیماری اور نامرادی نے اُسے دنیائے فانی کے بندھنوں سے آزاد کر دیا۔ تو دنیا کو یہی محسوس ہوتا رہا۔ کہ اس کی بے نور آنکھیں ابھی تک رہی ہیں + فرانس کی سرزمین آج بھی اس حیرت انگیز شخص کی قوت و اقتدار سے اثر پذیر ہے جس کی ہیبت سے آج سے سو سال پیشتر لوگ غش کھا کر گر پڑتے تھے۔ جس نے روس کے مقدس ترین معابد میں اپنے لشکر کے گھوڑے بندھوا دئے تھے۔ اور جو پاپائے اعظم اور شاہان زمین کو خدام بارگاہ سے زیادہ وقعت نہ دیتا تھا۔

اُس کی پوری زندگی کا صرف خاکہ بھی کھینچا جائے۔ تو کم از کم دو جلدوں میں آئیگا۔ اور اگر اُن تمام اصلاحات کا ذکر کیا جائے۔ جو حکومت فرانس میں اُس نے رائج کیں + اُس کے نافذ کردہ ان تمام قوانین کا حال لکھا جائے۔ جو یورپ کے اکثر ممالک نے اس کی نقل کر کے یکے بعد دیگرے اپنے ہاں رائج کر لئے۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں اُس کی دیگر کارفرمائیوں کی تفصیل بیان کی جائے۔ تو اس کے لئے ہزارہا صفحے درکار ہیں۔ میں یہاں چند الفاظ میں صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ اوائل میں اُسے اتنی کامیابی کیوں حاصل ہوئی۔ اور آخر میں ناکامی کا منہ کیوں دیکھنا پڑا + ۱۷۸۹ء سے ۱۸۰۴ء تک نپولین انقلاب فرانس کا رہنما تھا۔ وہ اس زمانے میں صرف شہرت اور نام نمود کے لئے مصروف پیکار نہ تھا۔ اُس نے آسٹریا اطالیہ اور انگلستان کو کئی معرکوں میں شکست دی۔ اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے سپاہیوں کو حریت۔ اخوت اور مساوات کا علمبردار سمجھتا تھا۔ وہ بادشاہوں کا دشمن تھا اور رعایا کا دوست۔

لیکن ۱۸۰۴ء میں نپولین فرانس کا شہنشاہ بن بیٹھا۔ سلطنت اِس کی موروثی ملکیت قرار پائی۔ اُس نے اپنی تاجپوشی کی رسم ادا کرنے کے لئے پاپا

پائس لہ ہفتم کو بلا بھیجا۔ کیونکہ فرانس کے مشہور بادشاہ شارلمان کی تاجپوشی کی رسم بھی ایک پوپ نے ہی ادا کی تھی۔ اور نپولین ہمیشہ شارلمان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا تھا ؁

تخت سلطنت پر متمکن ہوتے ہی یہ انقلاب پسند سردار فرمانروایان ہیسبرگ کی نقل بن کر رہ گیا۔ لیکن یہ نقل اصل سے کمتر رہی۔ اُس نے جیکوبن جماعت کی سیاسی انجمن کو جن سے خود کسب فیض کیا تھا۔ فراموش کر دیا۔ وہ اب مظلوموں کا حامی نہ رہا۔ بلکہ ظالموں کا سردار بن گیا۔ جو شخص اُس کے سامنے چون و چرا کرنے کی جرأت کرتا تھا۔ اُسے بے تامل گولی سے اڑا دیا جاتا۔ جب ۱۸۰۶ء میں رومتہ الکبریٰ کی مقدس سلطنت کے بچے کھچے آثار تاریخ کی کوڑی پر پھینک دیئے۔ اور روما کی پرانی عظمت کی یادگاریں ایک اطالوی کسان کے پوتے کے ہاتھوں برباد ہوگئیں۔ تو کسی نے آنسو نہ بہایا۔ لیکن جب نپولین کی فوجوں نے ہسپانیہ پر حملہ کر کے اس سرزمین کے باشندوں کو اس بات پر مجبور کر دیا۔ کہ وہ ایک ایسے شخص کو جس سے اُنہیں نفرت تھی۔ اپنا بادشاہ تسلیم کریں۔ اور غریب رعایا کا خون بے دریغ بہایا گیا محض اس لئے کہ انہیں اپنے قدیم بادشاہوں سے عقیدت تھی۔ تو رائے عامہ کا رُخ بدلا اور لوگ یکبارگی اس شخص کے خلاف ہو گئے۔ جو کبھی اسٹرلٹز ۲ے۔ میرنگو ۳ے۔ اور زمانہ انقلاب کے سینکڑوں معرکوں میں ناموری پیدا کر چکا تھا۔ نپولین میں اب "عہد قدیم" کی تمام قباحتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ اس لئے تھوڑے ہی عرصے میں لوگ اس سے بددل ہو گئے اور نیک اور ایماندار لوگ بھی اس سے نفرت کرنے لگے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی۔ تو انگلستان نے حسن تدبیر سے کام لے کر اس مخالفت کی رہنمائی کا کام اپنے ذمے لے لیا ؁

زمانہ انقلاب کے ہیبت ناک مظالم کا حال اخباروں میں پڑھ پڑھ کر انگریز شروع ہی سے برافروختہ تھے۔ اس سے کوئی ایک سو سال پہلے انہوں نے بھی اپنے

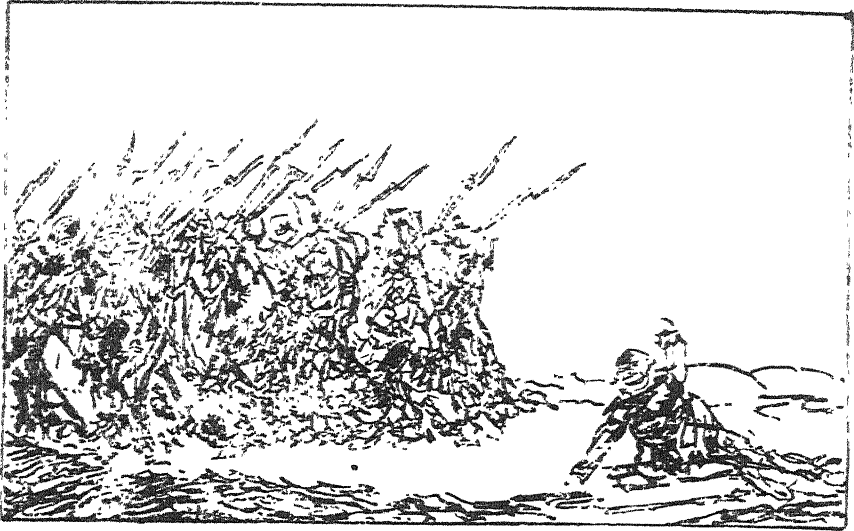
لہ Pope Puis VII ۲ے Austerlitz ۳ے Marengo

ماں انقلاب کا سوانگ رچایا تھا۔ لیکن پیرس میں جو طوفان برپا ہُوا۔ اُس کے سامنے انگلستان کے انقلاب کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ انگریز جیکوبین جماعت کے افراد کو کشتنی اور گردن زدنی سمجھتے تھے۔ اور نیپولین تو اُن کے نزدیک شیطانوں کا سردار تھا۔ چنانچہ انگلستان کا جنگی بیڑا ۱۷۹۳ء سے برابر فرانس کی راہ روکے کھڑا تھا۔ نیپولین کا ارادہ تھا۔ کہ مصر کے راستے ہندوستان پر حملہ آور ہو۔ ساحل نیل پر کئی معرکوں میں فتح حاصل کی۔ لیکن انگریزی بیڑے نے اُسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور آخر ۱۸۰۵ء میں وہ موقع بھی آپہنچا۔ جس کا انتظار انگلستان عرصے سے کر رہا تھا۔

ہسپانیہ کے جنوب مغربی ساحل پر راس ٹریفالگر کے قریب نیلسن نے نیپولین کے بیڑے کو ایسا مٹایا۔ کہ پھر اس نے اُبھرنے کا نام نہ لیا۔ اس کے بعد نیپولین کی فتحمندیوں کا دائرہ خشکی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اُس وقت بھی اگر وہ زمانے کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر سمجھ لیتا۔ کہ کیا ہونے والا ہے۔ اور جو شرائط دیگر دول یورپ کی طرف سے اُسے پیش ہو رہی تھیں۔ انہیں مان لیتا اور صلح کر لیتا۔ تو یورپ کے سارے براعظم میں اُسی کا راج ہوتا۔ لیکن اس کے آفتاب جلال کے جلوؤں نے خود اس کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔ وہ کسی کو اپنا ہمسر نہ مانتا تھا۔ اور اپنے مقابلے میں کسی کو سر اُٹھانے نہ دیتا تھا۔ بالآخر اس نے روس کو اپنی نفرت کا نشانہ بنایا۔ کیونکہ اس پُراسرار وسیع ملک میں ایسے انسانوں کی بہتات نظر آئی جن پر گولہ باری کی مشق کی جا سکتی تھی۔

جب تک روس پر کیتھرائین اعظم کے پاگل بیٹے پال اوّل کی حکومت رہی۔ وہ نیپولین کے قابو میں رہا۔ لیکن پال کی دیوانگی جب حد سے بڑھ گئی۔ تو اس کی حرکتوں نے رعایا کو برہم کر دیا۔ اور اُنہوں نے اس ڈر سے کہ کہیں یہ دیوانہ اُن سب کو جلاوطن کر کے سائبیریا کی سیسے کی کانوں میں کام کرنے کے لئے نہ بھیج دے۔ اُسے قتل کر ڈالا۔

پال کے بیٹے زار الیگزینڈر کو اپنے باپ کی طرح نیپولین سے محبت نہ تھی۔ وہ نیپولین کو بنی نوع انسان کا دشمن سمجھتا تھا۔ اور اُس کا عقیدہ تھا۔ کہ دنیا کو کارسیکا کی اس بلا سے نجات دینے کے لئے خدا نے مجھے منتخب کیا ہے۔ وہ پرشیا۔



انگلینڈ اور آسٹریا کے مقابلے میں صف آرا ہؤا۔ لیکن فتح کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہؤا۔ اُس نے پانچ بار قسمت آزمائی کی اور سوائے ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہؤا۔ ۱۸۱۲ء میں شہنشاہ پال کے آوازہ کسنے پر نپولین آگ بھبوکا ہوگیا اور قسم کھاکر کہا کہ یہ ماسکو والے جاتے کہاں ہیں۔ اب میں اپنی شرطیں منوا کر دم لونگا۔ چنانچہ جوش انتقام میں اُس نے جرمنی۔ ہالینڈ اور اٹلی سے پلٹنیں اور رسالے جبرًا منگائے اور شمال کی طرف چڑھائی کردی ٭

اس کے بعد جو کچھ ہؤا وہ سب کو معلوم ہے۔ اُس کی فوج کو اُس کے دارالسلطنت تک پہنچنے میں دو ماہ لگے۔ جب کہیں جا کے ماسکو تک پہنچا۔ اور کرم لین کے مقدس شہر کو اپنا صدر مقام بنایا۔ ۱۸۱۲ء کے ستمبر کی ۱۵ تاریخ کو رات کے وقت ماسکو سے آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ اور یہ قصبہ لگاتار چار دن تک جلتا رہا۔ پانچویں دن شام کے وقت نپولین نے واپسی کا حکم دیا۔ دو ہفتے بعد آسمان سے برف گرنے لگی۔ اور اس کے سپاہی تھکے ماندے کیچڑ میں لت پت۔ مینہ اور اولوں کے ستائے ہوئے گرتے پڑتے نومبر کی ۲۶ تاریخ کو دریائے بیرزینا تک پہنچے۔ اب

روسی بھی بڑے جوش و خروش سے حملے کرنے لگے۔ اور اُن کے ٹڈی دل لشکر نے فرانسیسی فوج کو گھیر لیا۔ فرانس والوں کی حالت اس وقت بلوائیوں کے ایک ہجوم کی سی تھی۔ اکثر مارے گئے۔ رہے سہے ستمبر کے وسط میں بُرے حالوں جرمنی کے مشرقی علاقے میں وارد ہوئے +

یہ وہ وقت تھا کہ قریب الوقوع بغاوت کی کئی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ اور یورپ کے لوگ کہہ رہے تھے کہ "اب اس بلائے جان غلامی کے جوئے کو اُتار پھینکنے کا زمانہ آ گیا ہے۔ وہ پرانی چھرے کی بندوقیں جو فرانسیسی جاسوسوں کی نظر سے اوجھل تھیں ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر قبل ازیں کہ اُن کو اصلیت معلوم ہو۔ نیپولین اپنی نئی فوج لے کر آ گیا۔ وہ اپنے ہارے ہوئے سپاہی اور برف پر چلنے والا اسباب کا چھکڑا پیچھے چھوڑ کر پیرس میں آ دھمکا۔ اور لوگوں سے کہا کہ مجھے اور سپاہی دو۔ تاکہ میں فرانس کی پاک سرزمین کو اغیار کے حملے سے بچا سکوں +

نیپولین سولہ سولہ اور سترہ سترہ سال کے لڑکوں کا لشکر لے کر اتحادیوں کے مقابلے کے لئے جانب مشرق بڑھا۔ اکتوبر کی ۱۶-۱۸ اور ۱۹ تاریخ کو تین دن تک میدانِ کارزار گرم رہا۔ تین دن تک سبز پوش اور نیلی پوش لڑکے آپس میں لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ آسٹریا کی زمین اُن کے خون سے لالہ زار بن گئی۔ ۱۷ تاریخ کو بعد از دوپہر اُسی پیدل فوج کے دستے نے جو اُسی وقت کے لئے تازہ دم تھا۔ فرانسیسی فوج کے چھکے چھڑا دئے۔ اور نیپولین میدان جنگ سے بھاگ نکلا +

میدان جنگ سے گریز کر کے نیپولین پیرس میں آیا۔ اور اپنے کمسن بیٹے کے حق میں دست بردار ہوگیا۔ مگر اتحادی بضد تھے کہ سابق بادشاہ لوئی شانزدہم کا بھائی لوئی ہیژدہم فرانس کا تاجدار بنایا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے بوربون خاندان کا سست نگاہ شہزادہ روسی اور جرمن سپاہیوں کے حلقے میں تزک اور احتشام کے ساتھ پیرس میں داخل ہُوا +

اب نیپولین کا حال سنو۔ بحیرہ روم میں ایک چھوٹا سا جزیرہ البا ہے نیپولین کو وہاں کا حاکم اور فرمانروا بنا دیا گیا۔ وہاں اُس نے اصطبل کے

ملازم چھوکروں کی ایک مختصر سے پیمانے پر فوج تیار کی۔ اور تختۂ شطرنج کو ان کا میدان حرب و پیکار بنا دیا۔

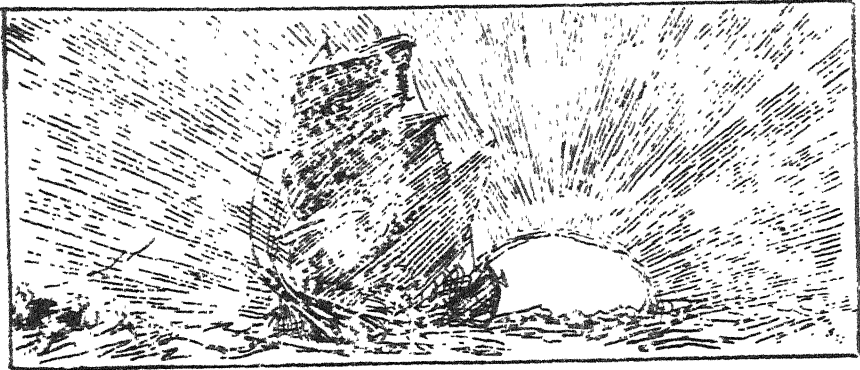
لیکن جب نیپولین فرانس سے چلا گیا۔ تو لوگوں کو اُس کی قدر معلوم ہوئی گذشتہ بیس سال کا زمانہ خواہ وہ کتنا ہی مہنگا پڑا بڑا شاندار زمانہ تھا۔ اس وقت پیرس دنیا کا دارالسلطنت سمجھا جاتا تھا۔ بوربون خاندان کے فربہ اندام بادشاہ سے جو جلا وطنی کے ایام میں بالکل بودہم رہا۔ لوگ اس کی کاہلی کی وجہ سے بہت بیزار تھے۔ یکم مارچ ۱۸۱۵ء کو جبکہ اتحادیوں کے تماشے نقشۂ یورپ سے چھپنا جھپٹی کی صورت دور کر کے اُسے پہلی اصلی حالت میں لانے کا کام شروع کرنے والے تھے۔ نیپولین نے یکایک کینیز کے قریب اپنی شکل آدکھائی۔ اور ایک ہفتہ بھی پورا نہ گذرا تھا۔ کہ فرانسیسی فوج نے بوربونوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور بے محابا جانب جنوب دوڑی۔ تاکہ اپنی سنگینیں اور تلواریں اس شخص کی نذر کرے۔ جو کبھی "چھوٹا نائیک" کہلاتا تھا۔ نیپولین نے براہ راست پیرس کی طرف کوچ کیا۔ اور ۲۰ مارچ کو وہاں پہنچ گیا۔ اب وہ آگے سے زیادہ محتاط تھا۔ اُس نے چاہا کہ صلح ہو جائے۔ مگر اتحادیوں نے نہ مانا اور لڑائی پر زور دیا۔ پھر کیا تھا۔ تمام یورپ "بے ایمان کارسیکائی" کے برخلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر شہنشاہ فی الفور اپنی فوج لے کر شمال کی طرف بڑھا۔ اُس کا منشا یہ تھا۔ کہ وہ دشمنوں کو ان کی افواج کے یکجا ہونے سے پہلے پامال کر دے۔ لیکن اب نیپولین وہ پہلا سا نیپولین نہ تھا۔ اس میں اب وہ پہلی سرگرمی نہ تھی۔ وہ جلد تھک جاتا تھا۔ ہراول کی رہنمائی کے وقت اُس پر نیند کا غلبہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اُس کے کئی وفادار اور جاں نثار جرنیل اس سے جدا ہو چکے تھے۔ اور خواب عدم میں تھے۔ جون کے آغاز میں اُس کی فوجیں بلجیم میں داخل ہوئیں۔ اور اُسی مہینے کی ۱۶ تاریخ کو اس نے پرشیا والوں کو زیر کمان بلوشر شکست دی۔ اور حکم دیا کہ جو فوج ہزیمت کھا کر پسپا ہو رہی ہے اُسے تباہ کر دیا جائے۔ لیکن اُس کا ایک نائب کماندار اس حکم کی تعمیل

نہ کرسکا +

اس واقعہ کے دو دن بعد نپولین کی مڈبھیڑ ولنگٹن سے واٹرلو کے میدان کے قریب ہوئی - یہ ۱۸ ؍ جون اور اتوار کے دن کا وقوعہ ہے - دو بجے بعد از دوپہر ایسا معلوم ہوا کہ فرانس کا پلہ بھاری ہے تین بجے مشرقی افق میں گرد کا ایک داغ سا دکھائی دیا - نپولین سمجھا کہ اُس کی کمک کو اُس کا رسالہ آرہا ہے - اور اب انگریزوں کے پاؤں یقیناً اکھڑ جائینگے - لیکن چار بجے حقیقت حال آشکارا ہوئی - اور بوڑھا بلوشر بکتا جھکتا اور کوستا ہوا ان میں آشامل ہوا - اس تصادم سے نپولین کے محافظ دستہ کی صفیں ٹوٹ گئیں - اس وقت اُس کے پاس کوئی اور محفوظ فوج نہ تھی - اس لئے وہ میدان جنگ سے رفوچکر ہوگیا - اور جاتا ہوا اپنے آدمیوں سے کہہ گیا کہ اب تم اپنی جان بچانے کی فکر کرو +

اب دوسری مرتبہ نپولین اپنے لڑکے کے حق میں دست بردار ہوا - البا سے فرار ہوکر ٹھیک تین مہینے اور دس دن کے بعد وہ جانب ساحل جا رہا تھا - وہ امریکہ جانا چاہتا تھا - لوسینا کی بستی جس کی نسبت بڑا خطرہ تھا کہ انگریز اُسے سنبھالنے والے ہیں - وہ مفت نام نہاد امریکہ کی نوعمر جمہوریت کے ہاتھ فروخت کرچکا تھا - چنانچہ اُس نے کہا کہ امریکہ والے میرے ممنون ہونگے - اور مجھے ضرور ایک مکان اور کچھ اراضی دے دینگے - تاکہ میں وہاں اپنی بقیہ زندگی امن اور چین سے بسر کروں - لیکن انگریزی جنگی بیڑا تمام فرانسیسی بندرگاہوں پر نظر جمائے ہوئے تھا - جب اتحادیوں کی افواج اور انگریزوں کے جہازوں نے ہر طرف سے گھیرا ڈال لیا - تو نپولین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے - پرشیا والے اُسے نشانۂ بندوق بنانا چاہتے تھے - ممکن تھا کہ انگریز بھی نرمی سے پیش آئیں - اُس وقت وہ راشفورٹ میں مقیم تھا - اور اس انتظار میں تھا کہ دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے - واٹرلو کے وقوعہ سے ایک ماہ کے بعد اُسے فرانسیسی حکومت کا حکم پہنچا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر فرانسیسی علاقہ سے باہر ہو جاؤ - اس زمانہ میں جارج ثالث

شاہ انگلستان پاگل تھا نے میں تھا - اُس کا ولی عہد اُس کا قائمقام تھا -
نپولین نے جو ہمیشہ غیر جنرنامک کا ایڈیٹر رہا - شہزادہ ویلز کو ایک خط لکھا -
اس کا مضمون یہ تھا کہ اب میں اپنے آپ کو اپنے دشمنوں کے رحم پر چھوڑتا
ہوں - امید ہے کہ وہ خندہ پیشانی سے مجھے اپنے دسترخوان پر جگہ دینگے -



۱۵ جولائی کو اُس نے بلیرونوز جہاز میں قدم رکھا - اور اپنی کرچ امیرالبحر
ہالتھم کے حوالہ کردی - پھر پلائی موتھ کے مقام پر اُسے اس جہاز سے اُتار کر
نارتھمبرلینڈ نامی جہاز پر سوار کرایا گیا - جو اُسے جزیرہ سینٹ ہلینا میں لے
گیا - اس جزیرے میں اُس نے اپنی زندگی کے آخری چھ سال بسر کئے - یہاں
اُس نے اپنی سوانح عمری لکھنے کی کوشش کی - اپنے محافظوں سے جھگڑا کیا
اور ہمیشہ گذشتہ زندگی کے خواب دیکھتا رہا +

عجیب بات یہ ہے کہ اُس نے بہت کم سے کم تصوّر میں اپنے اصلی مرکز
روانگی کی طرف عود کیا - اسے وہ دن یاد تھے - جب وہ انقلابی لڑائیاں لڑا
تھا - اُس نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی سعی کی کہ وہ ہمیشہ آزادی - اخوت
اور مساوات کے اُن بڑے اصولوں کا صادق حامی رہا ہے - جن کو جماعت
کے خرقہ پوش سپاہیوں نے تمام دنیا میں پھیلایا - وہ سپہ سالار اور کونسل
کی حیثیت میں اپنی رفتار زندگی پر بحث کرنا پسند کرتا تھا - لیکن سلطنت
کا ذکر اُس نے شاذونادر ہی کیا - کبھی کبھی اُس کو اپنے فرزند کا خیال آتا تھا -

جو اُس کا ننھا عقاب تھا - اور جو ابؔ وائیناؔ میں اپنی ماں کے رشتہ داروں کے پاس رہتا تھا - اور جہاں اُس کے ہیبسؔ برگ کے نوعمر اقربا اُس سے وہی سلوک کرتے تھے جو لوگ غریب رشتہ داروں سے کیا کرتے ہیں - یہ وہی اقربا تھے جن کے باپ نیپولین کا نام سن کر کانپ جاتے تھے - حالت نزع میں وہ اپنی فوج کو فتح اور ظفر کی طرف لے جا رہا تھا - اُس نے حکم دیا - کہ محافظ دستہ لے کر دشمن پر حملہ کرو - اور ساتھ ہی اُس کا مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا +

اگر تم اس انوکھی سیرت کی توضیح چاہتے ہو اگر تم فی الحقیقت جاننا چاہتے ہو کہ یہ کیسے ممکن ہؤا کہ ایک شخص نے تن تنہا اس قدر لوگوں پر محض اپنی قوت ارادی کے بل پر حکومت کی - تو اُس کی سوانح عمریاں نہ پڑھو - ان کتابوں کے مصنف یا تو اُس کے دشمن تھے یا عاشق - بے شک بہت سے واقعات کا ان کتابوں سے علم ہو جائیگا - لیکن یاد رکھو کہ علم تاریخ سے اثر تاریخ زیادہ اہم ہے +

"دی ٹو گرینیڈ ییرز" یعنی دو دراز قامت سپاہی ایک گیت کا نام ہے - اس کا مصنف ایک شخص ہینؔ نامی تھا - جو عہد نیپولین کا ایک مشہور و معروف شاعر ہو گزرا ہے - لیکن اُسے موسیقی کے سانچے میں ایک جرمن نے جس کا نام شومینؔ تھا ڈھالا ہے - پس یہ گیت اُس شخص کا طبع زاد ہے - جس کی نفرت شہنشاہ سے حق بجانب تھی - تم اس گیت کو نہ پڑھنا اور صبر کرنا - ہاں جس وقت اسے کوئی اچھا راگ دان گا رہا ہو - تو ضرور سننا اُس وقت تم وہ بات جان جاؤ گے - جو ہزاروں جلدیں تمہیں نہیں بتا سکتیں +

مقدّس اتحاد

نپولین کے جزیرہ سینٹ ہلینا میں پہنچتے ہی وہ حکمران جن کے بارہا اس مکروہ "کارسیکائی" نے دانت کھٹے کئے تھے ۔ وائنا میں جمع ہوئے ۔ اور انقلاب فرانس سے جو تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں ۔ اُنہیں نیست و نابود کرنے کی کوشش کی ۔

شہنشاہی خاندان کے اراکین ۔ شہزادے ۔ نواب ۔ صوبوں کے حاکم جو صاحب خطاب نہ تھے ۔ اُن کے فوجی دبیر ۔ ملازم اور لیموں نچوڑ جن کے اشغال اس مہیب کارسیکائی کی یکایک واپسی سے وحشیانہ طور پر تہ و بالا ہو گئے تھے ۔ اپنے اپنے کام پر چلے گئے ۔ اس فتح کی تقریب میں دعوتیں ۔ ضیافتیں ۔ گارڈن پارٹیاں اور رقص و سرود

کی محفلیں ہوئیں - جن میں مردوں اور عورتوں نے مل کر حیا سوز ناچ سابقہ حکومت کے وقت کے ناچے +

تقریباً ایک پشت تک یہ سب گوشہ نشین رہے - آخر کار خطرہ دور ہو گیا - انہوں نے اپنی ہولناک مصیبتوں کے متعلق فصیح تقریریں کیں - اور توقع ظاہر کی کہ نامعقول بلوائیوں کی لوٹ مار کا پیسہ پیسہ جنہوں نے اُن کے ظلِ سبحانی کو موت کے گھاٹ اتارا - بالوں والی ٹوپیوں کی ممانعت کی - اور ورسیلز کے دربار کے گھٹنّوں کی جگہ پیرس کے رذیل لوگوں کے بے ڈھنگے پاجامے جاری کئے - ہمیں واپس ملنا چاہیئے +

تم کہو گے کہ واقعات کی اس قدر تفصیل واہیات ہے - لیکن میری عرض یہ ہے کہ وائینا کی کانگرس میں اس قسم کی کئی لغو اور واہیات باتیں ہوئیں - اور گھٹنّوں بنام لمبے پائینچوں والے پاجاموں کے مقدمہ میں مہینوں بحث جاری رہی - اور نمائندوں نے اس معاملہ میں بہ نسبت پرشیا اور سپین کے مستقبل کے تصفیہ کے مسائل کے زیادہ دلچسپی لی - پرشیا کے بادشاہ سلامت نے تو یہاں تک کیا کہ انقلاب کی ہر بات سے علانیہ نفرت اور حقارت ظاہر کرنے کو اپنے لئے ایک گھٹنّا تیار کروایا - جرمنی کے ایک اور فرماں روا نے جو اس اظہار نفرت میں کسی سے پیچھے نہ رہنا چاہتا تھا - احکام صادر کر دئے کہ لوگ وہ تمام ٹیکس جو انہوں نے فرانس کے غاصب کو ادا کئے ہیں - اپنے جائز بادشاہ کو دوبارہ ادا کریں - جو انہیں اس زمانہ میں جب وہ کارسیکائی عفریت کے رحم پر پڑے ہوئے تھے دور سے پیار کرتا تھا - اس قسم کی کئی باتیں اور یکے بعد دیگرے عظیم غلطیاں ہوئیں - جن کو بیان کرتے ہوئے انسان کا دم رُکتا ہے - اور بے اختیار منہ سے نکلتا ہے کہ خدا کے لئے کوئی یہ تو بتائے کہ کیوں لوگوں نے اس وقت اعتراض نہ کیا ؟ اس اعتراض کی ایک ہی کہی ! کوئی اعتراض کیا کرتا - ان کا دم ناک میں تھا - اور اُنکے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا - اُنہیں پروا نہ تھی کہ کیا ہو



ٹرافالگر کو روانگی

رہا ہے۔ انہیں تو دیسے کے امن کی ضرورت تھی۔ اس سے بحث نہ تھی۔ کہ حکومت کی باگ کون سنبھالتا ہے۔ اب جنگ و پیکار اور انقلاب و اصلاح کے قضیوں سے لوگوں کی طبیعتیں اکتا گئی تھیں ✦

گزشتہ صدی کے آخر پر نظر ڈالو۔ تو تمہیں اور ہی عالم نظر آئیگا۔ تمام لوگ شجر آزادی کے گرد حلقہ باندھے ناچتے دکھائی دینگے۔ شاہزادے اپنے باورچیوں سے گلے مل رہے ہیں۔ نواب زادیاں اپنے ملازموں کے ساتھ ناچ رہی ہیں۔ اس بات پر سب کا ایمان تھا۔ کہ اس گند اور معصیت کی دنیا میں اخوت و مساوات کا مبارک عہد لوٹ آنے کو ہے لیکن افسوس کہ اس خواب کی تعبیر الٹی نکلی انقلابی افسروں کی حالت یہ تھی کہ دس بارہ گندے اور میلے کچیلے سپاہی ساتھ لئے اُن کے ہاں آتے۔ اور شب باش ہوتے۔ جب واپس پیرس جاتے تو سونے اور چاندی کے ظروف بھی چرا کر ساتھ لے جاتے۔ پیرس پہنچ کر یہی افسر حکومت کو اطلاع دیتے۔ کہ ہم نے اللہ کے نیک بندوں کے سامنے جو نیا دستور پیش کیا ہے۔ اُسے سارا ملک نہایت جوش و خروش کے ساتھ سر آنکھوں پر جگہ دے رہا ہے ✦

جب ان ستم زدہ لوگوں نے سنا۔ کہ انقلاب کی بدولت پیرس میں بدامنی کی جو آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ ایک نوجوان افسر بونا پارٹ کی بدولت اب تھم گئی ہیں۔ اور نیپولین نے اپنی بندوقوں کا رُخ فسادیوں کی طرف پلٹ کے فساد کی آگ ٹھنڈی کردی ہے۔ تو اطمینان کا سانس لیا۔ اب انہیں بھی مناسب معلوم ہوا۔ کہ اس آزادی اور مساوات کی کسی قدر قطع و برید کرنی چاہیئے۔ لیکن ان کے دیکھتے ہی دیکھتے نیپولین نے جو جمہوریہ فرانس کے تین قونصلوں میں سے ایک قونصل تھا۔ پہلے تو اپنے دو رفقائے کار کو بیدخل کر دیا۔ اور پھر فرانس کا شہنشاہ بن بیٹھا۔ اس مُلک میں آج تک جتنے فرمانروا گزرے تھے۔ بونا پارٹ ان سب سے زیادہ حُزرس تھا۔ اس لئے غریب رعایا کو اس کی وجہ سے طرح طرح کی مصیبتیں اٹھانی اور قسم قسم کی قربانیاں کرنی پڑیں۔ رحم کا اُس کے دل میں گزر نہ تھا۔ وہ نوجوانوں کو بہلا پھسلا کر فوج میں بھرتی کر لیتا تھا۔ اور لڑکیوں کو اپنے جرنیلوں کے ساتھ بیاہ دیتا تھا۔ وہ لوگوں کے ہاں سے تصویریں اور

مجسمے اٹھا کر لے جاتا تھا - اور ان سے اپنے عجائب خانے سجاتا تھا - اُس نے سارے یورپ کو میدانِ جنگ بنا دیا جس میں پوری ایک نسل تلوار کے گھاٹ اتر گئی +
اب نپولین بھی جا چکا تھا - اور چند پیشہ ور سپاہیوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگوں کو صرف ایک دُھن لگی تھی - وہ صرف اتنا چاہتے تھے - کہ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے + کچھ دنوں کے لئے تو انہیں حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کا موقع دیا گیا اور حکام شہر انہی کے مشورے سے منتخب ہونے لگے لیکن حکومت کا یہ طریقہ بے حد ناکام ثابت ہؤا - نئے حکام ناتجربہ کار اور فضول خرچ ثابت ہوئے - اور جب لوگ اُن سے مایوس ہو گئے - تو انہوں نے پرانی بادشاہت کے نمائندوں کی طرف رخ کیا - اور اُن سے کہنے لگے - تم جس طرح پہلے ہم پر حکومت کیا کرتے تھے - اسی طرح اب پھر حکومت کی باگ سنبھال لو - صرف ہمیں اتنا بتا دو - کہ تم ہم سے محصول کتنا لو گے - باقی ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دو - کیونکہ آزادی کے دورنے ہمیں جو نقصان پہنچایا ہے - ہم اُس کی تلافی کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں +
آرام و امن کی آرزو ہر دل میں جاگزیں تھی - جن لوگوں نے وی آنا کی کانگریس کا سوانگ رچایا تھا - ان کی کوشش یہی تھی - کہ کس طرح یہ آرزو پوری ہو جائے - مقدس اتحاد اسی کانگریس کا نتیجہ تھا - اس کی رو سے پولیس کے سنتری حکومت کے اہم ترین عہدہ دار بن گئے - اور جو لوگ سرکار کے کسی فعل میں مین میخ نکالنے کی جرأت کرتے تھے - انہیں شدید سزا کا مستوجب قرار دیا گیا +
اس طرح یورپ میں امن و سکون تو قائم ہو گیا - لیکن یہ امن و سکون گورستان کا امن و سکون تھا +
وی آنا کی کانگریس میں تین آدمی بہت پیش پیش تھے - اُن میں ایک تو الگزنڈر زار روس تھا - دوسرا میٹرنخ[1] جو آسٹریا کے ہیبسبرگ خاندان کا نمائندہ تھا - اور تیسرا ٹیلی راں[2] جو کبھی آتون[3] کا اُسقف رہ چکا تھا - اس شخص نے کئی لیل و نہار دیکھے تھے - اور محض اپنی دانائی اور چالاکی کی بدولت فرانسیسی حکومت کے

ف۱ Matternich ف۲ Talleyrand ف۳ Autun



وہ بھوت جس سے مقدس اتحاد خوف زدہ تھا

مختلف تغیرات میں زندہ رہا تھا۔ وہ اب آسٹریا کے پایہ تخت وی آنا میں اس غرض سے آیا تھا۔ کہ نیپولین کی لوٹ مار سے جو کچھ باقی بچا ہے۔ اُسے کسی طرح اپنے ملک کے لئے محفوظ کرلے۔ اُسے اپنی سُبکی اور خفت کا احساس کبھی نہ ہوتا تھا۔ وی آنا کی کانگرس میں وہ ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے آیا۔ لیکن اس ضیافت سے متمتع اس قدر ہُوا۔ گویا صرف اسی کو بلایا گیا تھا۔ وہ تھوڑے ہی عرصے میں میرِ مجلس بن گیا۔ اُس نے اپنے دلکش طور طریقوں سے سب کا دل موہ لیا۔ اور گفتار کے وہ جوہر دکھائے کہ لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے +

وی آنا پہنچ کر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اُس نے تاڑ لیا کہ اتحادی دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک طرف روس ہے۔ جو پولینڈ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور پرشیا اُس کا ساتھ دے رہا ہے۔ کیونکہ اس کا دانت سیکسنی پر ہے۔ دوسری جانب انگلستان اور آسٹریا ہیں۔ جو اس کوشش میں مصروف ہیں۔ کہ پرشیا اور روس اس تر نوالے سے محروم ہو جائیں۔ کیونکہ اگر روس یا پرشیا کو یورپ میں اقتدار حاصل ہو جاتا۔ تو اس سے آسٹریا اور انگلستان کے مقاصد کو نقصان پہنچنا یقینی تھا۔ ٹیلی راں اس موقع پر نہایت ہوشیاری سے دو رُخی چالیں چلا۔ یہ اُسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کہ یورپ بھر کو دس سال تک شاہی افسروں کے ہاتھوں جو مصیبتیں بھگتنی پڑیں۔ اُن سے فرانس کم از کم بچ گیا۔ اس مسئلے پر بحث شروع کی۔ تو کہا۔ اہل فرانس بے قصور ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا۔ نیپولین کے حکم سے مجبور ہو کر کیا۔ لیکن نیپولین اب معزول ہو چکا ہے۔ اور لوئی ہژدہم اس کی جگہ تخت سلطنت پر متمکن ہے۔ اس لئے اب اُسے حکومت کرنے کا موقع دینا چاہئے۔ اتحادی اس بات سے خوش تو تھے۔ کہ ایک انقلاب پسند سرزمین کے تخت سلطنت پر ایک جائز اور مستحق بادشاہ متمکن نظر آئیگا۔ لیکن اُنہوں نے ٹیلی راں کی بات اس انداز سے مانی۔ گویا فرانس پر احسان کر رہے ہیں۔ اور بوربون خاندان کو بحال رکھا۔ لیکن اس خاندان نے حکومت حاصل کرنے کے بعد وہ کمالات دکھائے کہ پندرہ سال کے بعد انہیں پھر فرانس سے نکال دیا گیا +

میٹرنخ آسٹریا کا وزیر اعظم تھا۔ اور ہیپسبرگ خاندان کی خارجی سیاست کی

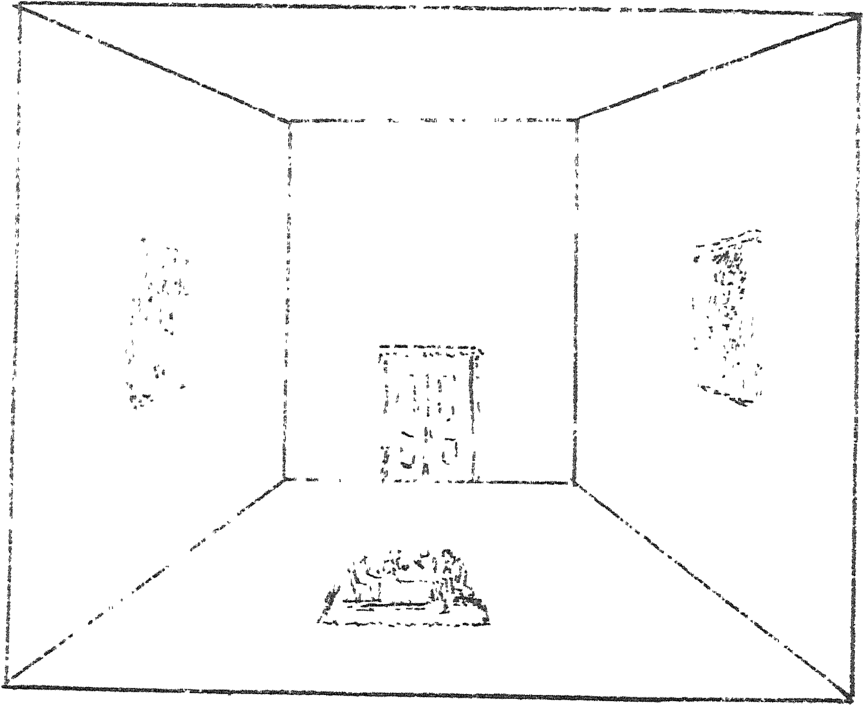
کُنجی اس کے قبضے میں تھی۔ اس کا پورا نام ونزل لوتھر پرنس آف میٹرنخ ون برگ تھا۔ اور جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ شخص گھر کا امیر اور خاندانی تھا۔ شکل وصورت کا حسین اور وجیہ تھا۔ اوضاع واطوار سے تہذیب اور شائستگی ٹپکتی تھی۔ قدرت نے بے شمار دولت کے ساتھ قابلیت کا جوہر بھی اسے عطا کیا تھا۔ لیکن جن لوگوں میں پیدا ہُوا۔ اور پروان چڑھا۔ وہ امرا لوگ تھے۔ جو جفاکش مزدوروں کی دنیا سے ہزاروں میل کے فاصلے پر عیش وراحت کے مزے لوٹتے تھے۔ اسے کیا خبر کہ شہروں کے کارخانوں اور کھیتوں میں مزدور کیونکر پسینہ بہاتے ہیں۔ اور کیا کیا مصیبتیں اٹھاتے ہیں۔ جب فرانس میں انقلاب کا طوفان رونما ہُوا۔ تو میٹرنخ کی اُٹھتی جوانی تھی۔ اور وہ سٹراسبرگ کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا (سٹراسبرگ وہی شہر ہے جس نے "مارسیلیز" یعنی فرانس کے قومی گیت کو جنم دیا) اُن دنوں یہ شہر جیکوبین جماعت کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہُوا تھا۔ میٹرنخ کو اس دور کے مصائب سب یاد تھے۔ کیونکہ انقلاب اس کی پر لُطف زندگی میں بہت بُری طرح خلل انداز ہُوا تھا۔ اکثر عہدے نالائق اور نااہل شہریوں کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔ اور لوگوں نے آغاز انقلاب کی رسم اس طرح منائی تھی۔ کہ بہت سے بے گناہ لوگوں کو بیدردانہ موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ تاہم جب خستہ حال فوجیں مادروطن کی عزت پر لڑنے مرنے کی خاطر میدان جنگ کو جاتیں۔ اور عورتیں اور بچے روٹی اور پانی سے اُن کی تواضع کرتے تھے تو ان کی نگاہوں میں امید کا نور چمکتا تھا۔ یہی وہ نور تھا جو میٹرنخ کو کبھی نظر نہ آیا۔ اُسے مظالم تو دکھائی دیئے لیکن اُسے اس بات کا کماحقہ احساس کبھی نہ ہُوا۔ کہ لوگوں کا جوش وخروش خلوص کی دولت سے مالامال ہے *

اس آسٹروی نوجوان کو یہ سارا ہنگامہ بہیمیت کا ایک مظاہرہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ جنگ کا قائل تھا لیکن اس طرح کہ جری اور بہادر نوجوان خوبصورت وردیاں پہنے سرسبز کھیتوں میں سے گھوڑے دوڑاتے غنیم پر یورش کرتے نظر آئیں۔ نہ یہ کہ سارا ملک ایک متعفن فوجی کیمپ کی صورت اختیار کرلے۔ اور دنیا بھر کے آوارہ اور خدائی خوار لوگ رات رات میں جرنیل بنا دیئے جائیں۔ کبھی آسٹریا کے کسی گرینڈ ڈیوک کے ہاں ضیافت ہوتی۔ اور وہاں اُسے فرانسیسی مدبروں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ تو وہ ان سے کہا کرتا۔

دیکھو تو سہی تمہارے اِن بلند اور اعلےٰ خیالات کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ تم آزادی مساوات اور اخوت چاہتے تھے۔ اور ان کے عوض تمہیں نپولین ملا۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا۔ کہ اپنی پہلی حالت پر ہی قناعت کرتے۔ پھر وہ استقلال حکومت کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرتا۔ اور اس بات پر زور دیتا۔ کہ یاد کرنے کے قابل وہی دن ہیں جب ملک میں جنگ وجدال کا وجود نہ تھا۔ اور کسی شخص کے ذہن میں یہ بیہودہ خیال نہ سمایا تھا۔ کہ سب انسان ایک جیسے ہیں۔ اُسے خود اس بات پر پورا یقین تھا۔ اور چونکہ قدرت نے اسے قابلیت کے جوہر اور زبردست قوت ارادی سے مالا مال کر رکھا تھا۔ اور وہ دوسروں کو ترغیب دے کر اپنا ہم خیال بنا لینے پر بھی بیحد قدرت رکھتا تھا۔ اس لئے اُس کا شمار انقلابی عقائد کے سب سے بڑے دشمنوں میں ہوتا تھا۔ ۱۸۵۹ء تک زندہ رہا۔ اس لئے اس نے اپنے سیاسی عقائد کی تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ۱۸۴۸ء میں انقلاب کے طوفان کا ریلا اس کی حکمتِ عملی کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ اور یورپ بھر کے لوگ اُسے سب سے زیادہ قابلِ نفرت انسان سمجھنے لگے۔ ایک سے زیادہ مرتبہ ایسا ہوا۔ کہ لوگوں نے غصے میں آکر اس پر حملہ کر دیا اور وہ مرتے مرتے بچا۔ لیکن وہ آخری دم تک وہ اپنے عقائد پر قائم رہا +

میٹرنخ کا ایمان تھا۔ کہ لوگوں کو امن وسکون آزادی سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ امن قائم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ اسے خلق خدا کے حق میں بہترین نعمت سمجھتا تھا۔ اور انصاف تو یہ ہے۔ کہ اُسے عالمگیر امن قائم کرنے میں اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔ چالیس سال تک یعنی ۱۸۵۴ء تک جب جنگ کریمیا میں روس انگلستان، فرانس اطالیہ اور ٹرکی کی فوجیں صف آرا ہوئیں، یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں باہمی جنگ وجدال سے محترز رہیں۔ اس سے پہلے یورپ میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ کہ مسلسل چالیس سال تک امن رہا ہو +

اس کانگرس کا تیسرا رکن شاہنشاہ الیگزنڈر تھا جس نے اپنی دادی کیتھرین اعظم کے دربار میں پرورش پائی تھی۔ اس دانشمند عورت نے اُسے یہ سبق پڑھایا تھا۔ کہ روس کی عزت و وقار سب چیزوں سے افضل ہے + لیکن برعکس اس کے اُس کا اتالیق سوئٹزرلینڈ کا ایک باشندہ تھا والیٹر اور روسو کا بڑا مداح اور معتقد۔ اس سے اُس نے



دی آنا کی اصلی کانگرس

اخوت انسانی کا سبق سیکھا - چنانچہ جب ہوش سنبھالا - تو طبیعت ایک معجون مرکب بنی ہوئی تھی - وہ خود غرض ستمگار بھی تھا - اور جذبات پسند انقلابی بھی - اُس کا باپ پال اول فاتر العقل تھا - الگزنڈر نے اُس کے جیتے جی بہت ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کی تھی - نیپولین کے ساتھ جو لڑائیاں ہوئی تھیں - اُن میں اس کی ساری فوج تلوار کی گھاٹ اتر گئی تھی - پھر جب زمانے کا رُخ بدلا - تو اس کی فوج نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر فتح حاصل کی - اس پر روس کل یورپ کا نجات دہندہ بن گیا - اس مُلک کے فرمانروا یعنی زار کو دیوتاوں کے سے اوصاف کا مالک سمجھا جانے لگا - اور لوگوں نے اُمید باندھ لی - کہ اس کے ہاتھوں دنیا بہتیرے دکھوں اور مصیبتوں سے نجات حاصل کر لے گی ؏

لیکن الگزنڈر کچھ ایسا عاقل اور ہوشیار آدمی نہ تھا - نہ تو وہ ٹیلی راں اور میٹرنخ کی طرح مردم شناس تھا - اور نہ اُسے سیاسی چالوں کی بہت سمجھ تھی - وہ نخوت پسند تھا

(یہ ایک قدرتی امر تھا) لوگ جب اُسے دیکھ کر تحسین و آفرین کے پھول برساتے۔ تو وہ بہت خوش ہوتا۔ رفتہ رفتہ وہ وی آنا کی کانگرس میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بیشتر کام ٹیلی ران اور انگریزوں کے لائق نمائندہ کاسلرےؔ[1] نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ وہ میز کے گرد بیٹھے شراب کے جام چڑھاتے جاتے تھے۔ اور بحث کئے جاتے تھے روس کی، مدد کے محتاج تھے۔ اس لئے زار کی عزت اور احترام کرتے تھے۔ لیکن دل سے یہی چاہتے تھے۔ کہ وہ زیادہ دخل نہ دے چنانچہ جب اس نے اتحاد مقدس کی تجویز پیش کی۔ تو انہوں نے اُس کی تائید کی۔ تاکہ وہ اپنی ہی باتوں میں الجھا رہے اور یہ بے کھٹکے اپنا کام کرتے چلے جائیں ؛

الگزینڈر لوگوں سے میل ملاقات بڑھانے کا شائق تھا۔ دعوتوں اور پارٹیوں میں بڑے اشتیاق سے شامل ہوتا۔ اور ایسے موقعوں پر ہمیشہ بہت شگفتہ اور مسرور نظر آتا۔ لیکن اس کے کردار میں ایک اور بات بھی تھی۔ اُسے اپنی زندگی میں بعض چیزیں ایسی پیش آئی تھیں۔ جو اُسے بھلائے نہ بھولتی تھیں۔ اسے ۲۳ مارچ ۱۸۰۱ء کی رات یاد تھی۔ وہ سینٹ پیٹرز برگ کے قصر سینٹ مائیکل میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ کہ کب میرا باپ تخت سلطنت سے دست بردار ہوتا ہے۔ لیکن جب شرابی افسر بادشاہ سے دست برداری کے اعلان پر دستخط کرانے گئے تھے اور اعلان اس کے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ تو بادشاہ نے صاف انکار کر دیا تھا افسروں نے طیش میں آکر رومال سے اس کا گلا گھونٹ کر اُسے مار ڈالا تھا۔ اس کے بعد وہ نچلی منزل میں الگزینڈر کے پاس پہنچے تھے۔ اور اُسے یہ خبر سنائی تھی۔ کہ آپ سارے روس کے شہنشاہ بن گئے ہیں ؛

زار بہت ذکی الحس آدمی تھا۔ یہ خوفناک رات کبھی اس کی یاد سے محو نہ ہوئی تھی۔ وہ ان فرانسیسی فلسفیوں کے عقائد سے روشناس ہو چکا تھا۔ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ بلکہ عقل انسانی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ لیکن صرف عقل اُسے کوئی تسکین نہ دے سکتی تھی۔ اب اُسے عجیب و غریب آوازیں سنائی دینے لگیں۔

---

[1] Castlereagh

طرح طرح کی چیزیں نظر آتیں۔ اُس نے ضمیر کی ملامت سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور زہد و تقوے کا رستہ اختیار کیا۔ پُراسرار اور نامعلوم چیزوں کی کشش تھیبس اور بابل کے مندروں کی طرح پرانی ہے۔ زار نے بھی اس کشش کو محسوس کیا اور معرفت اور تصوف کی طرح مائل ہوا ٭

ہنگامہ انقلاب نے جذبات میں جو طوفان بپا کر دیا تھا اس نے اس زمانے کی سیرت پر حیرت انگیز اثر ڈالا تھا۔ بیس سال تک خوف و بیم اور فکر و تشویش کی زندگی بسر کرنے سے لوگوں کی حالت یہ ہو گئی تھی۔ کہ دروازے کی گھنٹی بجتی۔ تو تھرا اُٹھتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی ان کے بیٹے کے مرنے کی خبر سنانے نہ آیا ہو۔ اخوت اور آزادی کے متعلق جو کہاوتیں اور فقرے زبان زد خاص و عام تھے۔ اب وہ مصیبت زدہ کسانوں کو بالکل کھوکھلے اور بے معنی معلوم ہوتے تھے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے۔ جب کبھی ان کے سامنے کوئی نئی چیز پیش کی جاتی۔ تو وہ اسے اس خیال سے قبول کر لیتے۔ کہ شاید اسی کی بدولت زندگی کی ہولناک مصیبتوں کا کوئی علاج مل جائے۔ اس زمانے میں بہتیرے دجّال پیدا ہو گئے تھے۔ جو اپنے آپ کو پیغمبر کہتے تھے۔ اور ایک عجیب و غریب عقیدے کی تعلیم دیتے تھے۔ جو دراصل انجیل کی کتاب مکاشفہ کے بعض غیر معروف حصوں سے اخذ کیا گیا تھا۔ مصیبت نے لوگوں کی حالت پتلی کر دی تھی۔ اس لئے وہ آسانی سے اُن کے جال میں پھنس گئے ٭

انگلینڈ اس قسم کے بہتیرے ساحروں سے مل چکا تھا۔ ۱۸۱۴ء میں اُسے اطلاع ملی۔ کہ ایک نبیہ پیدا ہوئی ہے۔ جو لوگوں سے کہتی ہے۔ کہ قیامت جلد آنے والی ہے۔ توبہ کرو۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔ اس عورت کا نام بیرونس فان[1] کروڈنر تھا۔ روس کی رہنے والی تھی۔ اس کی عمر کیا تھی۔ اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس کے چال چلن کے متعلق بھی عجیب و غریب قصے مشہور تھے۔ اس کا شوہر شہنشاہ پال کے زمانے کا ایک روسی مدبر تھا۔ اس نے اپنے شوہر کا روپیہ بھی بے دریغ لٹایا۔ اور اپنی بدکاریوں سے اس کے نام کو بھی بٹہ لگایا۔ اوباشی اور بدکاری کی زندگی نے اس کے اعصاب پر اثر ڈالا۔ اور کچھ

---

[1] Von Krudener

دنوں تک اُس کا دماغ بھی مختل رہا۔ پھر اپنے ایک عزیز دوست کو آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا۔ اس واقعہ نے زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ عیش و عشرت سے طبیعت متنفر ہو گئی۔ ایک مقدس موروی راہب نے سامنے جو کسی زمانے میں اس کے جوتے بنایا کرتا تھا اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔ (یہ شخص اُس قدیم مصلح جان ہُس کا پیرو تھا جسے مُلحدانہ خیالات کی پاداش میں کانسٹنس کی کونسل نے ۱۴۱۵ء میں زندہ جلا دیا تھا)

اس کے بعد بیرونس پورے دس سال تک جرمنی میں رہی اور بالخصوص بادشاہوں اور شہزادوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ یورپ کے نجات دہندہ الگزینڈر کو بھی اپنی غلطیوں کا یقین دلا دے۔ الگزینڈر کی زندگی اس درجہ المناک تھی کہ جو شخص بھی اس کے پاس اُمید کا پیغام لے کر آتا۔ وہ اُسی کی بات سننے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ بیرونس کو شرف باریابی حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ۴ جون ۱۸۱۵ء کو شہنشاہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی تو الگزینڈر انجیل پڑھ رہا تھا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اُس نے الگزینڈر سے کیا کہا۔ البتہ جب تین گھنٹے کی بحث کے بعد اُس کے خیمے سے باہر نکلی۔ تو الگزینڈر آنسوؤں کے سیلاب میں غرق تھا۔ اور قسم کھا کر کہہ رہا تھا کہ میری روح نے تسکین حاصل کر لی ہے۔ اُس دن سے بیرونس ہمیشہ اُس کے ساتھ رہی۔ اور مذہبی معاملات میں اس کی ہدایت کرتی رہی۔ وہ پیرس گیا۔ تو وہ ساتھ تھی۔ اور جب وہ آنا آیا۔ تب بھی اس کے ہمراہ تھی۔ الگزینڈر کو رقص سے جو وقت ملتا تھا۔ وہ کروڈنر کے ہاں دعا مانگنے میں صرف ہوتا تھا۔

تم پوچھو گے کہ آخر تم اس قصے کو اس طرح پھیلا کر کیوں بیان کر رہے ہو۔ کیا انیسویں صدی کی معاشرتی تبدیلیاں ایک فاترالعقل عورت کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں؟ یہ صحیح ہے کہ انیسویں صدی کی معاشرتی تبدیلیاں بوجوہ بہت اہم ہیں۔ لیکن ایسی کتابیں بہتیری پڑی ہیں۔ جن میں ان کا تذکرہ بالتفصیل کیا گیا ہے۔ میں اس کتاب میں مختصر واقعات ہی نہیں بیان کرنا چاہتا۔ بلکہ تمہیں کچھ اور باتیں بھی سکھانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم تاریخی واقعات پر بالکل خالی الذہن ہو کر نظر ڈالو۔ صرف اتنا پڑھ لینے سے کہ فلاں فلاں واقعات فلاں وقت فلاں مقام پر ہوئے تمہاری پیاس نہیں بجھنی چاہیے

تمہیں بروقتے ہیں پوشیدہ ہستی اور سبب تلاش کرنا چاہیئے۔ اپنے گردوپیش کو اچھی طرح سمجھنے کا یہی طریقہ ہے۔ اسی کی بدولت تم دوسروں کی مدد بھی کرسکو گے اور سچ پوچھو تو دوسروں کی مدد کرنا ہی حقیقی مسرت اور اطمینان کا موجب ہوتا ہے ۔

عہدنامہ اتحاد مقدس کو اس نظر سے نہ دیکھو۔ کہ وہ ایک کاغذ کا پرزہ تھا جس پر ۱۸۱۵ء میں دستخط ہوئے۔ اور جو اب حکومت کے مسلمہ نظریں التفات سے محروم پڑا ہے۔ یہ عہدنامہ بیجان سہی لیکن اس کے اثرات زندہ ہیں۔ منرو کا اصول[1] اسی اتحاد مقدس کا نتیجہ تھا۔ اور وہ اصول یہ ہے کہ امریکہ اہل امریکہ ہی کی ملکیت ہے۔ سیاسیات عالم میں اس اصول کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے میں تمہیں یہ بتادینا مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ اتحاد مقدس کیونکر عالم وجود میں آیا۔ اور مسیحی خداترسی اور فرض شناسی کے اس مظاہرے کی تہ میں کیا اغراض پوشیدہ تھیں ۔

اتحاد مقدس دو انسانوں کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ ایک تو ایک بدقسمت سرد تھا۔ جسے کسی زمانے میں ایک دماغی صدمہ ہوا تھا۔ اور اب وہ اپنی بے قرار روح کو تسکین دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور دوسری ایک ہوس کار عورت تھی۔ جس نے اپنی زندگی عیش و عشرت میں گنوائی تھی۔ حسن اور جوانی کو خاک میں ملایا تھا۔ اور اب ایک نئے مذہب کی خود ساختہ مسیح بن کر شہرت کی آرزو کو پورا کرنا چاہتی تھی۔ اور یہ کوئی راز کی بات نہ تھی۔ کاسلرے۔ میٹرنخ اور ٹیلی راں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے۔ کہ جذبات پرست بیرونس کی قابلیت کتنی محدود ہے۔ میٹرنخ چاہتا۔ تو اسے جرمنی واپس بھیج دیتا۔ شہنشاہی پولیس کے کماندار کو چند سطریں لکھنے کی دیر تھی۔ لیکن فرانس آسٹریا اور انگلستان کو روس کی اعانت کا سہارا تھا۔ وہ الگزینڈر کو کیونکر ناراض کرسکتے تھے۔ اسلئے وہ چار و ناچار اس ہرزہ سرا عورت کی ناز برداری کرتے رہے + وہ اتحاد مقدس کو خرافات سمجھتے تھے۔ اُن کی نظروں میں اس کی وقعت پرِ کاہ جتنی بھی نہ تھی۔ لیکن جب زار نے اُس کا مسودہ جو ابھی نامکمل حالت میں تھا۔ پڑھ کر سنایا۔ تو وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اس کا ماحصل یہ تھا۔ کہ انجیل مقدس کے ارشادات کے مطابق انسانوں میں اخوت کا رشتہ

---

[1] Monroe Doctrine

قائم کیا جائے جنہوں نے اس پر دستخط کئے انہوں نے عہد کیا کہ اپنی اپنی سلطنت کے انتظام اور دوسری سلطنتوں سے سیاسی تعلقات کے بارے میں ہم دین مقدس کے اصولوں کے مطابق عمل کریں گے۔ اور وہ اصول نیکی اور امن ہیں۔ یہ اصول صرف خانہ داری کی زندگی تک ہی محدود نہ رہیں گے۔ بلکہ سیاسی کارفرمائیوں میں بھی پیش نظر رہینگے اور آئندہ اس شمع ہدایت کی روشنی میں عمل کا قدم بڑھانا ہوگا۔ کیونکہ انسان کے قائم کئے ہوئے تمام ارادوں کے استحکام اور انسانی کمزوریوں کے علاج کا یہی ایک ذریعہ ہے" انہوں نے ایک دوسرے سے یہ پیمان کیا۔ کہ ہم سب کے سب اخوت کے ایک محکم رشتے میں منسلک رہیں گے۔ اور ایک دوسرے کو اپنا ہم وطن سمجھ کر دستگیری کرینگے"۔ اس کے علاوہ بہتیری اور باتیں بھی ضبط تحریر میں آئیں۔ لیکن ان کا ماحصل یہی تھا۔ بالآخر آسٹریا کے شہنشاہ نے اتحاد مقدس کے عہد نامے پر دستخط کر دئے۔ حالانکہ وہ اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہ سکتا تھا۔ بوربون شہنشاہ نے اس پر اپنی مہر ثبت کی۔ کیونکہ وہ نیپولین کے قدیم دشمنوں کی اعانت کا محتاج تھا۔ پرشیا کے بادشاہ نے بھی اس کی تصدیق کی۔ کیونکہ وہ پرشیا کی حکومت کو وسعت دینے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اور اُسے اُمید تھی۔ کہ وہ الگزینڈر نیز یورپ کی تمام چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو جن کی ہستی روس کے رحم وکرم پر موقوف تھی۔ اپنی مدد پر آمادہ کر لیگا۔ البتہ انگلستان نے اس معاہدے پر دستخط نہ کئے۔ کیونکہ کاسلرے اسے تار عنکبوت سے زیادہ بے حقیقت سمجھتا تھا۔ پاپا نے بھی دستخط نہ کئے۔ کیونکہ وہ خود مذہبی معاملات کا اجارہ دار تھا۔ اُسے کیونکر گوارا ہو سکتا تھا۔ کہ ایک یونانی کلیسا کا پیرو اور دوسرا پراٹسٹنٹ مذہب کا نام لیوا مذہب میں دخل دیں + سلطان ترکی یوں دستخط کرنے سے قاصر رہا۔ کہ اسے اتحاد مقدس کی خبر بھی نہ ملی +

بہرحال اتنا ضرور ہوا۔ کہ یورپ کے لوگ اس معاہدے کی اہمیت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ میٹرنخ کی کوششوں سے یورپ کی چار بڑی بڑی سلطنتوں میں واقعی اتحاد قائم ہو گیا۔ اور اتحاد مقدس کے کھوکھلے الفاظ اور ترکیبوں میں یہ زور اس لئے پیدا ہوا کہ اس کی پشت پر اتحاد اربعہ کی فوجیں کھڑی تھیں۔ اور فوجیں بھی کیسی۔ لڑنے مرنے پر نیار اور جنگ وجدال پر آمادہ۔ انہوں نے اعلان کر دیا تھا۔ کہ نام نہاد آزاد خیال جماعت

کے ہاتھوں یورپ کا امن وامان مٹنے نہ پائے گا۔ کیونکہ آزاد خیال جماعت کے بھیس میں جیکوبن جماعت پوشیدہ ہے۔ جیسے اب تک یہ آس بندھی ہے۔ کہ انقلاب کا زمانہ پھر پلٹ آئیگا + ۱۸۱۲ء ۱۸۱۳ء و ۱۸۱۴ء اور ۱۸۱۵ء میں آزادی کے لئے جو بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ انہوں نے لوگوں کے دلوں میں جنگجوئی کی آگ بھڑکا رکھی تھی۔ جو اب بجھ رہی تھی + لوگ اب عہد امن کی راہ تکنے لگے + جو سپاہی جنگ کی سختیاں جھیل چکے تھے۔ وہ اب امن کے جویا تھے۔ اور بڑی حسرت سے اس کا ذکر کرتے تھے +

لیکن یہ لوگ ایسا امن نہیں چاہتے تھے۔ جو اتحاد مقدس اور یورپی سلطنتوں کی کونسل نے انہیں عطا کیا تھا۔ انہیں شک گذرا۔ کہ ہمیں دھوکا دیا گیا ہے۔ لیکن ان کی آواز بلند نہ ہونے پائی۔ یہ دھڑکا برابر لگا ہوا تھا۔ کہ پولیس کا کوئی جاسوس نہ سن لے۔ اب ردّ عمل شروع ہوا۔ اور مد کے بعد جزر کی نوبت آئی۔ یہ ردّ عمل جن لوگوں نے شروع کیا ان کی نیتیں نیک تھیں۔ اور ان کا ایمان تھا۔ کہ ہمارا طریق کار نوع بشر کی فلاح کے لئے احسن ہے۔ لیکن صرف نیک نیتی سے کیا ہوتا ہے۔ اُن کے ارادے نیک نہ ہوتے۔ جب بھی لوگوں کو اتنی ہی تکلیف ہوتی۔ لوگوں نے مفت میں دکھ اٹھائے۔ اور سیاسی ترقی کا قدم آگے نہ بڑھ سکا +

زبردست ردِّ عمل

دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی۔ کہ نئے خیالات اور عقائد کو مٹا دیا گیا۔ تو مستقل امن کا زمانہ آجائیگا۔ پولیس کے جاسوس سلطنت کے سب سے بڑے کارپرداز قرار پائے۔ اور جن لوگوں کا یہ ایمان تھا۔ کہ رعایا کو خود حکومت کرنے کا حق حاصل ہے ان سے تمام ملکوں کے قید خانے بھر دیئے گئے۔

نیپولین کی فتوحات نے جو نقصان پہنچایا۔ اس کی تلافی قریباً ناممکن تھی۔ صدیوں پرانی حدود و قیود اس طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہ گئی تھیں۔ کم و بیش چالیس شاہی خاندانوں کے محلات ویران ہو گئے تھے۔ برعکس اس کے بعض فرمانروا ایسے بھی تھے۔ جو اپنے پڑوس کی کم مایہ سلطنتوں کا خون پی کر خود فربہ و توانا ہو گئے تھے۔ سیلاب اُترنے کو اُتر گیا۔ لیکن اس کی موجیں پیچھے ہٹتے ہٹتے بھی انقلابی عقائد کا بہت سا کوڑا کرکٹ پیچھے چھوڑ گئیں۔ اُسے باہر پھینکتے تو ساری قوم کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی تاہم جو سیاسی انجینئر کانگرس کی کل چلا رہے تھے۔ اُنہوں نے بہت کچھ زور مارا۔ ان کی کوششوں کا جو نتیجہ نکلا۔ وہ ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

فرانس نے سالہا سال تک دنیا میں تہلکہ مچایا تھا۔ اس لئے لوگ اب اس ملک کے نام سے بھی خوف کھانے لگے تھے۔ بوربون خاندان نے ٹیلی ران کی وساطت سے وعدہ کیا تھا۔ کہ ہم حکومت کے فرض کو بوجہ احسن سرانجام دینگے۔ لیکن "سو دن کی بادشاہت" سے یورپ والوں کو کان ہو گئے تھے۔

وہ اس سوچ میں تھے کہ اگر نپولین پھر [illegible] ہو گا۔ اس لئے ہالینڈ میں جمہوریت کی بجائے شخصی حکومت قائم ہوئی۔ اور بلجیم اس نئی بادشاہت میں شامل کر لیا گیا۔ (سولھویں صدی میں ہالینڈیوں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کی تھی۔ اس میں بلجیم شریک نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں ہیپسبرگ خاندان نے اسے اپنے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا تھا۔ بلجیم پہلے ہسپانیہ والوں کے قبضے میں رہا۔ اور پھر آسٹریا کے ہاتھ آ گیا) یہ الحاق کسی کو مرغوب نہ ہوا۔ نہ تو شمالی ملک جہاں پروٹسٹنٹ مذہب کا سکہ چل رہا تھا۔ اس کے حامی تھے۔ اور نہ جنوبی سلطنتیں جن میں کیتھولک مذہب کا دور دورہ تھا۔ اس کے حق میں تھیں لیکن کوئی حرف اعتراض زبان پر نہ لا سکا۔ یہ طریق کار یورپ کے امن کی خاطر اختیار کیا گیا تھا۔ اور یورپ کا امن ہر چیز پر مقدم تھا ۔

پولینڈ کو بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ کیونکہ پولینڈ کا ایک شہزادہ ایڈم زار ٹوریسکی[1]۔ زار الیگزینڈر کا گہرا دوست بنا ہوا تھا۔ اور وی آنا کی کانگرس کے زمانے میں بھی برابر اس کا مشیر رہا۔ لیکن پولینڈ کو بھی روس کا ایک نیم آزاد حصہ قرار دیا گیا۔ اور الیگزینڈر اس کا بادشاہ قرار پایا۔ اس سے کوئی خوش نہ ہوا۔ طبیعتوں کا عناد بڑھا۔ اور تین مرتبہ انقلاب کا اعلان برپا ہوا ۔

ڈنمارک اخیر تک نپولین کی وفاداری کا دم بھرتا رہا تھا۔ اس لئے اُسے سخت سزا دی گئی۔ اس سے سات سال پہلے انگریزی جہازوں کا ایک بیڑہ کاٹیگاٹ[2] پہنچا تھا۔ جہاں اس نے نہ جنگ کا اعلان کیا تھا۔ نہ لوگوں کو خبردار کیا تھا۔ بلکہ ایکا ایکی کوپن ہیگن پر بم برسانے لگا تھا۔ اور ڈنمارک کے جہازوں پر قابض ہو گیا تھا۔ تاکہ نپولین کو ان کا کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے۔ وی آنا کی کانگرس ایک قدم آگے بڑھی۔ اس نے ناروے کو (جو ۱۳۹۷ء کے اتحاد کالمر[3] کے زمانے سے ڈنمارک کے ساتھ ملحق تھا) ڈنمارک کے قبضے سے نکال کر سویڈن کے بادشاہ چارلس چہاردہم کے سپرد کر دیا۔ چارلس کو تخت و تاج نپولین ہی کے طفیل ملا تھا۔

---

۱ Adam Czartoryski ۲ Kattegat ۳ Colmar

لیکن اِس نے اپنے محسن سے دغا کی - جس کے صلے میں ناروے کا ملک اس کے ہاتھ آیا۔سویڈن کا یہ بادشاہ ابتدا میں ایک فرانسیسی جرنیل تھا - اُس کا اصل نام برناڈوٹ[1] تھا - اور وہ نیپولین کے نائب کی حیثیت سے سویڈن میں آیا تھا - چونکہ ہوسٹائن گوٹورپ[2] خاندان کا آخری فرمانروا لاولد مرا تھا - اس لئے لوگوں نے برناڈوٹ کو ملک کی حکومت پیش کی - اور وہ بادشاہ بن گیا - اُس نے ۱۸۱۵ء سے ۱۸۴۴ء تک اپنے نئے وطن پر (جس کی زبان سے وہ ہمیشہ نابلد رہا) نہایت قابلیت سے حکومت کی - دانشمند آدمی تھا - اس لئے ناروے اور سویڈن دونوں ملکوں کے باشندے اُس کا احترام کرتے تھے - حالانکہ دونوں ملکوں میں تاریخی اور طبعی اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے - یہی وجہ ہے - کہ ان دونوں ملکوں کی متحدہ سلطنت کبھی کامیاب نہیں ہوئی ۱۹۰۵ء میں ناروے نے خونریزی کے بغیر نہایت امن و سکون سے اپنے ہاں آزاد سلطنت قائم کر لی - اور سویڈن نے بڑی عقلمندی یہ کی - کہ اس کے معاملات میں کوئی دخل نہ دیا - اور اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیا +

اہل اطالیہ جن پر نشاۃ ثانیہ کے زمانے سے برابر بیرونی حملے ہو رہے تھے جنرل بونا پارٹ سے لَو لگائے بیٹھے تھے - لیکن شہنشاہ نیپولین کے سلوک سے اُنہیں بہت رنج اور مایوسی ہوئی - لوگ تو یہ چاہتے تھے - کہ اطالیہ کی ایک سلطنت متحدہ قائم ہو - لیکن یہ شیرازہ رہا سہا بھی بکھر گیا - جابجا چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن گئیں - بعض علاقوں میں جمہوریت قائم ہوئی - بعض پاپائے اعظم کے مقبوضات میں شامل ہوئے - پاپائی ریاست نیپلز کو چھوڑ کر نظم و نسق کے اعتبار سے باقی تمام اطالیہ کی بدترین ریاست سمجھی جاتی تھی - وی آنا کی کانگرس نے نیپولین کی قائم کی ہوئی چند جمہوری حکومتیں تو مٹا دیں - لیکن ان کی جگہ پرانی ریاستیں پھر قائم کر دیں - جن کی حکومت خاندان ہیپسبرگ کے چند مردوں اور عورتوں کے سپرد کر دی گئی +

---

[1] Bernadotte   [2] Holstein-Gottorp

بیچارے ہسپانیوں نے نیپولین کے خلاف ایک عظیم الشان وطنی جہاد کا علم بلند کیا تھا۔ اس جنگ میں انہوں نے خوب داد شجاعت دی تھی۔ اور بیشمار شریف گھرانوں کے بیٹے اپنے بادشاہ کی خاطر تلوار کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ لیکن جب وی آنا کی کانگرس نے بادشاہ سلامت کو اپنے ملک میں مراجعت کرنے کی اجازت دی۔ تو گویا ہسپانویوں کو ایک قسم کی سزا دی۔ یہ سرکش فرمانروا جسے دنیا فرڈیننڈ ہفتم کے نام سے جانتی ہے۔ چار سال تک نیپولین کی قید میں رہا تھا۔ وہ اس زمانے میں اپنے محبوب اولیا کے مجسموں کے لئے کپڑے بُنتا رہتا۔ انقلاب کے طوفان کا ریلا ہسپانیہ کی مذہبی عدالت کو بہا لے گیا تھا۔ اور مذہبی عدالت کے مجرموں کو وحشیانہ سزائیں دینے اور اذیتیں پہنچانے کا طریقہ بھی منسوخ ہو گیا تھا۔ لیکن فرڈی ننڈ نے اپنی مراجعت کی تقریب اس طرح منائی کہ مذہبی عدالت پھر قائم کی۔ اور تعذیب وعقوبت کے پرانے طریقوں کو پھر رواج دیا۔ ہر شخص اس سے نالاں تھا۔ اس کی چار بیویاں اس سے متنفر تھیں۔ رعایا بھی اس سے نفور تھی۔ لیکن اتحاد مقدس نے اسے تخت وتاج کا حقدار سمجھ کر حکومت اس کے سپرد کر دی۔ ہسپانوی شرفا نے بہتیری کوششیں کیں۔ کہ اس بلا سے ہسپانیہ کو نجات ملے۔ اور یہاں بھی دستوری حکومت قائم ہو جائے۔ لیکن اُنہیں کامیابی نہ ہوئی۔ اُنہیں موت کی سزائیں دی گئیں۔ اور بے دریغ ان کا خون بہایا گیا +

پرتگال کا شاہی خاندان ۱۸۰۷ء میں بھاگ کر برازیل چلا گیا تھا۔ اور اس وقت سے تخت شاہی خالی پڑا تھا۔ ۱۸۰۸ء سے ۱۸۱۴ء تک جزیرہ نما آئی بیریا میں جنگ چھڑی رہی۔ اس زمانے میں پرتگال ولنگٹن کی فوجوں کے لئے سامان خورد و نوش کی فراہمی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ۱۸۱۵ء کے بعد تو یہ ملک برطانیہ کا ہی مقبوضہ علاقہ سمجھا جانے لگا۔ پھر خاندان برگنزا پرتگال کی بادشاہت پر قبضہ کرنے کے لئے پلٹا۔ ایک رکن ریو ڈی جینرو میں چھوڑ آئے۔ تاکہ وہ برازیل پر حکومت کرتا رہے + امریکہ میں صرف برازیل ہی ایسا ملک تھا۔ جہاں زیادہ عرصے تک شہنشاہی قائم رہی۔ لیکن ۱۸۸۹ء میں اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور ملک میں جمہوریت قائم ہو گئی +

مشرق میں سلافیوں اور یونانیوں کی حالت بہت خراب تھی۔ یہ دونو قومیں

جو سلطان کی رعایا تھیں چشمِ التفات سے محروم رہ گئیں۔ ۱۸۰۴ئہ میں سیاہ فام جارج نے جو سرویا کا ایک سؤر چرانے والا تھا (کیراجارج وچ خاندان کا بانی یہی شخص تھا) ترکوں کے برخلاف بغاوت کی۔ لیکن اسے شکست ہوئی۔ اور اسے ایک شخص نے جو سرویا والوں کا رہنما تھا۔ اور بظاہر سیاہ فام جارج کا دوست سمجھا جاتا تھا قتل کر ڈالا۔ چنانچہ ترک بے غل وغش بلقان پر حکومت کرتے رہے +

یونانیوں کو آزادی کی دولت سے محروم ہوئے دو ہزار سال گزر چکے تھے۔ پہلے مقدونیہ والوں کی حکومت رہی۔ پھر روما۔ وینس اور ترکی یکے بعد دیگرے فرمانروا رہے۔ انہیں اپنے ہم وطن کاپوڈسٹریا ساکن کارفو اور زار الگزینڈر کے عزیز دوست زار ٹورسکی سے بڑی امیدیں تھیں۔ لیکن وی آنا کی کانگرس کو یونان کی کیا فکر پڑی تھی۔ اُسے تو لے دے کے یہ خیال تھا۔ کہ تمام مستحق فرمانروا خواہ وہ عیسائی ہوں۔ یا مسلمان تختِ سلطنت پر متمکن رہیں۔ اس لئے یونانیوں کی دستگیری کسی نے نہ کی +

کانگرس کی سب سے آخری اور غالباً سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اُنہوں نے جرمنی سے بہت بُرا سلوک کیا + ریفارمیشن اور سی سالہ جنگ نے جرمنی خوشحالی کو تباہ کر دیا تھا۔ بلکہ اسے سیاسی کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ ملک میں ایک چھوڑ دو بادشاہتیں تھیں۔ اور ان کے علاوہ بہت سی ریاستیں تھیں جن پر چند بڑے ڈیوک اور کثیر التعداد چھوٹے چھوٹے ڈیوک راج کرتے تھے۔ ملک کے بے شمار حصے بجرے ہو چکے تھے جن پر قسم قسم کے اُمرا حکومت کرتے تھے۔ ان علاقوں کے حکمران عجیب لوگ تھے جن کی نظیر ناٹک کی نقلوں اور رسوانگ کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔ فریڈرک اعظم نے پرشیا کو قوی اور مضبوط سلطنت بنا کر جرمنی کی کایا پلٹ دی تھی لیکن جس طرزِ حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ اس کی وفات کے بعد تھوڑے ہی سالوں میں صفحۂ تاریخ سے محو ہو گئی +

نپولین نے ان چھوٹے چھوٹے ملکوں کے مطالبہ آزادی پر خطِ نسخ پھیر دیا تھا۔

---

copo d'stria ط

چنانچہ ۱۸۰۶ء کے خاتمے تک تین سو ریاستوں میں سے صرف باون باقی رہ گئی تھیں۔ جب آزادی کی عظیم الشان جدوجہد شروع ہوئی۔ تو اس قسم کے بہتیرے نوجوان سپاہی پیدا ہو گئے۔ جو اپنے باپ دادا کی سرزمین کو متحد اور طاقتور دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب تک کوئی صاحبِ ہمت رہنمائی کی باگ ہاتھ میں نہ لیتا۔ اتحاد کیونکر ہو سکتا تھا +

یورپ کے جس حصے میں جرمن زبان بولی جاتی تھی۔ اس میں پانچ بادشاہتیں قائم تھیں۔ ان میں سے دو بادشاہتیں یعنی آسٹریا اور پرشیا تو "خدا کے فضل و کرم سے" قائم ہوئی تھیں۔ اور تین بادشاہتیں ورٹمبرگ۔ بویریا اور سیکسنی نیپولین کے فضل و کرم سے وجود میں آئی تھیں۔ چونکہ یہ تینوں سلطنتیں شہنشاہ نیپولین کی حامی تھیں۔ اس لئے جرمن قوم کے لوگ انہیں خیر خواہ وطن نہیں سمجھتے تھے +

کانگرس نے جرمنی کی ایک نئی سلطنت متحدہ قائم کی۔ اس مجلس میں ۳۸ بڑی بڑی ریاستیں شامل کیں۔ جن کا صدر شاہ آسٹریا کو بنایا۔ جو اب شہنشاہ آسٹریا کہلاتا تھا۔ یہ نظام مصلحت کی بنا پر قائم ہوا تھا۔ لیکن اس سے کسی کو اطمینان نہ ہوا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ ایک جرمن قانون ساز مجلس قائم ہو گئی تھی۔ جس کے اجلاس فرنیک فرٹ کے قدیم شہر میں ہوا کرتے تھے۔ اور اِن اجلاسوں میں ایسے مسائل پر بحث ہوتی تھی۔ جو جرمنی کی تمام ریاستوں کی حکمت عملی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جنہیں سب ریاستوں کے نزدیک یکساں اہمیت حاصل تھی۔ لیکن اس مجلس کے اڑتیس ارکان کے سامنے اڑتیس مختلف مقاصد تھے۔ اور قاعدہ یہ تھا کہ جب تک متفقہ فیصلہ نہ ہو۔ اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ (ایسے ہی ایک قاعدے نے ایک زمانے میں پولینڈ کی عظیم الشان سلطنت کو تباہ کر دیا تھا) چنانچہ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جرمنی کی یہ سلطنت متحدہ سارے یورپ کے نزدیک ہنسی دل لگی کا سامان بن گئی۔ اور اس قدیم سلطنت کا وہی حال ہوا۔ جو گزشتہ صدی کے وسط میں وسط امریکہ کی سیاسیات کا تھا +

جن لوگوں نے ایک قومی نصب العین کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ وہ ندامت کے مارے زمین میں گڑے جاتے تھے۔ لیکن کانگرس کو رعایا کے جذبات سے

کیا سروکار۔ اُس نے جرمنی کے معاملے کو طے شدہ سمجھ کر اسے جوں کا توں رہنے دیا +
کیا سب کی زبانوں کو تالے لگ گئے تھے؟ ہرگز نہیں + نیپولین کے خلاف نفرت کا جو طوفان اُمڈا تھا۔ جب وہ ختم ہو چکا۔ عظیم الشان جنگ آزادی کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور لوگوں نے پوری طرح محسوس کیا۔ کہ امن اور استحکام سلطنت کے نام پر کتنا بڑا جرم کیا گیا ہے۔ تو لب شکایت کو جنبش دی۔ اور معاملہ یہاں تک بڑھا۔ کہ علانیہ بغاوت کرنے کی دھمکیاں دینے لگے۔ لیکن بیچارے بے بس تھے۔ کرتے تو کیا کرتے۔ وہ پولیس کے رحم و کرم پر تھے۔ اور اُس زمانے میں پولیس کا نظام ایسا سخت گیر اور ظالمانہ تھا۔ کہ دنیا نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا +

وی آنا کی کانگرس کے ارکان صدق دل سے اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ اگر انقلابی اصولوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا جاتا۔ تو نیپولین کو کبھی یہ نصیب نہ ہوتا۔ کہ وہ تخت سلطنت کو یوں غصب کر لیتا + وہ محسوس کرتے تھے۔ کہ فرانسیسی خیالات و عقائد کے پیروؤں کا قلع قمع کرنا ہمارا فرض ہے۔ اُن کا حال بالکل فلپ ثانی کا سا تھا۔ اس بادشاہ نے پراٹسٹنٹ مذہب کے پیروؤں کو زندہ جلا دیا۔ مور قوم کے لوگوں کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا۔ اور اسے ضمیر کا فرمان سمجھا + سولھویں صدی کے آغاز میں جو شخص پاپائے اعظم سے انحراف کرتا تھا۔ اُسے ملحد سمجھا جاتا تھا۔ اور وفادار شہریوں کا یہ فرض تھا۔ کہ ایسے شخص کو جہاں پائیں بے دریغ تہ تیغ کر ڈالیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں سب سے بڑا گنہگار اُسے سمجھا جاتا تھا۔ جو شاہ وقت اور اس کے وزرا کے احکام سے انحراف کرے۔ پہلے زمانے میں پاپا کو اور اُنیسویں صدی میں شہنشاہ کو مامور من اللہ سمجھتے تھے۔ وفادار شہریوں کا فرض تھا۔ کہ بادشاہ کے باغیوں کو فوراً پولیس کے حوالے کر دیں۔ اور سزا دلا کے چھوڑیں +

لیکن ۱۸۱۵ء میں جو لوگ حکومت پر قابض تھے۔ وہ نیپولین کی درسگاہ میں تعلیم پا کر اپنے فن میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے ۱۵۱۷ء کے ارباب حکومت کو اُن کی سی مستعدی کہاں نصیب ہو سکتی تھی۔ ۱۸۱۵ء سے ۱۸۶۰ء تک پولیس کے جاسوسوں کا دور دورہ رہا۔ جہاں دیکھو۔ جاسوس ہی جاسوس

نظر آتے تھے۔ وہ محلوں میں بھی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ذلیل سے ذلیل شراب کی دکانوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ مجلس وزرا کا جلسہ ہو رہا ہے۔ تو جاسوس تالے کے سوراخ سے جھانک رہے ہیں۔ میونسپل پارک میں لوگ بنچوں پر بیٹھے ہوا کھا رہے ہیں۔ تو جاسوس اُن کی باتوں کی سُن گُن لے رہے ہیں۔ سرحدوں پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ کہ جب تک پروانہ راہداری کی تصدیق نہ ہو جائے کسی شخص کو گزرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ جتنے پارسل ملک میں آتے تھے۔ سب کا معائنہ کیا جاتا تھا۔ تاکہ کوئی ایسی کتاب ملک میں نہ آنے پائے جس میں فرانس کے خطرناک خیالات وعقائد کا ذکر ہو۔ جاسوس طلبا میں شامل ہو کر پروفیسروں کے لکچر سنتے تھے۔ اور جو پروفیسر اُس زمانے کے نظام کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالتا۔ اُسے سزا دلاتے۔ چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں گرجا کو جاتی تھیں۔ تو وہ اُن کے پیچھے لگے رہتے تھے +

پادری لوگ جاسوسوں کی اکثر مدد کرتے۔ انقلاب کے زمانے میں کلیسا کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ گرجاؤں کے اوقاف ضبط کر لئے گئے تھے۔ کئی پادری مارے گئے تھے۔ لوگ والٹیر۔ رُوسو اور دوسرے فرانسیسی فلسفیوں کی تعلیم کی بدولت حجتیں کرنا سیکھ گئے تھے۔ اکتوبر ۱۷۹۳ء میں جب مجلس حفاظت عامہ نے خدا کی پرستش کو ممنوع قرار دیا تھا۔ تو لوگوں نے بہت خوشیاں منائی تھیں۔ اور پادریوں کو بھی کئی اور لوگوں کی طرح ترک وطن کرنا پڑا تھا۔ اتحادیوں کی فوج کو فتح و ظفر نصیب ہوئی۔ تو پادری بھی برسر اقتدار آئے۔ اور لوگوں کو خوب مزا چکھایا +

اور تو اور ۱۸۱۴ء میں یسوعی راہب بھی آ پہنچے۔ اور حسب دستور سابق نوجوانوں کو تعلیم دینے لگے۔ اس فرقہ کو کلیسیا کے مخالفوں کا مقابلہ کرنے میں بہت کامیابی ہوئی تھی۔ اس نے دنیا کے ہر حصے میں اپنے حلقے قائم کر لئے تھے۔ تاکہ لوگوں کو دین عیسوی کی برکات سے آگاہ کیا جائے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ جماعت ایک تجارتی کمپنی بن گئی۔ جو ہمیشہ حکام ملک کے معاملات میں دخل دیتی رہتی تھی۔ جب مارکوئس ڈی پومبال[1] جو بہت اصلاح پسند شخص تھا۔ پرتگال کا

---

[1] Marquis de pombal

وزیر مقرر ہوا تھا۔ تو اُس نے انہیں ملک سے نکال دیا تھا۔ اور ۱۷۷۳ء میں یورپ کی اکثر کیتھولک حکومتوں کی درخواست پر پاپا کلیمنٹ چہاردہم نے اس فرقے کو بالکل ہی دبا دیا تھا۔ لیکن اب پھر انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اور بچوں کو جائز فرمانرواؤں کی اطاعت اور محبت کی تعلیم دینے لگے۔ جب ملکہ میری آنٹوانیٹ کو زندگی کے عذاب سے نجات دینے کے لئے کشاں کشاں دار کی طرف لے جا رہے تھے۔ تو انہیں بچوں کے والدین نے یہ تماشا دیکھنے اور ملکہ کی مصیبت پر ہنسنے کے لئے دکانوں کی کھڑکیاں کرائے پر لے رکھی تھیں۔ تاکہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے وہ اس نظارے سے محروم نہ رہ جائیں ۰

لیکن پرشیا جیسے ملکوں میں جہاں پراٹسٹنٹ مذہب کا دور دورہ تھا۔ حالات بالکل رُوبہ اصلاح نہ ہوئے۔ ۱۸۱۲ء کے محب وطن رہنما۔ شاعر اور ادیب جنہوں نے لوگوں کو غاصب شہنشاہ کے خلاف جہاد مقدس کا علم بلند کرنے کی تعلیم دی تھی اب محض مفسد اور شورش پسند لوگ سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے گھروں کی تلاشی لی جاتی۔ اُن کے خط کھول کر پڑھ لئے جاتے۔ انہیں مجبور کیا جاتا۔ کہ معین اوقات پر تھانے میں جا کر اپنی نقل و حرکت کی اطلاع دیں۔ حکام فوج کے احکام و قیود کو سارے نوجوانوں پر مسلط کر دیا گیا۔ جب وارٹبرگ میں طلبا کی ایک جماعت نے اصلاح کی ہزارویں برسی منائی۔ تو حکام کو ان کی خوش فعلیوں میں بھی انقلاب کا ہوا نظر آیا تھا۔ جب دینیات کے ایک طالب علم نے جس میں دیانت زیادہ تھی۔ اور عقل کم۔ حکومت روس کے ایک جاسوس کو جو جرمنی میں کام کر رہا تھا۔ قتل کر ڈالا۔ تو تمام یونیورسٹیاں پولیس کی نگرانی میں آ گئیں۔ نہ کوئی مقدمہ چلا نہ سماعت ہوئی۔ لیکن کئی پروفیسر یا قید ہوئے۔ یا علیحدہ کر دیئے گئے ۰

انقلاب کی مخالفت میں روس نے جو سرگرمی دکھائی۔ وہ اس سے بھی زیادہ بیہودہ تھی۔ اب الگزینڈر کے سر سے نیکی اور خداترسی کا نشہ اُتر چکا تھا۔ اور وہ رفتہ رفتہ افسردگی و ملال کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ جانتا تھا۔ کہ میری قابلیت کتنی محدود ہے۔ اور اُسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ

وی آنا میں میٹرنخ اور پیرونس فان کروڈنر نے مجھے بیوقوف بنایا تھا۔ اُس نے مغرب کے معاملات سے توجہ ہٹانی شروع کی ۔ اور صحیح معنوں میں روسیوں کا فرمانروا بن گیا ۔ اور قسطنطنیہ کے قدیم اور مقدس شہر کو جس نے سلافی نسل کو سب سے پہلے علم وتہذیب کا درس دیا تھا ۔ اپنے دل میں جگہ دی جوں جوں زار کی عمر زیادہ ہوتی جاتی تھی ۔ وہ زیادہ محنت سے کام کرتا تھا۔ لیکن اس کی محنت پروان نہ چڑھنے پائی۔ وہ اپنی مطالعہ گاہ میں بیٹھا رہا ۔ اور اُس کے وزرا نے سارے روس کو ایک فوجی خیمہ گاہ بنا دیا +

یہ تصویر کسی طرح دلکش نہیں کہی جاسکتی ۔ اور میں شاید اس عظیم الشان ردِّ عمل کے حالات کو مختصر طور پر بیان کر دیتا ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں ۔ کہ اسے عہد کے حالات سے اچھی طرح آگاہ ہونا بہرحال مفید ہوگا ۔ وقت کے کاروان کو پیچھے ہٹانے کی کوششیں اس سے پہلے بھی ہو چکی ہیں ۔ لیکن ایسی تمام کوششوں کا نتیجہ نامرادی اور ناکامی کے سوا کبھی کچھ نہیں ہوا +

قومی آزادی

قومی آزادی کا جذبہ اتنا کمزور نہ تھا۔ کہ ان طریقوں سے مٹ جاتا۔ وی آنا کی کانگرس کی رجعت پسندانہ تجاویز کے خلاف سب سے پہلے جنوبی امریکہ نے سرکشی کا علم بلند کیا۔ یونان بلجیم ہسپانیہ اور براعظم یورپ کے بہتیرے اور ملکوں نے اُس کی پیروی کی۔ اور اُنیسویں صدی میں ہر طرف آزادی کی لڑائیوں کی خبریں سنائی دینے لگیں

یہ کہنا بے سود ہے۔ کہ اگر وی آنا کی کانگرس نے فلاں طریقہ اختیار کرتے کی بجائے فلاں فلاں باتیں کی ہوتیں۔ تو اُنیسویں صدی کی تاریخ یورپ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا + جو لوگ اس کانگرس میں جمع ہوئے تھے۔ وہ انقلاب کے طوفان میں سے گزر چکے تھے۔ ان کی آنکھوں نے یورپ میں بیس سال تک خون کی ندیاں بہتی دیکھی تھیں۔ وہ امن کو ترس رہے تھے۔ اور انہوں نے یہ اجلاس اس لئے منعقد کیا تھا۔ کہ اس بدنصیب سرزمین کو پھر امن نصیب ہو۔ آج کل ہم انہیں رجعت پسند کہہ لیں تو کہہ لیں۔ لیکن ان کا ایمان یہ تھا۔ کہ عوام حکومت کے قابل نہیں۔ انہوں نے یورپ کی تقسیم ازسرنو اس نیت سے کی تھی۔ کہ آئندہ کو سب تنازعات بند ہو جائیں۔ لیکن افسوس کہ انہیں اس میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ تاہم ان کی نیت نیک تھی۔ وہ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ انہیں اپنی جوانی کا پُرسکون زمانہ یاد تھا۔ اور وہ چاہتے تھے۔ کہ وہی مبارک عہد

ایک بار پھر پلٹ آئے - انہیں یہ معلوم نہ تھا - کہ انقلابی عقائد اب اہل یورپ کی رگ رگ میں سما گئے ہیں - وہ گمراہی نگر بدطینت اور کج فطرت نہ تھے پھر ان اس کا کیا علاج کہ انقلاب فرانس سے نہ صرف یورپ بلکہ امریکہ تک یہ سبق سیکھ چکا تھا - کہ ہر ملک کے باشندوں کو "اپنی قومیت قائم رکھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے" +

نپولین جس کے نزدیک کوئی چیز قابل احترام نہ تھی - قومی اور وطنی جذبات کو فنا کرنے میں بہت بے دردی سے کام لیتا تھا - لیکن انقلاب فرانس کے ابتدائی زمانے میں جن جرنیلوں کے ہاتھ میں ملک کی باگ دوڑ تھی - انہوں نے یہ اعلان کر دیا تھا - کہ قومیت کا تعلق ملکی حدود یا نسلی امتیازات سے نہیں بلکہ دل اور روح سے ہے - ادھر یہ لوگ اپنے میں قومیت کا جذبہ پیدا کر رہے تھے - اور اُدھر ہسپانیہ ہالینڈ اور اطالیہ والوں کو یہی سبق سکھا رہے تھے - یہ لوگ سب کے سب روسو کے اس عقیدے پر ایمان رکھتے تھے کہ نسل انسانی ابتدا میں اعلےٰ اوصاف کی مالک تھی - چنانچہ انھوں نے ماضی کی راکھ کو کریدا تو دیکھا - کہ منصبداری کے کھنڈروں تلے عظیم الشان قوموں کی ہڈیاں مدفون ہیں - پھر اپنے گردوپیش پر غور کیا - تو اسلاف کے مقابلے میں اپنا آپ بہت ہی حقیر معلوم ہونے لگا +

انیسویں صدی کا نصف اول اہم تاریخی انکشافات کا زمانہ تھا - ہر ملک میں محققین زمانۂ وسطیٰ کے مسودات اور کتب سیر شائع کر رہے تھے - اس کا نتیجہ یہ ہوا - کہ ہر ملک کے لوگ اپنے آبا و اجداد کی سرزمین پر فخر کرنے لگے - اس میں شک نہیں - کہ اگر تاریخی واقعات کو صحیح طریقے سے پیش کیا جاتا - تو اسلاف کے کارنامے اتنے قابل فخر معلوم نہ ہوتے لیکن عملی سیاسیات میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی - عملی سیاست کا انحصار اُنہی عقائد پر ہے - جو لوگوں میں رواج پا جائیں - خواہ وہ عقائد غلط ہوں یا صحیح اور اکثر ممالک میں کیا بادشاہ اور کیا رعایا سب کا پختہ عقیدہ یہی تھا - کہ ہمارے آبا و اجداد بڑی شہرت اور عظمت کے مالک تھے +

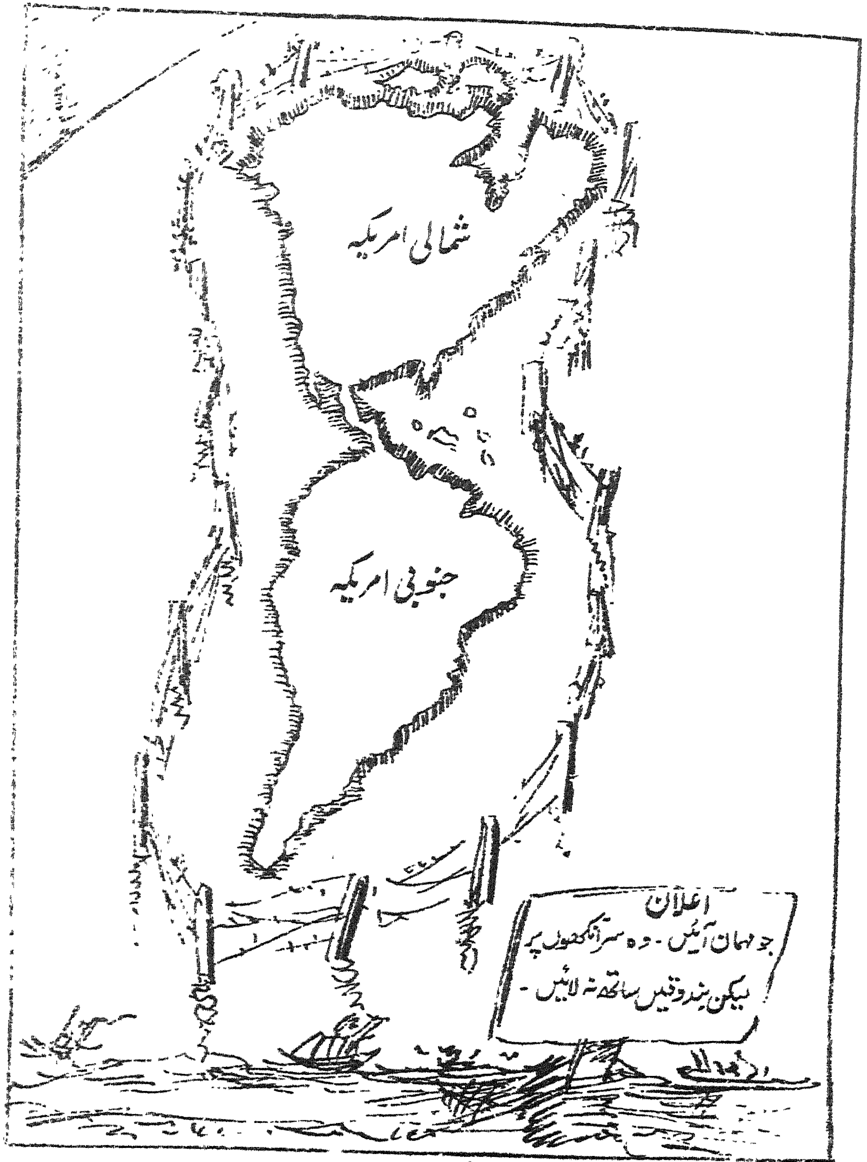
لیکن وی آنا کی کانگریس ایسے جذبات سے یکسر خالی تھی۔ اس کانگریس نے یورپ کو اس طرح تقسیم کیا۔ کہ اس سے قریباً نصف درجن شاہی خاندانوں کو تو ضرور فائدہ پہنچا۔ لیکن قومیت کی روح ویسے کی ویسی تشنہ رہی۔ انہوں نے قومی جذبات اور خواہشات کو بھی دوسرے خطرناک فرانسیسی عقائد کے ساتھ ممنوعاتِ سیاست کی فہرست میں شامل کر دیا +

لیکن سمندِ واقعات کی عنان گیری دنیا کی کوئی کانگریس نہیں کر سکتی + شاید تاریخ کا کوئی ایسا اصول کارفرما ہُوا جس کی تہ تک انسان کی نظر ابھی تک نہیں پہنچ سکی۔ بہرحال دیکھنے والوں کو یہی نظر آتا ہے۔ کہ اس زمانے میں نوعِ انسان کی معاشرتی ترقی کے لئے "قوموں" کا وجود اور قومیت کا جذبہ ضروری تھا۔ اور جس طرح میٹرنخ کی یہ کوشش ناکام رہی تھی۔ کہ لوگ سوچنا ہی چھوڑ دیں۔ اس طرح قومیت کے بڑھتے ہوئے جذبے کو روکنے کی بھی تمام تدبیریں بیکار ثابت ہوئیں +

یہ عجیب بات ہے۔ کہ شورش کے آثار سب سے پہلے دنیا کے ایک دور دراز حصے یعنی جنوبی امریکہ میں رونما ہوئے۔ جنگہائے نپولین کے زمانے میں جنوبی امریکہ کی ہسپانوی نوآبادیوں کے باشندے دوسرے ملکوں کی نسبت آزادی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب نپولین نے ان کے بادشاہ کو قید میں ڈال دیا۔ تو ان کی وفاداری کو لغزش نہ ہوئی۔ اور جب اُس نے ۱۸۰۸ء میں اپنے بھائی جوزف بونا پارٹ کو ہسپانیہ کا بادشاہ بنا دیا۔ تو انہوں نے اس کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا +

امریکہ کا صرف ایک علاقہ ایسا تھا۔ جو انقلاب فرانس سے زیادہ متاثر ہُوا۔ ہماری مراد جزیرہ ہیٹی[ل] سے ہے (یہ وہی جزیرہ ہے۔ جسے کولمبس کی اوّلین سیاحت کے سلسلے میں اسپانیولا کہا جاتا تھا) + ۱۷۹۱ء میں فرانس کی انقلابی حکومت نے اخوت انسانی کے جوش میں آ کر اس جزیرے کے سیاہ فام باشندوں کو تمام وہ حقوق و اختیارات عطا کر دئے۔ جو تا حال صرف ان کے سفید فام

ل Haiti



منرو کا اصول

آقاؤں کے حصے میں آئے تھے۔ لیکن بہت جلد حکومت اپنی اس دریا دلی پر پچھتانے بھی لگی۔ اس پر ہولناک جنگ چھڑ گئی۔ جو کئی سال تک جاری رہی افواج فرانس نیپولین کے نسبتی بھائی جرنیل لے کلرک[۵] کے زیر کمان تھیں۔

---

۵ Leclerc

وہاں ہیٹی کا سردار توسین لوورتور[۱] نامی ایک حبشی تھا۔ سنہ ۱۸۰۲ء میں لے کلرک نے توسین کو اپنے پاس بلایا۔ تاکہ مل کر صلح کی شرائط کا فیصلہ کریں۔ اور حلفیہ وعدہ کیا۔ کہ مہمان کو کوئی گزند نہ پہنچیگا۔ توسین نے اپنے سفیدفام دشمنوں کے وعدے پر یقین کر لیا۔ لیکن فرانسیسوں نے بدعہدی کرکے اُسے ایک جہاز پر سوار کرا کے فرانس بھجوا دیا۔ جہاں وہ ایک قید خانے کے اندر پڑا پڑا مرگیا۔ باوجود اس غداری کے حبشیوں کو کامیابی نصیب ہوئی۔ انہوں نے اپنے ملک کو آزاد کرالیا۔ اور جمہوری سلطنت قائم کرلی۔ بعد میں جب جنوبی امریکہ کے اولین جلیل القدر محب وطن نے اپنے ملک کو ہسپانویوں کے پنجے سے چھڑانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ تو یہی جمہوریت اُس کے آڑے آئی۔

سائمون بولیوار[۲]۔ ملک وینیزویلا[۳] کے شہر کیراکاس[۴] کا رہنے والا تھا۔ سنہ ۱۷۸۳ء میں پیدا ہؤا تھا اور ہسپانیہ میں تعلیم پائی تھی۔ جب پیرس کی سیاحت کی۔ تو انقلابی حکومت کے طریق کار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک ریاستہائے متحدہ میں سکونت اختیار کی۔ لیکن جب اہل وطن نے ہسپانوی حکومت کے خلاف شورش کی۔ اور اس بے اطمینانی نے ایک منظم صورت اختیار کرلی۔ تو وطن کو لوٹ آیا۔ سنہ ۱۸۱۱ء میں وینیزولا نے خودمختاری کا اعلان کردیا۔ اور بولیوار رہنمایان انقلاب میں شمار ہونے لگا۔ لیکن دو مہینے بھی گزرنے نہ پائے تھے۔ کہ انقلابیوں نے شکست کھائی۔ اور بولیوار فرار ہوگیا۔

پانچ سال تک کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اور چونکہ اس عرصے میں بولیوار اپنی سب دولت وطن کی راہ میں قربان کرچکا تھا۔ اس لئے لاچارگی نے اُسے عاجز کردیا۔ مگر حکومت ہیٹی کے صدر نے دست اعانت بڑھایا۔ اور بولیوار پھر ہمت پاکر میدان میں آیا۔ اب کی بار اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ بغاوت

---

[۱] Toussaint Louverture
[۲] Simon Bolivar
[۳] [illegible]
[۴] Caracas

کو سیلاب تمام جنوبی امریکہ میں پھیل گیا۔ حکومت ہسپانیہ نے جب دیکھا۔ کہ تنِ تنہا اس سیلاب کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔ تو اتحادِ مقدس سے مدد مانگی +

اس پر انگلستان بہت پریشان ہوا۔ اہل ہالینڈ کے بعد دنیا بھر کا تجارتی مال ادھر ادھر لانے لے جانے کا کام انگریز جہازرانوں نے سنبھال لیا تھا۔ انہیں یہ امید بندھ رہی تھی۔ کہ جب جنوبی امریکہ تمام تر آزاد ہو جائیگا۔ تو ہم خوب ہاتھ رنگینگے۔ انہیں یہ بھی توقع تھی۔ کہ ریاستہائے متحدہ کی حکومت ضرور ہسپانیہ کی مزاحمت کریگی۔ لیکن سینیٹ اس کی طرف بالکل متوجہ نہ ہوئی۔ جب یہ مسئلہ کھلے اجلاس میں پیش ہوا۔ تو وہاں بھی کئی ارکان نے یہ کہا۔ کہ ہسپانیہ کا ہاتھ نہ روکنا چاہیے +

انہی دنوں انگلستان کی وزارت تبدیل ہوئی۔ عنان حکومت ٹوریوں نے سنبھالی۔ اور وِگ بیدخل ہو گئے۔ جارج کیننگ سیکرٹری آف سٹیٹ مقرر ہوا۔ اس نے کنایتہً یہ بات امریکہ کے کان تک پہنچا دی۔ کہ انگلستان بھی حکومت اتحادِ مقدس کی حکمت عملی کی مخالفت کرے۔ اور جنوبی امریکہ کے حصول آزادی میں جو رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ ان پر اظہار ناراضگی کرے تو ہم بڑی خوشی سے تمہاری حمایت کرینگے۔ اس پر ۲ دسمبر ۱۸۲۳ء کو پریذیڈنٹ منرو نے کانگرس کو مخاطب کیا اور کہا۔" اگر اتحادی اپنی طرز حکومت کو مغربی نصف کرے میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ تو ان کا یہ اقدام ہمارے نزدیک ہمارے امن اور بہبودی کے لئے شدید خطرے کا باعث ہے۔" اور بدیں الفاظ تنبیہ کی۔ کہ" اگر اتحادی کسی ایسے فعل کے مرتکب ہونگے۔ تو ہم اس کا مطلب یہ سمجھیں گے۔ کہ وہ ریاستہائے متحدہ کے ساتھ مصالحانہ اور دوستانہ برتاؤ نہیں کرنا چاہتے"۔ چار ہفتے گزرے۔ تو" اعلان منرو" انگلستان کے اخبارات میں شائع ہو گیا۔ اور اتحادی سوچ میں پڑ گئے +

مٹیرنخ اپنے ارادے سے باز آیا۔ اسے ریاستہائے متحدہ کی ناراضگی کا ڈر نہ تھا۔ (۱۸۱۲ء کی اینگلو امریکن جنگ کے بعد سے ریاستہائے متحدہ کی بحری اور بری افواج نہایت ردی حالت میں تھیں) لیکن کیننگ کے رویئے

اور شورش کے خوف نے اُسے احتیاط برتنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ جنگ پیش ہی نہ آنے پائی۔ اور جنوبی امریکہ اور میکسیکو دونو آزاد ہو گئے +

یورپ میں جو شورش بپا ہو رہی تھی۔ وہ بھی بڑی سرعت کے ساتھ بڑھنے لگی۔ ۱۸۲۰ء میں فرانسیسوں کو حفظ امن کی خاطر اپنی افواج ہسپانیہ بھیجنی پڑیں + اطالیہ میں بھی جب باغیوں کی ایک خفیہ جماعت نے (جس کا نام کار بوناری یعنی "کوئلہ جلانے والے" تھا) کل اطالیہ کے اتحاد کی تبلیغ شروع کر کے ظالم فرڈی ننڈ کے خلاف بغاوت کرا دی تھی۔ تو آسٹریا نے بھی اپنی فوجیں اسی طرح "حفظ امن کی خاطر" اطالیہ بھیج دی تھیں +

روس کی حالت بھی اطمینان بخش نہ تھی۔ زار سکندر کی آنکھیں بند ہوئیں تو سینٹ پیٹرز برگ میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ جو بہت تھوڑے عرصے تک رہی۔ لیکن اس تھوڑے عرصے میں بھی خون کے دریا بہہ نکلے۔ (یہ بغاوت دسمبر کا واقعہ ہے۔ اس لئے اسے دسمبری بغاوت کہتے ہیں)۔ بہت سے محبانِ وطن جنہوں نے اواخر عہدِ سکندر میں حالات سے تنگ آ کر آئینی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھانسی پر لٹکا ئے گئے +

لیکن بعد میں ملک کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی۔ مٹیرنخ نے ایکس لا چیپل۔ ٹروپو۔ لائباخ اور ویرونا کے مقامات پر کانفرنسیں منعقد کر کر کے یہ کوشش کی تھی۔ کہ دول یورپ کی مدد اُس کے شامل حال رہے۔ آسٹریا کا یہ وزیر اعظم جس مقام پر سیاحت یا تفریح کی غرض سے جاتا۔ وہیں دول یورپ کے نمائندوں کو بلوا منگاتا۔ سب اُس سے وعدہ کرتے کہ ہم بغاوت کو فرو کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرینگے۔ لیکن قطعی اور یقینی کامیابی کا وعدہ کوئی نہ کر سکتا۔ عوام کے تیور بہت ہی بگڑے ہوئے تھے۔ اور فرانس کے بادشاہ کا تخت و تاج تک خطرے میں تھا +

لیکن فساد کے شعلے سب سے پہلے بلقان میں بھڑکے۔ یہ علاقہ چونکہ مغربی یورپ میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ اس لئے ہمیشہ سے حملہ آوروں کی گزرگاہ رہا ہے۔ شورش کا آغاز مولداویا[1] سے ہوا۔ (یہ صوبہ ڈیسیا[2] کے نام

---

[1] Moldavia [2] Dacia

سے قدیم مملکت روما کا ایک جزو تھا۔ لیکن تیسری صدی میں باقیماندہ مملکت سے اس کا تعلق منقطع ہو گیا تھا۔ اُس زمانے سے یہ صوبہ سب سے الگ تھلگ دنیا کی نظروں سے گم رہا۔ لوگ قدیم رومن زبان بولتے تھے۔ اور اپنے آپ کو "رومانیہ" کے باشندے کہتے تھے)۔ ۱۸۲۱ء میں یہاں کے ایک نوجوان یونانی شہزادہ الیگزینڈر ایپسلانٹی[۱] نامی نے ترکوں کے خلاف بغاوت شروع کی۔ اور اپنے ساتھیوں کو روس کی حمایت کا یقین دلایا۔ لیکن میٹرنخ کے ایلچی اڑتے ہوئے سینٹ پیٹرزبرگ میں پہنچے۔ زار کو سمجھایا کہ "امن اور استحکام" اس وقت بیحد ضروری ہیں۔ زار نے باغیوں کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ ایپسلانٹی آسٹریا بھاگ گیا۔ جہاں وہ سات سال تک قید میں رہا +

اسی سال یونان میں بھی شورش بپا ہوئی۔ یونانی محبان وطن کی ایک خفیہ انجمن ۱۸۱۵ء سے پخت و پز کر رہی تھی۔ ایکا ایکی انھوں نے موریا کے علاقے میں علم بغاوت بلند کر کے ترکی فوجوں کو وہاں سے بیدخل کر دیا۔ لیکن ترکوں نے بھی اپنے طریق کار پر عمل پیرا ہو کر قسطنطنیہ کے یونانی اسقف کو گرفتار کر لیا۔ اور ۱۸۲۱ء میں ایسٹر کی اتوار کے دن اُسے مع کئی اور پادریوں کے پھانسی پر لٹکا دیا۔ اسقف قسطنطنیہ کو یونانی (اور اکثر روسی) اپنا پاپا سمجھتے تھے۔ چنانچہ یونانیوں نے برافروختہ ہو کر موریا کے دارالسلطنت ٹریپولٹسا[۲] میں سب مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس پر ترک بھی آپے سے باہر ہو گئے۔ انھوں نے کیوس[۳] کے جزیرے پر حملہ کر دیا۔ پچیس ہزار عیسائیوں کو قتل کر ڈالا۔ اور پینتالیس ہزار عیسائیوں کو غلام بنا کر ایشیا اور مصر میں فروخت کر دیا +

یونانیوں نے دول یورپ سے استمداد کیا۔ لیکن میٹرنخ نے انھیں ٹکا سا جواب دے دیا۔ (عالیجاہ نے زار سے کہدیا تھا۔ کہ بغاوت کی آگ مہذب ممالک کی حدود سے باہر ہی جل جل کر بجھ جائے۔ تو بہتر ہے) سرحدوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ تاکہ کوئی رضاکار یونانیوں کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔ یونانیوں کے

---

[۱] Ypsilanti [۲] Tripolitsa [۳] Chios

پہنچے پچھوٹ گئے۔ ترکی کی درخواست پر مصر کی فوجیں موریا میں داخل ہوئیں۔ ورنفورٹ سے ہی عرصے بعد ترکی جھنڈا ایتھنز کے قدیم قلعے یعنی اکروپولیس پر لہرانے لگا۔ افواج مصر نے ترکوں ہی کے طریقے پر ملک میں امن قائم کیا۔ میٹرنخ چپکے بیٹھا یہ سب تماشا دیکھتا رہا۔ اور اُس دن کا انتظار کرتا رہا۔ جب اس شورش کا جسے وہ امن یورپ کے منافی سمجھتا تھا۔ خاتمہ ہو جائے ؛

لیکن میٹرنخ کے منصوبوں کو بھی انگلستان ہی نے خاک میں ملایا۔ انگلستان کی عظمت کا راز نہ نمول میں۔ نہ وسعت مملکت میں۔ اور نہ ہی افواج بحری میں۔ بلکہ اوسط درجے کے انگریز کی خاموش جرأت اور حریت پسندی میں مضمر ہے۔ انگریز قانون کی عزت کرتا ہے۔ صرف اس لئے کہ پابندی قانون ہی کو وہ مہذب انسانوں کا طغرائے امتیاز سمجھتا ہے ؛ لیکن وہ آزادئ خیالات میں کسی کی دخل اندازی گوارا نہیں کرسکتا ؛ اگر اس کی حکومت کوئی ایسا قدم اٹھائے۔ جو اُس کی دانست میں غلط رستے پر ہے۔ تو وہ اعتراض سے باز نہیں رہتا۔ حکومت بھی صاف گوئی کی قدر کرتی ہے۔ اور اگر اس قسم کے معترضین کو عوام کے ہاتھوں کسی طرح کے گزند پہنچنے کا احتمال ہو۔ تو حکومت انکی حفاظت کرتی ہے۔ کیونکہ سقراط کے زمانے سے یہی ہوتا آیا ہے۔ کہ جو افراد جرأت یا عقل میں عوام سے سبقت لے جائیں۔ لوگ انہیں قتل کرڈالنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں ہزاروں قضیے بپا ہوئے ہیں۔ لیکن ایک بھی تنازعہ ایسا نہیں جس میں ان لوگوں کی حمایت پر جو اس تنازعے میں حق اور راستی پر تھے۔ انگریزوں کی ایک نہ ایک جماعت ڈٹ نہ گئی ہو۔ چاہے عوام ان کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں ؛ انگریز عام طور پر اور ملکوں کے باشندوں سے مختلف نہیں۔ اور لوگوں کی طرح وہ بھی اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ اور لاحاصل زور آزمائیوں میں وقت نہیں گنواتے۔ لیکن اگر ان کا کوئی ہموطن اپنا گھر بار چھوڑ کر ایشیا یا افریقہ کی کسی غیر معروف قوم کی حمایت میں نکل کھڑا ہو۔ تو ایسے مجنونوں کی وہ قدر کرتے ہیں۔ اور جب وہ مارے جائیں تو ان کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھاتے ہیں۔ اور اپنے بچوں کو انکی

شجاعت اور جوانمردی کی داستانیں سناتے ہیں +

اس قومی خصوصیت کے مقابلے میں اتحاد مقدس کے جاسوس بھی بے بس ہو کر رہ گئے۔ ۱۸۲۳ء میں ایک متمول انگریز نوجوان لارڈ بائرن نامی نے (جس کی نظموں سے یورپ بھر کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں) اپنے جہاز کے بادبان کھول دیئے اور یونانیوں کی مدد کرنے کی غرض سے جنوب کی سمت روانہ ہو گیا تین مہینے کے بعد یہ خبر پہنچی۔ کہ یہ نوجوان یونانیوں کی آخری جائے پناہ یعنی مسولونگی[1] میں مارا گیا ہے۔ ایک بہادر جوانمرد کے غریب الوطنی میں یوں سپرد خاک ہونے سے یورپ بھر میں جوش پیدا ہوا۔ ہر ملک میں یونانیوں کی اعانت کرنے کے لئے انجمنیں قائم ہوئیں۔ انقلاب امریکہ کے بڈھے حمایتی لافا بیٹ[2] نے فرانس میں ان کی حمایت کی۔ شاہ بویریا نے سینکڑوں افسران کی مدد کو بھیجے۔ اور مسولونگی کے فاقہ زدہ سپاہیوں پر ہر طرف سے روپے اور ذخائر کی بارش ہونے لگی +

انگلستان میں وزیر اعظم کے عہدے پر اب جارج کیننگ متمکن تھا۔ جس نے جنوبی امریکہ میں اتحاد مقدس کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا تھا + موجودہ حالات میں اُسے پھر ایک بار میٹرنخ کو زک دینے کا موقع ملا۔ انگریزی اور روسی بیڑے بحیرہ روم میں پہنچ چکے تھے۔ کیونکہ انگلستان اور روس دونوں کی حکومتیں یہ اچھی طرح سمجھ چکی تھیں۔ کہ عوام میں یونانی محبان وطن کی حمایت کا جو جوش پیدا ہو چکا ہے۔ اس کو دبا ڈالنا اب ممکن نہیں رہا۔ فرانس چونکہ صلیبی جنگوں کے اختتام سے اپنے آپ کو مسلم ممالک میں دین مسیحی کا محافظ سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے بھی اپنے جنگی جہاز بھیج دئے۔ ۲۰۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو تینوں نے مل کر خلیج نوارینو میں ترکی بیڑے پر حملہ کر دیا۔ اور اُسے بالکل فنا کر ڈالا۔ لوگوں نے جب اس فتح کی خبر سنی۔ تو بہت خوشیاں منائیں۔ مغربی یورپ اور روس کے جو باشندے خود آزادی سے محروم تھے۔ وہ تصور ہی میں مظلوم

---

[1] Missolonghi [2] Lafayette

یونانیوں کی حمایت میں سینہ سپر ہو کر خوش ہوئے۔ ۱۸۲۹ء میں ان سب کی مرادیں بر آئیں۔ یونان خود مختار ہو گیا۔ اور ردِ عمل اور استحکام کی حکمت عملی نے دوسری مرتبہ شکست فاش کھائی +

دیگر ممالک میں بھی قومی آزادی کی خاطر لوگوں نے اسی طرح ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن اس مختصر سی کتاب میں ان سب کا حال بیان کرنا ناممکن ہے۔ تفصیل سے پڑھنا چاہو۔ تو کئی اچھی اچھی کتابیں موجود ہیں۔ یونان کی جنگ آزادی کا حال میں نے اس لئے بیان کیا۔ کہ وی آنا کی کانگرس نے "یورپ کے استحکام کی خاطر" رجعت پسندی کا جو ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اس جنگ نے پہلی مرتبہ اُس قلعے کی فصیل میں رخنے ڈال دئیے + یہ قلعہ بالکل منہدم تو نہ ہؤا۔ اور میٹرنخ کا اقتدار بالکل ہی مٹنے نونہ پایا۔ لیکن اہل بصیرت کو اس کا انجام قریب نظر آرہا تھا +

فرانس میں خاندان بوربون کے فرمانروا پولیس کے بل پر حکومت کر رہے تھے۔ اور ان کے افسر مہذب جنگ کے آئین وقوانین سے بے نیاز ہو کر انقلاب فرانس کے لئے پر پانی پھیر رہے تھے۔ لوگ ان کے ہاتھوں بیدنالاں تھے۔ ۱۸۲۴ء لیعنی لوئی ہژدہم کے سال وفات کے بعد جو "امن کے نو سال" آئے۔ وہ جنگ، مملکت کے دس سالوں سے بھی زیادہ ناقابل برداشت تھے۔ لوئی کے بعد۔ اس کا بھائی چارلس دہم تخت پر بیٹھا +

لوئی اُس مشہور خاندان بوربون کا فرد تھا جس نے کبھی کسی واقعے سے عبرت تو نہ پکڑی تھی۔ لیکن کسی واقعے کو فراموش بھی نہ کیا تھا۔ لوئی کو وہ دن کبھی نہ بھولا تھا۔ جب ہام[1] کے شہر میں صبح کے وقت اُسے اپنے بھائی کے سر قلم ہونے کی خبر ملی تھی۔ یہ گویا قدرت کا ایک اشارہ تھا۔ کہ جو فرمانروا مقتضائے زمانہ کو نہیں سمجھتے ان کا کیا حال ہوتا ہے + لیکن چارلس ابھی بیس برس کا بھی نہ ہؤا تھا۔ کہ اس کا ذاتی قرضہ پانچ کروڑ فرانک تک پہنچ گیا۔ یہ

---

[1] Hamm

بادشاہ ہر بات سے غافل رہا۔ نہ گزشتہ واقعات سے سبق سیکھا۔ نہ آئندہ بہتری کی کوئی تدبیر سوچی۔ تخت پر بیٹھتے ہی حکومت کو پادریوں کے سپرد کر دیا۔ اور انہیں کل سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ "حکومت کا سب کاروبار پادریوں کے ہاتھوں۔ پادریوں ہی کی وساطت سے اور پادریوں ہی کے فائدے کے لئے انجام پاتا تھا"۔ یہ قول جسے ہم نے یہاں نقل کیا ہے۔ ڈیوک آف ونگٹن کا قول ہے۔ جسے کسی طرح بھی انتہا درجہ کا آزاد خیال شخص نہیں کہا جاسکتا۔ اسی سے اندازہ لگا لیجئے۔ کہ چارلس کا عہد حکومت کس درجہ قابل نفرت ہوگا۔ جسے دیکھ کر قانون و امن کا یہ علمبردار بھی نکتہ چینی سے باز نہ رہ سکا۔ سب کچھ کر گزرنے کے بعد جب چارلس نے ان اخباروں کا گلا بھی گھونٹنے کی کوشش کی۔ جو حکومت پر حرف گیری کرتے تھے۔ اور پارلیمنٹ کو بھی منسوخ کر دیا۔ کیونکہ پارلیمنٹ پریس کی حمایت کرتی تھی۔ تو گویا اپنے انجام کو خود اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر اپنے قریب لے آیا۔

۲۷۔ جولائی ۱۸۳۰ء کی رات کو پیرس میں غدر برپا ہوا۔ ۳۰۔ جولائی کو بادشاہ بھاگ کر انگلستان چلا گیا۔ گویا اس کا پانزدہ سالہ مضحکہ انگیز عہد حکومت ختم ہوگیا۔ اس کے بیدخل ہونے سے خاندان بوربون ہمیشہ کے لئے تخت فرانس سے محروم ہوگیا۔ کیونکہ واقعات نے ثابت کر دیا تھا۔ کہ وہ فرمانروائی کے اہل نہیں۔ اس کے بعد فرانس میں پھر جمہوری حکومت قائم ہو جاتی۔ لیکن میٹرنخ کو یہ بات پسند نہ تھی۔

حالات نے بہت نازک صورت اختیار کر لی۔ بغاوت کی چنگاری سرحد فرانس سے اڑ کر ایک اور بارود خانے میں جا پڑی۔ جہاں عوام کی خستہ حالی نے بہت سا آتشگیر مواد جمع کر رکھا تھا۔ نیدرلینڈ کی حکومت کو کبھی کامیابی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اہل بلجیم اور اہل ہالینڈ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ ولیم آف اورینج (جو ولیم خاموش کے ایک چچا کی اولاد میں سے تھا) بہت محنتی شخص تھا۔ اور فن تجارت میں بہت مہارت رکھتا تھا۔ لیکن تدبر اور معاملہ فہمی سے عاری تھا۔ اس لئے رعایا میں امن قائم نہ رکھ سکا۔ علاوہ

برآں پادریوں کے لشکر جنہوں نے فرانس میں اپنے خیمے گاڑ دئے تھے بلجیم میں بھی آ نمودار ہوئے۔ ولیم پراٹسٹنٹ عقیدے کا شخص تھا۔ انگلی بھی اٹھاتا۔ تو لوگ جوش میں آجاتے۔ اور اس پر لعنتیں بھیجتے۔ اور یہ غلغلہ بلند ہوتا کہ کلیسائے کیتھولک کی آزادی چھینی جا رہی ہے + ۲۵ اگست کو برسلز میں عوام نے حکام کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور دو مہینے بعد بلجیم نے آزادی کا اعلان کرکے لیوپولڈ آف کوبرگ کو (جو ملکہ وکٹوریہ کا چچا تھا) تخت پر بٹھا دیا۔ سچ پوچھئے۔ تو اس مشکل کا بہترین حل یہی تھا۔ جب ان ملکوں کا آپس میں اس قدر تباین تھا۔ اور ان کا متحد رہنا بھی ناقابل عمل ثابت ہو چکا تھا۔ تو بہتر یہی تھا۔ کہ یہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے۔ چنانچہ اس کے بعد بلجیم و ہالینڈ کی آپس میں ہمیشہ صلح رہی ہے۔ اور ان دو ہمسایہ سلطنتوں کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے ہیں +

ان دنوں ریل صرف کہیں کہیں موجود تھی۔ اس لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک خبریں بہت دیر میں پہنچتی تھیں۔ تاہم جب فرانس اور بلجیم کے انقلاب پسندوں کی کامیابی کی خبر ایک دفعہ پولینڈ پہنچ گئی۔ تو وہاں طوفان برپا ہو گیا۔ اہل پولینڈ اپنے روسی آقاؤں کے مقابلے میں صف آرا ہوئے۔ سال بھر تک جنگ کا بازار گرم رہا۔ بالآخر روسیوں کو مکمل فتح نصیب ہوئی۔ اور انہوں نے دریائے وسٹولا کے کناروں پر امن قائم کیا۔ مگر اپنے مخصوص روسی طریقے پر۔ جیسے سب لوگ جانتے ہیں) + نکولس اول جو ۱۸۲۵ء میں اپنے بھائی الیگزینڈر کا جانشین ہوا تھا۔ خاندان شاہی کے آسمانی حقوق کا دعویدار تھا۔ پولینڈ کے ہزارہا باشندے وطن سے بھاگ کر مغربی یورپ میں پناہ گزیں ہوئے۔ ان کی درماندگی کو دیکھکر کون کہہ سکتا تھا۔ کہ اتحاد مقدس کے اصولوں میں (کم ازکم مقدس روس کے اندر) اب زور باقی نہیں رہا +

اطالیہ میں بھی دم بھر کو بے اطمینانی کے آثار ہویدا ہوئے + ماری لوئیز ڈچیس آف پارما کو (جو نپولین کی بیوی تھی مگر جس نے شکست واٹرلو کے بعد

اس کا سامنے چھوڑ دیا تھا) ملک بدر کر دیا گیا۔ اور پریشان حال عوام نے ایک خود مختار جمہوری حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آسٹریا کی فوجیں کوچ کر کے رومابیں آن پہنچیں۔ جہاں تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے جمہوریت کا خیال لوگوں کے دماغ سے نکال دیا + میٹرنخ بدستور بال پلاٹز[۱] میں جو خاندان ہیبس برگ کے وزیر خارجہ کا مسکن تھا۔ جلوہ افروز رہا۔ پولیس کے جاسوس پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ اور سب طرف امن و امان قائم ہو گیا۔ اس کے بعد اٹھارہ سال تک کسی نے یورپ کو کانگریس وی آنا کے نتائج و عواقب سے نجات دلانے کی کوشش نہ کی۔ لیکن سال بعد پھر لوگوں نے سعی کی۔ اور ابکے انہیں پہلے سے بہت زیادہ کامیابی نصیب ہوئی +

اس کوشش کا سہرا بھی فرانس ہی کے سر ہے۔ فرانس ہی یورپ کے باغیانہ خیالات کا مُرغ باد نما ہے۔ چنانچہ شورش کے پہلے آثار فرانس ہی میں نمودار ہوئے۔ چارلس دہم کے بعد لوئی فلپ یعنی اُس نامور ڈیوک آف اورلینز[۲] کا بیٹا جو جیکوبین جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ تخت پر بیٹھا + ڈیوک آف اورلینز ان لوگوں میں سے تھا۔ جنہوں نے بادشاہ کے قتل کے حق میں رائے دی تھی۔ اور اوائل انقلاب میں "مساوات پرست فلپ" کے نام سے مشہور تھا۔ بعد ازاں جب روبس پیر نے قوم کو سب غداروں سے (یعنی ان لوگوں سے جو اس کے ہمخیال نہ تھے) پاک کرنے کا تہیہ کیا۔ تو ڈیوک آف اورلینز کا سر بھی قلم کر دیا گیا۔ باپ کے مارے جانے کے بعد لوئی فلپ کو فرار کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ سالہا سال تک دور دراز کے ممالک میں بے خانماں پھرتا رہا۔ اسی دوران میں ایک دفعہ سوٹزرلینڈ میں معلمی بھی کر لی تھی۔ اور دو سال امریکہ کے مغرب بعید کی سیاحت میں بھی صرف کئے تھے۔ نپولین کے ہبوط کے بعد لوئی فلپ پیرس چلا آیا۔ ذہانت میں

---

[۱] Ball Platz

[۲] Duke of Orleans

ادھر اطالیہ کا یہ حال ہوا کہ جزیرہ صقلیہ نے نیپلز کا جُوا اتار پھینکا - اور خود مختاری کا اعلان کر کے اپنے بوربون بادشاہ کو باہر نکال دیا - ریاستہائے پاپائی میں وزیر اعظم روسّی[1] قتل کر دیا گیا - اور پاپائے اعظم کو فرار ہونا پڑا - اگلے سال پاپائے اعظم ایک فرانسیسی لشکر کو ساتھ لئے واپس آیا - یہ لشکر ۱۸۷۰ء تک روما میں مقیم رہا - تاکہ پاپائے اعظم کو رعایا کی دست درازی سے بچائے رکھے - اس کے بعد اہل پرشیا کا مقابلہ کرنے کے لئے ان افواج کو فرانس واپس جانا پڑا - اور روما اطالیہ کا دارالخلافہ بن گیا - شمال میں میلان اور وینس نے اپنے آسٹروی آقاؤں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا - شاہ البرٹ والیٔ سارڈینیا ان کا معاون ہوا - لیکن آسٹریا کا ایک طاقتور لشکر بڈھے ریڈٹسکی[2] کے زیر کمان وادی پو پر چھا گیا - کسٹوزا اور نووارا کے قریب اہل سارڈینیا کو شکست ہوئی - اور البرٹ اپنے بیٹے وکٹر عمانوئیل کے حق میں تخت سے دستبردار ہوا - چند سال بعد ہی وکٹر عمانوئیل متحدہ اطالیہ کا پہلا بادشاہ قرار پایا +

جرمنی میں ۱۸۴۸ء کی بےچینی نے یہ شکل اختیار کی - کہ سیاسی اتحاد اور نمائندہ حکومت کے حق میں ایک بہت بڑا قومی مظاہرہ ہوا - بویریا میں بادشاہ ایک آئیبریش خاتون پر جو اپنے آپ کو ایک ہسپانوی رقاصہ بتاتی تھی (یہ عورت لولا مونٹیز کے نام سے مشہور تھی - اور اب نیویارک کے پوٹرز فیلڈ میں دفن ہے) وقت اور روپیہ ضائع کر رہا تھا - یونیورسٹی کے طلبا نے طیش میں آکر بادشاہ کو باہر نکال دیا - پرشیا میں بادشاہ کی یہ دُرگت ہوئی - کہ بالآخر اسے برہنہ سر ہو کر ان لوگوں کے تابوتوں کے سامنے کھڑا ہونا پڑا - جو شورش کے دوران میں گلی کوچوں میں مارے گئے تھے - اور اسی حالت میں آئینی حکومت کا وعدہ کرنا پڑا - مارچ ۱۸۴۹ء میں ایک جرمن پارلیمنٹ جو مختلف اضلاع کے ۵۵۰ نمائندوں پر مشتمل تھی - فرینکفورٹ میں جمع ہوئی - اور اس نے

---

[1] Rossi　[2] Radetzky　[3]

یہ تجویز پیش کی۔ کہ فریڈرک ولیم آف پرشیا متحدہ جرمنی کا شہنشاہ مقرر ہو +

لیکن اس کے بعد حالات نے رُخ بدلا۔ تالائق فرڈیننڈ اپنے بھتیجے فرانسس جوزف کے حق میں تخت سے دستبردار ہؤا۔ آسٹریا کی منظم فوج اپنے جنگی آقا سے منحرف نہ ہوئی تھی۔ جلاد کو اپنے کام سے ایک لمحہ بھر بھی فرصت نہ ملی۔ گر بہ صفت اہل ہیبسبرگ کو ایک بار پھر قوت حاصل ہوئی۔ اور انہوں نے بسرعت تمام مشرقی اور مغربی یورپ میں اپنے اقتدار کو مستحکم کر لیا۔ بساط سیاست پر شاطرانہ عیاری سے کام لیا۔ دیگر جرمن ریاستوں کے حسد اور بغض کو اُبھار کر شاہ پرشیا کو دبائے رکھا۔ اور اسے شہنشاہیت کے رتبے تک نہ پہنچنے دیا۔ مدتوں سے شکست کھانے کے عادی تھے۔ اس لئے صبر اور تحمل کی قدر و قیمت خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ کچھ دیر تک چپکے بیٹھے رہے۔ اور جب لبرل لوگ جو عملی سیاسیات سے نابلد تھے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ اور خود اپنی ہی تقریروں کے نشے سے مخمور ہو رہے تھے۔ تو اہل آسٹریا نے چپکے سے فوجیں جمع کیں۔ فرینکفورٹ کی پارلیمنٹ کو منسوخ کر دیا۔ اور پھر اس جرمن وفاق کو از سر نو قائم کیا جس کا دیر تک قائم رہنا ناممکن تھا۔ اور جسے وی آنا کی کانگرس نے یک لخت دنیا کے سامنے پیش کیا تھا +

اس عجیب و غریب پارلیمنٹ میں ناتجربہ کار جوشیلے ارکان کے علاوہ پرشیا کا ایک زمیندار بھی شامل تھا۔ جس کا نام بسمارک[۱] تھا۔ بسمارک طبیعت کا چوکنا تھا۔ لفاظی اور تقریربازی سے اسے سخت نفرت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عملی زندگی میں تقریروں سے کچھ نہیں بنتا۔ اپنی بساط اور طبیعت کے مطابق وطن سے الفت کرتا تھا۔ پرانے زمانے کی سیاست کا ماہر تھا۔ یعنی جہاں اپنے دشمنوں کے مقابلے میں چل پھر زیادہ سکتا تھا۔ شراب زیادہ پی سکتا تھا۔ گھوڑے کی سواری میں زیادہ طاق تھا۔ وہاں جھوٹ بولنے میں بھی ضرورت پڑے۔ تو اُنہیں نیچا دکھا سکتا تھا +

---

[۱] Bismark

بسمارک کو یقین تھا۔ کہ اگر دول یورپ کے مقابے میں زندہ رہنا ہے۔ تو چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے اس مجموعے کو ایک متحدہ ملک کی شکل دینی پڑیگی۔ پرورش ایسی فضا میں ہوئی تھی۔ جہاں پرانی وضع کی وفاداری اور نمک حلالی کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا۔ کہ خاندان ہیپسبرگ کی بجائے خاندان ہوہن زولرن[۱] جس کا وہ خود ایک وفادار عقیدتمند تھا۔ تخت پر متمکن ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پہلے آسٹروی اقتدار سے مخلصی پانا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے اس تکلیف دہ عمل کے لئے تیاریاں شروع کر دیں +

اس دوران میں اطالیہ نے اپنی مشکل خود حل کر لی تھی۔ اور آسٹریا کے پھندے سے آزاد ہو چکا تھا۔ اطالیہ کا اتحاد تین شخصوں کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ کیوور[۲]۔ میزینی[۳] اور گیریبالڈی[۴] + ان میں سے کیوور جس کی بصارت کمزور تھی اور جو لوہے کے فریم کی عینک پہنتا تھا۔ سیاسی ناؤ کا محتاط ناخدا تھا۔ میزینی جس کی عمر کا بیشتر حصہ یورپ کے مختلف ممالک میں افلاس اور غربت میں بسر ہوا تھا۔ اور جو آسٹروی پولیس سے چھپتا پھرتا تھا۔ لوگوں کو ابھارنے پر مامور رہتا۔ وہ اور اس کے سرخ پوش سوار عوام میں بہت ہر دلعزیز تھے +

میزینی اور گیریبالڈی دونوں جمہوری حکومت کے حامی تھے۔ لیکن کیوور شہنشاہیت پسند تھا۔ اور چونکہ عملی سیاسیات میں اس کی قابلیت مسلم تھی۔ اس لئے اس کے دو ساتھیوں نے اس کی رائے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور اپنے محبوب وطن کی بہبود و فلاح کی خاطر اپنی خواہشات کو قربان کر دیا +

جس طرح بسمارک خاندان ہوہن زولرن کا عقیدتمند تھا۔ ویسے ہی کیوور دودمان سارڈینیا کا ہواخواہ تھا۔ از حد زیرکی اور احتیاط اور فراست

---

[۱] Hohenzollern　[۲] Cavour　[۳] Mazzini

[۴] Garibaldi

سے اس نے شاہ سارڈینیا کو ایسے مرتبے پر پہنچانے کی کوشش کی - جہاں سے بادشاہ سلامت کے لئے تمام اطالوی قوم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لینا مشکل نہ ہو - باقیماندہ یورپ کی سیاسی برہمی نے موافق حالات پیدا کر دئے - چنانچہ اطالیہ کی قدیم ہمسایہ سلطنت یعنی فرانس (جس کی دوستی اکثر مشتبہ سمجھی جاتی تھی) اطالوی آزادی کے حصول میں بہت ممد ہوئی +

ملک فرانس میں جو شورشوں اور زمانہ جنگیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا - نومبر ۱۸۵۲ء میں یک لخت اور خلاف توقع جمہوریت کا خاتمہ ہوگیا - ہالینڈ کے سابق بادشاہ لوئی بوناپارٹ کے بیٹے نپولین سوم یعنی الوالعزم چچا کے حقیر بھتیجے نے پھر سے سلطنت قائم کر لی تھی - اور "بفضل اللہ اور برضامندی رعایا" شاہنشاہ بن بیٹھا تھا +



جیوسپے میزینی

یہ نوجوان جس نے جرمنی میں تعلیم پائی تھی - اور جو فرانسیسی زبان میں جرمن زبان کی درشت اصوات استعمال کرتا تھا - (جس طرح نپولین اول فرانسیسی زبان اطالوی لہجہ میں بولتا تھا) - اس بات کی کوشش کر رہا تھا - کہ نپولین کی روایات اپنی مطلب برآری کے لئے کام میں لائے - لیکن اس کے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی - اور جو حکومت اسے نبا رل گئی تھی - اس کی پایندگی کا اسے بہت یقین نہ تھا - یوں تو اس نے ملکہ وکٹوریہ اور اس کے وزرا سے رشتہ دوستی استوار کر لیا تھا - اور یہ کوئی چھوٹی سی بات نہ تھی - لیکن یورپ کے دیگر تاجدار شاہنشاہ فرانس سے ہتک آمیز رعونت کا سلوک کرتے تھے - اور اپنی نفرت کے اظہار کے لئے رات دن نئے نئے طریقے سوچتے رہتے تھے - تاکہ اس کل کے لونڈے کو اپنی قدر معلوم ہو +

نپولین کے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ تھا - کہ جس طرح ہو سکے محبت

وآشتی سے یا اگر یہ کارگر نہ ہو۔ تو ڈرا دھمکا کر اس متی لفت کی صف شکنی کرے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ اس کی رعایا اب بھی جلالت فرانس کی دلدادہ ہے۔ تخت کے لیئے قسمت سے جُوا کھیلنا ضروری ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس نے تسخیر ملک اور توسیع سلطنت کا پانسہ پھینکا۔ اور اپنا سب مستقبل اس قمار بازی میں لگا دیا۔ جب روس ٹرکی پر حملہ آور ہؤا۔ تو نیپولین نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ کریمیا میں طبل جنگ پر چوٹ پڑی۔ انگلستان اور فرانس سلطان ٹرکی کی حمایت پر زار روس کے خلاف میدان کارزار میں کود پڑے۔ اس پر بہت سا روپیہ خرچ ہؤا۔ لیکن ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ نہ انگلستان کا نام روشن ہؤا۔ نہ فرانس کا +

لیکن جنگ کریمیا کا ایک فائدہ ضرور ہؤا۔ سارڈینیا کو موقع ہاتھ آیا۔ اس نے فاتحین کی حمایت میں اپنی خدمات پیش کیں۔ جب صلح ہوئی۔ تو انگلستان اور فرانس دونو کیوور کے احسانمند اور شکر گزار تھے +

جب اس ہوشیار اطالوی مدبر نے بین الاقوامی صورت حالات سے یوں فائدہ اٹھا کر سارڈینیا کو یورپ کی اہم ترین طاقتوں کا ہم پلہ تسلیم کروا لیا۔ تو جُون ۱۸۵۹ء میں سارڈینیا اور آسٹریا کے درمیان جنگ کرا دی۔ نیپولین سے حمایت کا وعدہ لیا۔ اور اس کے بدلے میں سیوائے کے علاقوں اور نیس کے شہر سے (جو فی الحقیقت اطالوی شہر تھا) دست بردار ہونے کا عہد کیا فرانسیسی اور اطالوی متحدہ افواج نے آسٹریوں کو میگنٹا[1] اور سولفرینو[2] کے مقامات پر شکست دی + سابقہ آسٹروی صوبجات اور جاگیروں کو ایک متحدہ اطالوی سلطنت کی شکل دی گئی۔ فلورنس اس نئی اطالوی سلطنت کا دارالخلافہ قرار پایا۔ تاآنکہ ۱۸۷۰ء میں اہل فرانس نے جرمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی فوجوں کو روما سے واپس بلا لیا + ان کے جانے کے بعد اطالوی افواج شہر مقدس میں داخل ہوئیں۔ اور وہاں سارڈینیا نے کوئرینل[3] کے قدیم محل میں جسے

---

[1] Magenta [2] Solferino [3] Quirinal

پچھلے زمانے کے پاپانے شاہنشاہ قسطنطین کے حمام کے کھنڈروں پر تعمیر کیا تھا۔
سکونت اختیار کی +

لیکن پاپائے روما دریائے ٹائبر کو عبور کرکے ایوان پاپائی کے اندر جو ۱۳۷۷ء کی جلاوطنی کے زمانے سے اکثر پاپاؤں کا مستقر رہا تھا۔ چھپ کر بیٹھ رہا۔ اپنے مقبوضات کے غصب ہو جانے پر بہت کچھ چیخا چلایا۔ اور ان کیتھولک لوگوں کو جو اس کے ساتھ اس بارے میں ہمدردی رکھتے تھے۔ خط لکھ لکھ کر اپنا دکھڑا سناتا رہا۔ لیکن وفادار کیتھولک کل تھے ہی کتنے۔ اور جو تھے ان کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی چلی گئی۔ جب پاپائے روما نے ایک مرتبہ جہانبانی اور سیاست دانی کے بکھیڑوں سے مخلصی پائی۔ تو اپنی توجہ تمام تر روحانیات کی طرف مبذول کر دی۔ یورپ کے سیاسی مخمصوں اور حقیر آویزشوں سے بالاتر ہو کر پاپائی کو وقار اور علو نصیب ہوا۔ جو کلیسا کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کلیسائے کیتھولک معاشرتی اور مذہبی ترقی کے میدان میں بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جدید زمانے کے اقتصادی مسائل کو جس خوبی سے سمجھ اور پرکھ سکتا ہے۔ وہ اکثر پروٹسٹنٹ فرقوں کو نصیب نہیں +

مختصر یہ ہے کہ وہی اینا کی کانگرس نے جو کوشش کی تھی۔ کہ اطالیہ کو آسٹروی مقبوضات میں شامل کر دے۔ وہ بارآور نہ ہوئی +

لیکن جرمنی کا مسئلہ ابھی جوں کا توں باقی تھا۔ اس کے حل میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ جب ۱۸۴۸ء کا انقلاب ناکام رہا۔ تو جرمنی کے باشندوں میں سے جو لوگ ہمت والے اور آزاد خیال تھے۔ وہ سب کے سب ہجرت کر گئے اور امریکہ کی ریاستہائے متحدہ۔ برازیل اور ایشیا اور امریکہ کی نو آبادیوں میں جا بسے۔ جو کام جرمنی میں وہ سرانجام دے رہے تھے۔ وہ برابر جاری رہا۔ لیکن اب اس کے کرنے والے اور لوگ تھے +

پرانی جرمن پارلیمنٹ کے بیدخل ہو جانے اور آزاد خیال طبقے کی مساعی اتحاد کی ناکامی کے بعد جب نئی پارلیمنٹ کا اجلاس فرینکفورٹ میں منعقد ہوا۔ تو اس میں پرشیا کے علاقے کی نمائندگی کا فرض اُسی اوٹوفان بسمارک نے ادا

کیا جس کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ بسمارک کو پرشیا کی پارلیمنٹ کے خیالات یا اہل پرشیا کی آرا سے ذرا دلچسپی نہ تھی۔ آزاد خیال طبقے کی شکست کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ جانتا تھا۔ کہ پرشیا کی فوج کو مستحکم بنانے اور جنگ کرنے کے بغیر آسٹریا سے مخلصی پانا ناممکن ہے۔ لینڈ ٹاغ[1] اس کے جابرانہ طریق کار سے سخت پریشان ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس نے بسمارک کی مالی امداد کرنے سے انکار کر دیا۔ بسمارک نے اس مسئلے پر غور کرنے یا بحث کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ اور اپنے ارادے سے باز نہ آیا۔ پرشیا کے دارالامرا اور بادشاہ نے جو فنڈ اس کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کی مدد سے فوج میں اضافہ کرتا رہا۔ اور اس تلاش میں رہا۔ کہ کوئی ایسا قومی مسئلہ ہاتھ آجائے جس کے بہانے سے تمام جرمن قوم کے جذبات وطنیت کو اُبھار سکے +

جرمنی کے شمال میں شلیسوگ[2] اور ہولشٹائن[3] کی جاگیرداریاں واقع تھیں۔ جو زمانہ وسطےٰ سے لے کر آج تک چھیڑ خانی کرتی چلی آئی تھیں۔ دونو علاقوں میں کچھ ڈین اور کچھ جرمن آباد تھے۔ دونو پر حکومت شاہ ڈنمارک کی تھی۔ لیکن یہ علاقے صحیح معنوں میں کبھی مملکت ڈنمارک میں شامل نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ اس سے گوناگوں مشکلات پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ ورسائی میں حال ہی میں جو کانگریس منعقد ہوئی ہے۔ اس سے یہ سب قضیے طے پا چکے ہیں۔ اس لئے میں اس نزاع کی یاد جو اب دلوں سے محو ہو چکی ہے۔ پھر تازہ کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اتنا کہنا ضروری ہے۔ کہ ہولشٹائن میں جرمن اہل ڈنمارک کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اور شلیسوگ میں ڈنمارک کے لوگ اپنی وطنیت کا اعلان کر رہے تھے۔ یورپ میں ہر جگہ اس قضیے کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ جرمنی میں دھواں دھار تقریریں ہو رہی تھیں جن کا موضوع یہ تھا کہ اپنے ہم قوم بھائیوں کی مدد کرنی چاہئے۔ اور جذبات کو اُبھارا جا رہا تھا۔ وزارتیں یکے بعد دیگرے اس مسئلے کو سمجھنے اور سلجھانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔

---

[3] Holstein [2] Schleswig [1] Landtag

کہ پرشیا نے "ان کھوئے ہوئے علاقوں کو بچانے کے لئے" فوجی بھرتی شروع کر دی ضابطے کی رو سے مملکت متحدۂ جرمن کا صدر آسٹریا تھا۔ اسے یہ گوارا نہ ہوا۔ کہ ایسے اہم معاملے میں پرشیا اکیلے ہی اکیلے پیشقدمی کرے چنانچہ ہیپسبرگ کی افواج کو بھی یکجا کیا گیا۔ دونو طاقتوں کے متحدہ لشکر نے ڈنمارک کی سرحد کو عبور کیا۔ اہل ڈنمارک نے دادِ شجاعت دی۔ اور خوب مقابلہ کیا۔ لیکن ان دو علاقوں کو بچا نہ سکے۔ یورپ سے اپیل کی۔ یورپ پہلے ہی مصروف تھا۔ چنانچہ اہل ڈنمارک کی کسی نے نہ سنی +

بسمارک نے اگلا قدم اٹھانے کے لئے تیاریاں شروع کیں۔ تاکہ شہنشاہیت کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچایا جائے۔ مال غنیمت کی تقسیم کا بہانہ تراش کر آسٹریا سے لڑائی مول لی۔ اہل ہیپسبرگ دام میں پھنس گئے۔ پرشیا کی جدید فوج جسے بسمارک اور اس کے وفادار جرنیلوں نے مرتب کیا تھا۔ بوہیمیا پر حملہ آور ہوئی۔ چھ ہفتے کے اندر اندر آسٹروی افواج کے آخری دستے کا کونگ گراٹس[1] اور سیڈووا[2] کے مقامات پر خاتمہ ہوا۔ اور وی آنا تک رستہ کھل گیا۔ لیکن بسمارک کا ارادہ انتہا تک پہنچنے کا نہ تھا۔ جانتا تھا کہ یورپ میں بعض لوگوں سے دوستی رکھنی پڑیگی۔ شکست خوردہ ہیپسبرگ کے سامنے معقول شرائط صلح پیش کیں بشرطیکہ وہ مملکت متحدہ جرمن کی صدارت سے دستبردار ہو جائیں۔ جن چھوٹی چھوٹی جرمن ریاستوں نے آسٹریا کا ساتھ دیا تھا۔ ان کے ساتھ سختی سے پیش آیا۔ اور انہیں پرشیا کے ساتھ ملحق کر لیا۔ اس کے بعد بیشتر شمالی ریاستوں نے ایک نیا اتحاد قائم کیا۔ جس کا نام شمالی مملکت متحدہ جرمن قرار پایا اور فتحمند پرشیا نے بے ضابطہ طور پر جرمن قوم کی سرداری کا منصب خود سنبھال لیا +

جس سرعت سے یہ اتحاد عمل میں آیا۔ اس پر یورپ انگشت بدندان رہ گیا۔ انگلستان نے پروا نہ کی۔ لیکن فرانس کسمسایا۔ فرانس میں نیپولین کا اقتدار کمزور ہو رہا تھا۔ جنگ کریمیا پر بہت سا روپیہ خرچ ہو گیا تھا۔ اور ہاتھ کچھ بھی نہ آیا تھا +

---

[1] Koniggratz [2] Sadowa

۱۸۶۳ء میں فرانس نے ایک بار پھر فوج کشی کی تھی جس کا مقصد یہ تھا۔ آسٹریا کے ایک گرینڈ ڈیوک میکسملین نامی کو میکسیکو کا شہنشاہ بنا دیا جائے لیکن جب امریکہ کی اندرونی جنگ میں افواج شمالی کو فتح حاصل ہوئی۔ تو فرانس کی تمام کوششیں خاک میں مل گئیں۔ واشنگٹن کی حکومت نے فرانسیسوں کو فوج ہٹا لینے پر مجبور کر دیا۔ اہل میکسیکو نے اس سے فائدہ اٹھا کر غنیم کو ملک سے نکال دیا۔ اور ہونے والے شاہنشاہ کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔

اب اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کہ نپولین کے تاج شاہنشاہی کو جس کی درخشندگی مات ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر جلا دی جائے۔ نپولین جانتا تھا کہ شمالی مملکت متحدہ جرمن چند سال کے اندر زور پکڑ کر فرانس کے مقابلے میں آن کھڑی ہوگی۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ فرانس کے شاہی خاندان کے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے جرمنی سے جنگ آزمائی کرنا ضروری ہے۔ بہانے کی تلاش شروع ہوئی۔ اور نظر ہسپانیہ پر پڑی جس کی کمر لاتعداد انقلابات کے بوجھ سے ٹوٹ چکی تھی۔

اتفاق کی بات ہے۔ کہ اس وقت تخت ہسپانیہ خالی پڑا تھا۔ ایک مرتبہ یہ تخت خاندان ہوہن زولرن کے کیتھولک شہزادوں کی خدمت میں پیش کیا جا چکا تھا۔ لیکن فرانس معترض ہوا تھا۔ اور خاندان ہوہن زولرن نے شکریہ کے ساتھ یہ پیشکش واپس کر دی تھی۔ لیکن نپولین جس کی صحت بگڑ رہی تھی۔ اپنی حسین بیوی یوجینی ڈی مانٹیخو[1] کے اشارے پر ناچتا تھا (یوجینی ہسپانیہ کے ایک رئیس کی بیٹی تھی۔ اس کا نانا ولیم کرک پیٹرک ملاگا میں، جہاں کے انگور مشہور ہیں۔ امریکن قونصل تھا)۔ یوجینی یوں تو بہت زیرک تھی لیکن اس زمانے کی دیگر ہسپانوی خواتین کی طرح تعلیم سے بے بہرہ تھی۔ اپنے روحانی مشیروں کی بہت معتقد تھی۔ اور ان مشیروں کو پرشیا کے پراٹسٹنٹ بادشاہ سے سخت نفرت تھی۔ ملکہ نے اپنے شوہر کو یہ مشورہ تو ضرور دیا۔ کہ "[illegible]" لیکن یہ کہتا

---

[1] Eugenie de Montijo

بھول گئی۔ کہ "اپنے پاؤں آپ کلہاڑی مارنے سے گریز کرو"۔ نپولین کو اپنی فوجی طاقت پر بہت اعتماد تھا۔ اسی کے بل بوتے پر شاہ پرشیا کو پیغام بھیجا۔ کہ ہم سے وعدہ کرو۔ کہ آئندہ تم ہوہن زولرن خاندان کے کسی شہزادے کو کبھی ہسپانوی تاج کا امیدوار بننے نہ دو گے۔ ہوہن زولرن پہلے ہی تخت سے انکار کر چکے تھے۔ اس لئے یہ وعدہ لینا فضول تھا۔ چنانچہ بسمارک نے حکومت فرانس کو یہی جواب دیا۔ لیکن نپولین اس سے مطمئن نہ ہوا +

یہ ۱۸۷۰ء کا واقع ہے۔ شاہ ولیم ایمز[1] کے صحت افزا ساحل پر مقیم تھا۔ ایک دن فرانیسی سفیر وہیں آن پہنچا۔ اس نے اس مسئلے پر بحث شروع کی۔ بادشاہ نے بڑے اخلاق سے پہلے تو بات ٹال دی۔ اور پھر کہا کہ ہسپانیہ کا مسئلہ طے ہو چکا ہے۔ اب اس پر بحث کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ معمول تھا۔ اس گفتگو کی اطلاع بسمارک کو جو امور خارجہ کا ذمہ وار تھا۔ بذریعہ تار دی گئی۔ بسمارک نے اس اطلاع میں اپنی مرضی اور مصلحت کے مطابق ایزاد تخفیف اور ردّو بدل کر کے اسے پرشیا اور فرانس کے اخبارات کو بغرض اشاعت بھیج دیا۔ بسمارک کی اس حرکت کو اکثر لوگوں نے مذموم قرار دیا۔ لیکن بسمارک بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتا تھا۔ کہ ابدالاباد سے مہذب حکومتیں سرکاری اطلاعات میں مصلحت کے مطابق ردوبدل کرتی چلی آئی ہیں۔ جب بسمارک کی تحریف کردہ اطلاعات شائع ہوئیں۔ تو برلن کے شہریوں کو یہی معلوم ہوا۔ کہ ہمارے خوش اخلاق اور معمر بادشاہ کی ایک حقیر اور متکبر فرانیسی کے ہاتھوں سخت توہین ہوئی ہے اور فرانس کے لوگوں کو یہ خبر پہنچی کہ ہمارے خوش اخلاق سفیر کو شاہ پرشیا نے اپنے چوبداروں کو بلوا کر باہر نکلوا دیا ہے +

چنانچہ دونوں میں جنگ برپا ہوئی۔ دو مہینے کے اندر اندر نپولین اور اس کی فوج کے بیشتر سپاہی جرمنی کے ہاتھ اسیر ہوئے۔ مملکت دوم مٹ گئی۔ جمہوریت سوم جرمن حملہ آوروں سے پیرس کو بچانے کے لئے تدبیریں سوچنے لگی۔ پیرس

---

[1] Ems

نے پانچ مہینے تک مقابلہ کیا۔ سقوطِ شہر سے دس دن پہلے ورسائی کے محل میں (جو جرمنوں کے جانی دشمن لوئی چہاردہم کی یادگار تھا) شاہ پرشیا کو شہنشاہ جرمن کا لقب دیا گیا۔ اور اس بات کا عام اعلان کر دیا گیا۔ جب پیرس کے فاقہ زدہ شہریوں نے توپوں کی آواز سنی۔ تو سمجھ گئے کہ قدیم ٹوٹا تک ریاستوں کا بے ضرر متحدہ گروہ اب ختم ہو چکا ہے۔ اور ایک جدید مملکت جرمنی نے ان کی جگہ لے لی ہے +

ان بھونڈے طریقوں سے آخرکار جرمنی کے مسئلے کا فیصلہ ہوا۔ ۱۸۷۱ء کے آخر تک بیعنی وی آنا کے مشہور اجتماع کے چھپن سال بعد کانگرس کا تمام کام خاک میں مل گیا۔ میٹرنخ۔ ایگزنڈر اور ٹیلی راں نے یہ کوشش کی تھی۔ کہ اہل یورپ کو ہمیشہ کے لئے امن نصیب ہو۔ لیکن اس کے لئے جو وسائل انہوں نے اختیار کئے تھے۔ ان کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ نکلا۔ کہ بے شمار جنگیں چھڑ گئیں۔ اور جابجا انقلابات برپا ہوئے۔ اٹھارویں صدی میں اخوت انسانی کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا۔ وہ مٹ گیا۔ اور قوموں نے وطنیت کے جوش کو انتہا کے درجے تک پہنچا دیا + وطنیت کا یہ جذبہ اب تک سیاسیات عالم میں کارفرما ہے +

انجن کا زمانہ

لیکن ادھر یورپ کے باشندے قومی آزادی کی خاطر جنگ کر رہے تھے۔ ادھر نئی نئی کلیں ایجاد ہو رہی تھیں۔ جن کی بدولت دنیا کا حلیہ بدل رہا تھا۔ اور اٹھارویں صدی کا بے ڈھنگا بھاپ کا انجن بیش از بیش انسان کی خدمت کے لئے مفید ثابت ہو رہا تھا

نسل آدم کے سب سے بڑے خیر خواہ کو مرے ہوئے پانچ لاکھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس مشفق بنی نوع انسان کے جسم پر لمبے لمبے بال تھے۔ ماتھا تنگ تھا۔ آنکھیں اندر کو دھسی ہوئی تھیں۔ اور دانت شیر کے سے اور مضبوط تھے۔ اگر یہ شخص جدید سائنس دانوں کے مجمع میں صورت دکھائے تو کچھ بھلا معلوم نہ ہو۔ لیکن اہل علم ضرور اس کی عزت کریں۔ اور اسے اپنا استاد مانیں۔ کیونکہ یہی وہ شخص تھا جس نے پتھر سے چیزیں توڑنے کا کام لیا۔ اور لٹھ کے ذریعے سے بھاری پتھروں کو اٹھانا سیکھا۔ پیرم اور ہتھوڑا جو انسان کے اولین اوزار ہیں۔ اسی نے ایجاد کئے۔ اور جو فوقیت انسان کو تمام دیگر حیوانوں پر حاصل ہے۔ وہ اسی شخص کی طفیل ہے۔ کیونکہ جتنا اس شخص نے انسانوں کو دیگر جانداروں سے بلند تر مرتبے پر پہنچایا۔ اتنا کوئی اور موجد نہیں پہنچا +

اس زمانے سے لے کر آج تک انسان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے۔ کہ نئے نئے اوزار ایجاد کرتا رہے۔ اور ان کو استعمال میں لا کر اپنی زندگی میں سہولتیں پیدا کرتا رہے۔ جب شروع شروع میں انسان نے ایک پرانے درخت کی لکڑی

کا ایک مدور موٹا سا تختہ کاٹ کر اس سے پہیے کا کام لیا۔ تو ایک لاکھ سال قبل مسیح کے دنیا میں ویسی ہی ہلچل مچی۔ جیسی چند سال ہوئے۔ ہوائی جہاز کی ایجاد سے جدید دنیا میں برپا ہوئی تھی ؛

کہتے ہیں۔ پچھلے صدی کے اوائل میں شہر واشنگٹن کے پیٹنٹ آفس کے ایک ڈائرکٹر نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ پیٹنٹ آفس کو اب منسوخ کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ میری رائے میں جو کچھ ایجاد ہونا ممکن تھا۔ وہ ایجاد ہو چکا + جب دنیائے قدیم میں بادبان ایجاد ہوا تھا۔ اور اس کی مدد سے لوگ بغیر کھینے کے کشتی کو رسوں سے کھینچنے کے سطح آب پر حرکت کرنے لگے تھے۔ تو اس زمانے کے لوگوں کو بھی یہی احساس ہوا ہو گا۔ کہ بس اب ایجادات انسانی انتہائے کمال کو پہنچ گئی ہیں +

انسان کی سرگزشت پر غور کرو۔ تو سب سے دلچسپ بات اس میں یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ انسان ہمیشہ اسی کوشش میں مصروف رہا ہے۔ کہ میرا کام کوئی اور شخص نبٹا دے۔ یا کسی کل کے ذریعے سے ہونے لگے۔ تاکہ میں فراغت سے زندگی کا حظ اٹھاتا رہوں اور فرصت کے اوقات میں دھوپ میں بیٹھا رہوں یا چٹانوں پر تصویریں کھینچتا رہوں۔ یا خونخوار جانوروں کے بچوں کو سدھاتا رہوں ؛

پرانے زمانے کا طریقہ تو یہ تھا۔ کہ اگر کوئی ہمسایہ قوم تم سے کمزور ہے۔ تو اسے اپنا غلام بنا لو۔ اور حقیر کام سب اس کے سپرد کر دو۔ اہل یونان اور اہل روما زیرکی اور فراست میں ہم سے کم نہ تھے۔ لیکن ان کی ایجادات ہماری کلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ غلامی اس زمانے میں بہت عام تھی کسی جید ریاضی دان کو کیا ضرورت پڑی تھی۔ کہ وہ اپنا وقت پیچوں اور میخوں اور کلوں پر ضائع کرے۔ اور ہر وقت کھٹ کھٹ لگائے رکھے۔ اور اپنا کمرہ شور اور دھوئیں سے بھر دے۔ غلام بازار میں عام بکتے تھے۔ جب ضرورت پڑتی۔ تھوڑے سے مول کے عوض ایک غلام خرید لاتے۔ اور محنت مشقت کے سب کام اس کے حوالے کر دیتے +

زمانۂ وسطیٰ میں غلام رکھنے کا دستور تو نہ تھا۔ لیکن پیشہ ور لوگوں کی انجمنیں

مشینری کے استعمال کو مستحسن نہ سمجھتی تھیں۔ کیونکہ ان کو خدشہ تھا۔ کہ اس سے ان کے کئی ہم پیشہ بھائی بیکار ہو جائیں گے۔ علاوہ بریں زمانہ وسطیٰ میں پیداوار بھی وسیع پیمانے پر نہ ہوتی تھی۔ نہ کسی کو اس کا خیال آتا تھا۔ کہ پیداوار کی توسیع کی جائے۔ مثلاً جو لوگ درزی یا قصائی یا بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ وہ صرف اپنے گرد و نواح کے باشندوں کی ضروریات کو مدنظر رکھتے تھے۔ اس سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ ان کو اس بات کی خواہش ہی نہ تھی۔ کہ ساتھ کے ملکوں کے جو حرفت پیشہ لوگ ہیں۔ ان سے مقابلہ کریں۔ یا پیداوار کو ضروریات سے متجاوز ہونے دیں +

نشاۃ ثانیہ کے دور میں جب کلیسا کا زور کم ہو گیا۔ اور علمی تحقیقات کی مخالفت کمزور پڑ گئی۔ تو کئی لوگ ریاضی اور علم الاجرام اور طبیعات اور کیمیا کی طرف متوجہ ہوئے۔ سی سالہ جنگ سے دو سال پہلے سکاٹ لینڈ کے ایک باشندے جان نیپیر نامی نے ایک چھوٹی سی کتاب شائع کی جس میں اس نے لوگارثم کے قاعدے سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ دوران جنگ میں گوٹفرئیڈ لائبنیز[1] نے ریاضی کا ایک نیا قاعدہ یعنی کیلکیولس وضع کیا۔ ویسٹ فیلیا کی صلح سے آٹھ سال پیشتر انگریز فلاسفر نیوٹن پیدا ہوا۔ اور اسی سال اطالوی منجم گیلیلیو فوت ہوا + جب سی سالہ جنگ نے یورپ کی خوشحالی کا ستیاناس کر دیا۔ تو لوگوں میں مہوسی کا شوق پیدا ہوا۔ یعنی اس علم سے دلچسپی پیدا ہوئی جس کی مدد سے زمانہ وسطیٰ کے لوگ سونا بنانے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ سونا تو نہ بن سکا۔ لیکن تجربات کے دوران میں کئی مفید دریافتیں ہوئیں جس نے مہوسوں کے جانشینوں یعنی ماہرین کیمیا کے علم کو ترقی بخشی +

اہل جستجو کی ان کی کارگزاریوں کی بدولت رفتہ رفتہ علم انسانی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور بالآخر سائنس کا ایک ڈھانچہ تیار ہو گیا۔ جس پر ایجادات کی عمارت کھڑی کی گئی۔ علم کی بدولت پیچیدہ سے پیچیدہ کلوں کی تعمیر بھی ممکن نظر آنے لگی چنانچہ

---

[1] Leibnitz



عصر جدید کا ایک شہر

عمل پسند لوگوں نے علم پسند لوگوں کی دریافت سے فائدہ اٹھایا - زمانہ وسطیٰ میں جو چند ایک کلیں استعمال ہوتی تھیں - وہ سب چوبی تھیں - لوہا لکڑی سے کہیں بہتر ثابت ہوا - لیکن انگلستان کے علاوہ باقی ممالک میں لوہا کمیاب تھا - کچی دھات کو صاف کرنے کے لئے آگ کی ضرورت تھی - شروع شروع میں لکڑی جلاتے تھے - لیکن جنگل رفتہ رفتہ کٹ کٹ کر بالکل صاف ہو گئے - اور لکڑی کا ذخیرہ ختم ہو گیا - اس کے بعد پتھر کا کوئلہ (جو قدیم درختوں کے پتھرا جانے سے بنتا ہے) استعمال ہونے لگا - لیکن کوئلہ زمین سے نکلتا ہے - ایک تو اسے کان سے نکال کر بھٹیوں تک پہنچانا پڑتا ہے - اور پھر ان کانوں کو سیلاب سے محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے +

ان مشکلات کا حل سوچنا پڑا - کچھ عرصہ تو گاڑیاں کھینچنے کا کام گھوڑوں سے لیا - لیکن پانی نکالنے کے لئے پمپوں اور خاص کلوں کی ضرورت محسوس ہوئی - کئی موجد اس کام میں لگے رہے - سب جانتے تھے - کہ ان مشینوں کو چلانے کے لئے بھاپ استعمال کرنی پڑے گی - کیونکہ بھاپ کے استعمال سے سب واقف تھے - سکندریہ کے ایک باشندے ہیرو نامی نے جو پہلی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے - کئی ایسی مشینوں کا ذکر کیا ہے - جو بھاپ سے چلتی تھیں - نشاۃ ثانیہ کے لوگ بھی جنگی رتھوں کے چلانے کے لئے بھاپ استعمال کرنا چاہتے تھے - ورسسٹر[۱] کے ایک امیر نے جو نیوٹن کا ہمعصر تھا - اپنی کتاب ایجادات میں بھاپ کے انجن کا ذکر کیا ہے - اس سے تھوڑے عرصے بعد یعنی ۱۶۹۸ء میں لندن کے ایک شخص ٹامس سیوری[۲] نے ایک پمپ پیٹنٹ کرانے کے لئے درخواست دی - اسی زمانے میں ہالینڈ کا ایک باشندہ کرسچین ہائگنز[۳] ایک ایسا انجن ایجاد کرنے میں مصروف تھا جس میں بارود کو مقررہ اوقات پر اڑا کر حرکت پیدا کی جاتی تھی - بعینہٖ اس طرح جیسے موٹر کاروں میں پٹرول کی گیس استعمال ہوتی ہے +

۱؎ Worce ster ۲؎ Thomas Savery ۳؎ Christian Huygens

..یورپ بھر میں لوگ بھاپ کے استعمال پر غور کر رہے تھے۔ ایک فرانسیسی پاپین[۱] نامی جو ہائیگنز کا دوست اور مددگار تھا۔ کئی ممالک میں بھاپ کے انجن کی آزمائش کر رہا تھا۔ اس نے بھاپ کا ایک چھوٹا سا چھکڑا اور ایک دخانی کشتی ایجاد کی۔ لیکن جب اس کشتی کو پانی میں چلانے لگا۔ تو ملاحوں کی انجمن نے شکایت کی کہ اس سے ہم بے روزگار ہو جائینگے۔ حکام نے کشتی ضبط کر لی۔ پاپین نے اپنا سب اثاثہ تجربات کی نذر کر دیا تھا۔ چنانچہ بہت عسرت کی حالت میں شہر لندن میں اس کا انتقال ہوا۔ لیکن جب اس کی وفات ہوئی۔ تو ایک اور ماہر طامس نیوکومن[۲] نامی ایک نئی قسم کے سٹیم پمپ پر تجربہ کر رہا تھا۔ پچاس سال بعد اسی انجن کو گلاسگو نے ایک کاریگر جیمز واٹ[۳] نامی نے ایک نئی شکل دے کر ۱۷۶۵ء میں پہلا سٹیم انجن ایجاد کیا۔ جو عملی دنیا میں بہت ہی کارآمد ثابت ہوا۔

لیکن ان تجربات کے دوران میں سیاسی دنیا کے اندر بہت سی تبدیلیاں ظہور پذیر ہو چکی تھیں۔ دنیا بھر کے تجارتی مال کو لادنے لے جانے کا کام اہل ہالینڈ کی بجائے اب انگریز سرانجام دے رہے تھے۔ انگریزوں نے نوآبادیاں قائم کر لی تھیں۔ وہاں کی پیداوار انگلستان لے جاتے تھے۔ انگلستان میں مال تیار کرتے تھے۔ اور پھر اُسے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا آتے تھے۔ سترھویں صدی میں جارجیا اور کیرولینا کے باشندے روئی کی کاشت کرنے لگے۔ جب فصل تیار ہو جاتی۔ تو اسے انگلستان بھیج دیتے۔ وہاں لنکاشائر کے لوگ اس سے کپڑا بنتے۔ کاریگر لوگ کپڑا بننے کا کام اپنے اپنے گھروں میں اپنے ہاتھ سے کرتے لیکن تھوڑے عرصے کے اندر اندر اس صنعت میں کئی اصلاحیں ہوئیں۔ ۱۷۳۳ء میں جان کے[۴] نے "اڑنے والی نال" ایجاد کی۔ ۱۷۷۰ء میں جیمز ہارگریوز[۵] نے کاتنے کی مشین کو پیٹنٹ کرا لیا۔ ایک امریکن ایلی وٹنے[۶] نے ایک اوٹنی ایجاد کی۔ پہلے یہ کام ہاتھ سے ہوتا تھا۔ اور دن بھر میں آدھ سیر سے زیادہ روئی نہ اونٹ

---

۱ Papin ۲ Thomas Newcomen ۳ James Watt

۴ John Kay ۵ James Hargreaves ۶ Eli Whitney

سکتے تھے۔ اور سب سے آخر میں رچرڈ آرکرائٹ[1] اور پادری ایڈمنڈ کارٹ رائٹ[2] نے کپڑا بننے کی بڑی بڑی مشینیں ایجاد کیں جو پانی کے زور سے چلتی تھیں۔ اس کے بعد ۱۷۸۹ء کے قریب جب فرانس کی سٹیٹس جنرل بنے اجلاسوں سے یورپ میں سیاسی انقلاب کی طرح ڈال رہی تھی۔ واٹ کے انجن میں رد و بدل کر کے اس سے آرک رائٹ کی ایجاد کردہ کپڑا بننے کی مشینوں کو چلانے کا کام لیا گیا۔ اس جدت سے ایک اقتصادی اور معاشرتی انقلاب برپا ہوا جس کی بدولت دنیا کے ہر حصے میں انسانی تعلقات نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔

جب سٹیم انجن کامیاب ثابت ہوا۔ تو ماہرین نے اس کی مدد سے کشتیاں اور گاڑیاں چلانے کے کام پر غور کرنا شروع کیا۔ واٹ نے خود بھی اس قسم کے ایک انجن کا نقشہ تیار کیا تھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ اس کے خیالات عملی شکل اختیار کریں ۱۸۰۴ء میں رچرڈ ٹریویتھک[3] کے بنائے ہوئے متحرک انجن کو ویلز کی کانوں کے علاقے میں بیس ٹن بوجھ کھینچنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

اسی زمانے میں امریکہ کا ایک جوہری اور مصور جس کا نام رابرٹ فلٹن[4] تھا پیرس میں رہتا تھا۔ اس نے نپولین کو اپنی ایجادات کا حال سنایا۔ اور اُسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ کہ میری ایجاد کردہ آبدوز کشتی اور سٹیم بوٹ سے اہل فرانس انگریزوں کی بحری طاقت کو نیچا دکھا سکتے ہیں۔

فلٹن کی سٹیم بوٹ میں کوئی خاص جدت نہ تھی۔ اس نے دراصل امریکہ کے ایک کاریگر جان فچ[5] کے خیالات کا سرقہ کیا تھا۔ جس نے ۱۷۸۷ء میں اپنا سٹیمر دریائے ڈیلاویر میں چلا کر دکھایا تھا۔ لیکن نپولین کو اس بات کا یقین نہ آیا۔ کہ یہ خود بخود چلنے والی کشتیاں عملی طور پر مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ خود دریائے سین کے اندر نپولین کی آنکھوں کے سامنے دخانی کشتی بڑی خوبی سے چل رہی تھی۔ لیکن نپولین نے اس بے پناہ ایجاد سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اگر وہ اتنی بے پروائی سے

---

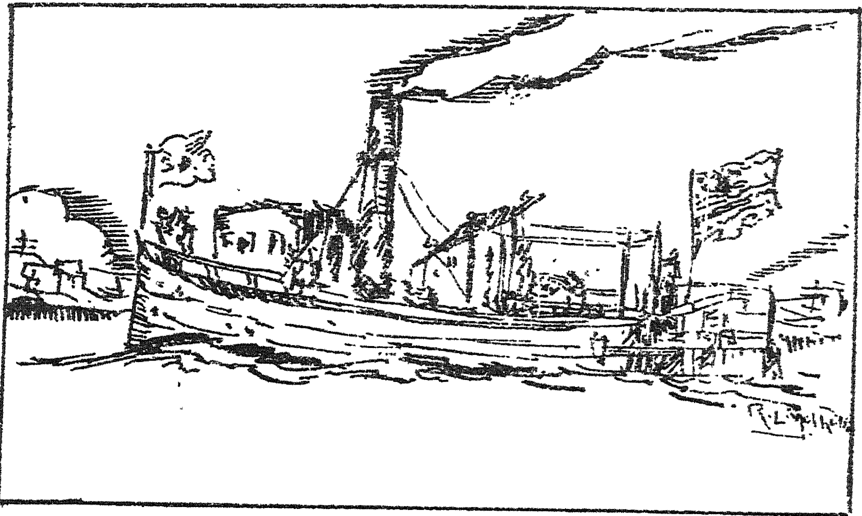
[1] Richard Arkwright [2] Edmund Cartwright [3] Richard Treithick

[4] Robert Fulton [5] John Fitch

سے کام نہ لیتا۔ تو عجب نہیں کہ وہ انگریزوں سے ٹرنیا لگر کا انتقام لینے کے قابل بن جاتا ؎

فلٹن امریکہ واپس چلا گیا۔ آدمی کاروباری تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اُس نے رابرٹ لونگسٹن[ا] کے ساتھ شریک ہو کر ایک سٹیم بوٹ کمپنی بنائی۔ جو بہت کامیاب رہی (جس زمانے میں فلٹن پیرس میں مقیم تھا۔ ان دنوں لونگسٹن وہاں امریکن سفیر کے منصب پر فائز تھا)۔ اس کمپنی کے پہلے سٹیمر کا نام کلیر مونٹ تھا۔ اس کا انجن انگلستان کے کاریگر بولٹن اور واٹ کا بنایا ہوا تھا۔ نیویارک کے تمام آبی رستوں کا اجارہ اسی سٹیمر کے پاس تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۷ء میں اس نے نیویارک اور ایلینسی کے درمیان باقاعدہ آنا جانا شروع کر دیا ؎

سب سے پہلے غریب جان فچ نے سٹیم بوٹ کو تجارتی اغراض کے لئے استعمال کیا تھا۔ لیکن اس بیچارے کا انجام بہت حسرتناک ہوا صحت نے جواب دے دیا



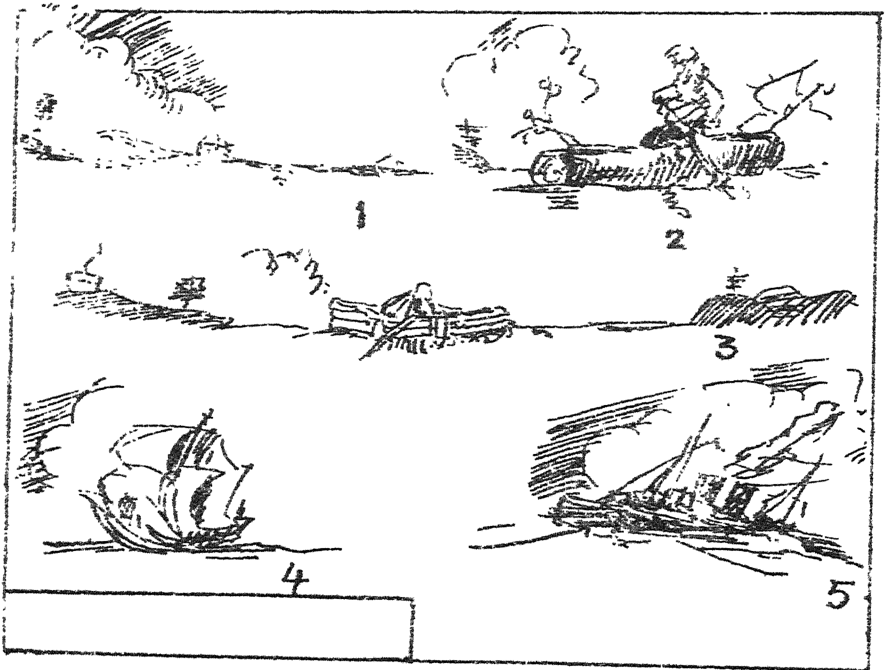
سب سے پہلی سٹیم بوٹ

جیب خالی ہو گئی۔ جب اس کی پانچویں کشتی جو کل کے ذریعے پیچدار چپوؤں سے چلتی تھی۔ ٹوٹ کر بیکار ہو گئی۔ تو پاس کھانے کو بھی کچھ نہ رہا۔ اس کے پڑوسی اس کا

ا؎ Robert Livingston

مذاق اڑاتے تھے (جس طرح سو سال بعد لوگ پروفیسر سینگلے، ذرائع کے اڑنے کھٹولوں کا مضحکہ اڑاتے تھے)۔ فچ کے دل میں یہ آرزو تھی کہ ان دخانی کشتیوں کے ذریعے سے مغرب کے چوڑے چوڑے پاٹ دار دریاؤں میں آمد و رفت کی سہولتیں پیدا کی جائیں۔ لیکن اس کے ہموطن چپٹی کشتیوں میں یا پیدل سفر کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ فچ از حد دل برداشتہ ہو گیا۔ اور جب صبر نے جواب دے دیا۔ تو ۱۷۹۸ء میں زہر کھا کر مر گیا۔

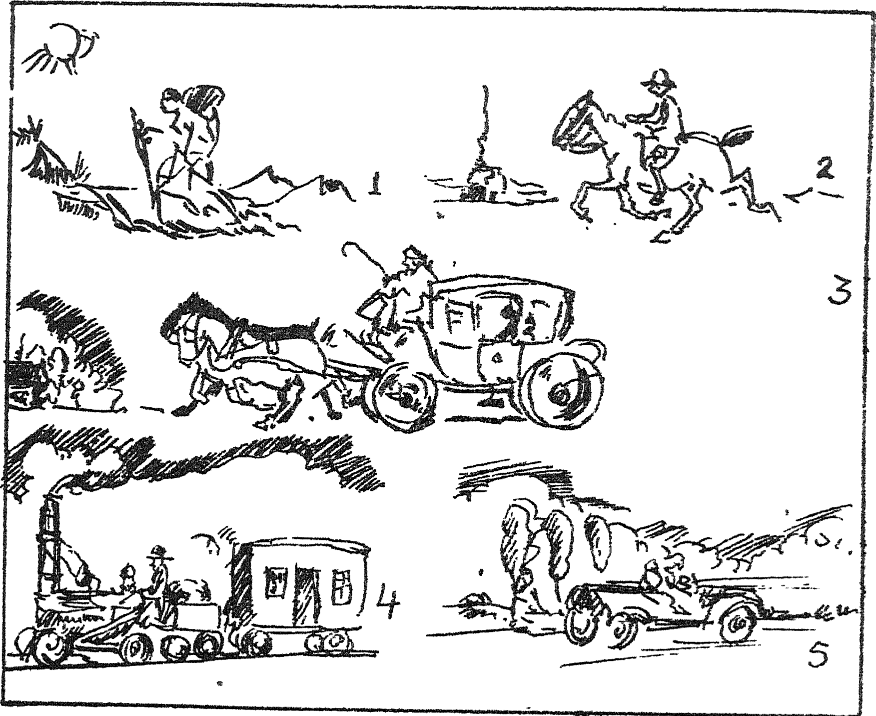
لیکن بیس سال بعد ۱۸۵۰ء تک کے ایک سٹیمر سیونہ نامی نے جو چھ بحری میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا تھا۔ (ماریٹینیا کی رفتار اس سے چار گنا ہے) سوانا سے لے کر لورپول تک کا سفر پچیس دن میں طے کر کے ریکارڈ قائم کیا۔ لوگوں نے دخانی کشتی کی ہنسی اڑانا بند کر دیا۔ اور جب جوش میں آئے۔ تو تحسین کے پھول اس پر برسائے۔ جو اس ایجاد کا بانی نہ تھا۔



سٹیم بوٹ کی ایجاد

سکاٹ لینڈ کا ایک باشندہ جارج اسٹیفنسن نامی کوئلے کی کانوں سے

پھٹیوں اور روئی کے کارخانوں تک کوئلہ لے جانے کے لئے متحرک انجن بناتا رہا تھا۔ چھ سال بعد اس نے اپنا مشہور و معروف "سفری انجن" ایجاد کیا جس کی بدولت کوئلے کی قیمت میں ستر فیصدی کے قریب تخفیف ہوئی۔ مانچسٹر اور لورپول کے درمیان باقاعدہ طور پر سواریوں کے لئے ریل چلنے لگی۔ اور لوگ پندرہ میل کی رفتار سے سفر کرنے لگے۔ جو اس زمانے میں ایک حیرت انگیز بات سمجھی جاتی تھی۔ بارہ سال بعد یہ رفتار بیس میل تک جا پہنچی۔ آج کل عام فورڈ گاڑی بھی (جو پچھلی صدی کے ڈیملر اور لیواسور کی اولاد ہے) اس سے زیادہ تیز چل سکتی ہے +



موٹر کار کی ایجاد

لیکن ادھر یہ عمل پسند کاریگر اور انجینئر اپنے دخانی انجنوں کو روز بروز بہتر بنا رہے تھے۔ ادھر "خالص" سائنس دان جو روزانہ چودہ گھنٹے ان علمی مسائل میں منہمک رہتے ہیں۔ جن کے بغیر مشینوں کا وجود ہی ناممکن ہے ایک

اور ہی کھوج میں لگے ہوئے تھے - ایسا معلوم ہوتا تھا - کہ ان کی تحقیق اور جستجو فطرت کے پوشیدہ ترین اسرار کو بے نقاب کر کے چھوڑیگی ۔

آج سے دو ہزار سال پہلے بہت سے یونانی اور رومن حکما نے خصوصاً ملیٹس کے باشندے تھیلز نے اور اس کے علاوہ پلائنی نے (جس نے ۷۹ء میں پومپئی اور ہرکیولینیم کی تباہی کے وقت آتش فشاں پہاڑ وسوویس کی آتش فشانی کے مطالعے میں اپنی جان نذر کر دی تھی) دیکھا - کہ اگر کہربا کو اون سے رگڑ کر کسی تنکے یا پر کے قریب لے جائیں - تو تنکا یا پر کھنچ آتا ہے - زمانۂ وسطےٰ کے اہل مکتب کو اس پر اسرار برقی قوت سے چنداں دلچسپی نہ تھی - لیکن نشاۃ ثانیہ کے بعد ملکہ الزبتھ کے معالج خاص ولیم گلبرٹ نامی نے مقناطیس کے خواص پر ایک کتاب شائع کی سی سالہ جنگ کے دوران میں اوٹو فان[1] گوریکہ نے جو میگڈیبرگ کا برگوماسٹر اور ہوائی پمپ کا موجد تھا - سب سے پہلی برقی مشین ایجاد کی - اگلی صدی میں کئی سائنس دان برق کے مطالعہ میں مصروف رہے - ۱۷۹۵ء میں ایک چھوٹر تین پروفیسروں نے لیڈن کا مرتبان ایجاد کیا - امریکہ کے عالم متبحر بنجمن فرینکلن کو بھی یہی دھن لگی تھی - اس نے یہ دریافت کیا - کہ بادلوں کی بجلی اور برقی شرارہ ایک ہی برقی قوت کے دو مظاہرے ہیں - فرینکلن عمر بھر برق کا مطالعہ کرتا رہا - اس کے بعد والٹا[2] آیا - جس نے برقی مورچہ ایجاد کیا - اور اس کے بعد گلوانی اور ڈے اور ہالینڈ کا پروفیسر اورسٹڈ اور ایمپیر اور اراگو اور فیراڈے سب یکے بعد دیگرے برقی قوت کی ماہیت دریافت کرنے میں رات دن کوشاں رہے ۔

ان ماہرین نے اپنی دریافتوں کو عوام سے نہ چھپایا - بلکہ لوگوں کو بطیب خاطر ان سے آگاہ کیا - تاکہ کوئی ان سے محروم نہ رہے - سموئیل مورس کو (جو فلٹن کی طرح سائنس دان بننے سے پہلے مصور تھا) یہ خیال سوجھا کہ برقی رو کو ایک شہر سے دوسرے شہر تک پیغام بھیجنے کے لئے استعمال کیا جائے - اس کا

---

[1] Otto von Guericke　[2] Volta

خیال تھا۔ کہ تانبے کے تار اور ایک چھوٹی سی مشین کی مدد سے جو اس نے خود ایجاد کی تھی یہ کام نکل سکتا ہے۔ کسی نے اس کی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ بلکہ لوگوں نے اس کی ہنسی اڑائی۔ مورس کے پاس اس کے سوا اور کچھ چارہ نہ تھا۔ کہ اپنی جیب سے روپیہ خرچ کرے۔ چنانچہ اس نے اپنی سب پونجی انہی تجربات پر صرف کر دی۔ اور جب پاس کچھ باقی نہ رہا۔ تو لوگوں نے اور بھی ہنسی اڑائی۔ اس نے کانگریس کے سامنے دست سوال پھیلایا۔ اور کانگریس کی ایک خاص تجارتی کمیٹی نے مدد کا وعدہ بھی کیا۔ لیکن کانگریس کے ارکان نے سرد مہری برتی۔ چنانچہ بارہ سال گزر گئے۔ جب جا کر کہیں تھوڑی سی بھیک ملی۔ مورس نے بالٹی مور اور واشنگٹن کے درمیان "ٹیلیگراف" قائم کیا۔ ۱۸۳۷ء میں نیویارک یونیورسٹی کے لیکچر ہال میں ٹیلیگراف کو کامیاب بنا کر دکھایا۔ بالآخر ۲۴ مئی ۱۸۴۴ء کو واشنگٹن سے پہلا برقی پیغام بالٹی مور کو بھیجا گیا۔ آج کل اسی ٹیلیگراف کے تاروں کا جال سب دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اور یورپ سے ایشیا تک خبریں چند سیکنڈ میں بھیجی جا سکتی ہیں۔ تینتیس سال بعد الیگزینڈر گراہم بیل نے برقی ٹیلیفون ایجاد کیا۔ نصف صدی بعد مارکونی نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ایسا برقی آلہ وضع کیا۔ جس میں تاروں کے جھمیلے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی +

ادھر امریکہ میں مورس ٹیلیگراف وضع کر رہا تھا۔ ادھر انگلستان میں فیرڈے برقی ڈائینمو بنا رہا تھا۔ یہ چھوٹی سی مشین ۱۸۳۱ء میں مکمل ہو گئی (یورپ میں ان دنوں ان انقلابات کا طوفان بپا تھا۔ جنہوں نے کانگرس وی آنا کے کئے پر پانی پھیر دیا تھا۔) ڈائینمو میں رفتہ رفتہ کئی اصلاحیں ہوئیں۔ اور اس کے استعمال کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ تاآنکہ آج کل گرمی اور روشنی اسی کے ذریعے گھر گھر پہنچائی جاتی ہے۔ (انیسویں صدی کے وسط میں فرانسیسوں اور انگریزوں نے جو تجربات کئے تھے۔ ان سے فائدہ اٹھا کر ۱۸۷۸ء میں ایڈیسن نے بجلی کا قمقمہ ایجاد کیا) ۔ میری رائے ہے کہ جس طرح پرانے زمانے کے بے ڈھنگے جانوروں کی جگہ اب ان جانوروں نے لے لی ہے۔ جن کی ساخت

زیادہ پُر حکمت ہے۔ اسی طرح دانشمندی کا رواج بڑھتا جائیگا۔ اور دخانی انجن دنیا سے معدوم ہو جائینگے +

میں ایک مورخ ہوں۔ اس لئے میرا کام یہ ہے کہ واقعات سے انحراف نہ کروں۔ اور خیالی پلاؤ نہ پکاؤں۔ لیکن اگر میں افسانہ نویس ہوتا۔ اور اپنے تخیل سے کام لے سکتا۔ تو میں مستقبل کے اس شاندار عہد کا حال لکھتا۔ جب دخانی انجن کو ایک عجوبہ سمجھ کر کسی عجائب خانے میں رکھ دیا جائے گا۔ ان جانوروں کے پنجروں کے پہلو بہ پہلو جن کا نشان اب صفحہ ہستی سے مٹ چکا ہے +

معاشرتی انقلاب

لیکن ان نئی نئی مشینوں پر بہت لاگت آتی تھی۔ اس لئے صرف امیر لوگ ہی انہیں استعمال کر سکتے تھے۔ جو لوگ بڑھئی یا موچی کا کام کرتے تھے۔ وہ پہلے پہل اپنی چھوٹی سی دکان میں بادشاہت کرتے تھے۔ اب انہیں مشین والوں کے ہاں ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ اس سے ان کی آمدنی تو بڑھ گئی۔ لیکن پہلے کی سی آزادی جاتی رہی۔ اور یہ بات انہیں بہت گراں گزری۔

اگلے وقتوں میں دنیا کی صنعت وحرفت آزاد کاریگروں کے ہاتھ میں تھی۔ جو اپنے اپنے گھروں کے سامنے چھوٹی چھوٹی دوکانیں لگا لیتے۔ اوزار ان کے اپنے ہوتے۔ اور شاگردوں کو جب چاہتے ڈانٹ ڈپٹ لیتے۔ اپنی اپنی برادری کا کہا تو انہیں ضرور ماننا پڑتا۔ لیکن باقی ہر طرح سے آزادی کی زندگی بسر کرتے ان کی زندگی بھی بہت سادہ تھی۔ کام تو بہت کرنا پڑتا۔ لیکن کسی کے سامنے گردن نہ جھکانی پڑتی۔ کسی دن موسم خوشگوار ہوتا۔ اور ان کا دل چاہتا۔ کہ آج مچھلی کا شکار کیا جائے۔ تو کوئی انہیں روکنے والا نہ ہوتا۔

لیکن جب مشینوں نے دنیا میں قدم رکھا۔ تو نقشہ ہی بدل گیا۔ مشین کیا ہے؟ ایک بہت بڑا اوزار۔ یہ ریل جو ایک منٹ فی میل کی رفتار سے چلتی ہے۔ اور چشم زدن میں ہمیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ دراصل کیا ہے۔ بہت ہی تیز رفتار ٹانگیں۔ بھاپ سے چلنے والا ہتھوڑا۔ جو لوہے کی موٹی موٹی

چادروں کو آسانی سے کوٹ لیتا ہے۔ فی الحقیقت کیا ہے؟ ایک بہت بڑا فولادی گھونسہ۔

ہاتھ پاؤں تو خدا نے سب کو دیئے ہیں۔ لیکن ریل اور دخانی ہتھوڑے اور روئی کی مشینیں ایسی چیزیں ہیں۔ کہ بغیر دولت کے میسر نہیں آسکتیں۔ اور پھر یہ کبھی ایک واحد شخص کی ملکیت بھی نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کی خاطر کمپنیاں قائم کی جاتی ہیں۔ جس میں کئی لوگ روپیہ لگاتے ہیں۔ اور اپنے اپنے حصے کے مطابق نفع آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔

چنانچہ جب مشینیں عملی طور پر مفید ثابت ہونے لگیں۔ تو ان کے بنانے والوں کو صاحب حیثیت گاہکوں کی تلاش ہوئی۔ جو ان مشینوں کو خرید سکیں۔ زمانہ وسطیٰ میں زمین ہی اصلی دولت تھی۔ اور یہ دولت صرف روساء کے پاس تھی۔ لیکن جیسا کہ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ سونا چاندی ان روسا کے پاس بہت کم تھا۔ چنانچہ یہ لوگ خرید و فروخت تبادلے کے ذریعے کرتے۔ یعنی گائیوں کے بدلے گھوڑے اور انڈوں کے بدلے شہد خریدتے۔

صلیبی جنگوں کے زمانے میں جب ایشیا اور یورپ کی باہمی تجارت کو فروغ ہُوا۔ تو شہروں کے سوداگر پیشہ لوگوں نے بہت سی دولت جمع کرلی۔ اور روساء کا مقابلہ کرنے لگے۔

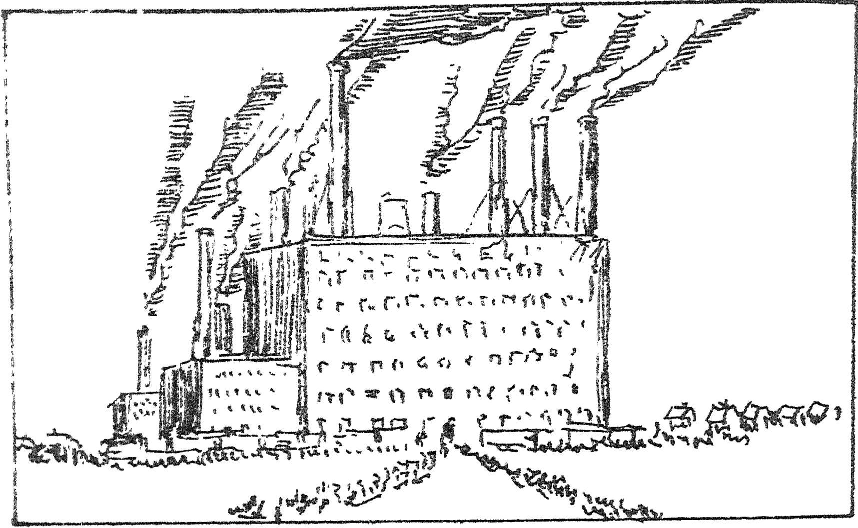
انقلاب فرانس نے روساء کو مفلس اور متوسط حال طبقے کو بیحد متمول بنا دیا۔ انقلاب عظیم کے بعد جو شورش اور بے چینی کا زمانہ آیا۔ اس میں متوسط الحال لوگوں کو زر اندوزی کے کئی موقعے نصیب ہوئے۔ فرانس کی حکومت نے کلیسا کے اوقاف ضبط کرلئے اور نیلام کرڈالے۔ بددیانت اور خائن لوگوں نے خوب ہاتھ رنگے۔ سٹہ بازوں نے کئی ہزار مربع میل زمین غصب کرلی۔ اور نپولین کی جنگوں کے زمانے میں غلے اور بارود کی تجارت پر قابض ہوکر خوب روپیہ کمایا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ضروریات سے کہیں زیادہ دولت جمع کرلی۔ اور اس قابل ہو گئے۔ کہ کارخانے تعمیر کریں۔ اور مشینوں پر کام کرنے کے لئے مردوں اور عورتوں کو ملازم رکھیں۔

اس صورت حالات سے لاکھوں انسانوں کی زندگی میں یکلخت ایک انقلاب رونما ہوا۔ چند سال کے اندر اندر کئی شہروں کی آبادی دوچند ہو گئی۔ پہلے تو لوگ شہر کے اندر رہتے تھے۔ لیکن جب آبادی بہت بڑھ گئی۔ تو اصل شہر کے اردگرد کم خرچ اور بدنما عمارتیں بننے لگیں یہی مزدور پیشہ لوگوں کے مکانات تھے۔ کارخانوں میں گیارہ بارہ یا تیرہ گھنٹے کام کرنے کے بعد یہ لوگ انہی مکانوں میں آکر سو رہتے۔ اور صبح جب کارخانے کی سیٹی بجتی۔ تو یہیں سے نکل کر کام پر جاتے +

دیہات میں یہ مشہور ہوا۔ کہ شہروں میں دولت کی ریل پیل ہے۔ کسانوں کے لڑکے جو کھلی ہوا میں زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ شہروں کو چل دیئے۔ ان دنوں کارخانوں میں ہوا اور روشنی کا انتظام ازحد ناقص تھا۔ چنانچہ جب دیہاتی روپیہ کمانے کی غرض سے شہروں میں آن بسے تو دھوئیں اور گرد اور غلاظت کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہو گئی۔ اور ان میں سے کئی ایک انجام کار محتاج خانوں یا ہسپتالوں میں مر گئے +

اُن دیہاتیوں کی جو اپنے کھیت چھوڑ کر کارخانوں میں نوکر ہو جاتے تھے۔ کئی لوگوں نے مخالفت بھی کی۔ چونکہ ایک مشین سو آدمیوں کا کام کرتی تھی۔ اس لئے وہ ننانوے شخص جو اس کی وجہ سے بیکار ہو گئے۔ ازحد پریشان ہوئے۔ چنانچہ ایسے لوگ اکثر کارخانوں پر دھاوا بول دیتے۔ اور مشینوں کو آگ لگا دیتے۔ لیکن بیمہ کمپنیاں سترھویں صدی میں بھی اچھے پیمانے پر کام کر رہی تھیں۔ اس لئے کارخانوں کے مالک مالی نقصان سے محفوظ رہتے +

تھوڑے ہی عرصے کے اندر نئی اور بہتر وضع کی مشینیں بننے لگیں۔ کارخانوں کے گرد اونچی اونچی فصیلیں کھڑی کی گئیں۔ اور فسادات کا خاتمہ ہوا۔ اس بھاپ اور لوہے کے عہد میں پیشہ وروں کی قدیم برادریاں زندہ نہ رہ سکیں۔ جب برادریاں فنا ہو گئیں۔ تو مزدور پیشہ لوگوں نے یونین قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کارخانوں کے مالک متمول اور بااقتدار لوگ تھے۔ سیاسی حلقوں میں انہیں بہت رسوخ حاصل تھا۔ انہوں نے ایسے قوانین پاس کرائے۔ جن کی رو



کارخانہ

سے تجارتی یونین ممنوع قرار پائے۔ وجہ یہ بیان کی گئی۔ کہ یونین مزدوروں کی "آزادی عمل" میں مخل ہوتے ہیں۔

اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے۔ کہ پارلیمنٹ کے جن ارکان نے یہ قانون پاس کئے وہ بدطینت اور ظالم شخص تھے۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے عہد انقلاب میں پرورش پائی تھی۔ اس عہد میں آزادی کا لفظ ہر ایک کی زبان پر تھا۔ یہاں تک کہ جس شخص کے متعلق لوگوں کو یہ شبہ ہوتا تھا۔ کہ یہ اتنا حریت پسند نہیں جتنا کہ اسے ہونا چاہئے۔ اسے مار ڈالنے میں بھی تامل نہ کرتے۔ جب آزادی ہی انسان کا طغرائے امتیاز قرار پائی۔ تو یہ کیونکر گوارا کر لیتے۔ کہ تجارتی یونین قائم ہوں جو مزدوروں کو حکم دیں۔ کہ تم اتنے گھنٹے سے زیادہ کام نہ کرو۔ اور اس سے کم اجرت قبول نہ کرو۔ نوکر کو یہ آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ کہ وہ اپنی محنت کو کھلے بازار میں جس قیمت پر چاہے بیچے۔ اور مالک کو یہ آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ وہ جس طرح مناسب سمجھے اپنا کاروبار چلائے۔ نظام تجارت کے زمانے میں ملک بھر کی اقتصادی زندگی کی باگ حکومت کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن اب وہ عہد ختم ہو رہا تھا۔ آزادی کے نئے جذبے کا اقتضا یہ تھا۔ کہ حکومت اقتصادی معاملات میں بالکل دخل نہ دے۔ اور تجارت اپنے اصول خود قائم کرے۔

اٹھارھویں صدی کے آخری نصف حصے میں نہ صرف علمی اور سیاسی مسلّمات ہی از سرنو جانچے تولے گئے۔ بلکہ پرانے اقتصادی اصول بھی فرسودہ ہوکر رہ گئے اور ان کی جگہ جدید حالات کے مطابق جدید اصول وضع ہوئے۔ انقلاب فرانس سے کئی سال پہلے ترگو نے جو لوئی شانزدہم کا ایک ناکام وزیر مالیات تھا" اقتصادی آزادی" کے نئے اصول کا پرچار کیا تھا۔ ترگو ایک ایسے ملک میں رہتا تھا۔ جو قوانین وقواعد کی زنجیروں میں سخت جکڑا ہوا تھا۔ ترگو نے کہا" ان سرکاری قیود کو ہٹا دو۔ لوگوں کو اس بات کی اجازت دو کہ وہ جو چاہیں کریں۔ بہبودی کا راز اسی میں مضمر ہے"۔ تھوڑے ہی عرصے کے اندر اندر اس زمانے کے کئی ماہرین اقتصادیات نے" اقتصادی آزادی" کے اصول کو بطور ایک نعرۂ جنگ کے اختیار کرلیا +

اسی زمانے میں انگلستان کے اندر ایڈم سمتھ اپنی اہم تصنیف "دولتِ اقوام" مرتب کررہا تھا[1]۔ اس میں بھی اس نے اسی" آزادی اور" تجارت کے فطری حقوق" کی حمایت کی۔ تیس سال بعد (یعنی نپولین کی معزولی کے بعد) جب یورپ کی رجعت پسند حکومتوں کو وہی آنا کے مقام پر کامیابی نصیب ہوئی۔ تو جو آزادی سیاسی معاملات میں لوگوں سے چھینی گئی۔ وہ اقتصادی معاملات میں زبردستی ان کے حلق کے اندر ٹھونسی گئی +

جیساکہ میں اس باب کے شروع میں بیان کرچکا ہوں۔ مشینری کا عام استعمال حکومت کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ ملک کی دولت نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ یہ مشینری ہی کی برکت تھی۔ کہ انگلستان نے جنگہائے نپولین کے مصارف کا بار اکیلے اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ سرمایہ داروں نے یعنی ان لوگوں نے جن کے روپے سے مشینیں خریدی جاتی تھیں۔ بہت نفع کمایا۔ جب بے اندازہ دولت سمیٹ لی۔ تو اقتدار کی خواہش اور بھی بڑھی۔ چنانچہ سیاسیات میں دلچسپی لینے لگے۔ اور جاگیردار امرا کو جو ابھی تک یورپ کے اکثر ممالک کے سیاسی معاملات میں کافی اثر اور رسوخ

---

[1] "Wealth of Nations"

رکھتے تھے۔ آنکھیں دکھانے لگے +

انگلستان میں ارکانِ پارلیمنٹ کا انتخاب ۱۶۶۱ء کے فرمان شاہی کے مطابق عمل میں آتا تھا۔ چنانچہ اکثر صنعتی علاقوں کو جو حال ہی میں نمودار ہوئے تھے۔ نمائندگی حاصل نہ تھی۔ سرمایہ داروں نے ۱۸۳۲ء میں ریفارم بل پاس کرایا۔ جس کے رو سے پرانا نظام انتخاب بدل دیا گیا۔ اور کارخانہ داروں کی جماعت کو مجلس قانون ساز میں زیادہ اختیارات عطا ہوئے۔ لیکن اس قانون سے ان ہزارہا مزدوروں میں بہت ہلچل مچ گئی۔ جن کو حکومت کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ انہوں نے بھی حق رائے دہندگی حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ اپنے تمام مطالبات کو ایک مسودے کی شکل میں پیش کیا۔ جسے "عوام کا چارٹر" کہتے ہیں۔ اس چارٹر کے متعلق زوروں کی بحثیں ہوئیں۔ اور شورش روز بروز بڑھتی گئی۔ یہ بے چینی ابھی فرو نہ ہوئی تھی۔ کہ ۱۸۴۸ء میں جا بجا بغاوت پھوٹ پڑی۔ جیکوبن عقائد اور تشدد کی دھمکیوں سے ڈر کر حکومت انگلستان نے ڈیوک آف ونگٹن کو جو اپنی عمر کے اسیویں سال میں تھا۔ فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اور رضاکار بھرتی کرنے شروع کئے۔ لندن شہر کی قلعہ بندی کی گئی۔ اور آنے والی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے تیاریاں شروع ہو گئیں +

لیکن اہل چارٹر کی تحریک لیڈروں کی ناقابلیت کے باعث خود بخود مر گئی۔ اور تشدد نے بہت زور نہ پکڑا۔ متمول سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی نئی جماعت کی سیاسی گرفت رفتہ رفتہ مضبوط تر ہوتی گئی۔ بڑے بڑے شہروں میں صنعت کو فروغ ہوا۔ تو چراگاہیں اور کھیت غائب ہوتے گئے۔ اور ان کی جگہ مفلس مزدوروں کے بے رونق غلیظ اور تنگ مکانات نے لی۔ جو آج یورپ کے ہر جدید شہر کی دہلیز پر واقع ہیں +

مُخلصی

جن لوگوں کے دیکھتے دیکھتے گھوڑا گاڑی کی جگہ ریل نے لے لی۔ ان کی پیشین گوئی تھی۔ کہ مشینری کے رواج پا جانے سے دنیا پر مسرت اور فارغ البالی کی برکات کا نزول ہوگا لیکن جب یہ پیشین گوئی پوری نہ ہوئی۔ تو طرح طرح کے علاج تجویز ہوئے۔ لیکن پوری طرح کارگر کوئی ثابت نہ ہوا

۱۸۳۱ء میں یعنی پہلے ریفارم بل کے پاس ہونے سے ذرا پہلے جیرمی بینتھم[1] نے جو انگلستان کا رہنے والا تھا۔ اور نظامِ قانون سازی کا بہت بڑا عالم اور عملی سیاسیات کے میدان میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا مصلح تھا۔ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا "خود آرام سے رہنے کی ترکیب یہ ہے۔ کہ دوسروں کی زندگی کو پُرمسرت بنایا جائے۔ دوسروں کی زندگی کو پُرمسرت بنانے کی ترکیب یہ ہے۔ کہ ان سے محبت ظاہر کی جائے۔ اور ان سے محبت ظاہر کرنے کی ترکیب یہ ہے۔ کہ ان سے فی الواقع محبت کی جائے" جیرمی نیک طینت شخص تھا۔ اور خدا لگتی بات کہتا تھا۔ اس کے اقوال میں بڑی تاثیر تھی۔ چنانچہ ہزارہا لوگ اس کے ہمخیال بن گئے۔ لوگ اپنے مصیبت زدہ پڑوسیوں کی بہبودی کا خیال رکھنے لگے۔ اور ان کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے۔ اور سچ پوچھو۔ تو حالات بھی کچھ ایسے مایوس کن تھے کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔

---

[1] Jeremy Benthan.

قدیم معاشرت کے عہد میں "اقتصادی آزادی" کا نصب العین یعنی ترگو کا وضع کردہ اصول بہت کارآمد تھا۔ کیونکہ زمانہ وسطیٰ کی پابندیوں نے صنعتی جدو جہد کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ لیکن آزادیٔ عمل کا اصول جس کا شروع میں بیحد احترام کیا جاتا تھا۔ بالآخر شدید مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ مزدوروں کی یہ حالت تھی۔ کہ جب تک تھک کر چور نہ ہو جائے۔ برابر کام کرتے رہتے۔ کوئی غریب عورت جب تک تکان سے غش کھا کر گر نہ پڑتی۔ اسے کام چھٹی نہ ملتی۔ ماں باپ پانچ پانچ چھ چھ سال کے بچوں کو اپنے ساتھ کام پر لے جاتے۔ تاکہ وہ گلیوں میں آوارہ نہ پھرتے رہیں۔ ایک نئے قانون کی رو سے یہ حکم ہوا۔ کہ غربا کے بچے بھی کام پر جایا کریں۔ ورنہ انہیں مشینوں کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیا جائیگا۔ محنت مشقت کے عوض انہیں قوت لایموت اور ایک غلیظ سی جگہ کے علاوہ جہاں وہ رات کو پڑ کر سو رہتے اور کچھ نہ ملتا۔ جب وہ کام کرتے کرتے تھک جاتے اور ذرا اونگھنے لگتے۔ تو ایک جمعدار انہیں چابک مار کر جگا دیتا۔ کام پر یہ جاتے۔ تو انہیں انگلیوں کے پوروں پر بید لگتے۔ اس ظلم و تعدی کی وجہ سے ہزارہا بچے گھل گھل کر مر جاتے۔ کارخانہ دار آخر انسان تھے۔ دل سے یہی چاہتے تھے۔ کہ کسی طرح کم عمر بچے محنت مشقت سے چھٹکارا پائیں۔ لیکن بے بس تھے۔ جب انسان "آزاد" ہے تو بچے بھی "آزاد" ہیں۔ علاوہ بریں جب ایک سرمایہ دار یہ کوشش کرتا۔ کہ اپنے کارخانے یہ کام کم عمر بچوں کے بغیر چلائے۔ تو کوئی دوسرا سرمایہ دار ان بیکار بچوں کو بھی اپنے ہاں نوکر رکھ لیتا۔ گویا جس کے دل میں رحم آتا وہی گھاٹے میں رہتا۔ جب تک کوئی قانون ایسا پاس نہ ہوتا جس سے بچوں کا نوکر رکھنا سب کے لئے یکساں ممنوع قرار پاتا۔ کوئی شخص بچوں سے مشقت کا کام لینے کے بغیر اپنا کارخانہ کامیابی کے ساتھ کیونکر چلا سکتا تھا۔

قدیم زمانے کے زمیندار۔ جاگیردار امرا کو کارخانہ داروں سے سخت نفرت تھی۔ کیونکہ ان سرمایہ داروں کا تمول اور تکبر انہیں توہین آمیز معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پارلیمنٹ میں ان روسا کا اقتدار زائل ہو چکا تھا۔ اب وہاں صنعتی قبول

کے نمائندوں کا دور دورہ تھا۔ جب تک حکومت مزدور پیشہ لوگوں کو یونین بنانے کی اجازت نہ دیتی ان کی فلاح ناممکن تھی۔ جو لوگ دانا اور معقولیت پسند اور منصف مزاج تھے۔ وہ مزدوروں کی تباہ حالی سے غافل نہ تھے۔ لیکن اس کی اصلاح ان کے بس کی بات نہ تھی۔ مشینری بڑی سرعت کے ساتھ دنیا پر مسلط ہو گئی تھی۔ چنانچہ کئی سال گزر گئے۔ اور ہزارہا شریف الطبع انسان رات دن جد و جہد کرتے تھے۔ جب کہیں جا کر مشینری کے ظلم سے نجات نصیب ہوئی۔ اور اسے وہ حیثیت ملی۔ جو اسے ملنی چاہئے تھی۔ یعنی یہ کہ وہ انسان کی غلام بن کر رہے۔ انسان کی آقا نہ بن بیٹھے +

آقا مزدور کے اس نظام پر جو دنیا کے گوشے گوشے میں مروج تھا۔ سب سے پہلا حملہ افریقہ اور امریکہ کے سیاہ فام غلاموں کے حمایتیوں کی طرف سے ہوا۔ امریکہ میں غلامی کی بدعت سب سے پہلے اہل ہسپانیہ نے رائج کی تھی۔ پہلے تو انہوں نے کاشتکاری اور کان کنی کے لئے امریکہ کے اصلی باشندوں کو نوکر رکھا۔ لیکن یہ لوگ کھلی ہوا میں زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ نئے ماحول میں زندہ نہ رہ سکے۔ جب ان کی نسل معدوم ہونے لگی۔ تو ایک نیک دل پادری نے ان پر ترس کھا کر یہ تجویز پیش کی۔ کہ مزدوری کے کام کے لئے افریقہ سے حبشی منگانے چاہئیں۔ کیونکہ وہ قوی جثہ اور جفاکش لوگ ہوتے ہیں۔ علاوہ برآں جب وہ اہل یورپ کے زیر سایہ رہینگے۔ تو مسیحیت کی برکات سے بھی فیضیاب ہونگے۔ چنانچہ یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ کیونکہ یہ رحمدل گورے اور اس کے جاہل سیاہ فام بھائی دونو کے لئے فائدہ مند معلوم ہوئی۔ لیکن جب مشینری ایجاد ہوئی۔ تو روئی کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ حبشیوں کو بہت زیادہ کام کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ بھی امریکہ کے دیسیوں کی طرح اپنے آقاؤں کی بدسلوکی اور ظلم سے خستہ جان ہو کر فنا ہونے لگے +

مظالم کے زہرہ گداز افسانے یورپ کے کانوں تک پہنچے۔ ہر ملک میں مردوں اور عورتوں نے غلامی کے خلاف آواز بلند کی۔ انگلستان میں ولیم ولبر فورس اور زکارے میکالے نے (جو مشہور مورخ میکالے کا باپ تھا) غلامی کے سد باب کے لئے ایک انجمن قائم کی پہلے ایک قانون پاس کرایا جس کے رُو سے بردہ فروشی ممنوع قرار پائی۔ چنانچہ ۱۸۴۰ء کے بعد برطانوی نو آبادیوں میں کہیں کوئی غلام

باقی نہ رہا۔ ۱۸۴۸ء کے انقلاب نے فرانسیسی مقبوضات میں بھی غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۸۵۸ء میں پرتگال نے بھی ایک قانون پاس کیا جس کا ماحصل یہ تھا۔ کہ بیس سال کے اندر اندر سب غلام آزاد کر دئے جائینگے۔ ہالینڈ نے بھی ۱۸۶۳ء میں غلامی کو منسوخ کر دیا۔ اور اسی سال زار الیگزینڈر دوم نے بھی کاشتکاروں کو وہ آزادی عطا کر دی۔ جو دوسو سال پہلے ان سے چھن چکی تھی +

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اِس سوال سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ اور ایک طویل جنگ چھڑ گئی۔ اگرچہ اعلان آزادی کے وقت یہ اصول تسلیم ہو چکا تھا کہ "خدا نے سب انسانوں کو آزاد اور ہم رتبہ پیدا کیا ہے"۔ لیکن ان مردوں اور عورتوں کو جن کی رنگت سیاہ تھی اور جو جنوبی ریاستوں کے کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ مستثنےٰ قرار دیا گیا تھا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ غلامی کے خلاف شمالی ریاستوں کے باشندوں کی نفرت بڑھتی گئی۔ بالآخر انہوں نے احتجاج کی آواز بلند کی۔ جنوب کے رہنے والوں نے یہ جواب دیا۔ کہ غلاموں کے بغیر روئی کی کاشت ناممکن ہے۔ تقریباً پچاس سال تک کانگرس اور سینیٹ دونو مجلسوں میں زوروں کی بحث ہوتی رہی +

شمال کے لوگ اپنی ہٹ کے پکے تھے۔ تو جنوب کے لوگ بھی اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ جب مفاہمت کو کوئی امکان باقی نہ رہا۔ تو جنوبی ریاستوں نے یونین سے قطع تعلق کر لینے کی دھمکی دی۔ یہ وقت یونین کے لئے بڑا نازک تھا لیکن ایک اولوالعزم اور نیک طینت شخص اڑے آیا۔ ورنہ خدا جانے یہ چپقلش کیا کرشمے دکھاتی +

۶۔ نومبر ۱۸۶۰ء کو الینائے کا ایک وکیل ابراہیم لنکن[1] نامی جس کی دماغی ترقی خود اس کی اپنی مساعی کی شرمندہ احسان تھی۔ جمہوریت پسند پارٹی کی مدد سے امریکہ کا صدر منتخب ہوُا۔ اس پارٹی کو اُن ریاستوں میں بہت رسوخ حاصل تھا۔ جو غلامی کے مخالف تھیں۔ لنکن خود بھی غلامی کی قباحتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ آدمی بہت معاملہ فہم اور دُور رس تھا۔ سمجھ گیا۔ کہ شمالی امریکہ میں دو

---

[1] Abraham Lincoln.

حریف فوجیں ایک ساتھ نہیں سما سکتیں۔ جب بعض جنوبی ریاستوں نے قطع تعلق کرکے اپنی ایک نئی حکومت قائم کرلی۔ تو لنکن نے آستینیں چڑھا لیں۔ شمالی ریاستوں میں والنٹیروں کی بھرتی شروع ہوگئی۔ لاکھوں جوشیلے نوجوانوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اور چار سال تک شدید جنگ جاری رہی۔ جنوبی ریاستوں کی تیاری شمالی ریاستوں سے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے لی اور جیکسن جیسے ماہرین کے زیر کمان شمالی افواج کو پے در پے شکست دی۔ لیکن نیو انگلینڈ اور مغربی ریاستوں کی اقتصادی برتری نے بالآخر اپنا اثر دکھایا۔ ایک غیر معروف افسر گرانٹ نامی گمنامی کی تاریکی سے نکل کر میدان جنگ میں جلوہ گر ہوا۔ اور چارلس مارٹل کے نام سے شہرت کے آسمان پر چمکا اور جنوبی افواج کو جو بیدم ہو رہی تھیں۔ بُری طرح لتاڑتا چلا گیا۔ ۱۸۶۳ء کے شروع میں لنکن نے "اعلانِ آزادی" نافذ کرکے سب غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اپریل ۱۸۶۵ء میں لی نے مع اپنی باقیماندہ لشکر کے اپومیٹکس کے مقام پر ہتھیار ڈال دئے۔ چند دن بعد ایک مخبوط الحواس شخص نے لنکن کو قتل کر دیا۔ لیکن اس کا کام تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ بجز کیوبا کے جو ہسپانیہ کے زیر حکومت تھا۔ باقی تمام مہذب دنیا سے غلامی کی لعنت معدوم ہو چکی تھی +

سیاہ فام مزدور تو آزاد ہو رہے تھے۔ لیکن یورپ کے نام نہاد "آزاد" مزدور ویسے کے ویسے مصیبت میں گرفتار تھے۔ اُس زمانے کے کئی مصنفین نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ کہ یہ مزدور پیشہ لوگ ان مصائب و آلام میں زندہ کیونکر رہتے ہیں۔ ان کے رہائشی مکان از حد گندے اور شہر کے غلیظ ترین محلوں میں واقع تھے۔ خوراک ان کی نہایت ناقص تھی۔ تعلیم انہیں صرف اتنی ملتی تھی جس سے وہ سرمایہ داروں کے کام آسکیں۔ مر جاتے یا کسی حادثے کی وجہ سے بیکار ہو جاتے۔ تو ان کے متعلقین کو کسی قسم کی امداد یا معاوضہ نہ ملتا۔ البتہ شراب کی بھٹیوں اور کارخانوں کے مالکوں نے جنہیں پارلیمنٹ میں بہت رسوخ حاصل تھا شراب ان کے لئے بہت ارزاں کر دی تھی۔ تاکہ وہ غم غلط کرنے کے لئے بے اندازہ وسکی اور جن پیتے رہیں +

۱۸۳۰ء کے بعد صورت حالات میں جو نمایاں اصلاح ہوئی۔ وہ کسی ایک

شخص کی کوشش کا نتیجہ نہیں مشینری کے یکلخت رواج پا جانے سے دنیا پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں ان کے تدارک کے لئے دو پشتوں تک کئی بڑے بڑے دانا رات دن تجویزیں سوچتے رہے۔ ان لوگوں نے نظام سرمایہ داری کو فنا کرنے کی کوشش نہ کی۔ اور دانائی بھی یہی تھی۔ کیونکہ متمول لوگوں کی جمع کردہ دولت اگر سوچ سمجھ کر استعمال کی جائے۔ تو بنی نوع انسان کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے اس خیال کی تبلیغ شروع کی کہ سرمایہ دار اور مزدور کے مابین جن میں سے ایک متمول ہے کارخانوں کا مالک ہے۔ جب چاہے اپنے کارخانے کے دروازے بند کر سکتا ہے اور دوسرا محتاج ہے۔ دست نگر ہے۔ جو اجرت ملے۔ اسی پر قانع ہے۔ اور اگر قانع نہ ہو۔ تو وہ خود اور اسکے بیوی اور اسکے بچے بھوکے مرتے ہیں حقیقی مساوات ناممکن ہے +

انہوں نے کئی ایسے قوانین پاس کرانے کی کوشش کی جن کی مدد سے سرمایہ داروں اور مزدوروں کے باہمی تعلقات پر پابندیاں عاید کر سکیں۔ چنانچہ مصلحین کا یہ مقصد رفتہ رفتہ پورا ہوتا رہا۔ یہ انہیں مساعی کا نتیجہ ہے۔ کہ آج کل اکثر مزدور پیشہ لوگ سرمایہ داروں کی دستبرد سے محفوظ ہیں۔ کام بھی پہلے سے تھوڑا کرنا پڑتا ہے۔ اور کوشش یہ ہو رہی ہے کہ اوسطاً آٹھ گھنٹے سے زیادہ نہ ہو۔ اسکے علاوہ مزدوروں کے بچے بجائے اس کے کہ کارخانوں اور کانوں میں کام کریں۔ اب سکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں +

لیکن بعض لوگ ایسے بھی تھے۔ جو کارخانوں کے آتشدانوں سے دھوئیں کے بادل اٹھتے دیکھتے۔ ریل گاڑیوں کا شور سنتے۔ گوداموں میں مال کے انباروں پر نگاہ ڈالتے اور دل میں سوچتے کہ آخر اس تگ و دو کا انجام کیا ہو گا۔ اور اس قدر افراتفری اور اس درجہ مستعدی سے کیا حاصل ہو گا نسل انسانی ہزارہا سال تک اس تجارتی اور صنعتی مسابقت اور جدوجہد کے بغیر بھی زندہ تھی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اس نظام کو مٹا دیا جائے۔ اور طلب زر کی خاطر جو انسانی مسرتیں قربان ہو رہی ہیں۔ اور جو جانیں تلف ہو رہی ہیں۔ انہیں کسی طرح بچا لیا جائے +

یہ خیال کہ ہوس زر کی کشاکش سے مخلصی پا کر دنیا کو بہتر بنایا جا سکتا ہے خاص

کسی ایک ملک میں پیدا نہیں ہوا۔ انگلستان میں رابرٹ اوون نے جو روئی کے کئی کارخانوں کا مالک تھا۔ نیولنارک میں ایک "اشتراکی جماعت" قائم کی جسے بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن جب وہ خود مرگیا۔ تو نیولنارک کی فارغ البالی اور خوشحالی کا بھی خاتمہ ہوگیا فرانس میں ایک جرنلسٹ لوئی بلانک نامی نے ملک بھر میں "اشتراکی کارخانے" قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی مساعی کا بھی یہی انجام ہوا رفتہ رفتہ اشتراکی مصنفین اور علماء نے یہ محسوس کیا۔ کہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں جو مروجہ صنعتی نظام سے منقطع ہوکر علیحدہ زندگی بسر کرنا چاہیں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان بنیادی اصولوں کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے۔ جن پر صنعت اور سرمایہ داری کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔ اور پھر سوچا جائے۔ کہ ان قباحتوں کا کیا علاج ہے +

جب رابرٹ اوون۔ لوئی بلانک اور فرانسو آفوریئے جیسے عملی اشتراکیوں کا دور گزر گیا۔ تو کارل مارکس اور اینگلز جیسے علمی اشتراکیوں کا دور آیا۔ ان دونوں میں سے مارکس زیادہ مشہور ہے۔ مارکس حیرت انگیز قابلیت کا مالک تھا۔ نسل کا یہودی تھا۔ لیکن اس کا خاندان کئی پشتوں سے جرمنی میں رہتا تھا۔ مارکس اوون اور بلانک کے تجربوں سے آگاہ تھا۔ شوق بڑھا۔ تو خود بھی مزدوری اور اجرت اور بیکاری کے مسائل میں دلچسپی لینے لگا۔ اس کی آزاد خیالی کی وجہ سے پولیس اس کے پیچھے پڑگئی۔ چنانچہ اس نے جرمنی سے بھاگ کر پہلے برسلز اور پھر لندن میں اقامت اختیار کی۔ "نیویارک ٹریبیون" کا نامہ نگار تھا۔ مرتے دم تک یہی اس کا ذریعہ معاش رہا۔ اس لئے تمام عمر عسرت میں بسر کی +

اقتصادیات پر مارکس نے جو کتابیں لکھی تھیں۔ پہلے پہل تو کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی لیکن ۱۸۶۴ء میں اس نے مزدور پیشہ لوگوں کی پہلی بین الاقوامی انجمن کی بنیاد رکھی تین سال بعد یعنی ۱۸۶۷ء میں اس نے اپنی مشہور تصنیف "سرمایہ" کی پہلی جلد شائع کی۔ مارکس کا عقیدہ تھا کہ تاریخ فی الحقیقت ایک طویل داستان ہے۔ اس کشمکش کی جو دولت والوں اور ناداروں کے درمیان ہمیشہ سے جاری ہے۔ مشینری کے استعمال کی وجہ سے سوسائٹی میں ایک نئی جماعت یعنی

سرمایہ داروں کی جماعت پیدا ہوگئی ہے ۔ یہ لوگ اپنی فالتو دولت سے مشینیں خریدتے ہیں ۔ مشینوں پر مزدوروں کو نوکر رکھتے ہیں ۔ اُن سے اور زیادہ دولت کماتے ہیں ۔ اور اس دولت سے اور کارخانے بناتے ہیں ۔ چنانچہ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے اس طرح سے سرمایہ دار دن بدن متمول تر اور مزدور لوگ دن بدن مفلس تر ہوتے جا رہے ہیں ۔ مارکس کی پیشینگوئی تھی ۔ کہ اگر یہ نظام قائم رہا ۔ تو ایک دن سب دنیا کی دولت ایک واحد شخص کی ملکیت بن جائیگی ۔ اور باقی تمام لوگ اس کے نوکر اور دست نگر ہونگے +

مارکس نے اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ سب ممالک کے مزدوروں کو یکجا ہو کر بعض سیاسی اور اقتصادی قوانین کی خاطر لڑنا چاہیے ۔ ۱۸۴۸ء میں یعنی جس سال یورپ میں آخری انقلاب عظیم برپا ہوا ۔ مارکس نے اپنے ایک اعلان میں اس قسم کے سب قوانین کی ایک فہرست شائع کر دی +

ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات دول یورپ کو بہت ناگوار گزرے ۔ چنانچہ کئی ممالک بالخصوص پرشیا نے اشتراکیوں کے خلاف بہت سخت گیر قوانین پاس کئے ۔ اور پولیس کو حکم دیا ۔ کہ اشتراکیوں کے جلسوں کو منتشر کر دیں اور مقررین کو گرفتار کر لیں لیکن اس قسم کے تشدد سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا ۔ جب کسی تحریک کے حامیوں پر سختیاں ہونے لگیں ۔ تو وہ پہلے سے زیادہ پھلتی پھولتی ہے ۔ چنانچہ یورپ میں اشتراکیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی ۔ جب حکام پر یہ ظاہر ہوا کہ اشتراکی تشدد آمیز طریقوں سے انقلاب برپا کرنا نہیں چاہتے ۔ بلکہ اپنے بڑھتے ہوئے اقتدار کے بل پر آئینی ذرائع سے مزدور پیشہ جماعت کے لئے مراعات حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ تو اشتراکیوں کو وزارتیں بھی پیش کی گئیں ۔ انہوں نے بھی روشن خیال کیتھولک اور پراٹسٹنٹ لوگوں کے ساتھ مل کر صنعتی انقلاب کی قباحتوں کے ازالے میں حصہ لیا ۔ تاکہ مشینری کے استعمال اور پیداوار کی افزونی سے فوائد حاصل ہوئے ہیں ۔ وہ لوگوں میں انصاف اور معدلت کے ساتھ بانٹے جائیں +

سائنس کا زمانہ

لیکن دنیا میں ایک اور انقلاب رونما ہُوا۔ جو سیاسی انقلاب سے زیادہ اہم تھا۔ سالہا سال کے ظلم و تعدی کے بعد سائنسدان کو آزادیٔ عمل نصیب ہوئی۔ اور وُہ اِن قوانین کو بے نقاب کرنے کے درپے ہُوا۔ جن پر کائنات کا دارومدار ہے۔



فلاسفر

سائنس کے اولین نظریے اور علمی تحقیقات کے مبادیات مصریوں۔ بابلیوں۔ کلدانیوں۔ یونانیوں اور رومنوں کے مرہون منت ہیں لیکن چوتھی صدی کی ہجرتوں نے بحیرۂ روم کی قدیم دُنیا کو برباد کر دیا۔ کلیسائے مسیحی نے اپنی توجہ تمام تر ارواح پر صرف کر دی۔ اجسام کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ سائنس کو انسانی نخوت اور تکبر کا نتیجہ سمجھا۔ خدا کی مصلحتوں کو پرکھنا اور اُس کے کاموں میں دخل دینا کلیسا کے عقیدے کے خلاف تھا۔ چنانچہ سائنس کو گناہ کبیرہ سمجھا گیا۔

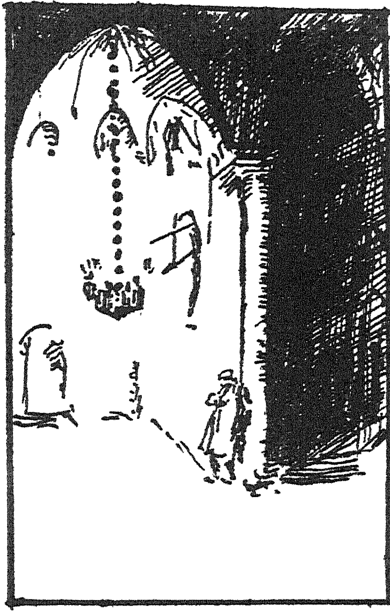
نشاۃ ثانیہ نے کسی حد تک زمانۂ وسطی کے ان توہمات کو دُور کیا۔ لیکن ریفارمیشن جو سولھویں صدی کے اوائل میں نشاۃ ثانیہ کے اثرات کو زائل کر رہی تھی "نئی تہذیب" کی مخالف تھی۔ چنانچہ اہل سائنس پھر ایک بار مظالم کا شکار ہوئے۔ اور کتاب مقدس نے علم کی جو تنگ حدود مقرر کر رکھی تھیں۔ اُن سے باہر قدم نہ رکھ سکے۔

ہماری دنیا میں بڑے بڑے سپہ سالاروں کے مجسمے تو کئی جگہ نصب ہیں۔ جن میں وُہ چابک گھوڑوں پر سوار ہیں۔ اور نعرہ زن فوج کے آگے آگے فتح و ظفر کا پرچم لہراتے ہوئے جا رہے ہیں۔ لیکن سائنس دانوں کے مقبرے بے نام و نشان پڑے ہیں۔ صرف کہیں کہیں سنگ مرمر کی ایک لوح پر اُن کا نام کندہ ہے۔ میرے خیال میں ایک ہزار سال کے بعد حالت دگرگوں ہوگی۔ اور لوگوں کے دل میں اس بات کا احساس کماحقہٗ پیدا ہو چکا ہوگا کہ یہ علم کے سالار جن کی بدولت ہماری جدید دنیا ظہور میں آئی کس قدر بہادر لوگ تھے۔ اور اپنا فرض کس تندہی سے بجالاتے تھے۔

ان میں سے اکثر نے از حد عسرت اور افلاس کی زندگی بسر کی۔ ہمعصروں کی نفرت اور حقارت سہتے رہے۔ زندگی کے دن تنگ و تاریک مکانوں میں کاٹے۔ اور قید خانوں میں پُورے کئے۔ ڈر کے مارے اپنی تصنیفوں پر اپنا نام بھی نہ چھاپ سکتے تھے۔ بلکہ اپنے مسودے چوری چُھپے امسٹروم یا ہارلم کے کسی چھاپے خانے کو بھیج دیتے تھے۔ کلیسا ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونو اُن کے جانی دشمن تھے۔ واعظین اور علما اپنے خطبوں میں بار بار ان کا ذکر کرتے تھے۔ اور اُنہیں کافر و ملحد قرار دیتے تھے۔ اور لوگوں کو ان کے خلاف اُبھارتے تھے۔

قسمت یاور ہوتی۔ تو کہیں پناہ گزیں ہو جاتے۔ ہالینڈ سب سے زیادہ روادار تھا وہاں کے حکام علمی تحقیقات کو بہ نظر استحسان تو نہ دیکھتے تھے۔ لیکن لوگوں کی آزادی خیال پر ہاتھ نہ ڈالتے تھے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہالینڈ اہل سائنس کا دارالامان بن گیا۔ فرانس اور انگلستان اور جرمن کے سائنس دان اور حکما اور ریاضی دان وہاں جا کر آزادی کا سانس لیتے اور تھوڑے عرصے کے لئے بے فکری کی زندگی بسر کرتے۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ تیرھویں صدی کے عالم جید راجر بیکن نے سالہا سال تک قلم نہ اُٹھایا ڈرتا تھا کہ کلیسا کے ارباب اقتدار کہیں بگڑ نہ جائیں۔ پانسو سال بعد جب فلسفے کا انسائیکلوپیڈیا مرتب ہُوا۔ تو اس کے مولفین اور مصنفین فرانس کی پولیس کے زیر نگرانی اور زیر عتاب رہے۔ نصف صدی بعد ڈارون نے تخلیق انسان کے مسئلے کو کریدا۔ اور توریت پر شک لایا۔ تو ہر کلیسا کے منبر سے اس کے خلاف آواز بلند ہوئی۔ اور اسے نوع انسانی کا دشمن قرار دیا گیا۔ جو لوگ سائنس کے بھیدوں



گیلیلیو

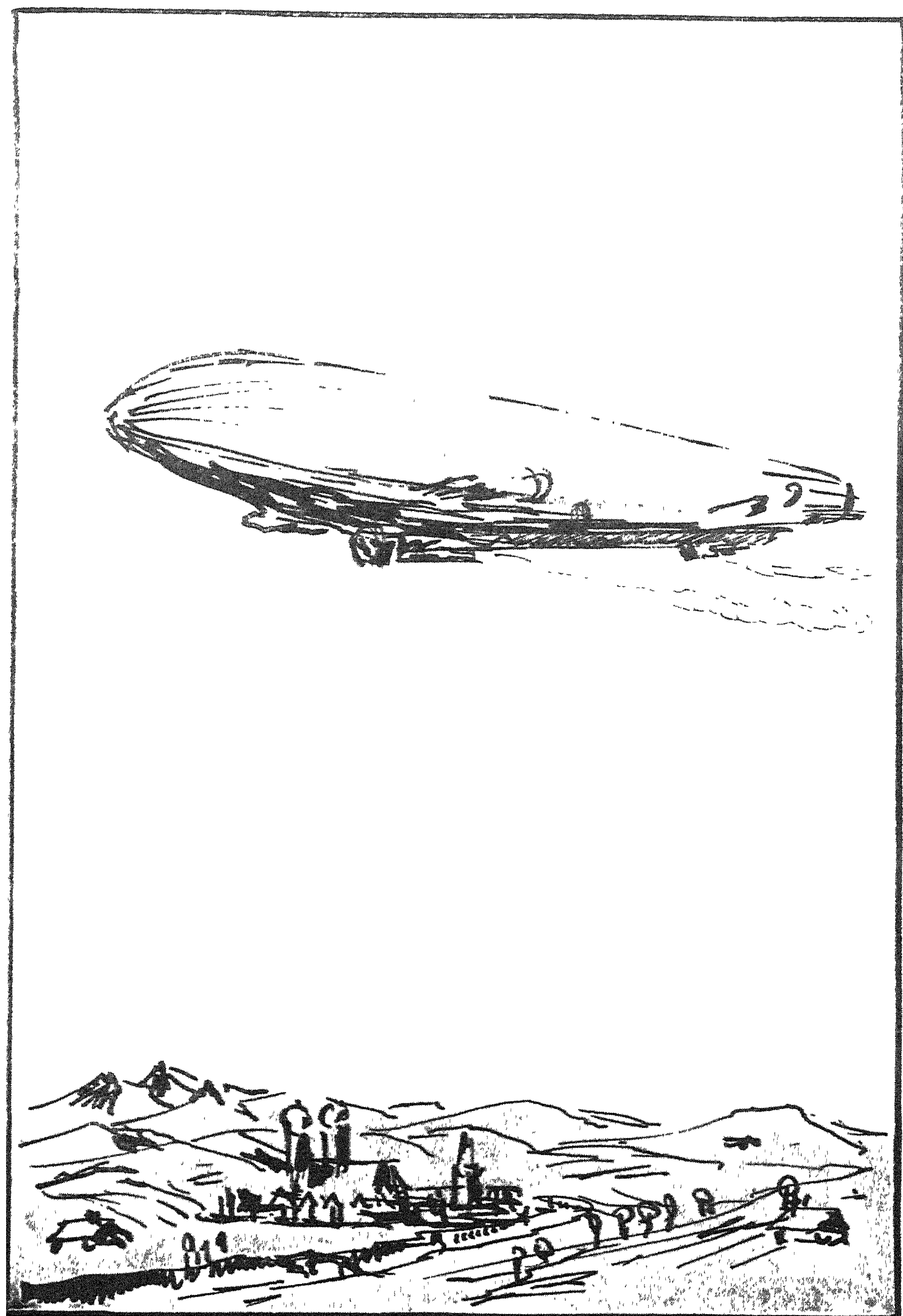
کو آشکارا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ وہ آج کل بھی مخالفت سے ناموں نہیں۔ آج کل بھی مسٹر برائن "عقیدہ ڈارون کے خطرات" پر لیکچر دے رہے ہیں۔ اور لوگوں کو اس جدید سائنس دان کے حماقتوں سے بچنے کی تنبیہ کر رہے ہیں ؂

لیکن یہ سب معمولی باتیں ہیں۔ جو کام ہونا ہو۔ وہ ہو کے رہتا ہے اور علمی تحقیقات اور دریافت اور ایجاد کا فائدہ بالآخر اُن لوگوں کو بھی پہنچتا ہے۔ جو اوّل اوّل مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں۔ اور سائنس دانوں کے نظریوں کو مجذوب کی بڑ سمجھتے ہیں ؂

سترھویں صدی میں منجموں نے اجرام فلکی کا مطالعہ کیا اور زمین اور نظام شمسی کے باہمی ترقی پر غور کیا۔ لیکن کلیسا کو یہ دخل درمعقولات پسند نہ آیا۔ چنانچہ کوپرنیکس نے یہ تو ثابت کر دیا کہ سورج سب کائنات کا مرکز ہے۔ لیکن مرتے دم تک اپنی کتاب شائع کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ گیلیلیو نے عمر کا بیشتر حصّہ ارباب کلیسا کے زیر نگرانی بسر کیا۔ لیکن اپنی دُوربین سے برابر کام لیتا رہا۔ اسی کے مشاہدات کی بدولت نیوٹن نے کشش ارضی کا اصول دریافت کیا ؂

علم سماوات یہاں تک پہنچ کر رُک گیا۔ لوگ زمین کی طرف متوجہ ہوئے۔ سترھویں صدی کے آخری نصف میں اینتھنی وان[ك] لیووین ہوبک نے خردبین ایجاد کی۔ یہ خردبین نہایت بھدّی قسم کی تھی لیکن اس کے ذریعے لوگوں نے ان کیڑوں کا مطالعہ کیا۔ جن کی وجہ سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے علم جراثیم کی بنیاد پڑ گئی۔ جس کے بدولت گذشتہ چالیس سال میں انسان کو کئی امراض سے نجات نصیب ہوئی ہے۔ خردبین ہی کے

ك Anthony van Leeuwenhoek.



غباره

ذریعے سے طبقات الارض کے ماہرین نے مختلف قسم کے جمادات کا مطالعہ کیا۔ جو زمین کی گہرائیوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور جو دراصل منجمد حیوانات ونباتات ہیں۔ اس تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا۔ کہ کتاب پیدائش میں زمین کی جتنی عمر بتائی جاتی ہے۔ فی الحقیقت اس سے بہت زیادہ ہے۔ ۱۸۳۰ء میں سرچارلس لائیل نے اپنی کتاب "اصول طبقات الارض" شائع کی۔ جس میں اس نے کتاب مقدس کو جھٹلایا۔ اور زمین کی پیدائش اور ارتقا کا حال عجیب وغریب پیرائے میں بیان کیا ❊

اسی زمانے میں مارکوئیس دی لاپلاس[1] تخلیق کے ایک نئے نظریے پر غور کر رہا تھا جس کی رُو سے کرۂ زمین گھر کے اس سمندر میں جس نے رفتہ رفتہ نظام اجرام فلکی کی شکل اختیار کر لی ہے محض ایک دھبا قرار پایا۔ بنسن[2] اور کرخوف[3] نے تجزیۂ نُور کے آلے سے ستاروں کی کیمیاوی ترکیب کا مطالعہ کیا۔ اور سورج کی ساخت کی تحقیقات کی جس کے دھبے سب سے پہلے گیلیلیو نے دریافت کئے تھے ❊

اسی زمانے میں علم الاعضا کے ماہرین نے بڑی کشمکش اور ردّوکد کے بعد کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ممالک کے پادریوں سے جسم انسانی کو چیرنے پھاڑنے کی اجازت حاصل کی۔ جس کی بدولت زمانہ وسطی کے بے اصول علم جراحی کا خاتمہ ہُوا۔ اور اعضائے انسانی کا باقاعدہ مطالعہ شروع ہُوا ❊

لیکن سائنس نے ۱۸۱۰ء سے لے کر ۱۸۴۰ء تک جتنی ترقی کی۔ وہ اُسے اُس دن سے لے کر جب کہ انسان نے پہلی مرتبہ ستاروں کو دیکھا۔ اور حیران ہُوا کہ یہ کیا ہیں آج تک یعنی کئی لاکھ سال کے عرصے میں نصیب نہ ہوئی تھی۔ جو لوگ پُرانے زمانے کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ بہت دلگیر ہوئے۔ چنانچہ یہ قدرتی امر تھا کہ انہیں لمارک اور ڈاروِن جیسے شخصوں سے نفرت ہوتی۔ یہ علما یہ تو نہ کہتے تھے کہ تم لوگوں بندروں کی اولاد ہو (ہمارے بزرگ اس میں اپنی توہین سمجھتے تھے کہ انہیں بندروں کی اولاد بتایا جائے) لیکن وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ انسان اشرف المخلوقات کے آباؤ اجداد کا شجرہ ان چھوٹی چھوٹی لیس دار مچھلیوں سے جا ملتا ہے۔ جو سب سے پہلے اس کرۂ زمین پر آباد تھیں ❊

---

[3] Kirchhoff. [2] Bussen. [1] Marqins do Laplace.

متوسط طبقے کے خوشحال لوگ جو انیسویں صدی میں اقتدار اور طاقت کے مالک تھے۔ گیس یا بجلی کی روشنی یا سائنس کی دوسری ایجادوں سے تو فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ لیکن سائنس دانوں کو جن کے بغیر یہ ایجادیں ممکن ہی نہ تھیں اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ لیکن آخرکار دنیا کو اہلِ سائنس کا لوہا ماننا پڑا۔ آج کل تو یہ حالت ہے کہ جہاں پہلے متمول اور فیاض لوگ اپنے خرچ سے گرجے بنواتے تھے۔ وہاں اب وہی روپیہ بڑی بڑی تجربہ گاہوں کی تعمیر پر صرف کرتے ہیں۔ جہاں خاموش طبیعت اہلِ علم بنی نوع انسان کے پوشیدہ دشمنوں کے خلاف ہر وقت جنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ اور اسی کوشش میں اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں سُکھ اور خوشحالی کی زندگی بسر کر سکیں +

انہی لوگوں کی بدولت انسان کے خیالات میں یہاں تک انقلاب آچکا ہے کہ کئی بلائیں اور مصیبتیں جنہیں ہم اٹل قہرِ الٰہی سمجھتے تھے۔ اب ثابت ہو رہا ہے کہ ہماری ہی جہالت اور غفلت کا نتیجہ ہیں۔ آج کل کا بچّہ بچّہ یہ بات جانتا ہے کہ میں اگر صاف اور ستھرا پانی پیوں۔ تو تپ محرقہ سے بچا رہوں گا۔ لیکن ڈاکٹروں نے کئی سال اس تحقیقات میں صرف کئے۔ جب کہیں جا کر لوگوں کو اس بات کا یقین آیا۔ اب لوگ دانتوں کا علاج کراتے ہوئے پریشان نہیں ہوتے منہ میں جو جراثیم پائے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہُوا کہ دانتوں کی بیماریوں سے محفوظ رہنا ناممکن نہیں۔ اگر دانت نکلوانا ہی پڑے۔ تو گیس سونگھ کر بغیر کسی تکلیف کے نکلوا سکتے ہیں۔ ۱۸۴۶ء میں جب امریکہ کے اخباروں میں یہ خبر چھپی۔ کہ اب اپریشن کلورا فارم کی مدد سے بغیر کسی تکلیف کے ہو سکتے ہیں۔ تو اہلِ یورپ کو اس پر یقین نہ آیا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ خدائے تعالےٰ کی ہرگز یہ مرضی نہیں ہو سکتی کہ لوگ جسمانی تکلیف سے بچ جائیں۔ کیونکہ جسمانی تکلیف خدا نے سب فانی انسانوں کی قسمت میں لکھی ہے۔ چنانچہ کئی سال گذر گئے۔ جب جا کر کہیں کلورا فارم کا استعمال عام ہُوا +

لیکن ترقی کے سیلاب کو روکنا اب ناممکن تھا۔ پُرانے خیالات کی فصیلیں ایک ایک کر کے گر رہی تھیں۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ جہالت کی دیواریں

مسمار ہو گئیں۔ نئی معاشرت اور بہتر زندگی کے علمبردار آگے بڑھتے چلے گئے لیکن ایک مقام پر پہنچ کر یک لخت ان کے قدم رک گئے۔ قدیم زمانے کے کھنڈروں کی اینٹوں سے لوگوں نے جہالت کا ایک نیا قلعہ تعمیر کیا۔ اور جب تک لاکھوں انسانوں نے اپنا خون نہ بہایا۔ یہ قلعہ سر نہ ہوا ٭

فن

فنون لطیفہ کا ذکر

جب بچّے کی صحت اچھی ہو۔ اور کھانا بھی پیٹ بھر کر کھا چکا ہو۔ اور سو بھی خوب چکا ہو تو وہ لیٹا لیٹا کچھ گنگناتا رہتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں بڑے چین سے ہوں بڑوں کو بچّے کا گیت بہت بے سُرا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بچّہ اسے اعلےٰ درجے کی موسیقی سمجھ کر گاتا ہے۔ فن کی دنیا میں اسے بچّے کا پہلا قدم سمجھنا چاہیئے ؂

جب بچہ ذرا بڑا ہوتا ہے۔ اور اُٹھ بیٹھ سکتا ہے۔ تو مٹی کے گھروندے بناتا ہے لوگ ان گھروندوں کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ دنیا میں کروڑوں بچّے ہیں۔ اور کروڑوں ہی گھروندے کس کس کی داد دیں۔ لیکن اس گھروندے کی قدر بچّے کے دل سے پوچھیئے وہ اپنے آپ کو معمار اور سنگ تراش سے کم نہیں سمجھتا ؂

جب بچّہ تین چار برس کا ہوتا ہے۔ اور اپنی اُنگلیوں پر قابو پا لیتا ہے۔ تو تصویریں بنانے لگتا ہے اماں انہیں رنگدار پنسلوں کا ڈبّہ لا دیتی ہیں۔ چنانچہ صاحبزادے کاغذ کے پرزوں پر طرح طرح کی شکلیں بناتے رہتے ہیں۔ کہیں گھر کی تصویر کھینچی۔ کہیں گھوڑے کی تصویر۔ کہیں جنگ کا نقشہ پیش کیا۔ کہیں پھول پتیاں بنائیں ؂

لیکن کاریگری اور فن کا یہ زمانہ جلد ختم ہو جاتا ہے۔ بہت دن گذرنے نہیں پاتے کہ مدرسے کی مصیبت گلے آن پڑتی ہے۔ دن بھر سکول ہی سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ اب وہ پہلے کی سی فرصت کہاں۔ اب تو دن بھر پہاڑے یاد کیا کیجے۔ یا گردانیں دُہراتے رہیئے۔ اس خشک زندگی میں فن کے لئے کہاں سے وقت نکالیں ؂

فن کا شوق یعنی ایسی چیزیں بنانے کا شوق جن سے آمدنی کی کوئی اُمید نہیں۔ بہت ہی زبردست ہو تو اور بات ہے۔ ورنہ اکثر بچّے جب بڑے ہوتے ہیں۔ تو فن کا وہ دور جو بچپن میں گذرا تھا پھر واپس نہیں آتا ؂

جو حال بچوں کا ہے۔ وہی قوموں کا ہے جب غاروں میں رہنے والے انسان کو برفانی زمانے کے خطروں سے نجات ملی۔ اور قدرے اطمینان نصیب ہوا۔ تو اس کے دل میں خوبصورت چیزیں بنانے کا شوق پیدا ہوا۔ حالانکہ اسے رات دن درندوں سے مقابلہ رہتا تھا۔ اور یہ چیزیں زندگی کی کشمکش میں کچھ بھی کام نہ آسکتی تھیں۔ غار کی دیواروں پر ہاتھیوں اور ہرنوں کی تصویریں کھینچیں۔ اور جو عورتیں اس کے دل کو بھائیں۔ پتھر تراش تراش کر ان کی مورتیاں بنائیں +

جب مصر۔ بابل اور فارس اور دوسرے ایشیائی قومیں دریائے نیل اور دریائے فرات کے کنارے آباد ہوئیں۔ تو انہوں نے اپنے بادشاہوں کے لئے شاندار محل تعمیر کئے۔ اور اپنی عورتوں کے لئے خوبصورت زیور گھڑے۔ اور باغ لگائے۔ جس میں شوخ رنگوں کے پھول سجائے +

اہل یورپ کے آباؤ اجداد یعنی ایشیائی خانہ بدوش بھی جب چین کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوئے۔ تو انہوں نے بھی گیت موزوں کئے جس میں سورماؤں کی بہادری کی داستانیں بیان کی۔ اور شاعری کی ایک ایسی صنف ایجاد کی۔ جو آج تک مروج ہے۔ ایک ہزار سال بعد جب یہی لوگ یونان کی سرزمین میں آباد ہوئے۔ اور وہاں انہوں نے اپنی شہری ریاستیں قائم کیں۔ تو اپنے خوشی اور غم کے جذبات کو شاندار مندروں اور معبدوں اور بتوں۔ اور کامیڈی اور ٹریجیڈی غرضیکہ قسم قسم کے فنون کی شکل دی +

اہل روما اپنے حریفوں یعنی اہل کارتھیج کی طرح لوگوں پر حکومت کرنے اور دولت سمیٹنے میں مصروف تھے۔ انہیں بے سود روحانی مشغلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا کام دنیا کو فتح کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دنیا کو فتح کیا۔ اور سڑکیں بنائیں۔ اور پل تعمیر کئے۔ لیکن جب فن کا خیال آیا تو اسے یونانیوں سے مانگ لیا۔ اور اسی پر کفایت کی +

چند نئی قسم کی عمارتیں ضرور بنائیں جو عملی زندگی کے لئے بہت مفید تھیں۔ لیکن ان کے بت ان کی تاریخی کتابیں اور ان کے نقش و نگار اور ان کی شاعری کو تمام تر یونان ہی کی بخشش سمجھنا چاہئے۔ فن کے لئے وہ چیز ضروری ہے۔ جس کو پوری طرح

بیان کرنا بہت مشکل ہے لیکن جسے شخصیت کہتے ہیں - اس قسم کی شخصیت کو رومن شبہے کی نظروں سے دیکھتے تھے - سلطنت روما کے علمبرداروں کو سپاہیوں اور تاجروں کی ضرورت تھی - نہ کہ فنون لطیفہ کی - چنانچہ شعرگوئی اور تصویرکشی اور اس قسم کے شغل غیرملکیوں ہی کے حصے میں آئے ؎

اس کے بعد زمانہ تاریک آیا - بربری اور وحشی لوگوں نے مغربی یورپ کے نگار خانوں کو برباد کر ڈالا - جب وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ فن کی باریکیوں اور خوبیوں کو سمجھ سکتے تو اس کی قدر بھلا خاک کرتے - ان کی مثال آپ یوں سمجھئے - کہ اگر وہ آج کل کے زمانے میں ہوتے تو رسالوں کے سرورقوں پر جو بازاری قسم کی تصویریں چھپی ہوتی ہیں - ان کو تو سینے سے لگا لیتے - اور ریمبرینٹ اور اس پائے کے مصوروں کی نادر تصویریں کوڑا سمجھ کر پھینک دیتے - لیکن رفتہ رفتہ بربری نے تمیز کا سبق سیکھا - جب مذاق سلجھا - تو اپنے کئے پر پشیمان ہوا - اور اس کی تلافی کرنی چاہی - لیکن جو تھا وہ راکھ ہو چکا ہوتا - اس کو کہاں تک کریدتا ؎

البتہ اپنا فن جو ایشیا سے ساتھ لایا تھا اسے خوب ترقی دی - اسی کو زمانہ وسطے کا فن کہتے ہیں - شمالی یورپ میں یہ فن جرمن قوم کے ذہن کی پیداوار تھا - اس پر یونانی اور لاطینی فن کا اثر بہت ہی خفیف تھا - اور مصر اور اسیریا کے قدیم فن کا تو اس پر سایہ بھی نہ پڑا تھا - باقی رہے ہندوستان اور چین سو اُن ملکوں کے نام تک سے شمالی یورپ کے لوگ آگاہ نہ تھے - اس زمانے میں فن کے اعتبار سے شمالی یورپ جنوبی یورپ تک سے اس قدر بے تعلق تھا کہ جب اطالیہ کے رہنے والوں نے شمالی عمارتوں کو دیکھا تو وہ انہیں بہت ہی حقیر اور بدنما معلوم ہوئیں ؎

تم نے "گوتھک" کا لفظ کبھی نہ کبھی ضرور سنا ہوگا - اس لفظ کو سن کر اکثر پرانے زمانے کے کسی خوبصورت گرجے کا خیال آتا ہے - جس کے نازک مینار آسمان سے باتیں کر رہے ہیں - لیکن کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں ؟

گوتھک کے معنی ہیں - بدتمیز - بھدا - وحشی - بھونڈا یعنی ایک ایسی چیز جس کی توقع کسی "غیرمہذب گوتھ" ہی سے ہو سکتی ہے - جو جنگلوں کا رہنے والا وحشی انسان ہے - یونانی اور رومن فن کے قواعد سے نابلد اور جس کا مذاق پست ہے - اور جو ایکروپولس

اور فورم کی طرز تعمیر کی قدر کرنے کے قابل نہیں ❊

لیکن باوجود اس کے شمالی یورپ کے باشندوں کے سینوں میں فن کا جو صحیح جذبہ موجزن تھا۔ اس نے کئی صدیوں تک اسی گوتھک تعمیر کی شکل اختیار کی۔ پہلے تم پڑھ چکے ہو۔ کہ زمانہ وسطے کے اواخر میں لوگوں کی زندگی کس قسم کی تھی۔ کسان تو دیہات میں رہتے تھے۔ لیکن باقی لوگوں "سٹی"[۱] یا "سیوٹیاس"[۲] میں رہتے تھے۔ جو ایک لاطینی لفظ ہے۔ جس کے معنی قبیلے کے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ اس زمانے کے شہری شہر کی چار دیواری کے اندر ایک قبیلے ہی کی طرح رہتے تھے۔ یعنی ایک دوسرے کی خوشی اور رنج میں شریک ہونے کے بغیر چارہ نہ تھا۔ ایک دوسرے کی حفاظت کرتے تھے اور ایک دوسرے کے نفع نقصان میں برابر کا حصہ پاتے تھے ❊

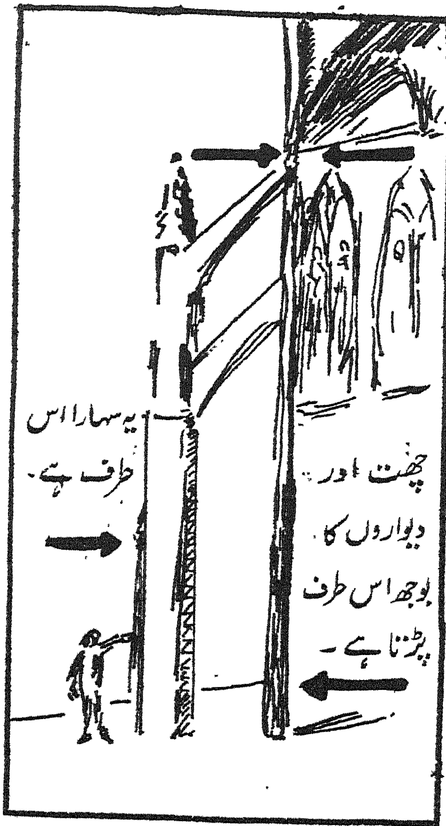
قدیم یونانی اور رومن شہروں میں شہر کا چوک جہاں مندر کی عمارت کھڑی تھی تمام شہری زندگی کا مرکز تھا۔ زمانہ وسطے میں بھی خانہ خدا یعنی کلیسا شہری زندگی کا مرکز قرار پایا۔ آج کل کے لوگ جو اوّل تو گرجے کا رُخ نہیں کرتے اور کرتے ہیں تو ہفتے میں ایک مرتبہ اور وُہ بھی تھوڑی دیر کو۔ انہیں اس بات کا پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں گرجے کی کیا حیثیت تھی۔ جب بچہ سات دن کا ہوتا تو اُسے گرجے میں بپتسمہ دیا جاتا۔ ذرا بڑا ہوتا تو اسے اسی گرجے میں کتب مقدس کا درس ملتا۔ اور بڑا ہوتا تو مقتدیوں میں شامل ہوتا۔ کمانے کے قابل ہوتا تو خیرات کے طور پر اسی گرجے کے ایک کونے میں اپنے خاندان کے کسی پیر یا ولی اللہ کے نام پر ایک چھوٹا سا معبد تعمیر کراتا۔ گرجے کا دروازہ دن بھر کھلا ہے۔ اور رات کو بھی دیر تک کوئی نہ کوئی وہاں گھٹنے ٹیکے دعا مانگ رہا ہے۔ گرجا کیا تھا۔ یوں سمجھئے کہ ایک کلب تھا۔ جس کے سب شہری ممبر تھے۔ گرجے ہی میں شادی ہوتی اور غالباً وہیں پہلی مرتبہ اس لڑکی پر نگاہ پڑتی جس کو کچھ عرصے کے بعد بیوی بننا ہے۔ اور جب زندگی کا سفر تمام ہو جاتا۔ تو اسی عمارت کے پتھروں کے نیچے آرام نصیب ہوتا۔ تاکہ بیٹے اور بیٹیاں اور پوتے اور پوتیاں اور آنے والی نسلیں روزِ حشر

---

[۱] City. [۲] Civitas.

تک قبر پر دعا مانگتی رہیں ۔

غرضیکہ گرجا نہ صرف خدا کا گھر بلکہ انسانی زندگی کا مرکز بھی تھا۔ اس لئے اس کی تعمیر کا اور عبادت خانوں کی تعمیر سے مختلف ہونا لازمی تھا۔ مصریوں یا یونانیوں یا رومنوں کا عبادت خانہ محض کسی دیوتا یا دیوی کا مندر تھا۔ چونکہ اوسرس یا زیوس یا جوپیٹر کے بت کے سامنے کھڑے ہو کر وعظ کرنے کی رسم نہ تھی۔ اس لئے وہاں لوگ بڑی تعداد میں جمع نہ ہوتے۔ چنانچہ ایسے عبادت خانے کے لئے یہ ہرگز ضروری نہ تھا کہ وہ بہت وسیع ہو۔ بحیرہ روم کے ساحل پر جو قومیں آباد تھیں۔ ان کے مذہبی اجتماع ہمیشہ کھلی جگہوں میں ہوتے۔ شمالی یورپ میں سردی اور بارش کی وجہ سے ایسی تقریبوں کے موقع پر لوگ گرجے کے اندر جمع ہوتے ۔



گوتھک تعمیر

کئی صدیوں تک تعمیر کے ماہر طرح طرح کی ترکیبیں سوچتے رہے تاکہ اتنی بڑی عمارت کھڑی کی جا سکے جس کے اندر ایک بہت بڑا مجمع آسانی سے سما جائے۔ رومنوں سے انھوں نے یہ تو سیکھ لیا تھا کہ دیواریں وزنی پتھروں کی بنانی چاہئیں اور ان میں کھڑکیاں بہت چھوٹی چھوٹی رکھنی چاہئیں ورنہ دیواریں اپنا وزن نہ سنبھال سکیں گی۔ اس قسم کی دیواریں بنا کر اس پر انھوں نے پتھروں کی وزنی چھت ڈالی۔ بارھویں صدی میں صلیبی جنگوں کی بدولت مسلمان ممالک کی تعمیرات دیکھنے میں آئیں جہاں سے یورپ والوں نے ڈاٹیں بنانا سیکھا۔ جب ڈاٹ کی ترکیب سمجھ میں آگئی۔ تو یورپ کی طرز تعمیر

میں ایک جدت پیدا ہوئی - ورنہ اس سے پہلے وسیع عمارتوں کا بنانا مشکل تھا - گوتھک طرز تعمیر کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے - گوتھک طرز کے ماہروں نے چھت کو ڈاٹ دار بنایا اور شہتیروں سے پسلیوں کا کام لے کر چھت کا بوجھ ان پر ڈالا - لیکن ایسی چھت اگر وزنی ہو - تو اس سے دیواروں کے گر جانے کا خطرہ ہوتا ہے - بعینہٖ جیسے تین چار من کا آدمی اگر بچے کی کرسی پر بیٹھ جائے تو کرسی بھی ساتھ ہی بیٹھ جاتی ہے - اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے بعض فرانسیسی ماہروں نے دیواروں کے ساتھ پشتے کھڑے کئے - تاکہ دیواروں کو ان کا سہارا رہے - اور وہ چھت کے بوجھ سے بیٹھنے نہ پائیں - یہ پشتے بھاری بھاری پتھروں کے تھے جنہیں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیتے - چھت کو اور بھی سہارا دینے کے لئے اڑتے ہوئے پشتے لگاتے جو چھت کے کمانچوں کا زور سنبھال لیتے - ان پشتوں کی ساخت تصویر سے ظاہر ہے ؂

جب دیواروں کو یوں مضبوط کر لیا - تو کھڑکیاں بھی بڑی بڑی بننے لگیں - بارھویں صدی میں شیشہ کمیاب تھا - اور شیشے کی کھڑکیاں بہت کم گھروں میں پائی جاتی تھیں - امرا کے محلوں میں جو کھڑکیاں تھیں ان میں بھی ہوا سے بچاؤ کا کوئی سامان نہ تھا - یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں لوگ گھروں کے اندر بھی پوستینیں پہن کر بیٹھتے تھے ؂

خوش قسمتی سے رنگین شیشے بنانے کا فن جس سے بحیرہ روم کے قدیم لوگ اچھی طرح واقف تھے - دنیا سے بالکل ناپید نہ ہوا تھا - لوگوں نے اس فن کو ازسر نو زندہ کیا - چنانچہ گوتھک گرجاؤں میں کھڑکیاں رنگین شیشوں سے مزین ہوئیں - ان کھڑکیوں کے چوکھٹے سیسے کے تھے - جنمیں رنگین شیشوں کے ٹکڑوں سے انجیل کے واقعات کی تصویریں بنی تھیں ؂

غرضیکہ لوگوں نے اپنی کاریگری اور فیاضی گرجوں کی عمارتوں پر صرف کر دی اور خانۂ خدا کی تعمیر اور اس کی آرائش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جو لوگ ان گرجوں میں جمع ہوتے - ان کی عقیدت اور ایمان کا بھی یہ حال تھا کہ زندگی کا ہر پہلو مذہب کے رنگ میں رنگا ہوا ہے - قیمتی سے قیمتی اور خوبصورت سے خوبصورت اشیا گرجے کی تزئین کے لئے وقف تھیں - سنگ تراش جو مملکت روما کے تباہی کی وجہ سے بیروزگار

ہو چکے تھے۔ پھر اپنے فن کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ گرجوں کی دیواریں اور ستون اور محرابیں یسوع مسیح اور اولیاءاللہ کے مجسموں سے بھر گئیں۔ کشیدہ کاڑھنے والوں نے دیواروں کے لئے خوبصورت پردے بنائے۔ جوہریوں اور سناروں نے اپنا تمام ہنر اس بات پر صرف کر دیا کہ گرجے کی قربان گاہ کو عبادت الہی کے شایاں شان آراستہ کریں۔ مصوّر نے بھی اپنا تمام زور گرجے ہی کی سجاوٹ میں لگا دیا۔ لیکن افسوس بچارے کے پاس صحیح مصالحہ موجود نہ تھا ⁂

یہ داستان بھی سننے کے قابل ہے :-

مسیحیت کے اولین دور میں رومن لوگ اپنی عبادت گاہوں اور مکانوں پر رنگین شیشے کی پچی کاری کا کام کرتے تھے۔ لیکن یہ فن بہت مشکل تھا۔ کیونکہ مصور اس کے ذریعے سے اپنے خیالات کا پوری طرح اظہار نہ کر سکتا تھا۔ جولڑکے رنگین لکڑی کے ٹکڑوں کو جوڑ کر تصویریں بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اِس فن کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ پچی کاری کی تصویریں بنانے کا فن زمانہ وسطےٰ کے اواخر میں سوائے روس کے باقی سب ملکوں میں فنا ہو گیا۔ روس میں اس لئے زندہ رہا کہ فتح قسطنطنیہ کے بعد اس فن کے بازنطینی ماہر وہیں جا کر پناہ گزیں ہوئے اور بالشویکوں کے زمانے تک وہاں کے گرجوں میں کام کرتے رہے۔ جب بالشویکوں کا زمانہ آیا۔ تو روس میں گرجوں کی تعمیر ہی بند ہو گئی ⁂

زمانہ وسطےٰ کے مصور چونے میں رنگ ملا کر دیوار پر تصویریں بناتے تھے۔ یہ فن کئی صدیوں تک مقبول رہا۔ آج کل اس فن کے ماہر بہت مشکل سے ملتے ہیں۔ مگر زمانۂ وسطےٰ میں اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کیونکہ دیواروں پر نقش و نگار کرنے اور تصویریں بنانے کی اور کوئی ترکیب ہی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ لیکن یہ فن بھی مشکلات سے خالی نہ تھا۔ اکثر اوقات چند سالوں کے بعد دیواروں کا پلستر اُکھڑ آتا۔ یا نم کی وجہ سے تصویریں خراب ہو جاتیں۔ چنانچہ لوگوں نے پلستر کی زمین سے ہٹ کر تصویریں بنانے کی کئی ترکیبیں سوچیں۔ کبھی رنگوں میں شراب کبھی سرکہ کبھی شہد اور کبھی انڈے کی سفیدی ملائی۔ ایک ہزار سال تک طرح طرح کے تجربے کرتے رہے۔ لیکن کوئی ترکیب کارگر نہ ہوئی۔ مومی کاغذ پر تصویریں بنانے والے لوگ زیادہ کامیاب رہے۔ لیکن

پتھر یا لکڑی پر نقش و نگار کا کام کرنے والے کبھی مطمئن نہ ہوئے۔ کیونکہ ایسا کوئی رنگ ایجاد نہ ہو سکا۔ جو لکڑی یا پتھر پر اچھی طرح جم جائے آخر کار پندرھویں صدی کے شروع میں یان[1] اور ہیوبرٹ وین آئیک[2] نے اس مشکل کا حل نکالا۔ ان دو بھائیوں نے رنگوں میں ایک خاص قسم کا روغن ملایا۔ جس سے فائدہ یہ ہوا کہ لکڑی، کینوس، پتھر غرضیکہ ہر چیز پر تصویر بنانا سہل ہوگیا ⁂

لیکن اب وہ زمانہٴ وسطیٰ کے اوائل کا سا مذہبی جوش جاتا رہا تھا۔ فنون لطیفہ کی پرورش اور ہمت افزائی کرنے والے اب کلیسا کے پادری نہیں بلکہ متمول دنیادار لوگ تھے اہل کمال ہمیشہ دولت والوں کے دست نگر رہتے ہیں۔ چنانچہ اب اہل فن بادشاہوں اور امیروں اور دولتمند تاجروں کے لئے تصویریں بنانے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے کے اندر اندر روغنی تصویریں بنانے کا فن یورپ بھر کے اندر عام ہوگیا۔ اور ہر ملک کے اندر مصوروں کا ایک علیحدہ گروہ بن گیا۔ اور ہر گروہ نے اپنی اپنی تصویروں کے اندر ان خوبیوں کے پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جو وہاں کے دولتمند لوگوں کے مذاق اور طبیعت کے مطابق تھیں ⁂

مثلاً ہسپانیہ میں ویلاسکوے[3] نے درباری مسخروں اور بونوں اور شاہی کاریگروں غرضیکہ ان تمام لوگوں کی تصویریں کھینچیں جو بادشاہ اور دربار شاہی سے تعلق رکھتے تھے۔ ہالینڈ میں تاجروں کا اقتدار بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ ریمبرینٹ اور فرانز ہیلز[4] اور ویرمیر[5] نے تاجروں کے مکانات کے صحنوں اور ان کی بدسلیقہ بیویوں اور ان کے موٹے تازے بچوں اور مال و اسباب سے لدے ہوئے جہازوں کی تصویریں بنائیں۔ اطالیہ میں پاپائے روم سے بڑھ کر کوئی فن کا مربی نہ تھا۔ چنانچہ مائیکل انجیلو اور کوریجیو بدستور حضرت مریمؑ اور اولیاء اللہ کی تصویریں بناتے رہے۔ انگلستان میں رؤسا کا طبقہ دولت اور رسوخ دونو کا مالک تھا۔ فرانس میں بادشاہوں کو بڑے بڑے اختیارات حاصل تھے۔ چنانچہ ان دو ملکوں کے مصور یا تو صاحب مرتبت ارکان سلطنت کی تصویریں بناتے یا ان حسین

---

[1] Jan. [2] Hubert van Eyck [3] Velasquez

[4] Frenz Hols [5] Vermeer

خاتونوں کی جنہیں ملک معظم کی دوستی کا فخر حاصل ہو ٭

جب لوگوں کے دل میں مذہب سے دوری پیدا ہوئی اور نظام معاشرت میں ایک نئے طبقے نے زور پکڑا۔ تو اس تبدیلی کا اثر نہ صرف مصوری بلکہ اور فنون لطیفہ پر بھی ظاہر ہوا۔ چھاپہ ایجاد ہوا۔ تو مصنفین کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ عوام کے لئے کتابیں لکھ کر شہرت حاصل کریں۔ چنانچہ لوگوں نے ناول لکھنے شروع کئے۔ لیکن جن لوگوں کو کتابیں خریدنے کا مقدور نہ تھا۔ وہ ایسے خشک طبیعت لوگ نہ تھے کہ شام کے وقت گھر کے اندر بیکار بیٹھے رہا کریں۔ زمانۂ وسطیٰ کے گویے جو لوگوں کا دل بہلایا کرتے تھے۔ اب ان سے دل کی پیاس نہ بجھتی تھی۔ اور پھر وہ تھے بھی بہت تھوڑے سے کس کس کی تفریح کا سامان مہیا کرتے۔ ان صورت حالات میں ڈراما نویسوں کو جن کی نسل یونانی دور کے بعد یعنی دو ہزار سال سے مفقود ہو چکی تھی پھر اپنا ہنر دکھانے کا موقع ملا۔ زمانۂ وسطیٰ میں ناٹک صرف مذہبی تقریبوں کے موقع پر دکھاتے تھے۔ چنانچہ تیرھویں اور چودھویں صدی کے کھیلوں میں حضرت عیسےٰؑ کے مصائب کی داستان کے سوا اور کوئی مضمون نہیں ملتا۔ سولھویں صدی میں تفریحی ناٹک کی ابتدا ہوئی۔ شروع شروع میں ڈرامہ نویسوں اور ایکٹروں کو لوگ بہت حقیر سمجھتے تھے۔ چنانچہ ولیم شکسپیر کا رتبہ بھانڈ کا سا تھا۔ جو گویا اپنے کھیلوں کے ذریعے سے لوگوں کی تفریح کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن سنہ ۱۶۱۶ء تک جب اس کے زندگی کے دن پورے ہونے کو آئے لوگ اسے عزت اور احترام کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ اور پولیس نے ایکٹروں کی نگرانی کرنا چھوڑ دیا تھا٭

ولیم شیکسپیر کا ہمعصر لوپے ڈے ویگا[۱] ایک حیرت انگیز شخص تھا۔ اس نے ۴۰۰ مذہبی اور ۱۸۰۰ غیر مذہبی ڈرامے لکھے۔ جن کو پاپائے روما تک نے سراہا۔ لوپے ڈے ویگا ہسپانیہ کا رہنے والا اور عالی خاندان شخص تھا۔ اس کے سو سال بعد ڈرامہ نویسوں کی عزت و توقیر اس قدر بڑھ گئی کہ فرانسیسی ڈرامہ نویس مولیئر[۲] کو شاہ لوئی چہاردہم کے مقربین میں شامل ہونے کا فخر حاصل ہوا ٭

اس کے بعد تھیٹر نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ آج کل تو یہ حالت ہے۔ کہ

---

[۱] Lope de Vega   [۲] Moliere

تھیٹر کو بڑے بڑے اور منظم شہروں کا ایک ضروری جزو سمجھا جاتا ہے۔ اور "خاموش ڈرامہ" تو معمولی معمولی قصبوں میں بھی دکھایا جاتا ہے ٭

لیکن جس فن نے سب سے زیادہ زور پکڑا۔ وہ موسیقی کا فن تھا۔ پرانی قسم کی موسیقی کے لئے بڑے ہنر اور علم کی ضرورت تھی۔ تصویر کشی یا سنگ تراشی سالہا سال کی مشق کے بغیر نہیں آتی۔ ایک عرصے کی شاگردی کے بعد کہیں انگلیاں اس قابل ہوتی ہیں کہ دل کے جذبات کے مطابق کاغذ پر خط کھینچیں یا سنگ مرمر کو تراش سکیں۔ ایکٹ کرنے کے لئے یا ایک قابل قدر ڈرامہ یا ناول کے تصنیف کرنے کے لئے بھی ایک عمر درکار ہے۔ یہی صرف یہی نہیں بلکہ مصوری اور سنگتراشی اور سخن سنجی سے لطف اٹھانے اور اس کے صحیح معنی سمجھنے کے لئے بھی تربیت کی ضرورت ہے۔ لیکن موسیقی کا یہ حال ہے کہ ہر شخص بشرطیکہ وہ بالکل ہی بہرہ یا سُر تال کو سمجھنے کے بالکل ہی ناقابل نہ ہو کسی نہ کسی گیت سے ضرور لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ زمانہ وسطیٰ کے لوگ تھوڑی بہت موسیقی سے ضرور واقف تھے۔ لیکن یہ موسیقی زیادہ تر کلیسا کی موسیقی تھی۔ بھجن اور دیگر مقدس گیت ضابطے اور قاعدے کے بندشوں کے مطابق گائے جاتے تھے۔ چنانچہ لوگ ان سے جلد اکتا گئے۔ اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ لوگ ان گیتوں کو بازاروں یا گلیوں میں محض اپنا دل بہلانے کو نہ گا سکتے تھے ٭

نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں موسیقی نے اپنا رنگ بدلا اور ایک بار پھر انسان کی دوستی کا حق ادا کیا اور اس کی خوشیوں اور اس کے غموں میں اس کی شریک بنی ٭

مصری اور بابلی اور قدیم یہودی سب کے سب موسیقی کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے تو مختلف سازوں کو یکجا کر کے ان سے آرکسٹرا بھی مرتب کر لئے تھے لیکن یونانی اس طرح کی سادہ زندگی کو وحشیوں اور غیر ملکیوں کی بدمذاقی سمجھتے تھے۔ اور اس سے رغبت نہ رکھتے تھے ان کو تو اس بات کا شوق تھا کہ کوئی شخص ہومر اور پنڈر کی نظمیں قرأت سے پڑھ کر انہیں سنائے۔ اگر ساتھ ہی ساتھ وہ لائیر[1] ہاتھ میں لے کر اس کے تاروں کو چھیڑتا رہے۔ تو خیر ـ ورنہ اس کے علاوہ وہ کسی اور ساز کو گوارا نہ کر سکتے تھے رومنوں کو البتہ آرکسٹرا کی موسیقی سے بہت رغبت تھی۔ چنانچہ ان کے ہاں دعوتوں اور

---

[1] Lyre

پارٹیوں کے موقعے پر آرکسٹرا بجانے کا دستور بہت عام تھا۔ آج کل جو ساز یورپ میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ درحقیقت رومنوں ہی کی ایجاد ہیں۔ گو ان میں بہت کچھ



رد و بدل ہو چکا ہے۔ شروع شروع میں کلیسا کو اس قسم کی موسیقی سے بہت نفرت تھی۔ کیونکہ جن کفّار کو مسیحیت نیچا دکھا چکی تھی انہی کے مشاغل کو اختیار کرنا عیسائیوں کی طبیعت کے خلاف تھا + چنانچہ جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی کے اسقف گنتی کے چند گیتوں پر گذارا کرتے تھے جنہیں سب نمازی مل کر گاتے تھے + ساتھ میں کوئی ساز نہ بجے۔ تو گانے والے اکثر بے سُرے ہو جاتے تھے۔ اس لئے کچھ عرصے کے بعد گرجے میں آرگن بجنے لگا + یہ باجہ دوسری صدی کی ایجاد ہے۔ موجد نے بین کی نفیریوں کے ساتھ ایک دھونکنی لگا کر اس کا نام آرگن رکھا۔ اور دنیا کے سامنے ایک نیا ساز پیش کیا +

اس کے بعد ہجرتوں کا زمانہ آیا۔ رومن سازندوں کی نسل برباد ہو گئی۔ جو بچ گئے وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی سارنگی اٹھائے شہر بشہر گھومنے لگے۔ اور گلی گلی بھیک مانگتے پھرے +

زمانہ وسطےٰ کے آخر میں جب شہروں کے اندر ایک ایسی تہذیب کا ظہور ہوا جس نے لوگوں کو ایک بار پھر دنیاوی لذات اور تفریحات سے آشنا کیا۔ تو از سر نو گویوں کی مانگ پیدا ہوئی + بُگل وغیرہ کی قسم کے سازوں نے جو صرف شکار کے موقع پر یا میدان جنگ میں استعمال ہوتے تھے رزم کے علاوہ بزم میں بھی جگہ پائی +

ماہروں نے ان میں ایسی تبدیلیاں پیدا کیں کہ ان کی آواز میں جو ایک کرختگی تھی وہ جاتی رہی + چنانچہ رقص کی مجلسوں میں اور ضیافتوں کے موقع پر بھی لوگ ان کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگے + سارنگی کی ابتدا یوں ہوئی کہ کمان کے اندر گھوڑے کے بال لے کر تن دئے چنانچہ موجودہ زمانے کی چار تاروں والی وائلن اسی سے نکلی ہے۔ اٹھارویں صدی میں سٹرادی ویریس[1]

---

[1] Stradivaruis

اور دیگر اطالوی کاریگروں نے اس ساز میں طرح طرح کی خوبیاں پیدا کیں ÷

سب سے آخر میں پیانو ایجاد ہؤا جو آج کل سب سازوں سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اور دنیا کے کونے کونے میں پایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے آرگن ایجاد ہؤا۔ لیکن آرگن میں خرابی یہ تھی کہ اس میں دو شخصوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ایک بجانے والا۔ دوسرا دھونکنی کرنے والا۔ (آج کل دھونکنی بجلی سے چلتی ہے) جب گرجا میں بھجن گانے کے لئے لوگوں کو موسیقی کی تعلیم دینا ضروری ہؤا۔ تو ایسے ساز کی تلاش ہوئی جو آرگن سے قدرے مختصر ہو تاکہ اس میں دو آدمیوں کی ضرورت نہ پڑے۔ گیارھویں صدی میں پیٹرارک کے شہر پیدائش ارنیسو کے رہنے والے ایک بینیڈکٹن راہب گیڈو[۱] نے موسیقی کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے اشارات وضع کئے + اسی صدی میں ایک ایسا ساز ایجاد ہؤا۔ جس میں آرگن کے سے پردے اور سارنگی کے سے تار دونو چیزیں پائی جاتی تھیں + وی آنا کے شہر میں جہاں ۱۲۸۸ء میں زمانہ وسطے کے خانہ بدوش سازندوں نے اپنی الگ ایک برادری قائم کر لی تھی اس ساز کو مقبولیت نصیب ہوئی۔ اور اس میں طرح طرح کی اختراعیں کی گئیں +

موجودہ زمانے کا پیانو اسی سے نکلا ہے + آسٹریا سے یہ ساز اطالیہ پہنچا۔ وہاں جیووینی[۲] سپینیٹی نے جو وینس کا باشندہ تھا۔ اسے ایک نئی شکل دی اور اس کے نام کی نسبت سے یہ ساز سپنییت[۳] کے نام سے مشہور ہؤا + آخرکار اٹھارویں صدی میں ۱۷۰۹ء اور ۱۷۲۰ء کے درمیان بارتولومیو کرسٹوفوری[۴] نے ایک ایسا پرزا بڑھایا۔ جس کے ذریعے سے اس ساز کی آواز بلند بھی ہو سکتی تھی اور مدھم بھی + اطالوی زبان میں مدھم کو پیانو اور بلند کو فورتے کہتے ہیں۔ چنانچہ اس ساز کا نام پیانو فورتے قرار پایا۔ پیانو فورتے کا بگڑ کر پیانو فورٹ بنا اور پیانو فورٹ کا مخفف پیانو ÷

گویا دنیا کو ایک ایسا ساز نصیب ہؤا۔ جس کا بجانا بھی سہل تھا۔ اور جسے سارنگی وغیرہ کی طرح بار بار سُر کرنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئی تھی + اس کے سیکھنے میں ایک دو سال سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ اور اس کی آواز بھی زمانہ وسطے کی نفیریوں اور ترموں سے زیادہ دلکش تھی + جس طرح آج کل گراموفون کی بدولت گھر گھر موسیقی کا چرچا ہے۔ اسی طرح اُس زمانے

---

۱ Guido ۲ Giovanni Spinetti ۳ Spinet

۴ Bartolomeo Cristofori

میں پیانو کی بدولت ہر کہ و مہ موسیقی کی لذت سے آشنا ہوا - چنانچہ اس فن کی تعلیم ہر شائستہ مرد اور ہر شائستہ عورت کی تربیت کا ایک جزو قرار پائی + متمول شاہزادوں اور صاحب حیثیت تاجروں نے سازندوں کو نوکر رکھا - اور اس فن کے ماہروں کو گداگری اور خانہ بدوشی سے نجات ملی اور لوگوں میں ان کی توقیر بڑھی + ہوتے ہوتے موسیقی نے ناٹک میں دخل پایا - جہاں اس نے رفتہ رفتہ اوپیرا کی شکل اختیار کی + شروع شروع میں اوپیرا کمپنیاں صرف امرا کے ہاں پائی جاتی تھیں - کیونکہ ان کے علاوہ کسی کا مقدور نہ تھا - کہ گویوں اور سازندوں کے ایک گروہ کے اخراجات کا کفیل ہو سکے - لیکن جب لوگوں کو اوپیرا کا چسکا پڑا - تو اکثر شہروں نے اپنے خرچ سے تھیٹر بنوائے جہاں پہلے پہل اطالوی اوپیرا پھر جرمن اوپیرا دکھائے گئے + رفتہ رفتہ شہر کے لوگوں میں اوپیرا سننے کا شوق عام ہوا اور یہ فن موسیقی عوام کی تفریحات میں شامل ہو گیا + چند کٹر عیسائی البتہ ایسے ضرور تھے جو اب بھی موسیقی سے احتراز کرتے تھے - اور اس عیاشی کو گناہ سمجھتے تھے - لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی +

اٹھارویں صدی کے وسط تک یورپ بھر میں موسیقی کا شوق بہت عام ہو چکا تھا + اس زمانے میں ایک ایسا صاحب کمال پیدا ہوا - جس نے اس فن کو چار چاند لگا دیئے + اس کا نام باخ[1] تھا - اور یہ لائپزگ کے گرجے میں آرگن بجایا کرتا تھا + اس نے ہر قسم کے سازوں کے لئے نئے سے نئے راگ وضع کئے + ہلکی پھلکی موسیقی بھی ایجاد کی جو عام گیتوں اور ناچوں کے کام آ سکے اور گھمبیر راگ بھی اختراع کئے جو مذہبی تقریبوں اور کلیسا کے بھجنوں کے لئے موزوں ہوں - چنانچہ یورپ کی سب جدید موسیقی باخ ہی کی تصنیفات کی شرمندۂ احسان ہے + ۱۷۵۰ء میں باخ کا انتقال ہوا - اور اس کے بعد موتسارت[2] آیا جس کے کمال فن نے موسیقی کو حسن اور دلاویزی بخشی - موتسارت کے راگوں میں اس درجہ نزاکت پائی جاتی ہے - گویا راگ نہیں - سر اور تال سے بنی ہوئی نفیس جالیاں ہیں + اس کے بعد بے تھوون[3] آیا - جس نے جدید آرکسٹرا کی بنیاد رکھی + بے تھوون کی زندگی رنج و الم کا مرقع تھی دنیا اس کی تصنیفات مبہوت

---

[1] Bach   [2] Mozart   [3] Beethoven

ہو کر سنتی تھی۔ لیکن وہ خود اس سے لطف اندوز نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ کانوں سے بہرہ تھا۔ افلاس کے زمانے میں زکام اور نزلے کی وجہ سے سماعت جاتی رہی تھی ٭

بے ٹوون کا زمانہ انقلاب فرانس کا زمانہ تھا۔ لوگوں کے دل امنگوں اور آرزوؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ سب کو یہ اُمید تھی کہ دنیا میں آزادی اور خوشحالی کا ایک نیا آفتاب طلوع ہونے کو ہے ٭ اسی جذبے کے اثر بے ٹوون نے اپنا ایک راگ نپولین کے نام معنون کر دیا تھا۔ کیونکہ اور لوگوں کی طرح اس کی اُمیدیں بھی نپولین ہی کی اولوالعزمی سے وابستہ تھیں ٭ لیکن بے ٹوون نے اپنی زندگی ہی میں اپنی اُمیدوں آرزوؤں کی بربادی کا نظارہ دیکھ لیا۔ جب ۱۸۲۷ء میں اس کا انتقال ہوا۔ تو نپولین رخصت ہو چکا تھا ٭ انقلاب فرانس محض ایک سراب ثابت ہوا ٭ اب دور دورہ سٹیم انجن کا تھا جس کا شور بے ٹوون کے راگوں سے بہت مختلف تھا ٭

جب بھاپ اور لوہے اور کوئلے اور بڑے بڑے کارخانوں نے دنیا پر اپنا تسلط جما لیا۔ تو مصوری اور سنگ تراشی اور شاعری اور موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ بے یار و مددگار رہ گئے ٭ کلیسا اور زمانہ وسطےٰ کے امرا اور تاجر جو فن کی دستگیری کیا کرتے تھے۔ اب دنیا سے اُٹھ چکے تھے ٭ کاروباری دنیا کے کامیاب انسانوں کو دولت سمیٹنے سے اتنی فرصت کہاں کہ وہ فن کی نفاستوں اور باریکیوں پر اپنا وقت ضائع کریں۔ باقی رہے اہل فن۔ سو ان کی صناعی سے زر پرستوں کی کونسی جیب بھرتی تھی۔ کہ ان کی قدر کرتے ٭ جو غریب کارخانوں میں مزدوری کرتے تھے۔ ان کے کان دن بھر انجن کا شور سن سن کر موسیقی سے بالکل ناآشنا ہو چکے تھے ٭ اسی کس مپرسی کی حالت میں فن نے زندگی سے کنارہ کشی اختیار کی پہلے زمانے کی چند تصویریں باقی رہ گئی تھیں۔ وہ لوگوں کی نظروں سے دور عجائب خانوں میں گوشہ نشین ہوئیں موسیقی کو شرفا نے اپنے ہاں سے نکال دیا۔ تو چند پیشہ ور گویوں نے اسے اپنے گھر میں ڈال لیا ٭ اس سے اس کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہی ٭

لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ فن کے نصیب پھر جاگنے کو ہیں۔ اب رفتہ رفتہ فن کا شوق پھر بڑھ رہا ہے۔ لوگوں کو پھر یہ محسوس ہو رہا ہے۔ کہ ریمبرینٹ اور بے ٹوون اور روڈیں جیسے اہل کمال ہی نسل انسانی کے حقیقی سردار ہیں۔ اور وہ قوم جو فن سے بے بہرہ ہے اس بچے کی طرح ہے جو کھیلنا اور مسکرانا نہ جانتا ہو ٭

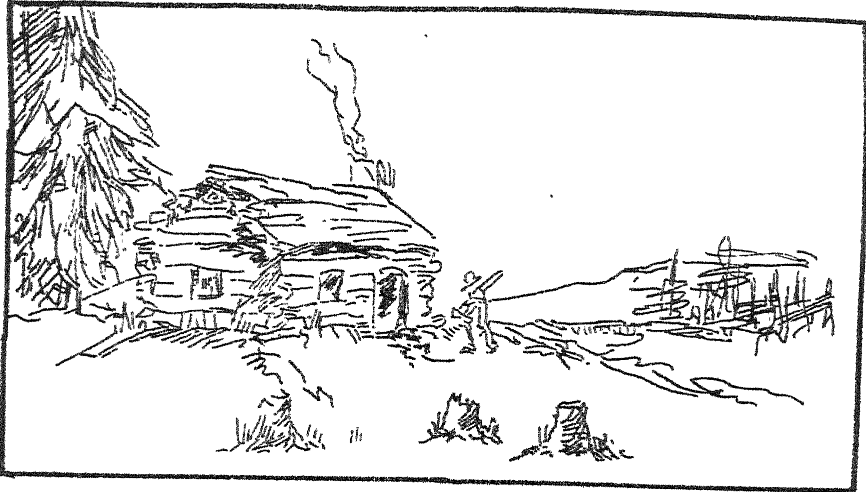
نوآبادیات کی توسیع اور جنگ

وہ فصل جس میں قاعدہ کی رو سے، گزشتہ پچاس سال کی بہت سی سیاسی معلومات درج ہونی چاہیئے تھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں، بہت کچھ اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، اور اس کے علاوہ بعض باتوں کے متعلق معذرت بھی پیش کی گئی ہے۔

اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ دنیا کی تاریخ لکھنا، گویا درد سر مول لینا ہے، تو میں ہرگز اس کام کو ہاتھ نہ لگاتا۔ یہ سچ ہے کہ اگر کوئی شخص اتنا جفاکش ہو کہ پانچ چھ سال کسی کتب خانہ میں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کر سکے۔ تو وہ ایسی عظیم الشان اور ضخیم کتاب مرتب کر سکتا ہے جس میں ہر ملک کے، ہر صدی کے حالات مندرج ہوں۔ لیکن اس کتاب کے لکھتے وقت یہ مقصد ہرگز پیش نظر نہ تھا۔ میرے پبلشر تو ایسی تاریخ شائع کرنا چاہتے تھے، جس میں شروع سے لیکر آخر تک یکسانیت، اور ہم آہنگی پائی جائے۔ جس میں واقعاتِ عالم کو ایک مخصوص تیز رفتار کے ساتھ گزرتا ہوا دکھایا جائے۔ لیکن اب جبکہ یہ کتاب ختم ہونے کو ہے میں دیکھتا ہوں کہ بعض فصلوں میں تو واقعات کو بہت تیزی کے ساتھ رواں دواں دکھایا گیا ہے۔ اور بعض میں غیر دلچسپ اور خشک مضامین مندرج ہیں جن کا تعلق اس زمانہ سے ہے جو اب لوگوں کے دماغوں سے تقریباً محو ہو چکا ہے۔ بعض فصلوں میں سرے سے حرکت ہی نظر نہیں آتی۔ اور بعض حصے ایسے ہیں جو از سرتاپا حیرت انگیز کارناموں کے بیان سے معمور ہیں۔ چونکہ یہ بدنظمی مجھے پسند نہیں آئی۔ اس لئے میں نے اپنے پبلشروں سے کہا

کہ میری رائے تو یہ ہے کہ اس تمام مسودہ کو جلا دوں اور دوبارہ از سرِ نو کتاب لکھوں، لیکن پبلشر اس تجویز کو منظور کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتے؟

ناچار میں نے اپنی مشکلات کا ایک اور حل سوچا یعنی اس مسودہ کو اپنے چند مہربانوں کو دکھایا کہ اُسے پڑھ کر اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔ لیکن یہ تجربہ اور بھی حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کی اپنی رائے ہے۔ ہر ایک کی طبیعت جدا۔ مذاق جدا۔ پسند جدا۔ چنانچہ سب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ تم نے اس کتاب میں فلاں محبِ وطن، فلاں مدبّر، فلاں لُچّے کا تذکرہ کیوں نہیں درج کیا؟ جس کو جو شخص پسند تھا۔ اس نے کتاب کے اوراق میں اسی کی تلاش کی۔ بعض دوستوں کی نظر میں نیپولین اور چنگیز خاں کا تذکرہ بہت شاندار الفاظ میں ہونا چاہئے تھا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں نے نیپولین کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ میری رائے میں وہ جارج واشنگٹن۔ حمورابی، گسٹیوس واسا، اگسٹس، لنکن اور بہت سے ایسے آدمیوں سے بھی کمتر



ہے جن کے تذکرہ کے لئے میں نے اس کتاب میں ایک یا دو پیراگراف سے زیادہ نہیں دے سکا۔ اب رہا چنگیز خاں کا معاملہ تو میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میدان جنگ میں انسانوں کو بے دریغ تہ تیغ کرنے کے فن میں اس کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ اور میں اپنی کتاب میں اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں لکھ سکتا +

دوسرے نکتہ چیں نے کہا " اچھا یہ تو ہوا، مگر یہ تو بتایئے کہ آپ نے اہل صفا کے متعلق اس قدر اختصار سے کیوں کام لیا ہے"؟ امریکہ نے حال ہی میں ان لوگوں کے اس ملک میں وارد ہونے کی سہ صد سالہ سالگرہ منائی ہے۔ ان کا ذکر تو ذرا وضاحت کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ اس کا جواب میں نے یہ دیا کہ اگر میں امریکہ کی تاریخ لکھتا۔ تو بیشک اس فرقہ کے تذکرہ کے لئے ابتدائی بارہ ابواب کا نصف حصہ وقف کر دیتا۔ لیکن میں تو دنیا کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ اور دنیا کی تاریخ میں اس فرقہ کا بندرگاہ پلی متھ سے روانہ ہونا کوئی بین الاقوامی اہمیت نہیں رکھتا۔ علاوہ بریں اس کی ابتدائی تاریخ کے بیس سالوں میں اسکے لیڈر زیادہ تر ورجینیا ہین سلوینا اور جزیرہ نیوس سے آئے تھے۔ نہ کہ میسے چوسیٹس سے لہذا اس فرقہ کے تذکرہ کے لئے اس تاریخ کا ایک صفحہ اور ایک نقشہ بالکل کافی ہے +

اس کے بعد زمانہ قبل تاریخ کے ماہروں کی باری آئی۔ انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ ہم تمہیں عظیم الشان ٹائیرینوسور[1] کا واسطہ دیکر پوچھتے ہیں کہ تم نے کرومیگنان[2] کی حیرت انگیز نسل کے آدمیوں کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیوں نہیں کیا؟ حالانکہ ان لوگوں نے آج سے دس ہزار سال قبل ایک عظیم الشان تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی +

اس کا جواب تو بہت ہی آسان ہے! میں ان لوگوں کے کمالات کا اس قدر قائل نہیں ہوں جس قدر بعض ماہرین علم الانسان قائل ہیں۔ روسو اور اٹھارویں صدی کے دیگر فلاسفہ نے اس " شریف وحشی " کا تصور قائم کیا۔ جو ابتدائے آفرینش میں کامل شادمانی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن ہمارے موجودہ سائینسدانوں نے اس " شریف وحشی " کے تخیل کو رد کر دیا ہے اور اس کی جگہ " شاندار وحشی " کا تخیل پیش کیا ہے جو آج سے ۳۵ ہزار سال پہلے فرانس کی وادیوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ اور جس نے ہالینڈ اور جرمنی کے قرب وجوار میں بسنے والے حیوانوں کے عالمگیر اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ جن کی پیشانیاں بھی تنگ تھیں۔ اور جن کی زندگی کا معیار بھی پست تھا۔ ان سائینسدانوں نے ہمیں اُن ہاتھیوں کی تصویریں بھی دکھائی ہیں۔ جو

---

[1] Tyrannosaur.

[2] Cro-Magnon.

کرو میگنان بنایا کرتے تھے۔ اور وہ مجسمے بھی دکھاتے ہیں۔ جو وہ بنایا کرتے تھے۔ اور انہوں نے اس قوم کے دوسرے شاندار کارنامے بھی بیان کئے ہیں؛

میں یہ نہیں کہتا کہ وہ غلطی پر ہیں۔ لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ ہمیں اس زمانہ کا علم اس قدر تھوڑا ہے کہ اس کی بناء پر ہم ابتدائی مغربی سوسائٹی کی صحیح تاریخ مرتب نہیں کر سکتے۔ اور کسی قوم کے متعلق مشکوک اور غیر مستند روایات بیان کرنے سے یہ بہتر ہے کہ اس کے متعلق کچھ بھی نہ بیان کیا جائے۔

ان کے علاوہ اور بھی نکتہ چین تھے جنہوں نے کھلم کھلا مجھ پر جنبہ داری کا الزام لگایا۔ انہوں نے کہا "آپ نے بعض ممالک مثلاً آئرلینڈ، بلغاریہ اور سیام کا مطلق ذکر نہیں کیا، اور بعض ممالک، مثلاً ہالینڈ، آئس لینڈ اور سوئزرلینڈ کو زبردستی اپنی تاریخ کے صفحات میں جگہ دیدی ہے۔ میں نے اس کا جواب یہ دیا کہ میں نے کسی ملک کا اپنی مرضی سے ذکر نہیں کیا ہے۔ جن ممالک کا تذکرہ اس تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے خود مجھے ان کا تذکرہ کرنے پر مجبور کیا۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس اصول کی تشریح کر دوں جس کے مطابق میں نے مختلف ممالک عالم کا تذکرہ اس کتاب میں قلمبند کیا ہے؛

وہ اصول یہ ہے "کیا فلاں شخص یا فلاں ملک نے دنیا کے سامنے کوئی ایسا اچھوتا خیال یا کوئی ایسا نیا کارنامہ پیش کیا ہے جس کے بغیر تمام نسل انسانی کی تاریخ بالکل ہی مختلف ہوتی؟" اس اصول میں میرے ذاتی رجحان طبع کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ تو ایک ایسا امر ہے جس کا فیصلہ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ بلکہ یوں کہیئے کہ ریاضی کے قواعد کے مطابق کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں منگولی نسل سے زیادہ، کسی قوم کے کارنامے "تاریخی دلچسپی کے حامل نہیں ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ کامیابی یا عقلی ترقی کے اعتبار سے اس نسل کو دنیا کی تاریخ میں سب سے کم درجہ حاصل ہے۔

ٹگلینھ[1] پلیسر اسیری کی زندگی شاندار کارناموں کی ایک مسلسل داستان

---

[1] Tiglath-Pileser

ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس کا ہونا نہ ہونا یکساں ہے۔ اسی طرح جمہوریۂ ولندیز کی تاریخ محض اس لئے دلچسپ نہیں کہ کسی زمانہ میں ڈچ ملاح دریائے ٹیمز میں مچھلی کا شکار کھیلتے چلے جاتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ بحیرہ شمالی کا یہ مختصر سا ساحل ہمیشہ ان تمام لوگوں کا جو غیر معمولی امور میں غیر معمولی رائے رکھتے تھے ملجا اور ماوا بنا رہا ہے (جنہیں کسی ملک میں پناہ نہیں مل سکتی تھی۔ انہیں اس ملک میں پناہ مل جاتی تھی) +

یہ سچ ہے کہ ایتھنز اور فلارنس کی آبادی جبکہ یہ اپنے عروج پر تھے۔ کینساس شہر کے دسویں حصے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اگر یہ دو خوبصورت شہر دنیا میں اپنی ہستی کا ثبوت نہ دیتے۔ تو آج دنیا کی تاریخ اور تہذیب موجودہ تہذیب سے بالکل مختلف ہوتی۔ لیکن امریکہ کے باشندوں سے بادب معذرت خواہی کرکے عرض کرتا ہوں کہ یہ بات اس عظیم الشان شہر کے متعلق نہیں کہی جاسکتی جو دریائے مسوری پر واقع ہے +

اب چونکہ میں ذاتیات سے بحث کرنے لگا ہوں۔ اس لئے لگے ہاتھوں ایک بات اور بھی کہہ ڈالوں!

جب ہم کسی طبیب کے پاس جاتے ہیں۔ تو ہم پہلے یہ معلوم کرلیتے ہیں کہ یہ طبیب نبّاض ہے یا جرّاح، ہومیوپیتھ ہے یا عامل روحانی؟ کیونکہ ہم یہ جاننا ضروری خیال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے مرض کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھیگا؟ جس طرح ہم طبیب کے انتخاب میں احتیاط مدنظر رکھتے ہیں، اسی طرح مُورّخ کے انتخاب میں بھی ہمیں محتاط ہونا چاہیئے۔ لیکن افسوس اس بات میں ہم چنداں غور و فکر نہیں کرتے۔ ہم اس مقولہ پر اکتفا کرتے ہیں کہ تاریخ بہرحال تاریخ ہے خواہ کسی نے لکھی ہو۔ لیکن حقیقت حال اس سے بالکل مختلف ہے جس مصنف کی ابتدائی زندگی کسی خاص مذہبی ماحول میں بسر ہوئی ہو۔ وہ واقعات عالم کو اس زاویۂ نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا جس سے وہ شخص دیکھیگا جس نے بچپن میں انگرسال[1] جیسے مشہور

---

[1] Ingersoll.

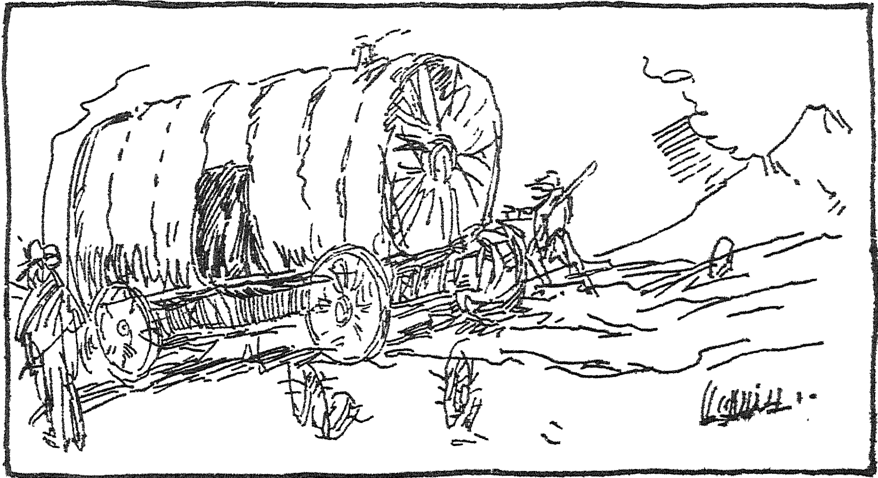
منکر خدا کے لیکچر سُن لئے ہوں - یہ تو ممکن ہے کہ عرصہ دراز کے بعد یہ دونوں افراد ، اپنی ابتدائی تعلیم کو فراموش کر دیں - اور ان کو گرجا یا لیکچر ہال سے کوئی تعلق باقی نہ رہے - لیکن جو اثر انسان اوائل عمر میں قبول کر چکا ہو وہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا - اور تحریر و تقریر میں ضرور اپنا رنگ دکھائیگا ۔

میں نے اس کتاب کے دیباچہ میں یہ لکھا ہے کہ میں ایک ایسا رہنما ہونے کا مدعی نہیں ہوں جس سے غلطی سرزد ہی نہیں ہو سکتی - اور اب جبکہ یہ کتاب ختم ہونے کو ہے میں اسی بات کا اعادہ کرتا ہوں - میری تعلیم و تربیت ، روشن خیالی کے ماحول میں ہوئی - جس میں ڈارون اور انیسویں صدی کے دوسرے فلاسفہ کی علمی تحقیقات کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی - بچپن کا زمانہ میں نے ایسے چچا کے زیر تربیت گزارا جس کو سولہویں صدی کے مشہور فرنچ ادیب مانٹین کی تصانیف سے خاص شغف تھا - چونکہ میری پیدائش رائٹرڈم میں ہوئی ، اور تعلیم گوڈا میں اس لئے مجھے ایراسمس کی تصانیف کو متعدد مرتبہ پڑھنے کا اتفاق ہوا - اور خدا جانے کیوں میرا ضمیر کشش نفس رواداری کے اس عظیم الشان علمبردار کی تعلیم سے بہت متاثر ہوا - کچھ عرصہ کے بعد مجھے اناطول فرانس کی تصانیف کے مطالعہ کا موقع ملا ، اور پہلا انگریزی ناول جس کے پڑھنے کا اتفاق ہوا - وہ تھیکرے کا "ہنری اسمنڈ" تھا - اس کتاب سے بڑھ کر کسی انگریزی کتاب نے مجھے متاثر نہیں کیا ۔

اگر میں امریکہ کے کسی صوبجاتی شہر میں پیدا ہوا ہوتا ، تو شائد مجھے ان مناجاتوں سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ، جو میں نے اپنے بچپن میں سُنی تھیں لیکن موسیقی کے متعلق میری قدیم ترین یادداشت ، ان نغموں سے وابستہ ہے جو میری ماں عصر کے وقت مجھے سنایا کرتی تھی - اور بعد ازاں مجھ پر اپنے پراٹسٹنٹ استاد کے خیالات کا ایسا اثر پڑا کہ اب اگر میں کسی گرجا میں یا کسی مذہبی مجلس میں مذہبی گیت (مناجاتیں) سنوں ، تو مجھے انتہائی ذہنی کوفت بلکہ اعصابی تکلیف محسوس ہوگی اسی طرح اگر میں اٹلی میں پیدا ہوا ہوتا - اور آرنو کی دلچسپ وادی میں دھوپ کا لطف اٹھا چکا ہوتا - تو مجھے ان رنگ برنگ تصاویر سے بہت دلچسپی ہوتی جن کو

آج میں مطلق پسند نہیں کرتا ۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے بچپن میں ذہنی تاثرات ایسے ملک میں رہ کر حاصل کئے ۔ جہاں سورج بہت کم دکھائی دیتا ہے ۔ اور جب دھوپ نکلتی ہے تو بارش سے تر زمین پر تیزی کے ساتھ چمکتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظلمت اور روشنی میں شدید تقابل پیدا ہو جاتا ہے +

میں نے یہ باتیں اس لئے لکھی ہیں کہ ناظرین کو اس کتاب کے مصنف کے ذاتی میلانات سے اور اس کے زاویۂ نگاہ سے واقفیت ہو جائے ۔ تاریخ انسان پر اور لوگوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ۔ وہ مختلف مصنفوں کے زاویۂ نگاہ کا آئینہ ہیں ۔ اور ان کی مدد سے ناظرین میرے خیالات کا دوسروں کے خیالات سے مقابلہ کر سکتے ہیں ۔ اور اس طرح وہ خود ہی کسی مخصوص نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں ۔ اس مختصر مگر ضروری تمہید



تسخیر مغرب

کے بعد میں نفس مضمون کی طرف گریز کرتا ہوں یعنی گزشتہ پچاس سال کی تاریخ بیان کرتا ہوں ۔ اگرچہ اس عرصہ میں بہت سے واقعات رونما ہوئے ، لیکن اُن کے وقوع کے وقت ان میں سے کسی واقعہ کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا ۔ اکثر مغربی طاقتوں کی سیاسی حیثیت ، تجارتی اداروں کی شکل میں تبدیل ہو گئی ۔ چنانچہ انہوں نے ریلیں نکالیں اور تمام دنیا میں دخانی جہازوں کا سلسلہ قائم کیا ۔ اور اپنے مختلف مقبوضات کو ، تار برقی کے ذریعہ سے باہم منسلک کر دیا ۔ اور دوسرے براعظموں میں اپنی

مقبوضات کو وسعت دی ۔ چنانچہ ایشیا اور افریقہ میں جہاں بھی ممکن تھا کسی نہ کسی یورپین سلطنت نے اپنا قبضہ جما لیا ۔ فرانس نے مڈغاسکر، الجیریہ، اناّم اور ٹانکن (مشرقی ایشیا) میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں ۔ جرمنی نے جنوب مغربی اور مشرقی افریقہ کے حصوں پر اپنا قبضہ جمایا ۔ اور کیمرون میں جو افریقہ کے مغربی ساحل پر واقع ہے اور نیوگنی میں اور بحرالکاہل کے اکثر جزائر میں اپنی بستیاں بسائیں ۔ اور بعض پادریوں کے قتل کو بہانہ بنا کر چین کی بندرگاہ کیاؤچاؤ پر جو بحیرہ زرد کے کنارہ پر واقع ہے ۔ قبضہ کر لیا ۔ اٹلی نے حبشہ پر دانت جمایا ۔ لیکن نجاشی کی فوج نے اطالوی فوجوں کے دانت کھٹے کر دئے ۔ اس لئے اُس نے طرابلس پر جو ترکی مقبوضہ تھا، قبضہ کر کے اپنی خفت مٹائی ۔ روس نے تمام سائبیریا کو اپنی مملکت میں شامل کر کے پورٹ آرتھر چین سے چھین لیا ۔ جاپان نے ۱۸۹۵ء میں چین کو شکست دے کر جزیرہ فاموسا پر قبضہ کر لیا ۔ اور ۱۹۰۵ء میں کوریا کا تمام علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۔

۱۸۸۳ء میں برطانیہ نے جو نوآبادیات کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت ہے مصر کو اپنی "حفاظت" میں لے لیا ۔ اُس نے اس ملک کا انتظام بہت عمدگی کے ساتھ کیا ۔ اور یہاں کے باشندوں کی حالت بہت بہتر ہو گئی ۔ واضح ہو کہ ۱۸۶۹ء میں نہر سوئیز کے کھل جانے سے یہ ملک بیرونی حملوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا مگر برطانی سیادت کی وجہ سے بالکل محفوظ ہو گیا ۔ آئندہ تیس سالوں میں برطانیہ نے بہت سی نوآبادیاتی جنگوں میں حصہ لیا ۔ اور ۱۹۰۲ء میں تین سال کی خونریزی کے بعد ٹرانسوال اور آرنج فری سٹیٹ کی بوئر جمہوری ریاستوں پر قبضہ کر لیا ۔ اسی اثنا میں اُس نے سیسل روڈز کو موقع دیا کہ وہ ایک عظیم الشان افریقی حکومت کی بنیاد ڈالے ۔ جو کیپ ٹاؤن سے لیکر دریائے نیل کے دہانہ تک وسیع ہو ۔ اور ان جزائر اور علاقوں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا ۔ جن پر کسی یورپین طاقت نے قبضہ نہیں کیا تھا ۔

بلجیئم کے عقلمند بادشاہ لیوپولڈ نے ہنری سٹینلی کے دریافت کردہ علاقہ کو ۱۸۸۵ء میں کانگو فری سٹیٹ کی شکل دی ۔ اور اگرچہ شروع میں یہ ایک خود مختار حکومت تھی ۔ لیکن عرصہ دراز تک بدنظمی کا شکار رہنے کی بنا پر

۱۹۰۸ء میں بلجیم نے اس کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ اور اُس کی حیثیت ایک نوآبادی کی سی ہو گئی۔ اس کے بعد ان خرابیوں کی جو سابقہ حکومت کے زمانہ میں رائج تھیں۔ اصلاح کی گئی۔ کانگو کا سابق حکمران نہایت غافل آدمی تھا وہ رعایا کی حالت زار سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا تھا۔ اُسے تو صرف ربڑ اور ہاتھی دانت سے غرض تھی +

اب رہیں ریاستہائے متحدہ امریکہ، تو ان کے پاس پہلے ہی سے اس قدر زمین موجود تھی کہ انہیں مزید زمین کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن جزیرہ کیوبا میں ہسپانوی حکومت کے ظلم وستم نے واشنگٹن کی حکومت کو مداخلت پر مجبور کر دیا۔ واضح ہو کہ کیوبا، مغربی نصف کرہ میں ہسپانیہ کا آخری مقبوضہ رہ گیا تھا۔ ایک مختصر اور معمولی سی جنگ کے بعد ہسپانیہ کے لوگ کیوبا پورٹو رکو اور فلپائینز سے نکل بھاگے اور آخر الذکر دو جزیرے ریاستہائے متحدہ کی نوآبادیاں قرار پائیں +

دنیا کی اقتصادی ترقی بالکل قوانین فطرت کے مطابق تھی۔ فرانس انگلستان اور جرمنی میں جس قدر فیکٹریوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اسی قدر خام اجناس کی ضرورت بھی بڑھتی گئی اور جس قدر یورپین کاریگر بڑھتے گئے اُسی قدر خوراک کی مقدار بھی بڑھتی گئی۔ ہر جگہ یعنی ہر ملک میں لوگوں کی آرزو یہ تھی کہ ہمیں عمدہ منڈیاں دستیاب ہو جائیں۔ اور کوئلہ اور لوہے کی کانیں دریافت ہو جائیں۔ اور ربڑ کی کاشت کے لئے زرخیز زمینیں مل جائیں۔ اور تیل کے چشمے دستیاب ہو جائیں۔ اور گیہوں اور غلہ کی پیداوار بڑھ جائے +

جو لوگ وکٹوریا نیانزا میں اگن بوٹ اور شینٹنگ کے اندرونی علاقہ میں ریلیں چلانے کا انتظام کر رہے تھے + اُن کی نظر میں خالص سیاسی واقعات کی جو براعظم یورپ میں واقع ہو رہے تھے۔ چنداں اہمیت نہ تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ بہت سے یورپین مسائل ابھی حل طلب ہیں۔ لیکن انہیں اس امر کی مطلق پروا نہ تھی۔ اور محض اس تغافل اور لاپرواہی کی بدولت ان لوگوں نے آئندہ نسلوں کے لئے نفرت اور حقارت کا خوفناک ورثہ تیار کر دیا۔ صدیوں سے یورپ کا جنوب مشرقی حصہ بغاوتوں اور خونریزی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اور ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے مابین

ممالک سرویا۔ بلغاریہ۔ مانٹی نیگرو اور رومانیا کے لوگ ترکوں کی حکومت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور بہت سی مغربی حکومتیں ان لوگوں کی حمایت پر کمربستہ تھیں۔ ۱۸۷۶ء میں بلغاریہ میں خوفناک خونریزی کی بناء پر روس نے مداخلت کی۔ ٹھیک جس طرح صدر میک کنلے کو کیوبا جا کر ہوآنا میں جنرل ویلر کے غارتگر سپاہیوں کو قتل عام سے باز رکھنا پڑا تھا۔ اپریل ۱۸۷۷ء میں روسی فوجوں نے دریائے ڈینوب کو عبور کیا۔ اور درہ شپکا کو فتح کیا اور پلونا کو مسخر کر کے جنوب کی طرف پیشقدمی شروع کی۔ یہاں تک کہ وہ قسطنطنیہ کے قریب پہنچ گئیں۔ اس موقع پر ترکی نے برطانیہ سے امداد کی درخواست کی۔ اگرچہ بہت سے انگریزوں نے اپنی حکومت کو ترکوں کی امداد کی بناء پر برا بھلا کہا مگر ڈزرائیلی نے (جس نے اسی زمانہ میں ملکہ وکٹوریہ کو قیصرۂ ہند بنایا تھا۔ اور جو ترکوں کو پسند اور روسیوں کو ناپسند کرتا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی یہودی رعایا کے ساتھ نہایت ظالمانہ برتاؤ کرتے تھے) مداخلت کا فیصلہ کر ہی لیا۔ روس کو مجبور کیا گیا کہ وہ بمقام سن اسٹفانو (۱۸۷۸ء) صلح کرلے اور بلقان کے مسائل کا تصفیہ ایک مجلس کے سپرد کیا گیا جس کا اجلاس اسی سال جون اور جولائی میں بمقام برلن منعقد ہوا۔

اس مشہور کانفرنس میں ڈزرائیلی کی شخصیت باقی ارکان پر حاوی تھی۔ خود بسمارک بھی اس دانا یہودی مدبر کی قابلیت کا لوہا مانتا تھا۔ جس کے بال گھنگریالے تھے۔ اور جس کے مزاج میں اعلیٰ درجہ کی تمکنت تھی۔ لیکن طبیعت میں طنز آمیز ظرافت اور خوشامد کا عنصر بھی شامل تھا۔ برلن کانگریس میں، برطانی وزیراعظم نے اپنے دوستوں یعنی ترکوں کے مفاد کو بخوبی پیش نظر رکھا۔ کانفرنس کے فیصلہ کی رو سے مانٹی نیگرو، سرویا اور رومانیا کی آزادی تسلیم کی گئی۔ بلغاریہ کو زار روس سکندر ثانی کے بھتیجے پرنس الگزینڈر آف بیٹن برگ کی ماتحتی میں نیم آزاد حیثیت عطا کی گئی۔ چونکہ برطانیہ کو ترکوں کا مفاد مدنظر تھا۔ اس لئے ان حکومتوں کو اپنے داخلی ذرائع کی ترقی کے مواقع عطا نہیں کئے گئے۔ وجہ یہ تھی کہ برطانیہ سلطنت ترکی کی بقا کا آرزومند تھا۔ تاکہ روسیوں کو بحیرہ روم میں جارحانہ پیشقدمی کا موقع نہ مل سکے۔

اس کانگریس نے ایک غلطی یہ کی کہ بوسینا اور ہرزیگونیا کے صوبے ترکوں سے لیکر آسٹریا کے حوالہ کر دئیے۔ یہ سچ ہے کہ آسٹریا نے ان صوبوں پر حسن تدبیر سے حکمرانی کی اور ان کی حالت ایسی ہی اچھی ہو گئی جیسی کہ بہترین برطانی نوآبادیات کی ہے۔ لیکن ان صوبوں میں بہت سے سروی آباد تھے۔ اور قدیم زمانہ میں یہ صوبے اسٹیفن ڈوشن کی عظیم الشان سروی سلطنت کا جزو تھے جس نے چودھویں صدی کے اوائل میں ترکوں کے مغربی یورپ پر حملوں کی مدافعت کی تھی۔ اور جس کا پایۂ تخت اُسکُپ، کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے سے ڈیڑھ سو سال پہلے یورپ میں تہذیب و تمدن کا زبردست مرکز تھا۔ اہل سرویا کے دلوں میں اپنی سابقہ عظمت کی یاد چٹکیاں لیتی تھی اور کیوں نہ لیتی؟ یہ تو تقاضائے فطرت ہے۔ انہیں ان صوبوں پر آسٹریا کا قبضہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ جن کو وہ روایات کے لحاظ سے اپنی ملکیت سمجھتے تھے +

چنانچہ ۲۸ رجون ۱۹۱۴ء کو سراجیوو میں جو بوسنیا کا پایہ تخت ہے سلطنت آسٹریا کے ولیعہد آرچ ڈیوک فرڈینینڈ کو قتل کر دیا گیا۔ قاتل ایک سروی تھا جس نے محض حُبِ وطن کے جوش میں یہ کام کیا تھا +

لیکن اس خوفناک سانحہ کا الزام جس نے یورپ میں جنگ عظیم کی آگ بھڑکا دی۔ نہ سر پھرے سروی پر عائد ہوتا ہے۔ اور نہ اس کے آسٹرین مقتول پر بلکہ اسکی تمامتر ذمہ واری مشہور برلن کانفرنس پر عائد ہوتی ہے + اس کانفرنس میں یورپ مادی تہذیب کی تعمیر میں اس قدر منہمک تھا کہ اُسے جزیرہ نمائے بلقان کے کوہستانی علاقہ کی ایک فراموش شدہ قوم کے جذبات کا پاس کرنے کی فرصت ہی نہ تھی +

ایک نئی دنیا

جنگ عظیم جو دراصل ایک نئی اور بہتر دنیا کے قیام کے لئے ایک کشمکش تھی

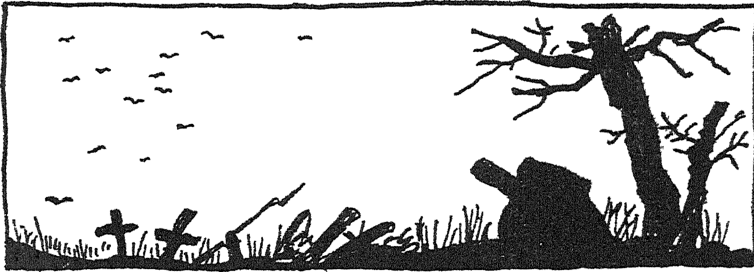
مارکوئیس آف کندورسے اُن پُرجوش کارکنوں کی جماعت کا ایک ممتازترین فرد تھا۔ جن کی کوششوں سے فرانس کا زبردست انقلاب رونما ہوا۔ اس شخص نے اپنی زندگی غریبوں اور بدبختوں کی بہبود کے لئے وقف کردی تھی۔ یہ شخص دالمبیر اور دیدرو کے مشہور فرنچ سائیکلوپیڈیا کی ترتیب میں بھی ان کا معاون تھا۔ اور انقلاب کے ابتدائی زمانہ میں مجلس عالیہ کے معتدل طبقہ کا لیڈر تھا +

چونکہ یہ شخص بہت روادار، رحمدل اور زیرک شخص تھا۔ اس لئے جب بادشاہ اور اس کے درباریوں کے ایک مخصوص گروہ کی ریشہ دوانیوں کی بناء پر انتہا پسندوں کو عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینے اور اپنے مخالفوں کو قتل کرنے کا موقع ملا۔ تو انہوں نے اس شخص کی وفاداری پر بہت کچھ شکوک ظاہر کئے۔ چنانچہ کندورسے کو "بدمعاش" قرار دیکر محبانِ وطن کے رحم پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے دوستوں نے اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر اُسے کہیں چھپا دینا چاہا۔ لیکن اس نے اس بات کو منظور نہ کیا۔ بلکہ یہ کوشش کی کہ کس طرح اپنے وطن چلا جائے۔ چنانچہ تین راتیں کھلے میدان میں گزار کر تھکا ماندہ زخمی تلووں کے ساتھ وہ ایک سرائے میں داخل ہوا۔ اور کھانا طلب کیا دہقانیوں نے اُسے شبہ کی نظر سے دیکھا، اور اس کی جامہ تلاشی لی جس پر انہیں ہوریس لاطینی شاعر کا ایک نسخہ اس کی جیب میں سے ملا، اس پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ شخص خاندانی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا یوں پاپیادہ سفر کرتے پھرنا خالی از علت نہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ ہر تعلیمیافتہ آدمی انقلابی حکومت کا دشمن

سمجھا جاتا تھا۔ اس کا سفر کرنا یقینی طور پر ایک مجرمانہ فعل تھا۔ پس انہوں نے اس کی مشکیں کس لیں، اور اس کے مونہہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اور اسے گاؤں کے قید خانہ میں ڈال دیا۔ لیکن جب دوسرے دن سپاہی اُسے کشاں کشاں پیرس لے جانے کے لئے آئے۔ تاکہ وہاں اُسے قتل کیا جائے۔ تو اس کو مردہ پایا!

اس شخص نے اپنا سب کچھ قوم اور ملک کے لئے قربان کر دیا تھا جس کا اسے بجز موت کے کچھ بھی صلہ نہ ملا۔ اس لئے اُسے انسانوں سے متنفر ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن اُس نے چند باتیں ایسی لکھی ہیں۔ جو آج بھی ویسے ہی سچی ہیں۔ جیسے آج سے ۱۳۰ سال پہلے سچی تھیں۔ میں ناظرین کے فائدہ کے لئے انہیں ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

"فطرت نے ہماری امیدوں کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ اور نسل انسانی کی تصویر جو کہ قیود سے آزاد ہو کر صداقت نیکی اور مسرت کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ ایک فلاسفر کے سامنے ایسا دل خوش کُن نظارہ پیش کرتی ہے جس کو دیکھ کر وہ اُن جرائم اور مظالم اور مصائب سے چشم پوشی کر سکتا ہے۔ جو ابھی تک اس دنیا کو ناپاک کر رہے ہیں اور اس کے باشندوں کو دکھ پہنچا رہے ہیں" +



جنگ

دنیا نے ابھی ابھی اُس عذاب الیم سے نجات پائی ہے جس کی سختیوں کے مقابلہ میں انقلاب فرانس محض ایک معمولی واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ سانحہ اس قدر شدید تھا کہ کروڑوں انسانوں کے دماغ سے بہبود کی آخری توقع بھی زائل ہو چکی ہے۔ وہ ترقی کے لئے کوشاں تھے۔ لیکن ان کی کوششوں کا نتیجہ اسکے سوائے کچھ نہ نکلا کہ نسل انسانی چار سال تک خون سے ہولی کھیلتی رہی۔ وہ بجا طور پر یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا ایسی مخلوق کے لئے جو ابھی تک بربریت کے اُسی ابتدائی دور میں ہے۔

اپنا خون پانی ایک کرنا کوئی معنے رکھتا ہے؟ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ "ہاں"۔

بلاشبہ جنگ عظیم ایک خوفناک مصیبت تھی۔ لیکن اُس نے نظام عالم کو ختم نہیں کیا۔ بلکہ ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔

روم یا یونان یا زمانہ تاریک کی تاریخ لکھنی آسان ہے۔ کیونکہ اس زمانہ کے لوگ سب مر چکے ہیں اور اب ہم اطمینان کے ساتھ اُن کے قول وفعل پر نکتہ چینی کر سکتے وہ لوگ بھی جو اُن کے کارناموں کے شاہد تھے۔ اب دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ہماری تنقید سے ان کی دل آزاری نہیں ہو سکتی۔

لیکن موجودہ زمانے کے واقعات کو صحیح طور پر قلمبند کرنا نہایت دشوار ہے۔ کیونکہ وہ مسائل جو آج دنیا میں زیر بحث ہیں۔ خود ہمارے مسائل ہیں۔ اور یا تو ہم ان کی تنقید سے اس درجہ تکلیف محسوس کرتے ہیں یا اس درجہ مسرت کہ ہم تاریخ لکھتے وقت دیانت داری سے کام نہیں لے سکتے۔ بلکہ ہماری تحریریں پروپاگنڈا کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے تاہم میں آپ کے سامنے وہ دلائل ضرور پیش کرونگا جن کی بناء پر میں بدقسمت کندورسے متفق ہوں اور یقین رکھتا ہوں اُس نے مستقبل نوع انسانی کے متعلق جو بہبودی کا خیال ظاہر کیا تھا۔ وہ صداقت پر مبنی ہے۔

میں نے ناظرین کو اس غلطی سے آگاہ کر دیا ہے۔ جو ہماری نام نہاد تاریخ انسان کو چار حصوں میں تقسیم کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے یعنی زمانہ قدیم، زمانہ تاریک، زمانہ نشاۃ ثانیہ اور زمانہ حال یہ آخری اصطلاح بہت خطرناک ہے۔ لفظ حال کا مفہوم یہ ہے کہ ہم لوگ جو بیسویں صدی میں رہتے ہیں۔ انسانی کامیابی کی آخری منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ پچاس سال قبل، انگلستان کے "آزاد خیال لوگ" جو سیاسیات میں گلیڈسٹون کی پیروی کرتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ دوسرے ریفارم بل کی بدولت، ایک حقیقی نمائندہ اور جمہوری طرز حکومت کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو گیا ہے جس کی رو سے مزدوروں اور مالکان کارخانجات کو انتظام حکومت میں مساوی رتبہ مل گیا ہے۔ اور جب ڈزرائیلی اور اس کے قدامت پسند اصحاب اصلاحات کو ایک جوا سمجھتے تھے۔ تو مخالفین نفی میں

جواب دیتے تھے۔ کیونکہ انہیں اپنے اصولوں کی صداقت پر یقین تھا۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ آئندہ سوسائٹی کے تمام افراد اپنی ملکی حکومت کو کامیابی کے ساتھ چلا سکینگے۔ اس عرصہ میں بہت سی ایسی باتیں رونما ہو چکی ہیں جن کی بدولت، وہ چند آزاد خیال لوگ جو اس وقت زندہ ہیں۔ اپنی غلطی کا احساس کرنے لگے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی تاریخی مسئلہ کا کوئی حتمی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ ہر نسل کو اپنے زمانہ کی جنگ نہایت ثابت قدمی کے ساتھ لڑنی پڑیگی۔ ورنہ وہ زمانہ قبل تاریخ کے بھدے اور کاہل جانوروں کی طرح صفحہ ہستی سے ناپید ہو جائیگی۔

اگر آپ اس صداقت کو سمجھ لیں، تو آپ کو حیات انسانی کے متعلق ایک نیا اور وسیع تر علم حاصل ہو جائیگا۔ اس کے بعد آپ ایک قدم اور آگے بڑھائیں اور اُن لوگوں کا اور ان کی ذہنیت کا تصور کریں۔ جو آپ کی نسل سے ۱۰۰۰۰ء میں پیدا ہونگے۔ وہ بھی دنیا کی تاریخ کا علم حاصل کرینگے۔ لیکن وہ اس چار ہزار سال کے مختصر زمانہ کے متعلق کیا خیال کرینگے۔ جس کی تاریخ ہم نے لکھکر مرتب کی ہے؟ غالباً وہ نیپولین کو ٹگلیتھ پلیسر اسیری فاتح کا ہمعصر سمجھیں گے۔ اور ممکن ہے کہ وہ اس میں اور چنگیز خاں یا سکندر میں تمیز نہ کرسکیں۔ اس جنگ عظیم کو جو ابھی ختم ہوئی ہے۔ غالباً وہ اُس تجارتی کشمکش کی روشنی میں دیکھینگے جس نے بحیرۂ روم کے تفوق کے مسئلہ کو طے کیا۔ جبکہ روما اور کارتھیج دونوں ۱۲۸ سال تک اس سمندر پر قبضہ کرنے کے لئے باہم لڑتے رہے۔ اور اُنیسویں صدی کی جنگ بلقان کا سلسلہ ان کی انہیں ہجرتوں کے زمانے سے ملتا ہوا نظر آئیگا۔ وہ ریمز کے گرجا کو جسے کچھ عرصہ ہوا۔ جرمنی کی توپوں نے تباہ کیا۔ اسی نظر سے دیکھینگے جس نظر سے ہم ایکروپولس کے فوٹو کو دیکھتے ہیں۔ جو ترکوں اور اہل وینس کی جنگ میں، آج سے ۲۵۰ سال پہلے تباہ ہوا۔ وہ موت کے خوف کو جو ابھی تک لوگوں میں عام ہے۔ ایک طفلانہ وہم پرستی خیال کرینگے۔ جو اس نسل کے لوگوں میں قدرتی طور پر ہونا چاہئے تھا جس نے ۱۶۹۲ء تک بیگناہ عورتوں کو جادوگرنیاں سمجھ کر زندہ آگ میں جلایا۔ حتیٰ کہ ہمارے موجودہ ہسپتال، اور تجربہ گاہیں اور جراحی کے کمرے جن پر ہم اس قدر نازاں ہیں۔ ان کی نظروں میں زمانہ تاریک کے

جراحوں اور دوا سازوں کی دکانوں سے زیادہ وقیع نہ ہونگے +

اور اس تبدیلی نظر کا سبب نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے - ہم موجودہ زمانہ کے لوگ دراصل قطعاً "جدید" نہیں ہیں - بلکہ ہم ابھی تک قدیم زمانہ میں غاروں کے رہنے والوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں - دور جدید کی بنیاد کل ہی رکھی گئی ہے - نسل انسانی کو مہذب ہونے کا پہلا موقع ملا - جب اس میں ہر معاملہ کے متعلق شکوک اور سوالات کرنے کی جرأت پیدا ہوئی - اور اُس نے معقول اور دانشمند سوسائٹی کی بنیاد علم وحکمت کو قرار دیا - یہ نئی دنیا جنگ عظیم سے پیدا ہوئی - صدیوں تک لوگ ضخیم



کتابیں یہ ثابت کرنے کو لکھتے رہینگے کہ فلاں شخص یا جماعت اس جنگ کی ذمہ وار تھی۔ مثلاً اشتراکی اپنی کتابوں میں سرمایہ داروں کو ملزم قرار دینگے کہ انہوں نے تجارتی مفاد کی خاطر جنگ برپا کرائی۔ سرمایہ دار اس کے جواب میں لکھینگے کہ ہمیں اس جنگ کی بدولت نفع سے زیادہ نقصان پہنچا۔ اور ہمارے افراد نے اس جنگ میں دل کھول کر شرکت کی اور میدان جنگ میں مارے گئے۔ اور ہر ملک کے مہاجنوں نے جنگ کو روکنے کے لئے سر توڑ کوششیں کیں۔ فرنچ مورخ جرمنوں کے مظالم کی فہرست تیار کرینگے۔ جو شارلیمان کے زمانہ سے شروع ہو کر قیصر ولیم پر ختم ہوگی۔ اور اس کے جواب میں جرمن مورخ فرانسیسوں کی بربریت کے افسانے مرتب کرینگے۔ جو شارلیمان کے عہد سے شروع ہو کر پوائنکارے صدر جمہوریہ فرانس کے زمانہ پر ختم ہونگے۔ اور ان میں سے ہر ایک اس بات کو ثابت کرکے اپنے دل کو تسلی دیگا کہ فریق ثانی جنگ کے آغاز کے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ تمام ممالک کے مدبرین جو فوت ہو چکے یا آئندہ ہونگے۔ سب اپنا اپنا بیان مرتب کرینگے جس میں ہر ایک یہی لکھیگا کہ میں نے جنگ کو روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن ہمارے بدطینت مخالفین نے ہماری بات نہ مانی +

آج سے سو سال کا مورخ ان معذرت ناموں اور صفائی کے بیانوں میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں لیگا۔ بلکہ وہ پس پردہ اسباب کی حقیقت کو سمجھ لیگا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچیگا کہ شخصی آرزو، شخصی بدفطرتی اور شخصی طمع کو اس جنگ کے وقوع میں بہت کم دخل تھا۔ اصلی غلطی (جو اس جنگ کا اصلی سبب ہے) اس وقت واقع ہوئی۔ جبکہ ہمارے سائنسدانوں نے بجلی اور کیمیا لوہے اور فولاد کی ایک نئی دنیا بنانی شروع کی۔ اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ انسانی دماغ چیونٹی سے بھی زیادہ سست رفتار اور کچھوے سے بھی زیادہ کاہل ہے +

افریقہ کا وحشی اگر فراک کوٹ پہن لے تو بھی وحشی ہی رہتا ہے۔ اور اگر ایک کتے کو سائیکل چلانا اور پائپ پینا سکھا دیا جائے۔ تو بھی وہ کتا ہی رہتا ہے۔ اسی طرح ایک انسان کا دماغ اگر سولھویں صدی کے تاجر کا سا ہو۔ تو وہ رولز رائس میں سوار ہونے کے باوجود سولھویں صدی ہی کا دماغ رہتا ہے۔ بدل نہیں جاتا +

اگر آپ اس مثال کو نہ سمجھے ہوں۔ تو اس پر دوبارہ غور کریں۔ آپ کی سمجھ میں بہت سی وہ باتیں بھی آ جائینگی جو ۱۹۱۴ء سے بیدار اب تک واقع ہوئی ہیں +

مناسب ہے کہ اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے میں آپ کے سامنے ایک واضح تر اور آسان تر مثال اور پیش کروں۔ فلمی تھیٹروں میں اکثر مذاقیہ اور ظریفانہ باتیں گفتگو کے دوران میں پیش کی جاتی ہیں۔ بعض لوگ کلام سننے سے پہلے بات کا مطلب سمجھ جاتے ہیں۔ بعض ذرا دیر میں سمجھتے ہیں۔ بعض کو نصف منٹ صرف کرنا پڑتا ہے اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا ذہن اس سے بھی زیادہ کند ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کا حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی ابھی آپ کو سمجھا دونگا +

میں یہ حقیقت آپ پر واضح کر چکا ہوں کہ آخری رومی شہنشاہ کی وفات کے ہزار سال بعد تک سلطنت روما کا تصور لوگوں کے دماغوں سے محو نہیں ہو سکا۔ اور اسی کی بدولت بہت سی نقلی رومن سلطنتیں عالم وجود میں آگئیں۔ اور اسی کی بدولت روما کے اسقفوں کو یہ موقع ملا کہ انہوں نے اپنے آپ کو تمام کلیسا کا سردار بنا لیا۔ کیونکہ وہ روما کے عالمگیر تفوق کے مظہر تھے۔ اور اسی کی بدولت بہت سے معصوم بھولے بھالے وحشی سردار گھناؤنے جرائم اور طویل جنگوں کے مرتکب ہوئے کیونکہ ان پر روما کے لفظ کا جادو مسلط تھا۔ یہ سب لوگ کیا پوپ کیا شہنشاہ، اور کیا شمشیر زن آپ سے اور مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ لیکن وہ اسی دنیا میں رہتے تھے۔ جس میں روما کی روایات ایک زندہ حقیقت کا مرتبہ رکھتی تھیں۔ پس وہ اس چیز کے لئے اپنی جانوں کو قربان کرنا سب سے بڑی عزت سمجھتے تھے جس کے مداح آج مشکل سے تمام دنیا میں گنتی کے چند آدمی مل سکتے ہیں +

ایک اور باب میں میں نے آپ کو بتایا ہے کہ بڑی مذہبی جنگیں اصلاح کے سو سال کے بھی بعد وقوع پذیر ہوئیں۔ اور اگر آپ سی سالہ جنگ کے باب کا ایجادات کے باب سے مقابلہ کریں۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ قتل و غارت اس زمانہ میں واقع ہوئی جب دخانی انجن فرانسیسی برطانی اور جرمن سائنسدانوں کی تجربہ گاہوں سے حرکت میں آ چکے تھے۔ لیکن دنیا نے اس وقت ان مشینوں میں کچھ زیادہ دلچسپی

نہیں لی اور بدستور اُن دینی مباحث میں منہمک رہی - جو اگر آج لوگوں کے سامنے دُہرائے جائیں تو انہیں جمائیاں آنے لگیں +

نوع انسانی کا اندازہ بس یہی ہے - آج سے ہزار سال کے بعد کا مورخ یہی الفاظ انیسویں صدی کے یورپ کے متعلق استعمال کریگا - جبکہ وہ یہ دیکھیگا کہ اُس زمانہ کے لوگ خوفناک قومی تنازعات میں منہمک تھے - جبکہ اُن کے گردوپیش تجربہ گاہوں میں سائینسدانوں کی جماعت اپنے کام میں مشغول تھی - اور اُسے سیاسیات سے کوئی وابستگی نہ تھی - کیونکہ اس کی توجہ اس بات پر مبذول تھی کہ کسی طرح فطرت کے اسرار و رموز کو بے نقاب کیا جائے +

آپ رفتہ رفتہ سمجھ ہی جائینگے کہ میرا اصلی مطلب کیا ہے؟ ہمارے زمانہ میں انجینیروں، سائینسدانوں اور ماہرین کیمیا نے یورپ اور امریکہ اور ایشیا کے بازاروں کو مشینوں اور تاروں اور ہوائی جہازوں اور کول تار کے مرکبات سے معمور کر دیا ہے اور ایک نئی دنیا پیدا کر دی ہے جس میں زمان و مکان کی اہمیت بالکل ہی باقی نہیں رہی - انہوں نے نئی نئی چیزیں اختراع کی ہیں - اور ان کو اس قدر ارزاں فروخت کرنا شروع کر دیا ہے کہ ہر شخص ان کو حاصل کر سکتا ہے - اگرچہ میں نے اس کی تفصیل قبل ازیں بیان کر دی ہے لیکن اس کا اعادہ غیر موزوں نہ ہوگا +

ان روز افزوں فیکٹریوں کو قائم رکھنے کے لئے مالکوں کو جو حکمران بھی تھے - اجناس خام اور کوئلہ کی ضرورت تھی - خاص کر کوئلہ کی - اس اثناء میں عام لوگوں کی ذہنی کیفیت سولھویں صدی کے لوگوں سے مختلف نہ تھی - حکومت کے متعلق ان کا تصور وہی رہا - اس زمانہ تاریک کی ذہنیت پر یکایک صنعتی دنیا کے موجودہ مسائل کا بار آن پڑا - اُس نے حتیٰ الامکان ان مسائل کو ان پُرانے اصولوں کے مطابق سلجھانے کی بہت کوشش کی - جو آج سے کئی صدی پہلے مرتب کئے گئے تھے - مختلف حکومتوں نے عظیم الشان فوجیں مرتب کیں اور بڑے بڑے بحری بیڑے تیار کئے - جن کی مدد سے دور دراز ممالک پر قبضہ کیا گیا - دنیا کے پردے پر جہاں کہیں کوئی زمین کا حصہ نظر آیا - وہاں ایک نہ ایک جرمن یا فرانسیسی روسی یا برطانوی نوآبادی قائم ہو گئی - اگر اس مقام کے باشندوں نے کچھ چون و چرا کی تو انہیں بلا تامل موت کے گھاٹ اتار

دیا گیا۔ لیکن اصلی باشندوں نے بہت کم مزاحمت کی۔ چنانچہ فاتحین نے بھی انہیں زندہ رہنے کا حق عطا کر دیا۔ بشرطیکہ وہ ہیرے، کوئلہ، تیل اور سونے کی کانوں یا ربر کی کاشت سے کوئی تعرض نہ کریں۔ اور اس طرح انہیں بھی تصرف اغیار سے کچھ فائدہ حاصل ہو گیا +

بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی خطۂ زمین پر دو حکومتوں نے بیک وقت قبضہ کرنا چاہا۔ اس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مثلاً پندرہ سال ہوئے روس اور جاپان میں چین کے بعض علاقوں پر جنگ واقع ہوئی تھی۔ لیکن یہ استثنائی صورتیں ہیں۔ دراصل کوئی جنگ کا خواہاں نہ تھا۔ اور ابتدائی بیسویں صدی کے لوگوں کو فوجوں جہازوں اور آبدوزوں کی لڑائی ایک مہمل بات معلوم ہونے لگی۔ جنگ و جدل کو وہ قدیم زمانہ کی مطلق العنان حکومتوں اور سازشی حکمرانوں کی روایات میں سے سمجھتے تھے۔ وہ ہر روز اپنے اخباروں میں نئی ایجادات کا حال پڑھتے تھے کہ انگریز جرمن اور امریکن سائنسدان باہم مل کر علم طب اور علم ہیئت میں نئے نئے انکشافات کر رہے ہیں۔ وہ تجارت، خرید و فروخت اور فیکٹریوں کی مشغول دنیا میں رہتے تھے۔ اور بہت کم لوگوں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ حکومت کا تصوّر دوسری ایجادات کے مقابلے میں کئی سو سال پیچھے رہ گیا ہے۔ انہوں نے دوسروں کو متنبہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن لوگ اپنے اپنے مشاغل میں منہمک تھے +

میں نے اس قدر تشبیہیں استعمال کی ہیں کہ اب آخری تشبیہ پیش کرتے وقت میں ناظرین سے معذرت طلب کرتا ہوں۔ حکومت کا جہاز مصریوں، یونانیوں، رومیوں اور اہل وینس اور سترھویں صدی کے حوصلہ مند تاجروں کے قبضے میں تھا۔ ایک نو پختہ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اور ایسے افسروں کے زیر کمان تھا۔ جو اپنے جہاز اور جہاز والوں کی خوبیوں اور خامیوں سے پوری طرح آگاہ تھے +

اس کے بعد لوہے فولاد اور مشینوں کا زمانہ آیا۔ پہلے اس حکومت کے جہاز کا ایک حصہ تبدیل ہوا پھر دوسرا۔ اس کی وسعت میں بھی اضافہ ہوا۔ بادبانوں کی جگہ انجن لگایا گیا۔ بود و باش کے لئے بہتر کمرے بنائے گئے۔ لیکن کو عملہ

جھو نکنے کے لئے پہلے سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت پیش آئی۔ کوئلہ جھو نکنے کا کام نسبتاً آرام دہ اور منفعت بخش تھا۔ لیکن بادبانی جہازوں میں باوجود خطرے کے جو ایک دلفریبی تھی۔ وہ اب مفقود ہوگئی۔ پرانا لکڑی کا جہاز بدلتے بدلتے ایک دخانی جہاز بن گیا۔ لیکن کپتان اور اس کے ماتحت کام کرنے والے وہی پرانی ذہنیت کے آدمی رہے، اُن کے تقرر یا انتخاب کا طریقہ وہی رہا جو آج سے سو سال پہلے رائج تھا۔ اور انہیں جہاز رانی کا وہی فن سکھایا گیا جو پندرھویں صدی کے جہاز رانوں میں رائج تھا۔ اُن کے کمروں میں وہی نقشے اور جھنڈے لٹکے ہوئے تھے۔ جو لوئی چہاردہم اور فریڈرک اعظم کے زمانہ میں استعمال ہوتے تھے۔ مختصر یہ کہ جہاز تو بالکل نیا ہو گیا تھا۔ مگر جہاز ران وہی پرانے لوگ تھے +

بین الاقوامی سیاسیات کا سمندر زیادہ وسیع نہیں ہے۔ جب شہنشاہیت اور نوآبادیات کے جہازوں میں مقابلہ شروع ہوا۔ تو ایک دوسرے سے ٹکرانا یقینی تھا۔ چنانچہ تصادم کے واقعات رونما ہوئے اور اگر آپ سمندر کے اس حصہ سے ہو کر گزریں۔ تو ان جہازوں کی بربادی کا منظر اب بھی دیکھا جا سکتا ہے +

اس داستان سے جو سبق حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کا سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ دنیا کو آج کل ایسے لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ جو رہنمائی کا فرض انجام دے سکیں۔ جن کا ایمان پختہ ہو اور جو اس حقیقت کا اعتراف کر سکیں۔ کہ ہم ابھی سفر کی ابتدائی منزلوں ہی میں ہیں۔ اور ہمیں دخانی جہاز رانی کا طریقہ ابھی از سرِ نو سیکھنا ہے +

ان لوگوں کو مدتوں تک شاگردانہ حیثیت میں کام کرنا ہوگا۔ اور ترقی کی بلندی پر پہنچنے کے لئے ہر قسم کی مخالفتوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب وہ اثنائے سفر میں کسی پل پر سے گزریں۔ تو اُن کے ہمراہی اُن سے غداری کریں اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیں۔ لیکن ایک نہ ایک دن ایک شخص ایسا بھی پیدا ہوگا۔ جو اس جہاز کو صحیح سلامت ساحل مقصود تک لے آئیگا۔ اور یہی شخص تمام دنیا کا ہیرو قرار دیا جائیگا +

وہ سچ جو کبھی جھوٹ نہ ہوگا

"میں انسانی زندگی کی الجھنوں پر جس قدر غور کرتا ہوں۔ اتنا ہی مجھ پر روشن تر ہوتا جاتا ہے کہ جس طرح قدیم مصر کے لوگ بخشش اور نجات کے لئے آئیمس اور نیفتیس کا دامن پکڑتے تھے۔ اسی طرح ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لئے طنز اور رحم کا دامن پکڑنا چاہئے۔

طنز اور رحم سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری مشکلکشا نہیں ہوسکتی۔ طنز سے زندگی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ اور رحم اپنے آنسوؤں سے زندگی کو مقدس بناتا ہے۔

جس طنز کو میں اپنا دیوتا بنانا چاہتا ہوں۔ وہ کوئی سنگدل دیوتا نہیں وہ محبت اور حسن کا مضحکہ نہیں اڑاتا۔ وہ حلیم اور مہربان دیوتا ہے۔ اس کا تبسم دشمنوں کو بھی دوست بنالیتا ہے۔ اور وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ احمقوں اور ظالموں پر ہنسو۔ ان سے نفرت مت کرو۔ کیونکہ یہ کمزوری کی نشانی ہے۔"

ایک بہت بڑے فرانسیسی کے ان دانشمندانہ الفاظ پر میں اس کتاب کو ختم کرتا ہوں۔ اور رخصت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ۔

دنیا کی جیتی جاگتی تاریخ

(از سنہ ۵۰۰۰۰ ق م تا سنہ ۱۹۲۲ء)

اوپر سے نیچے کی طرف پڑھئے

زمانہ قبل تاریخ سنہ ۵۰۰۰۰ ق م تا سنہ ۶۰۰۰ ق م
برفانی زمانہ

سنہ ۴۰۰۰ ق م - مصر میں تہذیب کا آغاز - اہرام مصری کی تعمیر - تقویم سال و ماہ

سنہ ۳۰۰۰ ق۔م - سلطنت مصر

سنہ ۲۰۰۰ ق۔م - عراق میں تہذیب کا دور - شہر نینوا - مصر میں یہود کا قیام - بابل میں حمورابی کی حکومت

سنہ ۱۰۰۰ ق۔م - جنگ ٹرائے - ایکینز کا یونان فتح کرنا

سنہ ۹۰۰ ق۔م - یونان میں شہری ریاستوں کی ابتدا - فلسطین میں یہودی حکومت اور ہیکل کی تعمیر

سنہ ۸۰۰ ق۔م - قوم یہود کے انبیاء - شہر روما کا آباد ہونا - فنیقیوں کا شہر کارتھیج آباد کرنا

سنہ ۷۰۰ ق م - اشوری حکومت کا عروج و زوال -
یونانی نوآبادیوں کی ابتداء - شہر نینوا کا تباہ ہونا

سنہ ۶۰۰ ق م - چین میں حکیم کنفوشش - ہندوستان میں گوتم بدھ
حکیم سولن کا اہل ایتھنز کے لئے ضابطہ قوانین مرتب کرنا -

سنہ ۵۰۰ ق م - یونانی تھیٹر کا عروج - ایتھنز کا دورِ زرین -
جنگ میریتھن - پیریکلیز -

سنہ ۴۰۰ ق م - جنگ مابین ایتھنز و اسپارٹا اور ایتھنز کا
تباہ ہونا - ایتھنز میں علم و حکمت کا احیاء - سقراط اور افلاطون

سنہ ۳۰۰ ق م - سکندر اعظم - ہینی بال - ارسطو

سنہ ۲۰۰ ق م - کارتھیج کا تباہ ہونا - یونان کا رومی سلطنت
کا ایک صوبہ بن جانا - روما کا بحیرہ روم پر قابض ہونا - مقابیوں کی آخری آزاد
یہودی سلطنت

سنہ ۱۰۰ ق م - بحیرۂ روم - پمپی کا مغربی ایشیا کو فتح کرنا -
سیزر کا فرانس فتح کرنا - سیزر کا قتل - آگسٹس کا شہنشاہ بن جانا

سنہ ۱ء - مسیح کی ولادت اور انگلستان کی فتح - مسیحیت کی
مغربی یورپ میں اشاعت -

سنہ ۱۰۰ء - سلطنت روما کا دنیا پر حکمرانی کرنا - ٹراجن -

ہیڈرین ۔ مارکس آریلیئس ۔سٹوئک فلسفہ

سنہ ۲۰۰ و سنہ ۳۰۰ء ۔ وحشیوں کا سلطنت روما پر حملہ آور ہونا ۔

سنہ ۴۰۰ء ۔سینٹ آگسٹن ۔ پاپائیت کی ابتداء ۔قوم گاتھ کا روما کو تباہ کرنا ۔ مغربی رومن سلطنت کا خاتمہ ۔ اہل سیکسن کا انگلستان میں ورود ۔

سنہ ۵۰۰ و سنہ ۶۰۰ء ۔ ازمنۂ مظلمہ ۔ روم کے کھنڈروں پر کلیسا کا قایم ہونا ۔بانیٔ اسلام حضرت محمدؐ صاحب کی ولادت

سنہ ۷۰۰ء ۔مسیحیت کی شمالی یورپ میں اشاعت ۔مسلمانوں کا شمالی افریقہ اور اسپین فتح کرنا ۔چارلس مرٹل کا مسلمانوں کو شکست دینا

سنہ ۸۰۰ء و سنہ ۹۰۰ء ۔شارلیمان کا روم میں تاج سر پر رکھنا ۔ شمالی اقوام کے حملے ۔جرمینک بنیادوں پر رومی سلطنت کے احیاء کی کوشش ۔ پہلی روسی حکومت ۔

سنہ ۱۰۰۰ء ۔کنوسا ۔پوپ اور شہنشاہ گریگوری ہفتم اور ہنری چہارم کے مابین مناقشات ۔ ولیم فاتح انگلستان ۔پہلی صلیبی جنگ ۔

سنہ ۱۱۰۰ء ۔ مزید صلیبی جنگیں ۔یورپ میں شجاعانہ کارناموں کی ابتداء ۔بحیرۂ روم کا تجارت کا مرکز قرار پانا ۔ یونیورسٹیوں کی ابتداء ۔

سنہ ۱۲۰۰ء ۔گاتھک طرز کے بہت سے گرجوں کی تعمیر ۔ اٹلی میں احیاء العلوم کا آغاز ۔صلیبی جنگوں کا اختتام ۔ٹامس ایکوینا س ۔

راجر بیکن - ڈانٹے - میگنا کارٹا

۱۳۰۰ء - بارود کی ایجاد - اور فیوڈل سرداروں کی طاقت میں زوال - حکومت ہائے عمومی اور مجلس شوریٰ کی ابتداء

۱۴۰۰ء - جون آف آرک انگریزوں کا فرانس سے اخراج - چھاپہ کی ایجاد - ترکوں کا قسطنطنیہ فتح کرنا - اور مشرقی رومن امپائر کا خاتمہ

۱۵۰۰ء - کولمبس - انکشافات کا زمانہ - میگیلن - دور اصلاح کلیسائی - ایریزمس - لوتھر - کالون - زونگلی - مینلنکتھان - اصلاح کا ردعمل - لایولا اور جیزویٹ فرقہ - ہسپانی آرماڈا کا تباہ ہونا - ایلزبتھ ملکہ انگلستان - ولندیزیوں کا ہسپانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا - فلپ ثانی کی دستبرداری - جہازرانی کی جملہ اقوام کو آزادی کے لئے پہلی تحریک -

---

۱۶۰۰ء - مذہبی مناقشات - احیاء العلوم کے دور کا خاتمہ - دنیا کے تمام حصوں میں یورپین نوآبادیوں کا قیام - سی سالہ جنگ - انقلاب انگلستان - شاہ چارلس کا قتل ہونا - سائنس کی ابتدا - گلیلیو اور نیوٹن - شیکسپیئر - مالیار - کرامویل - گسٹیوس ایڈولفس آف سویڈن +

۱۷۰۰ء - روس کا عالمگیر طاقت ہو جانا -

فلاسفر:- اسپنوزا، ڈیکارٹ، ڈایڈورے، والٹیر، کینٹ، گوئٹے، جے ایس باخ - موزارٹ - لوئی چہاردہم اور ولیم آف آرینج - توازن طاقت - امریکن انقلاب - واشنگٹن، فرینکلن - ہملٹن - جیفرسن - انقلاب فرانس اور شاہ لوئی شانزدہم

کا قتل ہونا اور فرانس میں جمہوریہ کا قیام

سنہ ۱۸۰۰ء - نپولین کا عروج اور زوال - انسداد غلامی - طب جدید - حفظانِ صحت - ریل گاڑی - تار برقی - دخانی جہاز - دخانی انجن - اتحاد مقدس - ردعمل کا دور - بیتھوون - ویگنر - ابراہام لنکن - جنوبی امریکہ میں ہسپانی نو آبادیوں کا علم بغاوت بلند کرنا - یورپ میں قومی آزادی کے حصول کے لئے جدوجہد کا آغاز - سلطنت جرمنی کا دوبارہ قیام پذیر ہونا +

سنہ ۱۹۰۰ء - وسیع پیمانہ پر سامان زندگی کا تیار کیا جانا - رقابت متعلقہ سامانِ حرب - ہوائی جہاز کی ایجاد - جنگِ عظیم - مجلس اقوام عالم - تجارتی رقابت - دنیا کے تمام ملکوں میں اقتصادی بے چینی - جرمنی اور روس کی سلطنتوں کا خاتمہ - بہت سی نئی قومیتوں کا قیام - تباہ کن انجنوں کی صنعت کی تکمیل +

سنہ ۲۰۰۰ء

یہ سلسلہ ایک غیر معین عرصہ تک یونہی چلا جائیگا +

باہتمام لالہ موتی رام منیجر مفید عام پریس واقع چیٹرجی روڈ لاہور میں چھپی اور مسٹر ایل - اے - ہاشمی سیکرٹری پنجاب ایڈوایزری بورڈ فار بکس لاہور نے شائع کی -

انڈکس

الف

ب

پ

ڈ

ر

ز

ژ

س

ش

ص

ط

گ

ل

م

ہ